سلسلۂ نصابیات جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند

حصۂ اول، دوم و سوم

برائے میٹرک

(طبع ششم)

تالیف

مولوی سید ہاشمی صاحب، فرید آبادی
سابق رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ
و
حال مددگار معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۶ھ م سنہ ۱۳۴۶ف م سنہ ۱۹۳۷ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تاریخ ہند (برائے میٹرک) حصۂ اول، حصۂ دوم، حصۂ سوم

(طبع ششم)

حصۂ اوّل

"دور قدیم"

ابتدائے تاریخ سے سنہ ۱۲۰۶ء تک

(از صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱۱)

حصہ دوم

"دورِ وسطیٰ"

(از ۱۲۰۶ء تا ۱۷۶۵ء)

از صفحہ ۱۱۲ تا صفحہ ۳۲۱

حصۂ سوم

"دورحال"

(از ۱۷۶۵ تا زمانۂ حال)

از صفحہ ۳۲۲ تا صفحہ ۴۴۳ ختم



مطبوعہ پروسس اسٹوڈیو مطبع جامعہ عثمانیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ ہند

حصہ اول

دورِ قدیم

(ابتدائے تاریخ سے سنہ ۱۲۰۶ء تک)

باب اول

ہند کی جغرافی تقسیم اور نسلیں

تاریخ شروع کرنے سے پہلے اس کی جغرافی تقسیم اور خاص خاص نسلوں کے متعلق چند لفظ لکھنے مناسب ہیں کیونکہ ملکوں کی قدرتی حدود کا، آب و ہوا کا، اور نسلوں کا ملکی تاریخ پر بہت کچھ اثر ہوتا ہے۔

جغرافی تقسیم

ہندوستان کا جنوبی حصہ مثلثی شکل کا جزیرہ نما ہے اور اس کے مغرب میں بحیرۂ عرب اور مشرق میں خلیج بنگال کا سمندر واقع ہے لیکن جزیرہ نما کے شمال میں "ہندوستان خاص" کا جو قطعہ

براعظم ایشیا کے جسم اصلی میں پیوستہ ہے اس کا قدرتی حصار ہمالیہ کے پہاڑ ہیں یہ دونوں سروں پر پہنچ کر جنوب میں سمندر تک مڑے چلے گئے ہیں گویا کسی دیو نے باہیں پھیلا کر ہندوستان کو اپنی گود میں لے لیا ہے۔

کوہستان کی فصیل اور سمندر کی اس قدرتی خندق نے ہندوستان کو سیاح اور تاجر، حملہ آور اور قزاق سب کی دسترس سے دور کر دیا تھا لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے وہ عقل و تلاش بخشی ہے کہ سمندر کی تہ اور پہاڑ کی بلند سے بلند چوٹی تک پہنچتا ہے، یہ عمدہ سرزمین اس کی جستجو سے کیونکر بچ سکتی سمندر میں جہاز رانی تو آج سے چند صدی پہلے بہت دشوار تھی اور جزیرہ نمائے ہند کے اس قدر قریب کوئی ملک بھی نہیں کہ وہاں سے لوگ بآسانی سمندر کی راہ یہاں تک آجاتے۔ صرف شمال کے پہاڑی درے باقی رہ گئے جو اصل میں ندیوں کی گزرگاہ ہیں انھی کے کنارے کنارے باہر کے لوگ پہلے سرحدوں تک پہنچے اور پھر ملک ہند میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ مشرق کی طرف پھیلنے لگے۔

واضح رہے کہ شمالی ہندوستان ہی وہ زرخیز خطہ ہے جس میں ہمالیہ کے دریا پہاڑوں سے اتر اتر کے بہتے اور مشرق یا مغرب کی طرف سمندر میں جا گرتے ہیں۔ زمین کی بلندی اور پستی ناپنے سے معلوم ہوا ہے کہ دریائے جمنا سے چند میل مغرب میں سرہند کا علاقہ اس ملک کا فاصل آب ہے یعنی اسی بلندی سے پانی ڈھل کر ایک طرف پنجاب کے دریا بہتے اور دریائے سندھ یا اٹک سے مل کر بحیرۂ عرب میں جا گرتے ہیں، اور دوسری طرف "ہندوستان خاص" کے دریا گنگا اور جمنا مغرب میں بہتے ہیں اور ایک وسیع دوآبہ بنا کر الہ آباد کے قریب مل جاتے ہیں۔ ہندوستان کا دل یہی "دوآب" ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب اور سلطنتوں کا مرکز اسی علاقے میں تھا۔ اس سے آگے بہار اور بنگال کا ملک شروع ہو جاتا ہے جسے قدیم مورخ "شرقی صوبہ" کہا کرتے تھے۔

اوپر کے بیان کا چند لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کا سب سے زرخیز خطہ یعنی وادی سندھ و گنگا تین بڑے بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) پنجاب (۲) دوآب یا بنارس سے دہلی تک کا علاقہ۔ اور

(۳) **مشرقی صوبہ**۔ قریب قریب اس تمام ملک کا موسم "برّی" ہے یعنی گرمی میں سخت گرمی اور سردی میں سخت سردی پڑتی ہے۔ لیکن مشرقی صوبے میں بارش کی کثرت سے موسم مرطوب اور کسی قدر معتدل رہتا ہے۔ یہاں کی زمین بھی سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے لیکن لوگ مغربی باشندوں کے برابر جفاکش اور طاقتور نہیں ہوتے۔

شمالی ہندوستان کے سیرحاصل قطعات سے جنوب میں آتے ہی زمین کی حالت بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ یعنی ایک طرف تو سینکڑوں میل تک گرم لو اور سنہری ریت کا ملک **راجپوتانہ** پھیلا ہوا ہے اور دوسری طرف وسط ہند کے بلند اور کوہستانی قطعات ہیں جو بلند ہوتے ہوتے **ست پڑا** اور **بندھیاچل** کے پہاڑوں کی صورت میں سر ابھارتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہی جزیرہ نما کا علاقہ اور دکن کی سطح مرتفع شروع ہو جاتی ہے، مگر جزیرہ نما ہونے کے علاوہ ایک قدرتی فرق یہ ہے کہ ملک دکن **منطقۂ حارہ** میں واقع ہے اور نربدا تک پہنچتے پہنچتے آپ **خط سرطان** سے گزر جاتے ہیں۔

اس محلِ وقوع کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس ملک کی آب و ہوا بہت گرم ہوتی لیکن شمال میں سطح کے بلند ہونے کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا ہے اور یہی دکن خاص کی وہ زرخیز سطح مرتفع ہے، جسے **مہاندی**، **گوداوری** اور **کرشنا** سیراب کرتے ہیں اور جہاں ہندو مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس کے جنوب میں سمندر کے قریب ہونے سے موسم میں اعتدال پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم یہاں اچھے اور سرسبز قطعات وہی ہیں جو زیادہ گرم ہیں اور جہاں کے باشندے زراعت و تجارت میں بہت ہوشیار اور محنتی ہوتے ہیں، لیکن جنگ جوئی اور ملک گیری کی ان میں صلاحیت نہیں اور نسل کے اعتبار سے بھی اگر انھیں ہندوستان میں سب سے الگ اور ممتاز سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ خالص دراوڑی نسل کے لوگ ہیں جن کا حال آگے آتا ہے۔

ہندوستان کی نسلیں

اگرچہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی "نوع" کے فرد ہیں لیکن قد، قامت، رنگ، روپ اور خط و خال کے اعتبار سے ان کے خاص خاص گروہ الگ کر دیئے گئے ہیں اور انھی کو ہم ایک نسل کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں مختلف موسم طرح طرح کی زمینیں اور قسم قسم کی پیداوار پائی جاتی ہے وہاں سب سے نمایاں دو بائیں

یہ بھی ہیں کہ آبادی میں مختلف مذہب و عقائد کے پیرو ملتے ہیں اور ان کے رنگ و روپ، قدوقامت وغیرہ میں بھی باہم اسقدر فرق پایا جاتا ہے کہ مثلاً ایک مدراسی اور پنجابی کو دیکھکر کسی طرح یقین نہیں آتا کہ وہ ایک ہی ملک کے باشندے ہونگے۔

لیکن رنگ و روپ اور قدوقامت کے اِس ظاہری فرق کے علاوہ کچھ اور فرق بھی کاسۂ سر کی بناوٹ میں پائے جاتے ہیں اور ان سب باتوں کو پیش نظر رکھکر اہل تحقیق نے ہندوستان کی آبادی کو سات نسلوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ ترکو ایرانی اِس نسل کے لوگ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے صوبوں میں آباد ہیں۔ ان کا قد میانہ، رنگ گورا، آنکھ کی پتلی سیاہ، یا کبھی کبھی کرنجی، چہرے پر گھنے بال، سر چوڑا اور خاصی باریک اور بہت لمبی ستواں ناک ہوتی ہے۔ یہ نسل غالباً ترکی اور ایرانی نسلوں سے ملکر بنی ہے، اور بلوچی، براہوی اور سرحدی پٹھان یا افغانی لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ ہندی آریا (انڈو آرین)۔ راجپوت، کھتری اور جاٹ اس نسل کی خاص قومیں اور ان آریا فاتحین کی اولاد ہیں جو ہزاروں برس پہلے ہندوستان میں آکر آباد ہوگئے تھے ان کا قد لمبا، رنگ کھلتا ہوا، پتلی سیاہ، بال گھنے اور سر لمبوترا ہوتا ہے۔ اِس نسل کے لوگوں کی بھی ناک ستواں اور باریک ہوتی ہے مگر ترکو ایرانیوں کی مثل لمبی نہیں ہوتی[1]۔

۳۔ سیتھی دراوڑی اِس نسل میں سیتھی، اور دراوڑی، دونوں کا خون شامل ہے اور مغربی ہند کے مرہٹہ برہمن، اور کنبی لوگ اسی نسل سے ہیں ان کا قد ترکو ایرانی لوگوں سے چھوٹا سر زیادہ لمبا اور ناک چھوٹی مگر اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی ہے۔

---

[1] ہندی آریا نسل کے لوگ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ ذات پات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پنجاب کے ایک چوہڑے یا (خاکروب) اور اودے پور کے ایک معزز ٹھاکر میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جسم کی ساخت برابر غمازی کر رہی ہے کہ وہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی نسل کے افراد ہیں۔ ملاحظہ ہو (گزیٹیر آف انڈیا جلد اوّل صفحہ ۲۹۳)

۴- آریا دراوڑی

یا ہندوستانی (آریو ڈراوڈین) راجپوتانے کے بعض حصوں اور دوآب اور بہار کے علاقوں کی آبادی ہندی آریا، اور دراوڑی نسلوں کے بین بین ہے اور غالبًا انہی دونوں کی آمیزش سے یہ نسل پیدا ہوئی ہے۔ اِس نسل کے لوگوں کا سر لمبوترا، رنگ گندمی یا سانولا اور قد چھوٹا ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ طبقے کے ہندوستانی پنڈت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ تک بالعموم سب اسی نمونے کے ہوتے ہیں۔

۵- منگولو دراوڑی

یا بنگالی، یہ نسل منگول اور دراوڑی نسل کے ملنے سے بنی ہے اور مشرقی بنگال اور اڑیسہ میں اسی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ان کا سر چوڑا، رنگ سانولا، قد میانہ، اور ناک کسی قدر چپٹی ہوتی ہے۔

۶- منگولوی

(منگولو ایڈ) ہمالیہ کے دامن میں برما سے کشمیر کے جنوب مشرقی حدود تک اس نسل کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اِن کا سر چوڑا، رنگ زردی مائل، قد چھوٹا، چہرہ چپٹا اور اس پر بال بہت چھدرے ہوتے ہیں، گورکھے، بھوٹانی اور برمی سب اسی نمونے میں شامل ہیں۔

۷- دراوڑی

اس نسل کے لوگوں کا قد چھوٹا، رنگ سیاہ، سر لمبا اور گھنے گھونگروالے بال ہوتے ہیں۔ اگرچہ ناک بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہے مگر چہرہ چپٹا نہیں نظر آتا۔ ہندوستان کی سب سے قدیم نسل یہی ہے اور بندھیاچل سے راس کماری تک جنگلوں اور پہاڑوں میں اس کے خالص نمونے موجود ہیں۔ مدراس ریاست حیدرآباد اور صوبجات متوسط اس کے خاص وطن ہیں۔ جنوب میں ساحل ملیبار کے دیسی باشندے اور انتہائے شمال میں چھوٹے ناگپور کی سنتال قوم، اسی نسل کی شاخیں مانی جاتی ہیں۔

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ آبادی کی یہ تقسیم ایسی قطعی نہیں ہے کہ ان نمونوں کے سوا جن کا اوپر بیان ہوا دوسرے رنگ روپ کا آدمی ہی ہندوستان میں نہ پایا جائے۔

ل قد کا اوسط ۵½ فیٹ مانا گیا ہے اور پستہ قامت یا چھوٹا قد اسے کہیں گے جو ۵ فیٹ ۵ انچ سے نیچا ہو ۱۲

دراصل جو نمونے زیادہ عام ہیں انھیں ایک علحدہ نسل مان لیا گیا اور ان کے نمایاں خط و خال کو اس نسل کی خصوصیت قرار دے لیا گیا ہے، ورنہ ہر نسل میں تھوڑی بہت تعداد ہر رنگ کے افراد کی مل سکتی ہے، اور اسی طرح ہر نسل کا آدمی بھی ہر جگہ ملک میں نظر آجاتا ہے خاص کر اس زمانے میں سفر کی آسانیوں نے اگر بنگالیوں کو لاہور و دہلی تک پہنچا دیا ہے تو ہزاروں پنجابی اور ان کی اولاد برما، اور دکن، کے علاقوں میں آباد نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے اکثر حصوں میں عربی نسل کے مسلمان اور دکن میں جا بجا حبشیوں کی اولاد بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر نسلوں کی تقسیم اور ان کی سکونت کے مقامات وہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔

باب دوم[1]

زمانۂ ماقبل تاریخ اور وادی سندھ کی قدیم تہذیب

زمانۂ ماقبل تاریخ

ہر قوم کی اصلی یا تحریری تاریخ ان کے آباد ہونے سے بہت مدت کے بعد شروع ہوتی ہے، کیونکہ لکھنے پڑھنے کا فن آدمی نے بہت بعد میں ایجاد کیا ہے۔ تحقیقات سے اندازہ ہوا ہے کہ دنیا کے بعض خطّوں میں آج سے ہزار ہا برس پہلے آدمی کی نسل موجود تھی لیکن اس کی آبادی بڑھنے میں اور مل جل کر رہنا سیکھنے میں بہت مدت صرف ہوی۔ رفتہ رفتہ اس نے بُرے بھلے کچے مکان بنائے اور پتھر کے موٹے جھوٹے اوزاروں سے کام لینا شروع کیا۔ انھی پُرانی یادگاروں کو دیکھ کر آثار قدیمہ کے ماہروں نے ماقبل تاریخ زمانے کی کئی قسمیں کر دی ہیں۔ سب سے ابتدائی زمانہ **عہد حجر قدیم** کہلاتا ہے اور اس کے بعد جب آدمی پتھر کے ذرا بہتر اوزار یا ہتیار بنانے سیکھ گیا، تو اسے **عہد حجر جدید** کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس زمانے کے بعض برتن اور ہتیار ہندوستان کے مختلف مقامات میں

---

[1] اس باب کا ماخذ کتاب "موہن جو دارو اینڈ دی انڈس سوی لی زیشن" (کامل ۳ جلد) ہے جو سر جون مارشل (سابق صدر ناظم آثار قدیمہ ہندوستان) کی تالیف اور نگرانی میں ۱۹۳۱ء میں سرکاری اہتمام سے شایع ہوئی ہے۔ ہم نے اس باب کے حاشیوں میں جہاں صرف جلد اور صفحہ کا نشان لکھا ہے وہاں یہی کتاب مراد ہے۔

زمین کے نیچے سے برآمد ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہاں بھی آدمی کا قدم آگیا تھا لیکن اس کے بعد پھر صدیوں تک اور کسی آبادی یا ان کے حالات کا سُراغ نہیں ملتا۔ اور صرف دس بارہ سال پہلے تک اہل تاریخ کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ آریا قوم کے ہندوستان میں آنے کے بعد شروع ہوتی ہے اور ان سے پہلے کے حالات کا علم نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان کے جو اصلی یا قدیم باشندے تھے ان میں تہذیب و تمدن کا وجود ہی نہ تھا کہ ان کی کوئی یادگار ہی باقی رہ جاتی۔

زمانۂ حال کے حیرت انگیز اکتشافات

لیکن گزشتہ دس بارہ سال میں سندھ، مغربی پنجاب اور بلوچستان کے بعض مقامات میں وسیع پیمانے پر جو کھدائیاں ہوئیں ان میں زمین کے اندر سے بے شمار اسباب و اشیاء کے علاوہ، خاصے بڑے بڑے شہر اور بستیوں کے آثار برآمد ہوئے اور ان کی دریافت نے علمی دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان سے صاف ثابت ہو گیا کہ آریوں کے ہندوستان میں آنے سے صدہا سال پہلے بھی اس ملک یا کم سے کم وادی سندھ میں جو لوگ آباد تھے وہ محض خانہ بدوش جنگلی نہ تھے بلکہ ان میں قدیم وضع کی تہذیب موجود تھی۔ سر جون مارشل نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب (" موہن جو دارو۔۔") کی تمہید میں اس تہذیب کی نوعیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

سر جُون مارشل کا بیان

"ابتک عام خیال یہی تھا کہ ہندوستان کے قدیم تر باشندے تہذیب و تمدن میں اپنے آریا فاتحین سے بہت کم درجہ رکھتے تھے اور اسپارٹا کے ہلوٹ یا بازنطیم کے سلاقوں کی طرح انکی قوم ایسی ذلیل اور غلامانہ حیثیت کی تھی کہ انھیں عام طور پر داس یا غلام ہی کہا جاتا تھا۔

رگ وید کے بھجنوں سے ان کی صورت و سیرت کا جو نقشہ کھنچتا ہے، وہ یہ ہے کہ خوش رو اور صاحب زبان و مذہب آریوں کے خلاف، یہ ہندی سیاہ فام اور چپٹی ناک کے جنگلی لوگ تھے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ مویشی کی ان کے پاس کمی نہ تھی اور بہت سے قلعے یا گڑھ بھی تھے جن کے اندر محفوظ ہو کر وہ آریا حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے اور بہت اچھے لڑانے والے تھے، لیکن ابتک علمائے ویدان "قلعوں" کو محض عارضی جائے پناہ

بناتے تھے جن کے گرد وہ یا ان گھڑ پتھروں کی دیواریں بنالی جاتی ہوں گی کیونکہ اس زمانے میں جب کہ خود آریا قوم کا تمدن دیہات کی منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا اور مختلف اعتبار سے بہت ادنیٰ یا بدوی تھا، یہ کسی طرح ممکن نظر نہ آتا تھا کہ ہندوستان کے قدیم تر باشندے اچھے بنے ہوئے شہروں یا قلعوں کے اندر آباد ہوں اور انکا تمدن بہت کچھ ترقی کرچکا ہو۔ بخلاف اس کے سب کو یقین تھا کہ وہ فاتح حملہ آوروں سے ہر طرح پست و کم رتبہ تھے اور ہندوستان کی تہذیب و ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ آج سے پانچ ہزار برس قبل اور اس سے بہت پہلے کے آریوں کا نام بھی سننے میں آیا ہو، ہندوستان کے دوسرے اقطاع میں نہیں تو کم سے کم پنجاب و سندھ میں انہی ذلیل و حقیر ہندی داسوں کا ایک ترقی یافتہ اور یکساں تمدن موجود تھا جو مصر و عراق کے ہمعصر تمدن سے بہت قریبی تعلق اور بعض اعتبار سے اس پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ مگر حقیقت یہی ہے جسے ہڑپا اور موہن جودارو کے تازہ اکتشافات نے قطعی طور پر ثابت و آشکار کردیا ہے۔ ان اکتشافات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولادت مسیح علیہ السّلام سے تین چار ہزار برس قبل وادی سندھ کے باشندے بہت اچھی اور نشو و نما پائی ہوئی تہذیب کے مالک تھے جس میں آریوں کا مطلق کوئی دخل و اثر نہ تھا۔ مغربی ایشیا کے دوسرے ملکوں کی مثل سندھ میں بھی اسوقت حجر و نحاس کا عہد تھا جس میں تانبے اور پیتل کے ساتھ ساتھ پتھر کے ظروف و اوزار بھی استعمال ہوتے تھے۔ لوگوں میں شہری تمدن آگیا تھا ان کی دولت بیشتر زراعت و تجارت سے مہیا ہوتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تجارت کا دائرہ ہر طرف دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ گیہوں اور جو کے علاوہ وہ کھجور کی کاشت کرتے تھے۔ اونٹ، ہاتھی، بھیڑ، بکری، سور، کتا، بھینس اور چھوٹے سینگ والے نیز کوہانی سانڈ پالنے لگے تھے لیکن غالباً بلی اور گھوڑے سے وہ واقف نہ تھے۔ باربرداری کے لئے بیلوں کی گاڑیاں ہوتی تھیں اور یقین ہے کہ ان میں بیل جوتے جاتے ہوں گے۔ ہم انہیں دھاتوں کے کام میں اچھا کاریگر پاتے ہیں اور سونے چاندی اور تانبے کی بھی ان کے پاس کچھ کمی نہیں۔ سیسا اور (صرف پیتل بنانے میں) ٹین بھی استعمال کرتے ہیں، اور کاتنے اور بننے سے بخوبی واقف ہیں۔ تیر کمان، برچھی، تیر، خنجر اور گرز ان کی لڑائی اور شکار کے ہتیار ہیں۔ تلوار

ابھی تک نہیں بنا سکے اور نہ کسی دفاعی زرہ، یا ڈھال وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ عام اوزاروں میں ہتوڑہی، درانتی، آرا، چھینی اور استرا (تانبے اور پیتل دونوں دھاتوں کے بنے ہوئے) ملتے ہیں۔ چھرے چاقو کبھی ان دھاتوں کے اور کبھی چقماق یا دوسرے سخت پتھروں کے بنائے جاتے ہیں۔ غلہ پیسنے کے لئے گول چکی ان کے پاس نہیں مگر سل بٹے اور (کوٹنے کی) کنڈالی موجود ہے۔ گھریلو برتن عموماً مٹی کے ہیں مگر ایک آدھ تانبے پیتل یا چاندی کا بھی استعمال میں ہے۔

. . . . لکھنے کے فن سے بھی اہل سندھ باخبر ہو گئے ہیں اور اس غرض کے لئے جس رسم الخط سے کام لیتے ہیں وہ ہندوستان سے مختص ہونے کے باوجود صریحاً مغربی ایشیا کے دوسرے ہمعصر خطوں سے مشابہ ہے:۔

پلیٹ　CXI　انگریزی کتاب "موہن جو دارو جلد سوم"

تصاویر نشان 337, 338, 342, 351, 356, 357

رسم الخط اور مہریں

افسوس ہے کہ اب تک اس سندھی خط کو پڑھا نہیں جا سکا جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس تحریر میں کوئی بڑا کتبہ یا مسلسل عبارت دستیاب نہیں ہوئی۔ جو نمونے ملے ہیں وہ سب کے سب گول، چوکور یا بیلن کی سی شکل کی مہروں پر کھدے ہوئے ہیں۔ اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط مصریوں کے خط تصویری کے بعد کی ایجاد ہے اور اس کی بعض علامتوں میں ہمارے زمانے کے حروف کی شان پائی جاتی ہے یعنی ایک علامت پورے لفظ کی بجائے صرف ایک آواز (یا حرف) کا کام دیتی ہے۔ یہ علامتیں بہت صاف اور واضح بنی ہوئی ہیں اور لکھنے کا رُخ بھی دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف ہے جیسے آجکل اردو۔ فارسی رسم الخط کا لیکن اصل عبارت کے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ غالباً یہ دُعائیہ کلمات یا دیوی دیوتاؤں کے نام ہیں جن کی تصویریں بھی ان مہروں پر کندہ ہیں۔

ان قدیم باشندوں کا مذہب

ان مہروں سے غالباً گنڈے تعویذ کا کام لیا جاتا تھا اور ان تصاویر سے سندھ کے ان قدیم باشندوں کے مذہبی عقائد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پتھر، مٹی اور دھاتوں کی بہت سی مورتیاں یا چھوٹے بُت برآمد ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ



پلیٹ CXI انگریزی کتاب "موہن جو دارو جلد سوم"

تصاویر نشان 337, 338, 342, 351, 356 357



تصویر کتاب انگریزی جلد اوّل مقابل صفحہ ۵۲

پلیٹ XII تصویر ۱۷

شوجی کی شبیہ

"دھرتی ماتا" یا "مہاماہی" کی پوجا کا عام رواج تھا اور غالباً اس دیوی پر انسانی قربانی بھی چڑھائی جاتی تھی۔ ہندوستان کے ہر حصے میں اب بھی ماتا کی پوجا کا جو رواج پایا جاتا ہے، اہل تحقیق کے نزدیک یہ آریا نسل کے ہندوستان میں آنے سے صدہا سال پہلے کی یادگار ہے[1]۔

شومت اور شجر ستی

مگر اس "ماتا پوجا" سے بھی زیادہ حیرت کے قابل یہ بات ہے کہ اس قدیم زمانے میں شوجی کی پوجا اور لنگایتوں کے بعض اصولی عقائد کے بہت سے آثار ملے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ

تصویر۔ (کتاب انگریزی۔ جلد اوّل مقابل صفحہ ۵۲)

پلیٹ XII تصویر ۱۷

شوجی کی شبیہ

زمانۂ حاضرہ کا یہ مذہب بھی کسی نہ کسی صورت میں آریوں سے پہلے ہندوستان میں موجود تھا[2]۔

بعض خیالی اور بعض واقعی حیوانات کی پوجا کا پتہ چلتا ہے جن میں ہاتھی، بھینسا، سانڈ اور شیر نمایاں ہیں۔ مگر قرائن کہتے ہیں کہ ان سے بھی بڑھکر عبادت اور تقدیس درختوں کی ہوتی تھی اور ان میں سے بعض درخت ہندوستان کی بجائے ایران و عراق کے درختو سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ البتہ بعض تصویروں میں بظاہر پیپل کی پوجا کا سماں دکھایا ہے اور یہ درخت اب تک ہندوؤں میں مقدس مانا جاتا ہے۔

مکانات اور گلی کوچے

ان قدیم دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تو بہت سی ملیں مگر تعجب یہ ہے کہ اس زمانے کے کسی بڑے مندر یا عبادت گاہ کا سراغ نہیں ملا۔ اس عہد سے بھی پہلے مصر و عراق میں لوگ مذہبی عمارتیں بنانے ہی میں زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ بخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے وادی

[1] جلد اوّل۔ صفحہ ۵۱۔
[2] جلد اوّل صفحہ ۵۸ و آئندہ۔

سندھ کے قدیم باشندوں کو عبادت گاہوں سے زیادہ اپنے رہنے کے مکان بنانے کا شوق تھا۔ ان کے جو مکانات موہن جو داڑو کی کھدائیوں میں برآمد ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے ہندوستان کے قدیم باشندے ایسے اچھے اور پختہ مکانوں میں رہنے لگے تھے کہ آج بھی ہمارے اکثر دیہات میں ایسے پختہ مکانات کم ملیں گے۔ وہ اینٹ پکانے کے فن سے واقف تھے اور بڑی بڑی اینٹیں (جو اس زمانے کی گماں اینٹ کے برابر ہیں) تیار کر کے گارے اور گچ کے بڑے بڑے مکانات بناتے تھے۔ چونے کا استعمال کم تھا اور دیواروں پر کوئی پلاستر یا استرکاری بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن رہنے کے الگ اور نہانے دھونے، کھانا پکانے اور غالباً سونے کے کمرے بھی الگ الگ ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کمرے ۲۳، ۲۴ گز تک لمبے اور اسی کے مناسب چوڑے پائے گئے ہیں عام طور پر بڑے مکانوں میں حمام اور ایک پختہ کنواں ہوتا تھا۔ جس تک پہنچنے کا ایک راستہ گلی میں رکھتے کہ دوسرے لوگ بھی پانی لے سکیں۔

تصویر - پلیٹ (b) XLI جلد سوم

"مکان کے اندر ایک کنواں"

حمام کے اندر چھوٹے حوضوں میں پانی گرم کرنے، اور موریوں کے ذریعے باہر نکالنے کا بھی معقول انتظام ہوتا تھا۔ یہ مکان ایک دوسرے سے ملا کر سیدھی قطاروں میں بنائے جاتے اور آج بھی خاصے باقاعدہ گلی کوچوں اور بازاروں کا پتہ چل سکتا ہے۔

لباس، ظروف اور زیورات

تصویروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان قدیم باشندوں کو خیاطی یا سینے کا فن نہیں آتا تھا اور غالباً وہ صرف لنگوٹ اور بے سلی چادریں استعمال کرتے تھے۔ البتہ کاتنا اور بننا خوبی جانتے تھے اور ہاتھ، سر اور گلے کے طرح طرح کے زیور بھی خوب بنانے لگے تھے۔ سونے، چاندی، جست اور تانبے کی ان کے پاس کمی نہ تھی اور بعض ادنیٰ درجے کے جواہرات بھی بہم پہنچا لیتے تھے، لیکن ان زیورات کے بنانے سے بھی زیادہ ترقی اور کاریگری ان کے برتنوں خاص کر مٹی اور چینی کے ظروف میں نظر آتی ہے۔ ایسے برتن بہت کثرت سے نکلے ہیں اور بعض اتنے خوبصورت اور منقش پائے گئے ہیں کہ شاید آج بھی ہندوستان میں بہت کم کمہار ان سے بہتر بنا سکیں گے۔



تصویر۔ پلیٹ (b) XLI جلد سوم

مکان کے اندر ایک کنواں





تصویر- پلیٹ LXXXVII جلد سوم

تصویر ۱ و ۴

"روغنی ظروف کے دو نمونے"

تصویر۔ پلیٹ LXXXVII جلد سوم

تصویر (۱) و (۲)

"روغنی ظروف کے دو نمونے"

نسل

اس قدیم تمدن کے حالات پر زیادہ تفصیلی بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں کیونکہ ابھی تک بہت سے نتائج قیاسی ہیں لیکن چند اہم اور یقینی باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ان قدیم باشندوں کی پرانی قبروں سے ان کے مردوں کے چند پنجر بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ان کی کھوپریوں کی ساخت کا امتحان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً مختلف چند نسلوں یا کسی مخلوط نسل کے لوگ تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا عراق کے سمیریوں یا ہندوستان کی دراوڑی نسل سے رشتہ ہو لیکن اتنا یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ آریا نسل سے نہ تھے۔ یوں بھی آریا ہندوستان میں آئے تو ان کا تمدن بہت سادہ تھا اور وہ شہر یا پختہ مکان تک بنانا نہیں جانتے تھے[1]۔ بخلاف اس کے سندھ کے پرانے آثار سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ان قدیم تر باشندوں میں حضریت یا شہری تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا تھا۔

زمانہ اور علاقہ

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا وادی سندھ کا یہ قدیم تمدن مصر و عراق کے قدیم تمدن سے کئی باتوں میں اتنا ملتا جلتا ہے کہ وہ بھی یقیناً انھیں کے قریب زمانہ کا ہوگا، لیکن اس کا زمانہ تعین کرنے میں سب سے اچھا سراغ یہ ہے کہ ان آثار قدیمہ میں کہیں لوہے کی بنی ہوئی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی، حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آریا قوم ہندوستان میں آئی تو وہ لوہے کے ہتیار استعمال کرتی تھی۔ یوں بھی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ آدمی نے تانبے پیتل وغیرہ سب دھاتوں کے بعد لوہے کو تپانا، پگھلانا، اور اس کے اوزار یا ہتیار بنانا سیکھا ہے اور دو ہزار برس قبل مسیح سے پہلے اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اسی بِنا پر یہ یقینی ہے کہ وادی سندھ کا تمدن عصر جدید (یعنی لوہے کے زمانے) سے بہت پہلے کا ہے۔ اور مختلف شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر اہل تحقیق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

[1] جلد اوّل۔ صفحہ ۱۱۰۔

یہ تمدن حضرت مسیح سے کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار برس پہلے موجود تھا۔ اور نہ صرف موجودہ صوبۂ سندھ بلکہ مغربی پنجاب اور دوسری طرف بلوچستان تک اس کے آثار زمین کے نیچے سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان مقامات میں سب سے زیادہ کارآمد اور حیرت انگیز اشیاء موہن جو دارو (ضلع لاڑکانا سندھ) اور ہڑپا (ضلع منٹ گمری، پنجاب) کی کھدائیوں میں نکلی ہیں لیکن یہ سلسلہ جاری رہا تو کچھ عجب نہیں کہ آیندہ وادی سندھ کے علاوہ گنگا، نربدا، گوداوری وغیرہ بڑی ندیوں کی وادیوں سے بھی آریوں سے پہلے کی قوموں کے آثار نکل آئیں کیونکہ یہ بات اب صاف طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ آریا قوم کے حملہ آوروں نے ہندوستان کے جن قدیم تر باشندوں سے یہ ملک فتح کیا، وہ بالکل جنگلی لوگ نہ تھے بلکہ اپنی ایک پرانی تہذیب اور اچھی خاصی آبادیاں رکھتے تھے۔

باب سوم

آریا قوم کی آمد اور ابتدائی حالات

سنہ ق م تک

ہندوستان کے ماقبل تاریخ زمانے کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں آریا قوم کے لوگ افغانستان کے راستے اس ملک میں داخل ہوئے اور قدیم باشندوں کو ہٹاتے ہوئے رفتہ رفتہ پنجاب اور پھر مشرقی اور جنوبی علاقوں میں پھیل گئے۔ ان کی ہندوستان میں آمد اور تسلط کے بھی حالات صحیح طور پر معلوم نہیں کیونکہ ان کو اول اول لکھنے پڑھنے کا فن نہیں آتا تھا اور اس وقت کی کوئی تحریر ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ اس واسطے یہ زمانہ بھی اصلی تاریخ سے پہلے کا زمانہ شمار ہوتا ہے لیکن آریوں کی قدیم مذہبی کتابوں سے جن کا کچھ حال تم آگے پڑھو گے، اس قوم کے بہت سے حالات کا پتہ چلتا ہے۔

اصلی وطن، اور آنے کا زمانہ۔

اول تو ان کی قدیم زبان سنسکرت کا ایران اور دوسرے ملکوں کی زبان سے قریبی رشتہ ثابت ہے دوسرے ان کے افغانستان کی طرف سے آنے اور پہلے صرف پنجاب میں آباد ہونے کے کئی ثبوت موجود ہیں۔ اگرچہ یہ ابھی تک مسلم نہیں کہ اس قوم کا اصلی یا سب سے پہلا وطن کہاں تھا۔

بہت دن تک اہل تاریخ کا خیال یہ رہا کہ یہ لوگ وسط ایشیا یا ترکستان سے اتر کر ایک طرف یورپ اور دوسری طرف ایران و ہندوستان میں پھیلے لیکن اب

اس خیال کو درست نہیں مانا جاتا اور ایک تازہ تاریخ میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ غالباً آریا نسل کا اصلی گہوارہ جنوب مشرقی یورپ کا علاقہ (موجودہ ہنگری) تھا کیونکہ ان کے ایشیائے کوچک، عراق، اور پھر ایران سے ہوکر ہندوستان آنے کی بعض معقول شہادتیں حال میں دستیاب ہوئی ہیں[۱]۔

بہرحال، اتنا یقینی ہے کہ یہ لوگ ہندوستان میں باہر سے آئے اور افغانستان کی راہ سے پنجاب میں داخل ہوئے۔ ان کی آمد کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں مگر یہ بات اب اچھی طرح معلوم ہوگئی ہے کہ تخمیناً ۱۵۰۰ ق م تک وہ اور ان کے ایرانی ہم قوم ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کی زبانیں چند صدی کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہوئیں۔ اس سے یہ صاف طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ آریا قوم مذکورۂ بالا تاریخ سے کچھ پہلے یا کچھ بعد ہندوستان میں داخل ہوئی۔ رگ وید کے قدیم بھجنوں سے اور دوسری طرح بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے[۲]۔

آریوں کا قدیم تمدن

انھی مذہبی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پنجاب میں آنے کے وقت ہی آریوں کے بہت سے قبیلے اور الگ الگ گروہ ہوگئے تھے لیکن زبان ایک تھی اور مذہبی رسمیں اور عقیدے بھی سب میں یکساں رائج تھے۔ پھر ہر گروہ یا قبیلے کی کئی کئی بستیاں اور بستیوں میں کئی کئی گاؤں علیحدہ ہوتے تھے۔ ہر کنبے کا بڑا یا بزرگ خاندان اپنے گھر کا حاکم ہوتا تھا مگر پورے قبیلے پر ایک سردار یا راجہ کی حکومت ہوتی جسے یا تو حکومت ورثے میں مل جاتی تھی اور یا قبیلے کے لوگ مل کر اپنا راجہ خود منتخب کر لیتے یعنی کمیٹی یا قومی مجلس میں جس شخص کے متعلق زیادہ رائیں ہو جاتیں وہی راجہ بنا لیا جاتا تھا۔ ذات پات کی یہ قید کہ ایک ذات کا آدمی دوسرے ذات والے کے ساتھ نہ "کھان پان" کر سکتا ہے نہ شادی بیاہ قدیم آریوں میں موجود نہ تھی۔ البتہ ان کی آبادی میں مختلف طبقے ضرور تھے۔ اور سب سے اوّل طبقہ (راجینا) امیروں کا تھا اور ان سے دوسرے مرتبے پر وہ لوگ سمجھے جاتے تھے

---

[۱] دیکھو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد اوّل صفحہ ۷۸ و مابعد

[۲] کیمبرج ہسٹری صفحہ ۱۱۲ و ماقبل۔

جو اپنے راجہ یا قبیلے کی جانب سے نذر نیاز یا قربانی کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ انھی لوگوں کو امیر اُمرا پوجا پاٹ کرانے کے لئے اپنے ہاں رکھ لیتے تھے اور وہ "پروہت" کہلاتے۔ دیوتاؤں کے بھجن گانے کے علاوہ یہ لوگ اپنے آقاؤں کی تعریف کی گیت بھی گاتے تھے۔ جن میں ان کی بہادری کے قصے یا سخاوت و فیاضی کا ذکر ہوتا تھا۔ ان دو فرقوں کے سوا باقی تمام لوگ جن کا پیشہ زراعت یا گلہ بانی تھا" ویش" کہلاتے تھے۔

ضرورت کے وقت قوم کا ہر شخص سپاہی کے فرائض انجام دیتا تھا اور اس قسم کے جھگڑے بھی ان میں آئے دن ہوتے رہتے تھے کہ باہم کشت وخون کی نوبت پہنچتی اور ر یہ نہیں تو ان قومی دشمنوں ہی سے لڑائیاں رہتیں جو ہندوستان کے اصلی یا قدیم باشندے تھے اور جن کی زمینیں نو وارد آریوں نے چھین لی تھیں۔ یہ کالے رنگ کے دراوڑی (داسیوس یا داس) تھے اور ان کے جو قیدی لڑائی میں ہاتھ آتے انھیں آریا اپنا غلام بنا لیتے تھے۔

آریوں کی اصلی دھن دولت گائے بھینسیں تھیں۔ اناج کے ساتھ دودھ مکھن ان کی مرغوب غذا تھی۔ وہ گوشت بھی کھاتے تھے خاص کر تیر تہوار کی قربانی میں بچار کا گوشت ان کی خاص خوراک تھی[1]۔ گھوڑوں کی بہت قدر کی جاتی تھی کیونکہ لڑائی یا دوڑ کے وقت جگمگاتی رتھوں میں انھی سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر گاؤں کی حفاظت کے لئے لکڑیاں گاڑ کر مضبوط باڑھ بنائی جاتی تھی اور ان کے قدیم مکانات بھی شہتیر اور لکڑی ہی کے بنے ہوئے تھے۔ مردوں کے قدیم خود اور زرہ بکتر اور عورتوں کے زیورات برآمد ہونے سے ثابت ہے کہ اس زمانے کے آریا بعض دستکاریاں بھی خوب جانتے تھے۔

ان کے ہاں شادی بعض اوقات دولھا دلھن کی مرضی سے ہوتی تھی اور زوجہ پوجا پاٹ میں شوہر کی شریک اور گھر کی مالک مانی جاتی تھی۔ عجب نہیں کہ اُمرا میں "ستی" موجود ہو کیونکہ یہ خوفناک رسم بہت قدیم سے وسط ایشیا کے قبائل میں مروج تھی۔ تاہم رگ وید سے اس کے جائز ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور ہند میں اس کا عام رواج بعد کی بات ہے۔ جبریہ بیوگی اور بچپن کی شادی کا بھی قدیم آریوں میں پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] قدیم آریوں کی خوراک و لباس وغیرہ کے متعلق دیکھو کیمبرج ہسٹری باب چہارم۔ نیز تھامسن (طبع ۱۹۳۰ء) صفحہ ۱۶ و مابعد۔

مُردوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ اچھے لوگوں کی ارواح راجہ یم کے علاقے میں چلی جاتی ہیں اور اپنے بزرگوں اور دیوتاؤں کے ساتھ آرام و راحت سے بسر کرتی ہیں۔ (راجہ یم، آریوں کے عقیدے میں پہلا انسان تھا جس نے سب سے اول موت کا مزہ چکھا)۔

آریوں کی سب سے قدیم کتابیں

اِس دور کے حالات کا بڑا اور واحد ماخذ رگ وید ہے لیکن اِس جگہ مناسب ہوگا کہ وید کے چاروں مجموعوں کا ذکر کر دیا جائے۔ ان سب میں زیادہ اہم رگ وید ہے جس کے دس منڈل یا حصے ہیں اور ان میں مختلف دیوتاؤں کے کل بھجن بھی ہزار سے زیادہ ہیں۔ یہ اصل میں بزرگ رشی، یا ان دینی پیشواؤں کے اقوال ہیں جن کا اوپر ذکر آیا۔ اوّل اوّل پجاریوں کے خاندان میں یہ بھجن لوگوں کو زبانی یاد تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے منڈلوں کی صورت اختیار کی اور یہ تم آئے بڑھو گئے کہ عرصۂ دراز کے بعد جب کتابت کا رواج ہوا تو یہ پورے مجموعے قیدِ تحریر میں آ گئے۔

رگ وید کے بعض بھجن جو خاص خاص قربانیوں کے وقت گائے جاتے تھے ایک جگہ جمع کر لئے ہیں اور اس مجموعے کا علحدہ نام سام وید ہے، اگر مختصر ہونے کے علاوہ مورخ کو اس سے کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی۔

یجر وید میں بھی کچھ گیت رگ وید کے ہیں اور کچھ منتر یا دعائیں بعد کی شامل ہیں اور یہ اور سام وید غالباً سنہ قم کے بعد جمع کئے گئے جب کہ نذر و نیاز اور قربانیوں کی رسموں کا بہت زور ہو گیا تھا۔ سب سے آخری مجموعہ (یا سمتھیا) اتھرو وید کہلاتا ہے اس میں بہت سے حکیمانہ اقوال، منا جاتیں، اور اس قسم کے منتر جنتر بھی ہیں جن سے آریوں کے ہندوستان میں آنے کا زمانہ یاد آ جاتا ہے، یعنی وہ زمانہ جب کہ ان میں آگ کی پوجا اور جادو ٹونے کا رواج تھا، تاہم یہ وید رگ وید کے بعد کا ہے اور بہت عرصہ میں جا کر علحدہ وید تسلیم کیا گیا تھا۔

آریوں کے عقائد

رگ وید کے بھجنوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریوں کا مذہب بہت سے مختلف عقائد کا مجموعہ تھا۔ بعض ولولہ انگیز اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ ایک نوخیز و جواں ہمت قوم کے گیت ہیں جو مناظرِ فطرت کو دیکھ دیکھ کے جھومنے لگتی ہے۔ مجسم دیوی دیوتاؤں کا ابھی تک دخل ہونے نہیں پایا۔ اور صرف وہ بڑی بڑی قوتیں جو نور و حرارت یا برق و باراں کا

سبب ہیں، اس قوم کی معبود ہیں۔ مردانِ جنگجو کا محبوب دیوتا **اندر** ہے اور وہی نیلے عفریت **ورتر** (یعنی آسمان) پر بجلی کے کوڑے مار کر پانی کو قید سے چھڑاتا ہے کہ جائے اور دنیا کو تر و تازہ کر دے۔ لڑائی کے وقت پجاری بھی اسی کو پکارتے ہیں کہ آفتِ سماوی سے بچائے اور دشمنوں پر غلبہ دے۔ لیکن ان قدیم بھجنوں میں بھی کہیں کہیں پجاریوں کے خاص حقوق اور ایسی رسموں کا ذکر آجاتا ہے جنھیں صرف پجاری ہی ادا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ **اتھرو وید** کے بعض بھجنوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگ جادو کے قائل تھے اور ان میں نیچ ذات کے پجاریوں کا کام ہی شعبدہ بازی تھا اور لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ جادو کے زور سے کسی کے دشمن کو مار سکتے ہیں یا دوا پھونک پڑھ کر کسی کا دل دوسرے پر مائل کرا سکتے ہیں۔ **رگ وید** کے آخری اشعار میں اور ایک قابلِ لحاظ بات یہ نظر آتی ہے کہ اب لوگوں کو فلسفیانہ باتوں کا بھی شوق ہو چلا تھا۔ اربابِ فکر یہ تجسّس کرنے لگے تھے کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی اور کائنات کا صانع اور حاکم کون ہے۔ انھی قدیم مناجاتوں میں ہمیں مذہبی رسوم اور فلسفے کے وہ بیج نظر آسکتے ہیں جو آگے جا کر ہندوستان کا نہایت وسیع نظامِ مذہبی بن گئے۔ اس بات کا بھی سراغ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح بہت سے دیوتاؤں کے بجائے رفتہ رفتہ ایک خدا کا عقیدہ پیدا ہوا جو تمام کائنات کا منبع اور سہارا ہے البتہ اس کی صفات میں کہ آیا وہ ذاتِ ادراک و ارادہ رکھتی ہے یا نہیں، ان میں ہمیشہ بحث ہوتی رہی۔

آریوں کا مشرق میں پھیلنا

رگ وید کے بھجنوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھجن کہنے والے ہندوستان کے شمال مغربی گوشے سے واقفیت رکھتے تھے یعنی دریائے **کابل** سے لے کر **سرستی** اور **دریشدوتی** ندیوں تک کا علاقہ ان کا اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا تھا اور یہ دونوں ندیاں اس زمانے میں وہاں بہتی تھیں جہاں آجکل **انبالے** کا ضلع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آریوں کی زیادہ تعداد سندھ و ستلج ہی کے درمیان (ملک پنجاب) میں آباد تھی لیکن اس کے ساتھ اب وہ آہستہ آہستہ مشرق کی طرف پھیل رہے تھے۔ ان کے قبیلے کے قبیلے یا محض ایک کنبے کے لوگ اپنے شمال مغربی مسکنوں سے اٹھتے اور گنگا جمنا کے کناروں پر آکر بس جاتے تھے کیونکہ ان زرخیز علاقوں میں وسائلِ معاش میں بہت کشائش اور آسانی تھی۔ اس کے بعد انھی

دریاؤں کے کنارے کنارے وہ مشرق کی طرف بڑھتے رہے، اور بعض گروہوں نے دامن ہمالیہ کا رُخ کیا اور گنگا کے شمالی علاقوں میں بستیاں بسائیں۔ پنجاب سے نکلنے والوں نے ادھر آنے کے علاوہ جنوب اور جنوب مغرب کی راہ بھی اختیار کی یعنی قطاع مالوہ وسندھ میں بھی جا جا کے آباد ہونے لگے۔

قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ آریوں کے اس طرح پنجاب سے نکلنے کا سبب محض یہ نہ تھا کہ ان کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی یا یہ کہ وہ نئے علاقوں کو فتح اور آباد کرنے کے خواہاں تھے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پنجاب میں بسنے کے کچھ عرصہ بعد انہی کے ہم نسل آریوں نے پھر یورش کی اور چترال وسوات کے راستے ملک میں داخل ہوئے اور جو آریا پہلے سے پنجاب میں آباد تھے ان کو ہٹا ہٹا کر ہر طرف منتشر کر دیا۔

کتب برہمنا کی شہادت

اس عہد کے متعلق ہماری واقفیت کا مدار یجروید اتھروید اور برہمنا نامی کتابوں پر ہے۔ کتب برہمنا گویا ویدوں کے ضمیمے ہیں جن میں قربانیوں کی رسموں کا بیان نیز وید کے ان منتروں کی تشریح کی گئی ہے جو ان موقعوں پر پڑھے جاتے تھے۔ انہی رسوم کے انبار میں کہیں کہیں بعض پرانی کہانیاں بھی مل جاتی ہیں جو مورخ کے لئے بہت بیش قیمت ہیں۔

ان کتابوں کا رگ وید سے مقابلہ کیا جائے تو بعض دلچسپ فرق ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ رگ وید میں شیر ببر کا ذکر آتا ہے، لیکن شیر (ٹائیگر) کا نام تک نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ رگ وید کے بھجن کہنے والوں کا مسکن شمال مغربی ہندوستان کا علاقہ تھا اور ابھی وہ دریائے گنگا کے کناروں تک پہنچنے نہ پائے تھے جہاں آج تک شیروں کی کثرت ہے۔

مزید برآں ایک برہمنا میں یہ افسانہ محفوظ رہ گیا ہے کہ ودیھا کا راجہ ماتھوا اور اس کا پروہت راہوگن سرستی کے کنارے مقیم تھے کہ اگنی کا شعلہ ایک طرف کو چمکتا اور آگے بڑھتا نظر آیا۔ راجہ اور پروہت بھی اس کے پیچھے ہو لئے اور ندیوں کو عبور کرتے ہوئے گنڈک تک پہنچے جس کے پار کوئی برہمن نہ رہتا تھا اور زمین دلدل سے بھری غیر آباد پڑی تھی لیکن مقدس شعلے نے اس ندی کو بھی عبور کیا اور ماتھوا بھی اس کے پیچھے پیچھے گنڈک کے پار ہو گیا چنانچہ اب اس ندی کے مشرق میں بہت سے برہمن آباد ہیں اور

زمین میں زراعت ہوتی ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر آریوں کے مشرق میں پھیلنے کی ایک دھندلی تصویر نظر میں پھر جاتی ہے۔ ان کے گروہ پنجاب کے میدانوں سے اُٹھ اُٹھ کے گنگا جمنا کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہے ہیں جہاں راجہ کا قدم جاتا ہے وہیں پروہت بھی اس کے ساتھ ہے اور جاتے ہی ہر جگہ اپنی پوجا پاٹ کا نقشہ جما دیتا ہے۔ ہر قدم پر اس کی تعلیم بھی ہے کہ جو کچھ طاقت ہے اسی بھینٹ اور قربانی میں ہے اور سب سے زیادہ برگزیدہ اور قابل تعظیم شخص پجاری ہے۔

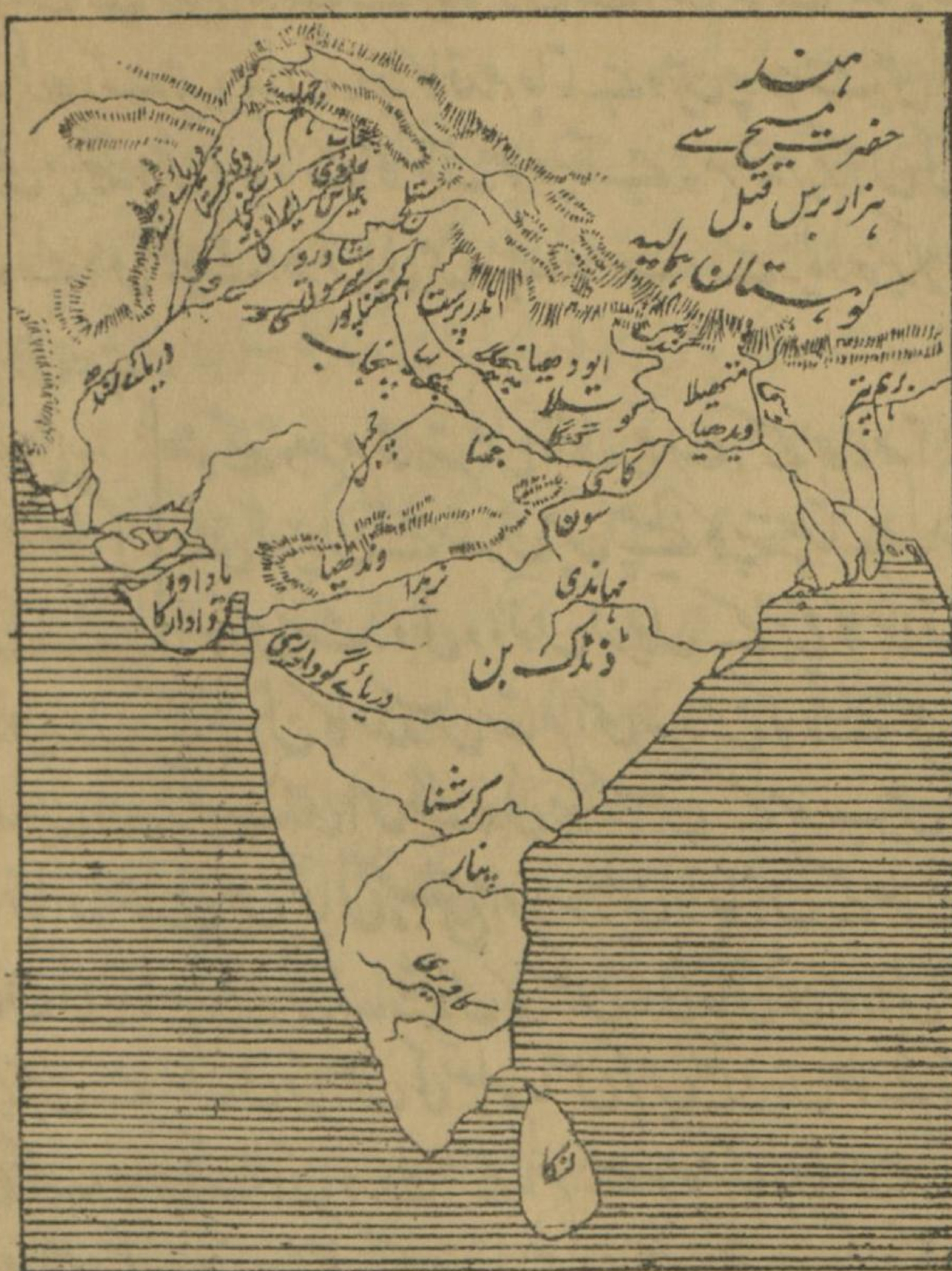
منو کے جغرافی نام

منو کے دھرم شاستر میں اقطاع ہند کے جو نام آئے ہیں ان سے بھی آریوں کے مشرق میں پھیلنے کا پتہ چلتا ہے۔ سرستی[1] اور دریشدوتی دونوں ندیوں کے بیچ کا علاقہ "برہم ورت" کہلاتا تھا اور ویدوں کے نزول کا مقدس مقام اسی سرزمین کو مانتے تھے بلکہ عجب نہیں کہ رگ وید کی تدوین اور ترکیب بھی اسی جگہ ہوئی ہو۔ اس کے جنوب میں کورکشتر یعنی کورو کا ملک تھا اور مشرق میں پنچال، ہستی اور سورسین راجاؤں کے علاقے تھے۔ جمنا کے دونوں کناروں کی یہ تمام زمین بزرگ رشیوں کا مسکن مانی جاتی تھی اور اہل عالم کا فرض تھا کہ یہیں کے کسی برہمن سے انسانی فرائض کی تعلیم حاصل کریں لیکن اس علاقے کے بعد ہمالیہ سے بندھیاچل تک سارا ملک "آریاورت" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ آریوں کے قدم ابھی تک بندھیاچل کے جنوب میں نہ پہنچے تھے اور دکن کے حصوں کا انھیں کچھ علم نہ تھا۔

یہ بات ثابت ہے کہ ستلج و جمنا کے درمیان کا علاقہ اول اول سب سے محترم مانا جاتا تھا اور آریوں کی تہذیب اور تمدن کا سب سے پہلا گھر اسی کو سمجھنا چاہئیے لیکن برہمنوں کو ابھی تک فروغ نہیں ہوا تھا اور نہ ان کی تہذیب اس حصۂ ملک میں زیادہ ترقی کر سکی تھی بلکہ برہمنوں کا غلبہ بھی اسی وقت ہوا جبکہ آریا قوم مشرق میں پھیلی اور گنگا کے

[1] سرسوتی یا سرستی ندی پہلے غالباً ستلج کی معاون تھی مگر اب اس تک پہنچنے نہیں پاتی اور تھوڑی دور ریگستان میں چل کر سوکھ جاتی ہے۔

حاصل خیز طاس میں آباد ہو گئی۔ اسی علاقے میں برہمنوں کے بڑے بڑے مرکز بنے اور



ذات پات کی تفریق پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مشرقی برہمن آسودگی اور تمدن میں بڑھ گئے اور اپنے مغربی ہم نسلوں کو قدامت پسند اور گنوار سمجھنے لگے۔

مہابھارت کی داستان

مذکورۂ بالا قول کی تائید دو مشہور نظموں سے ہوتی ہے جن میں پہلی "مہابھارت" ہے۔ یہ دلکش داستان اب بہت بڑی کتاب بن گئی ہے۔ حالانکہ اول اول یہ ان گیتوں کا مختصر مجموعہ ہوگی جنھیں بھاٹ گاتے پھرتے تھے اور جن میں محض دو ہمسایہ ریاستوں کی لڑائیوں کا ذکر تھا، لیکن اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اخلاق و الٰہیات، تاریخ و سیاسیات غرض ہر قسم کے

مضامین شامل کر دیئے گئے۔ خاص وہ لڑائی جس کی یادگار میں یہ نظم کہی گئی شاید ولادت مسیح علیہ السلام سے بھی ایک ہزار برس پہلے واقع ہوئی تھی لیکن "مہابھارت" کی داستان جس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اس کی تکمیل غالباً دو ہزار برس سے بھی کم کی بات ہے۔

بہرحال اگر صرف اصل قصے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا اس میں کورو اور پنچالوں کے ملکی واقعات کا ذکر ہے۔ کوروکشتر، جمنا کے مغرب کا علاقہ تھا اور یہ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ آریوں کے مشرق میں آباد ہونے سے پہلے، ہی جمنا کے مغرب میں یہی راج سب سے زیادہ مُعزز سمجھا جاتا تھا لیکن اب جمنا کے مشرق میں بسنے والے آریا بھی مغربی ہمسایوں سے برابری بلکہ فوقیت کا دعویٰ کرنے لگے تھے اور آخر اس نزاع کا فیصلہ تلوار نے کیا۔ کوروکشتر کے میدان میں خون کے دریا بہہ گئے اور ایک روایت کے بموجب اٹھارہ دن تک برابر کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ ایک ایک کر کے سب کورو سردار مارے گئے۔ تقدیر نے مشرقی دعویداروں کے حق میں فیصلہ دیا اور ہستناپور کا راج جو زور آزمائی کا حیلہ بن گیا تھا یدھشٹر کے قبضے میں آگیا۔

رامائن

مہابھارت کے بعد کی مثنوی، ضخامت میں بھی اس سے کم ہے اور اس بات کے ماننے میں بھی کوئی دشواری نہیں نظر آتی کہ یہ تمام نظم ایک ہی شاعر نے لکھی ہوگی، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اول اول نظم کی کتابت اور حفاظت کا کوئی قابل اطمینان انتظام نہ تھا اور ان سینکڑوں برس کے عرصے میں تھوڑا بہت ردّ و بدل ضرور اس میں واقع ہو گیا، تاہم اس سے نامور والمیک کے فخر میں کوئی کمی نہیں آتی جس نے چھٹی صدی (ق م) میں کوسالا یا کوسل (موجودہ اودھ) کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر رامچندر جی کی ولولہ انگیز کتھا دنیا کو سنائی اور سیتا جی کے حسن و جمال اور لچھمن کی وفا کیشی کا نقش درست کیا۔

رامچندر جی کی شادی جلاوطنی اور راون سے لڑائیوں کا قصہ اس قدر مشہور ہے کہ یہاں اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں مگر طالب علم کے دیکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ اس تمام داستان کی تہ میں صاف نظر آرہا ہے کہ اب آریا تہذیب کا مرکز نہ جنوبی پنجاب ہے، نہ جمنا کا مشرقی کنارہ۔ بلکہ دولت و حشمت گنگا ندی کے کناروں پر کھنچ آئی ہے۔ دوسرے رامائن میں دکن کا جس طرح ذکر آیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ والمیک کے عہد میں بھی یہ علاقہ آریوں کے اثر سے

باہر تھا چنانچہ رامچندر کو ان کی سوتیلی ماں نے خاص اسی لئے ادھر بھجوایا کہ جنوب کے بن مشہور تھے اور سمجھا جاتا تھا کہ ان میں "بن مانس" آباد ہیں۔ بایں ہمہ قرینہ کہتا ہے کہ ادھر آریوں کی آمد شروع ہو گئی تھی اور ان کے تمدن کا اثر بھی رفتہ رفتہ جنوب تک ہونے لگا تھا چنانچہ جس اگستیا رشی سے راجہ رامچندر جی نے دکن میں ملاقات کی وہ بندھیاچل کے پار سے آیا تھا اور اب تک جنوبی ہند میں آریا تہذیب کا پہلا معلم مانا جاتا ہے۔

اس عہد کی خصوصیات میں سب سے نمایاں چیز یہ نظر آتی ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ آریا قوم میں عیش و عشرت بڑھتی جاتی ہے، ان کے بزرگوں کی ایک جھلک ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ سیدھے سادے کسانوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی دھن دولت جو کچھ تھی گائے بھینسیں تھیں۔ ان کا کوئی بادشاہ نہ ہوتا تھا اور ہوتا تو وہ جسے خود قوم نے سربرآوردہ تسلیم کر لیا ہو لیکن چھٹی صدی (ق م) کے قریب ہمیں اہل ملک اور ان کی تہذیب کا رنگ دوسرا نظر آتا ہے۔ گاؤں اور اس کی پنچایت کے بجائے اب جا بجا طاقتور راجاؤں کی راجدھانیاں آباد ہیں جن میں شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ دربار لگتے ہیں۔ ریاست ایک موروثی جاگیر بن گئی ہے جو باپ کے بعد بیٹے کو پہنچ جاتی ہے۔ وہ سادہ جمہوریت اور قوم کے اجماع سے انتخاب کرنا یہ سب آئین مٹ گئے اور مطلق العنانی کا دور دورہ ہے۔ اسی کے ساتھ مشرق میں آکر دراوڑی نسل سے بھی آریا قوم خلط ملط ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس سے بہت پہلے سے ان میں باہم شادی بیاہ کا سلسلہ جاری ہو گیا اور غالباً اس محکوم قوم کے ساتھ ملنے جلنے کا بھی یہی نتیجہ ہوا کہ آریوں میں عیش پسندی عام ہو گئی۔

برہمنوں کا زور

اس عہد کی دوسری قابل ذکر خصوصیت پجاریوں کا غلبہ ہے کہ سلطنت میں اب وہ سب سے اعلیٰ مرتبے کے دعویدار بن گئے تھے۔ امن و فراغت کے زمانے میں انہیں اس بات کی خوب فرصت اور موقع ملا کہ اپنی مذہبی نذر و بھینٹ کی رسموں کو اس قدر ترقی دیں کہ ان رسموں کو ادا کئے بغیر دنیا کا کوئی کام ہی نہ ہو سکے اور یہ رسمیں اسقدر پیچیدہ تھیں کہ سوائے سدھے ہوئے پجاریوں کے انھیں اور کوئی نہ جانتا تھا۔ قدم قدم پر لوگ انھی کے محتاج تھے اور چونکہ عقیدہ یہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ طاقت ہے بھینٹ میں ہے، اس لئے بھینٹ کرنے والا پجاری سب سے بڑے مرتبے کا شخص مانا جانے لگا اور خود راجہ مہاراجہ تک اب اس کے محتاج اور اس سے کم رتبہ

رہ گئے۔ ان امیروں یا بادشاہوں کے سوا اب کسی کی مجال بھی نہ رہی تھی کہ بھینٹ کی سب رسمیں ادا کر سکے کیونکہ پجاریوں نے ان کو اسقدر بڑھا دیا تھا کہ ان کے پورا کرنے میں زر کثیر صرف کرنا پڑتا تھا۔ رگ وید کی تدوین اسی زمانے میں ہوئی اور قربانیوں کے وقت جو بھجن گائے جاتے تھے انھیں دو چھوٹے مجموعوں میں مرتب کیا گیا۔ ان کا نام سام وید اور یجر وید ہے اور انہی کے ساتھ قربانی کی رسموں کے متعلق وہ طویل اور پیچیدہ تحریریں لگا دی گئی ہیں جن کا نام برہمنا ہے۔

ذات پات کی ابتدا

ہندوؤں میں ذات پات کی جو قیود آج کل نظر آتی ہیں ان کی ابتدا کا بھی یہی زمانہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب آریا لوگ جن علاقوں میں پہنچے وہاں قدیم باشندوں کی آبادی زیادہ اور نو وارد فاتحین کی تعداد کم تھی۔ دراوڑی نسل کے ساتھ ان کا خلط ملط ہونا ناگزیر تھا، خاص کر آریا قوم کے چرواہے اور کسان جو ویش کہلاتے تھے، آس پاس کی قدیم آبادی میں بہت جلد گھل مل گئے اور پجاریوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اگر اعلیٰ طبقے کے آریہ بھی اسی طرح دراوڑی لوگوں سے بلا روک ٹوک میل جول رکھنے لگے تو ان کا حاکمانہ وقار باقی نہ رہے گا۔ دوسرے پجاریوں کا دھرم گیان بھی غیروں تک پہنچ جائے گا۔ غرض ان سب باتوں کے خیال سے اور کچھ نسل کے تعصب سے پجاریوں نے تمام غیر آریا اقوام کو "شدر" یعنی نجس یا کمینہ قرار دیا اور ان خاندانوں کے واسطے جو آریا اور غیر آریا قوموں کی مخلوط اولاد میں تھے الگ الگ فرقے یا ذاتیں مقرر کر دیں۔ اسی تقسیم نے رفتہ رفتہ شدید پابندی کی صورت اختیار کر لی اور ہر گروہ جس کی نسل یا مذہبی عقائد، بولی یا پیشہ دوسروں سے مختلف ہوتا، وہ ایک علٰحدہ ذات بن جاتا تھا اور پھر اس کے افراد سب کے ساتھ کھانا پینا شادی بیاہ چھوڑ کر صرف اپنے گروہ یا ذات والوں سے اس قسم کے تعلقات رکھ سکتے تھے

باب چہارم

سنہ ۶۰۰ ق م سے سنہ ۳۲۵ ق م تک

اب ہماری تاریخ اس عہد کے قریب پہنچ گئی ہے جس میں جین اور بدھ مت کے نامور بانیوں کا ظہور ہوا لیکن ان کے مختصر حالات لکھنے سے پہلے ضرور ہے کہ اس زمانے کے عام ملکی حالات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

مشرقی علاقوں میں آریوں کی کوسل، ودیھا۔ اور مگدھ کی طاقتور حکومتوں کا ذکر ضمناً پہلے آچکا ہے۔ اب ہم چند اور خودمختار علاقوں کا حال پڑھتے ہیں۔ گنگا کے اوپر ہمالیہ کے دامنوں میں بہت سے آزاد قبائل بھی آباد تھے جن میں حکومت جمہوری طرز کی تھی، یعنی قوم کے لوگ اپنا راجہ خود منتخب کر لیتے تھے۔ ان میں سب سے وسیع ساکیا اور لچھوی قبائل کے علاقے تھے اور نیپال کی سرحد سے متصل شہر کپل وستو ساکیا قبائل کا صدر مقام تھا لیکن سب سے زیادہ قوت لچھوی قوم کو حاصل تھی جن کا علاقہ دریائے گنگا کے زیادہ قریب اور زیادہ شاداب تھا اس کے صدر مقام کا نام ویسالی تھی اور وہ موجودہ شہر پٹنہ کے جنوب میں دریا کے دوسرے کنارے سے کوئی پچیس میل فاصلے پر واقع تھا۔

۱ مگدھ

کہانیوں کے طومار میں اگر کسی علاقے کے بادشاہی خاندان کا ٹھیک ٹھیک کچھ پتہ چلتا ہے تو وہ مگدھ دیس کے راجہ ہیں یہاں کا پہلا شاہی خاندان سیس ناگ کی اولاد سے تھا اور چھٹی صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی ق م تک حکومت کرتا رہا۔

اسی خاندان کا پانچواں راجہ بمبسار گزرا ہے جس نے بہت سے علاقے فتح کئے اور پہاڑ کے دامن میں راج گرہا نامی نیا شہر آباد کیا۔ کاشی کی ریاست اسے بیوی کے جہیز میں مل گئی تھی کیونکہ اس کی بیوی کوسل کے راجہ کی بہن تھی اسی لئے جب بمبسار مرا اور مشہور ہوا کہ اس کے بیٹے اجاتسترو نے اسے بھوکا مار ڈالا ہے، تو کوسل کا راجہ بہنوئی کا بدلہ لینے چلا اور بہت دن تک دونوں میں جنگ رہی۔ لڑائی کے صحیح حالات کا علم نہیں لیکن یہ پڑھکر کہ والی کوسل نے آخر میں اپنی بیٹی مگدھ کے نوجوان راجہ کو بیاہ دی تھی، قیاس ہوتا ہے کہ لڑائی میں اجاتسترو کو غلبہ حاصل ہوا ہوگا۔

پھر اجاتسترو نے گنگا اتر کے لچھویوں کے علاقے پر چڑھائی کی اور ان کا صدر مقام چھین کر اسی کنارے پر ایک نیا قلعہ تعمیر کیا کہ یہ لوگ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں، یہی وہ قلعہ ہے جو بعد میں قدیم دنیا کا وسیع اور شہرۂ آفاق شہر پاٹلی پتر ابنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سیس ناگ کی اولاد چوتھی صدی (ق م) کے وسط تک حکمرانی کرتی رہی، یہاں تک کہ ان کے آخری فرمانروا کو ایک نائی نے مار ڈالا اور خود راجہ بن بیٹھا خاندان نندا کے حکمراں اسی غاصب کی اولاد میں تھے۔

مذہبی خیالات میں انقلاب

پجاریوں نے جو قوت حاصل کر لی تھی اس کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اصلی عبادت اور اصلی طاقت جو کچھ ہے قربانی اور بھینٹ میں ہے جس کی دقیق رسمیں ان پیشوایان دین کے سوا اور کوئی نہ ادا کر سکتا تھا۔ پجاریوں کے ان دعووں کو عوام الناس سچا جانتے تھے لیکن بہت سے سوچ بچار کرنے والے ایسے بھی تھے جن کا ان باتوں سے اطمینان نہ ہوتا تھا، وہ کائنات کی اصل اور خالق کل کے جویا تھے اور اکثر جنگلوں میں نکل جاتے کہ سب سے الگ ہو کر پیدا کرنیوالے سے لو لگائیں اور سخت ریاضت و مشقت سے اپنے سرکش نفس کو زیر کریں۔

ان بزرگ رشیوں کی سب سے مشہور یادگار اپنشد مانے گئے ہیں۔ روح اور انسانی زندگی کے متعلق جو تعلیم ان حکما نے دینی شروع کی تھی، یہ اسی کا مجموعہ ہیں اور مسئلۂ کرم اور تناسخ ارواح، اس تعلیم کے سب سے اہم عقائد میں داخل ہیں۔

اسی زمانے میں جبکہ لوگوں کے خیالات و عقائد میں یہ تلاطم ہو رہا تھا مہاویر

جناتری پترا اور گوتم پیدا ہوے اور **جین مت** اور **بودھ مت** کی بنیاد پڑی۔ سچ پوچھئے تو یہ مذہب ان ہی خیالات کا مجموعہ تھے جو دلوں میں اندر ہی اندر بہت دن سے پک رہے تھے۔ اب وہ علانیہ ایک مرتب صورت میں اہل ہند کے روبرو آگئے اور دونوں کے ماننے والوں نے اسی بات پر زور دیا کہ دیوی دیوتاؤں کے اوپر بھینٹ چڑھانا اور یہ نذر و نیاز بیکار باتیں ہیں۔ انسان کی اصلی نجات اس میں ہے کہ اس کا عمل اچھا ہو۔

مہابیر کی زندگی اور تعلیم

ان مذہبوں کے بانیوں میں پہلے شخص مہابیر جناتری پترا ویسالی کے کسی راجہ کے بیٹے تھے وہ تیس سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر جنگل میں نکل گئے اور چالیس برس سے زیادہ عرصے تک ملک بہار کے شمال وجنوب میں دشت نوردی کی ۵۲۸ق م کے قریب انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ جسم یا مادے کی سرشت میں بدی بھری ہوئی ہے اور جب تک انسان کی روح جسم کے اندر قید ہے اس وقت تک وہ سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔ لہذا جب تک آدمی زندہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ تا امکان جسمانی خواہشوں کو زیر کرے۔ بدی سے محفوظ رہنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان روح اور مادّے کی حقیقت جانے۔ اپنے پیر یا استاد اور کلام الٰہی کا دل سے معتقد ہو اور نیکی کے کام کرے۔ یعنی زکواۃ دے، سچ بولے، اور کسی جاندار کو آزار نہ پہنچائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو بعد میں **جین مت** کے نام سے مشہور ہوا اور اس کے پیرو جینی کہلائے یعنی ایسے لوگ جو جسمانی خواہشوں پر فتح حاصل کر چکے ہیں۔

بودھ مت

مہابیر کی طرح گوتم بھی ساکیا قوم کے ایک راجہ کے فرزند تھے مگر کہتے ہیں کہ لڑکپن ہی میں گوتم نے کسی کوڑھی فقیر کو دیکھا کہ بھیک مانگتا پھرتا تھا اور اسی طرح ایک بازار میں کوئی مردہ نظر سے گزرا اور انھی کو دیکھ کر گوتم کو عبرت ہوئی کہ انسانی زندگی کس قدر پر آلام اور بے حقیقت شے ہے۔ پھر جب وہ بڑے ہوے تو حق اور حصول نجات کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے اور کئی سال تک سنیاسیوں کی طرح ادھر ادھر پھرتے رہے کبھی برہمنوں کی شاگردی کی اور کبھی نہایت سخت ریاضتیں اور مشقتیں برداشت کیں لیکن جس چیز کی تلاش تھی وہ عرصے تک نصیب نہ ہوئی۔ آخر کار ایک روز قصبہ گیا کے قریب وہ درخت کے سائے میں اسی طرف لو لگائے بیٹھے تھے کہ وہ حقیقت جو انسان کے دائمی سرور و اطمینان کا باعث ہے،

ان پر کھل گئی۔ اور یہی مبارک مقام بعد میں بودھ مت والوں کی زیارت گاہ بنا اور وہ درخت بدھی یا بودھی کہلانے لگا جس کے معنی "شجر تجلی" سمجھنے چاہئیں کہ اسی کے نیچے گوتم کو حقیقت کی تجلی نظر آئی تھی۔ گوتم کو بھی اسی بناء پر آئندہ سے بودھ یا بُدّھ یعنی تجلی یافتہ یا روشن ضمیر کہنے لگے، پھر انھوں نے قریب کے علاقوں میں پھر پھر کر وعظ و تلقین شروع کی۔ اس تعلیم کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانی زندگی سراپا رنج و آلام ہے۔ اور ان آلام کی وجہ "خواہش" ہے پس خواہشوں کو مٹا دیا جائے تو آلام سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

یہ تو قرین قیاس نہیں ہے کہ گوتم بدھ نے عوام الناس کے سامنے علانیہ بت پرستی کو جھوٹا مذہب قرار دیا ہو، نہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے ذات پات کی قیود کے خلاف تقریریں کیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے طریقے کو نجات کا سب سے اچھا راستہ بتاتے تھے اور ان کی تعلیم یہ تھی کہ راست باز اور نیک دل بنو اور کسی کو آزار نہ پہنچاؤ یہی انسان کے خاص فرائض ہیں جس کے معنی یہ تھے کہ نذر و نیاز وغیرہ بیکار چیزیں ہیں۔ اسی طرح اپنے گروہ میں انھوں نے کسی قسم کی تفریق یا ذات پات جائز نہیں رکھی تھی۔ ان کی نظر میں سب انسان برابر تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ قوم کا آدمی بھی اسی طرح بودھ مت کا "بھکشو" (یعنی درویش) بن سکتا تھا جس طرح کے بڑے امرا یا دولتمند سوداگر تھے۔ اسی مساوات اور سیدھی سادی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں آدمی بدھ کے چیلے ہو گئے اور جا بجا ان کی خانقاہیں اور عبادت گاہیں بن گئیں اور امرا نے ارد گرد بڑی بڑی زمینیں دیدیں کہ یہ پاکباز درویش اطمینان سے گیان دھیان میں مصروف رہیں

گوتم نے بڑی عمر پائی اور شاید ۴۸۳ ق م میں انتقال کیا۔ موت کا وقت قریب دیکھ کر انھوں نے اپنے عزیز شاگرد انند سے یہ الفاظ کہے: "اے انند! میں بوڑھا ہو گیا اور میرا سفر اب ختم ہونے کو ہے۔ میں نے زندگی کے اسی برس جو قسمت میں تھے پورے کر لئے اور اب میرا جسم ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی طرح مشکل سے حرکت کر سکتا ہے۔ . . . . آئندہ سے تم خود اپنی شمع بنو اور خود ہی اپنا بچاؤ کرو مگر کسی اور کی پناہ نہ لینا۔ اپنی سچائی کو اپنے راستے کی شمع اور اپنی پناہ بنانا۔ . . . . . . جب میں نہ ہوں تو دین کے وہ حقائق اور احکام جو میں نے تمھیں تعلیم کئے ہیں تمھارے رہبر ہوں گے۔ انھی کی پیروی کرنا۔"

بودھ مت کے عروج و زوال کے کسی قدر تفصیلی حالات تم آگے پڑھو گے بالفعل

مناسب ہے کہ مختصر طور پر اُس تغیر کا کچھ ذکر کیا جائے جو انہی دنوں ہندوستان کی زبانوں میں پیدا ہوا تھا۔

ہندوستان کی مختلف زبانیں

واضح رہے کہ برہمنوں کی درسگاہوں میں ابتک سنسکرت زبان مروج تھی اور چوتھی صدی ق م میں پانینی نام ایک عالم نے اس زبان کی صرف و نحو تیار کی اور اسے نہایت باقاعدہ اور مستقل زبان بنا دیا۔ پانینی نے اپنے پیشرو علما کی محنت و عرق ریزی سے فائدہ اٹھایا تھا لیکن اس کتاب کو جو قبولیت نصیب ہوئی اسکی نظیر ملنی دشوار ہے۔ چنانچہ دو سوا دو ہزار برس گزرنے کے بعد بھی یہ صرف و نحو ابتک مسلم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

مگر جس وقت برہمنی مذہب کے خلاف خیالات میں تلاطم ہوا اور مہابیر اور گوتم نے لوگوں کو اپنے طریقے کی تعلیم دینی شروع کی تو برہمنوں کی زبان (سنسکرت) کا زور بھی کم ہوگیا۔ مذہب کے یہ نئے مصلح عوام الناس کے حامی تھے اور اس لئے وعظ بھی مگدھ دیس کی عام بولی (پراکرت) میں کیا کرتے تھے اور جب ان کے پیرووں نے یہ اقوال جمع کئے تو اسی قسم کی مقامی زبانوں میں ان کی ابتدائی کتابیں مرتب ہوئیں اس طرح مختلف بولیوں کو تحریری زبان بننے کا مرتبہ ملا لیکن صدیوں کے ردّ و بدل سے خود ان زبانوں کا رواج ملک سے جاتا رہا اور وہ بھی سنسکرت کی طرح محض کتابی زبانیں رہ گئیں۔ اب برہمنوں کا پھر غلبہ ہوگیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جین اور بودھ مت کے پیرووں نے مختلف پراکرتوں کو چھوڑ دیا اور برہمنوں کی قدیم علمی زبان یعنی سنسکرت میں اپنی مذہبی کتابیں تحریر کیں کیونکہ علمی حیثیت سے سنسکرت زیادہ وسیع اور باقاعدہ زبان تھی اور برہمنی مت کے پنڈتوں نے اس کا قدیم معیار گرنے نہ دیا تھا۔ بایں ہمہ بول چال میں سنسکرت نے رواج نہ پایا اور انہی پراکرتوں کی تبدیل شدہ صورتیں لوگوں میں مستعمل رہیں، اور یہ سب جیسے پنجابی، پوربی ہندی، مرہٹی، بنگالی وغیرہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی دیس کی زبانیں ہیں۔

باب پنجم

سکندر اعظم کا حملہ ہندوستان پر

تحریری سند کی رُو سے پہلی غیر سلطنت جس نے ہندوستان پر حملہ کیا ایران ہے وہاں کے قدیم پایۂ تخت اسطخر سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں ہندوستان کا ذکر موجود ہے۔ یہ کتبے ولادت مسیح علیہ السّلام سے پانسو برس پہلے کے لکھے ہوئے ہیں اور ان سے زیادہ قدیم کوئی تحریر ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس میں ہندوستان کا نام آیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ دارائے اول (داریوش اکبر یا اسفندیار) کے عہد حکومت میں (سنہ ۵۲۱ تا سنہ ۴۸۵ ق م) دولت ایران کو نہایت وسعت و قوت حاصل ہوئی اور منجملہ اور فتوحات کے پنجاب کا کچھ حصہ بھی (غالباً دریائے سندھ تک) فتح ہو کر سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ کتبات میں اسی مقبوضہ حصے کو ولایت ہند کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہاں سے ایرانیوں کو خراج کی معتد بہ رقم وصول ہوتی تھی

سکندر کی فتوحات

دارائے اول سے تقریباً دو سو برس بعد فلپ کے بیٹے سکندر (شاہ مقدونیہ) نے ایران پر چڑھائی کی اور تین فیصلہ کن معرکوں میں مصر و شام سے ایران و سیستان تک تمام علاقہ فتح کر لیا۔ یونانی قوم کا یہ اقبالمند نوجوان دنیا کے سب سے بڑے سپہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے اور حقیقت میں ایسے خوش نصیب فاتح بہت کم

گزرے ہیں۔ اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور پُر شوکت سلطنت (ایران) کو اس نے فتح کیا (۳۳۰ قم) تو اس کی عمر پچیس ہی برس کی تھی۔ مسلسل فتوحات اور جوانی کی امنگ کا تقاضا تھا کہ ابھی اور ملک فتح کیے جائیں۔ ہندوستان کا ملک ایران سے ملا ہوا تھا۔ اور اگرچہ اب ایرانیوں کا اس ملک پر کچھ تسلط باقی نہ رہا تھا لیکن یہاں کی دولت اور عجائبات کی شہرت سکندر کو ادھر کھینچ لانے کے لئے کافی تھی ایران کے اور صوبوں کی تسخیر سے فارغ ہوتے ہی اس نے افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر فوج کشی کی۔

راجہ پورس کی شکست

یونانی لشکر سرحدی قبائل کو مغلوب و مطیع کرتا ہوا، پنجاب میں داخل ہوا (۳۲۶ قم) اور دریائے سندھ اُتر کے راجہ ٹکسیلا (ٹاکشا سیلا) کے صدر مقام امبھی کی طرف چلا۔ اہل ہند میں باہمی نفاق و عداوت کی بیماری اسوقت بھی موجود تھی۔ ٹکسیلا کے راجہ نے اپنے ہمسایہ راجہ پورس کی دشمنی میں سکندر کی اطاعت قبول کرلی اور کئی دن تک اس کی فوج کو مہمان رکھا۔ لیکن پورس کو یونانی بادشاہ کے آگے سر جھکانا منظور نہ تھا اور جب سکندر مشرق میں بڑھا تو جہلم کے کنارے مردان ہندی آمادۂ جنگ نظر آئے جو دریا کا راستہ روکے پڑے تھے۔

سکندر نے کئی دن تک انہیں دھوکے میں رکھنے کے بعد، رات کے وقت دریا کو عبور کرلیا اور صبح ہوتے ہوتے فوج کا بڑا حصّہ لئے ہوئے راجہ کے لشکر گاہ کی طرف بڑھا۔ راجہ نے یہ خبر سنتے ہی کچھ فوج پڑاؤ کی حفاظت کے واسطے چھوڑی، باقی لشکر لیکر مقابلے کو نکلا اور اس مقام پر صف جنگ آراستہ کی جسے آجکل کری کا میدان کہتے ہیں۔ جنگی ساز و سامان اور تعداد کے اعتبار سے پورس کو غلبہ حاصل تھا اور ذاتی دلیری دکھانے میں بھی اس نے یا اس کے سپاہیوں نے کمی نہیں کی لیکن یونانی سپہ سالار کی تدبیر اور یونانی سپاہیوں کی شجاعت و کاروانی کے آگے ہندیوں کی کچھ پیش نہ گئی اور چند گھنٹے کی شدید خونریزی کے بعد پورس کے سپاہی تتر بتر ہوگئے۔ جنگی ہاتھیوں نے اول اول یونانیوں کو پریشان کردیا تھا لیکن پھر زخمی ہو ہو کر وہ اپنی ہی فوج کو پامال کرنے لگے اور آخر میں دوڑتے دوڑتے شل ہوگئے اور بہت سے یونانی پیادوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ پورس نے بھی جب میدان ہاتھ سے جاتے دیکھا اور خود زخم کھایا تو ہاتھی کا رخ پھیر دیا۔

مگر سکندر نے سوار دوڑا کے اسے واپس بُلایا اور خود آگے بڑھ کر ملاقات کی۔ بیان کرتے ہیں کہ پورس نہایت بلند قامت اور طاقتور سپاہی تھا اس کی وجاہت اور دلیری نے سکندر کے دل میں جگہ کر لی تھی اور جب اس سے پوچھا کہ تم اپنے ساتھ کیا سلوک چاہتے ہو تو اس نے متانت سے جواب دیا "بادشاہوں کا سا"۔ سکندر بہت خوش ہوا اور نہ صرف اس کی جاں بخشی کی بلکہ اس کا علاقہ اسے واپس دیدیا۔ آئندہ سے پورس بھی اپنے فاتح کا وفادار حلیف بن گیا۔

سکندر کی واپسی

جہلم کے کنارے سکندر نے دو نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ ان میں ایک تو فتح کی یادگار میں خاص وہاں تھا جہاں یہ لڑائی ہوئی اور دوسرا اپنے عزیز گھوڑے بوسفالس (بوکفالوس) کے نام سے موسوم کیا۔ یہ گھوڑا عرصۂ دراز تک سکندر کا ساتھ دینے کے بعد اسی ملک میں مرا تھا۔ پھر مشرق میں بڑھ کر وہ راوی کو عبور کر گیا اور بعض جمہوری ریاستوں کو لڑ کر زیر کیا۔ ان میں سب سے سخت لڑائی کُٹھی (یا کتھیوری) قوم سے پیش آئی جن کا صدر مقام سانگلا اس مقام کے قریب واقع تھا جہاں آجکل امرتسر آباد ہے۔ سکندر نے قلعے کو تڑوا کے زمین کے برابر کرا دیا۔ اس کے بعد وہ دریائے بیاس کے کنارے تک پہنچا جسے قسمت نے اس کی پیشقدمی کا منتہا قرار دیدیا تھا۔

واضح رہے کہ خود سکندر کے جوش فتوحات میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور مشرقی ہندوستان کے بادشاہ کی بیشمار دولت کے افسانے سن سن کر اس کا شوق اور زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن مقدونیہ کے سپاہی لڑتے لڑتے تنگ آ چکے تھے۔ وطن کی یاد انھیں بے چین کر رہی تھی اور یونان سے زیادہ دور ملکوں میں بڑھے جانا ان کی ہمت کو پست کئے دیتا تھا۔ ادھر ہندوستان کی گرمی اور برسات نے ان کے حواس بگاڑ دیئے تھے۔ غرض انہیں آگے جانے کا حوصلہ نہ ہوا سکندر کی ولولہ انگیز تقریریں سن کر بھی وہ جوش میں نہ آئے اور بالآخر کُئنُوس نے ان کے جذبات کی ترجمانی اپنے ذمے لی۔ یہ رسالے کا سردار پورس کی جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا چکا تھا۔ اس موقع پر اس نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت کی اور سکندر کو یاد دلایا کہ کئی ہزار جوانوں میں جنھیں مقدونیہ سے اپنے ساتھ لے کر چلے تھے اب معدودے چند زندہ رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر سپاہ میدان

میں کام آئی یا مصائب سفر کی نذر ہو چکی ہے۔ بہت سے سپاہیوں کو خود بادشاہ نے اپنے آباد کردہ شہروں یا چھاؤنیوں میں بسا دیا ہے بہت سے زخم کھا کے مر گئے یا لڑائی کے قابل نہیں رہے جو چند کس ہیں وہ بھی اب مزید سختیاں برداشت نہ کر سکیں گے۔ دوسرے گھر چھوڑے انھیں سالہا سال گزر گئے اور اب وہ واپس جا کر اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے بیقرار ہیں۔ آخر میں کئی نوس نے بادشاہ کو ڈرایا کہ وہ اپنی اقبال مندی پر زیادہ نہ بھولے مبادا آسمان کو اس کا غرور برا معلوم ہو، اور وہ اسکی دشمنی کے در پے ہو جائے۔

سکندر یہ باتیں سُن کر بہت ناراض ہوا اور تین دن تک اس نے اپنے ساتھیوں کی صورت نہ دیکھی، لیکن آخر میں جب وہ کسی طرح بیاس کو عبور کرنے پر رضامند نہ ہوے تو اس نے بادل ناخواستہ واپسی کا حکم دیا۔ اور جہلم کے کنارے کچھ عرصے دم لینے کے بعد کشتیوں کے بیڑے میں دریا سمندر کی جانب روانہ ہوا۔ حفاظت کے لئے فوج کی معقول جمعیت ساتھ ساتھ کناروں پر کوچ کر رہی تھی اور خود سکندر کشتی میں سوار تھا۔ اس سفر میں دو مرتبہ اس کی جان جاتے جاتے بچی۔ پہلی دفعہ تو جہلم اور چناب کے سنگم پر جو بھنور پڑتا ہے اس میں دو کشتیاں ڈوبیں اور خود سکندر کی کشتی بھی اسی چکر میں آ کر ڈوبتے ڈوبتے رہ گئی۔ اور دوسری دفعہ مالوی قوم کے مقابلے میں وہ اکیلا ان کے قلعے پر چڑھ گیا۔ اس کے لشکر میں بس دو ہی سیڑھیاں یورش کرنے کے وقت موجود تھیں اور بادشاہ کو فصیل پر چڑھتے دیکھ کر یکبارگی اتنے سپاہی دوڑ پڑے کہ ان کے بوجھ سے دونوں سیڑھیاں ٹوٹ گئیں اور سکندر تک صرف دو ساتھی پہنچ سکے اب دشمن کی فوج نے ان تینوں پر یورش کی اور جب یونانی سپاہی چلّائے کہ سیڑھیاں ٹوٹ گئی ہیں اب فصیل سے کود کر اپنی فوج میں واپس چلے آؤ تو سکندر غیرت اور بہادری کے جوش میں باہر کودنے کے بجائے خود قلعے کے اندر دشمنوں میں کود پڑا۔ اور صرف دو ساتھ والوں کی مدد سے اس وقت تک لڑتا رہا کہ یونانی سپاہی فصیل میں میخیں گاڑ گاڑ کے اوپر چڑھ آئے اور قلعہ سر ہو گیا لیکن سکندر نے اس ہنگامے میں ایک ایسا کاری زخم کھایا کہ اسکی جاں بری کی امید نہ رہی اور مہینوں تک بیمار رہا۔

آخر یونانی بیڑا اور فوج دریائے سندھ کے دہانے پر آ پہنچی یہاں سکندر نے ایک شہر کی بنیاد رکھی جسے وہ مصر کے سکندریہ کی طرح مشرقی تجارت کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔

پھر نیارکورس نامی سردار کو امیرالبحر بنا کے سمندر کے راستے ایران آنے کی ہدایت کی اور خود فوج لے کر خشکی کی راستے مکران وسیستان ہوتا ہوا ایران کے پائے تخت سوسس کا رُخ کیا۔ مکران کے بیابان وریگستان میں فوج نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں اور بہت کچھ مال غنیمت چھوڑ دینا پڑا۔ خدا خدا کر کے یہ لشکر ۳۲۴ ق م کے موسم بہار میں ایران پہنچ گیا اور عیش ونشاط کے جلسوں سے سفر کی کلفت دور کی۔

سکندر کی سلطنت کا خاتمہ

ہندوستان سے واپسی کے بعد دنیا کا یہ نامور فاتح کچھ بہت دن زندہ نہ رہا اور اگلے ہی سال بابل جاکر مرگیا (جون ۳۲۳ ق م) وفات کے وقت از نیل تا سیحون اور ستری من (موجودہ سٹوما) تا بیاس تمام وسیع وسرسبز علاقہ سکندر کے زیرنگیں تھا، لیکن ان دور دراز ممالک اور مختلف اقوام پر محض سکندر کی تلوار نے حکومت قائم کی تھی، اور جب وہ شمشیر زن ہی زمین کے نیچے چھپ گیا تو اس کی جگہ لینے والا کوئی سامنے نہ آیا۔ بعضے دور دست صوبے آزاد ہوگئے اور جو باقی رہے ان پر سکندر کے جس سردار کا جہاں زور چلا وہ قابض ہوگیا۔

جہلم وبیاس کے درمیان کا علاقہ سکندر نے پورس کو دیدیا تھا اور جہلم کے پار سندھ تک وہ اپنے دوسرے حلیف یعنی ٹیکسلا کے راجہ کو حاکم بنا گیا تھا، لیکن دریائے سندھ کے شاخ در شاخ دہانے پر اور اس کے شمال مغرب میں دو صوبے بنا کر اس نے براہِ راست اپنے ماتحت رکھے اور ان کا والی ایک یونانی کو مقرر کیا تھا، مگر یہ انتظام بھی اس کے مرتے ہی درہم برہم ہوگیا۔ اور چند سال کے اندر اندر سرزمین ہند پر یونانی حکومت کا نام ونشان باقی نہ رہا، گویا ہندوستان کے آسمان پر سکندر ایک شہاب ثاقب تھا کہ ٹوٹ کر گرا اور چمک کر غائب ہوگیا۔ اس میں کلام نہیں کہ ہندوستان کا حملہ اس نامور کشور کشا کی ایرانی فتوحات کا نہایت درخشاں تتمہ تھا لیکن اس سے کسی مستقل حکومت کی بنیاد قائم نہ ہوئی اور سچ یہ ہے کہ یونانی تمدن کا کوئی قابل ذکر اثر بھی ہندوستان پر نہ پڑسکا۔ یونانیوں کو اس زمانے میں اپنے علم وحکمت پر بہت ناز تھا مگر سکندر کے حملہ سے اہل ہند کے خیالات میں کوئی تموج پیدا نہ ہوا گویا یہ وہ اقلیم تھی جس پر یونانی فاتح کا کوئی زور نہ چل سکا، یہ درست ہے کہ افغانستان اور پنجاب میں بعض نیم یونانی خاندان کچھ عرصے تک حکمران رہے اور یہ

سکندر کی مشرقی فتوحات ہی کا نتیجہ تھا۔ با ایں ہمہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان یونانی حکومتوں نے تاریخ ہند میں کوئی ایسا نقش چھوڑا کہ بعد میں ان کی یادگار رہتا۔

باب ششم

موریا سلطنت از ۳۲۱ سنہ تا ۲۷ سنہ ق م

اب تک ہم چھوٹی ریاستوں کا حال پڑھتے رہے اور سکندر کے ساتھ کے یونانی مورخوں نے ان سے بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے بعض ریاستیں تمدن کے اعتبار سے بخوبی ترقی یافتہ تھیں اور بعض کا ہم حال پڑھتے ہیں کہ ان میں خالص برہمن آباد تھے۔ کہیں کہیں راجہ کے مشیر برہمن تھے مگر اکثر علاقوں میں وحشی اور متمدن آبادی ملی جلی تھی اور سکندر کے بعض معرکوں میں کبھی کبھی ایسے ہندی سپاہی بھی میدان میں آتے ہیں جن کے پاس دور قدیم کے بھدے ہتھیار اور لباس میں صرف جانوروں کی کھالیں تھیں۔

لیکن ہماری تاریخ اب ہمیں موریا خاندان کے عہد تک لے آئی ہے جس کی اسی زمانے میں بہت بڑی سلطنت قایم ہوئی بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا آغاز اسی خاندان کے حالات سے ہوتا ہے۔

چندرگپت ۳۲۱ سنہ (یا ۳۲۲ سنہ) تا ۲۹۷ سنہ (یا ۲۹۸ سنہ ق م)

سکندر کے بعد جب شمالی پنجاب کا یونانی امیر بھی تھوڑی سی فوج لیکر ایران چلا گیا تو رہے سہے یونانی سپاہیوں کو بھگانے والا

کوئی نہ رہا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ سب مارے گئے یا گرد و نواح کی بستیوں میں گھل مل کے بے نشان ہوگئے۔ اس انقلاب میں **چندر گپت** نامی ایک نوجوان شخص کی کوشش کو خاص دخل تھا اور بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مگدھ دیس کے **نند** خاندان میں کسی عورت کے پیٹ سے تھا جو اس خاندان کی نہ تھی اسی ہل چل میں اپنے چالاک وزیر **چانکیا** (چانک) کی مدد سے وہ پنجاب کا مالک بن بیٹھا اور اس نے مگدھ کا رُخ کیا جو ان دنوں ہندوستان کی سب سے دولتمند اور طاقتور تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہاں کے راجہ کی حرص و تعدی نے لوگوں کو پہلے سے بیزار کر رکھا تھا اور وہ چندر گپت کے ساتھ ہوگئے تھے۔ بہر حال مگدھ کا راجہ مارا گیا اور خاندان **نندا** کے بادشاہوں کے بجائے سند شاہی نے چندر گپت سے زینت پائی پھر اس کی اولاد کئی پشت تک مگدہ کی فرماں روا رہی اور ان کو **موریا** خاندان کے بادشاہ کہتے ہیں۔

سنہ ۳۲۱ ق م تک چندر گپت ہندوستان کا سب سے طاقتور راجہ بن گیا اور سنہ ۳۰۵ ق م میں جب **سلیوکوس** (سلوکوس) یونانی نے ہندوستان پر حملہ کیا کہ سکندر کے فتح کئے ہوئے صوبوں کو پھر چھین لے تو چندر گپت کی حکومت پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی اور اسکی فوج کے سامنے یونانی حملہ آوروں کی کچھ پیش نہ گئی۔ سلیوکوس کو دب کر صلح کرنی پڑی اور ناکام واپس ہوا۔ واضح رہے کہ یہ یونانی سردار بھی سکندر کے ان جانشینوں میں تھا جنھوں نے اس کی وسیع سلطنت آپس میں بانٹ لی تھی اور ایران و سیستان کا ملک سلیوکوس کے حصے میں آیا تھا اور کچھ عرصے تک وہ اور اس کی اولاد خاندان موریا کے بادشاہوں کے ہمسائے میں حکومت کرتی رہی۔

میگاس تھنز

اس ہمسائگی سے ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ہندوستان کے مشرقی حصوں تک یونانیوں کی آمد و رفت ہونے لگی **سلیوکوس** نے مگدھ کے پائے تخت میں اپنا سفیر مقرر کیا (سنہ ۳۰۲) اور اس خدمت پر سب سے پہلے جو شخص بھیجا گیا وہی سب سے زیادہ مشہور ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ چندر گپت کی سلطنت ایسی پر شوکت اور وسیع تھی کہ غالباً اس سے پہلے کسی ہندی راجہ کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اسی بناء پر اس کی شجاعت اور اقبال مندی کے بہت سے گیت اور افسانے بن گئے جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ

اس قسم کے افسانوں سے تاریخی واقعات کا پتہ نہیں چل سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ یونانی سفیر میگاس تھنیز نے ہندوستان کے متعلق جو تحریر چھوڑی ہے، وہ قدیم تاریخ ہند کا نہایت بیش بہا ماخذ ہے۔ اس نے یہاں کے حالات پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی جس کے بعض حصے اب تک محفوظ ہیں اور انہی سے اس عہد کی معاشرت اور چندر گپت کے آئین و انتظام کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

سلطنت کا صدر مقام پاٹلی پترا اس جگہ واقع تھا جہاں ان دنوں سون ندی گنگا سے آکر مل جاتی تھی۔ اس جگہ آجکل شہر پٹنہ (عظیم آباد) اور اس کی چھاؤنی بانکی پور آباد ہیں میگاس تھنیز کے وقت میں اس کا طول ۹ میل اور عرض $1\frac{1}{2}$ میل تھا اور چاروں طرف خندق اور کچی فصیل بنی ہوئی تھی۔ فصیل میں ۶۴ دروازے اور سینکڑوں برج تھے کہ جنگ کے وقت وہاں سے مدافعت کی جا سکے۔

انتظام کے لئے شہر میں چھ انتظامی مجلسیں تھیں۔ اوراجناس کی قیمت اور کروڑ گیری کے محصولات مقرر کرنا انہی کا کام تھا۔ ولادت و موت کی فہرست ان کے پاس رہتی اور باہر سے جو سائل یا سیاح، سوداگر یا مسافر شہر میں آتے ان کی خبر گیری بھی ان شہری مجالس کے فرائض میں داخل تھی۔ شہر کے باہر فوج کی چھاؤنی تھی اور چندر گپت جنگی رتھیں، ہاتھی، باقاعدہ پیادہ سوار کی جمعیت کثیر ملازم رکھتا تھا۔

میگاس تھنیز نے لوگوں کو سات گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول حکماء جن میں غالباً سنیاسی بن باسی اور برہمن پنڈت سب ہی داخل ہیں۔ دوسرے کسان جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ تیسرے خانہ بدوش شکاری بنجارے وغیرہ۔ چوتھے اہل حرفہ جو سرکاری نگرانی میں کام کرتے تھے۔ ایک گروہ پیشہ ور سپاہیوں کا علیحدہ بن گیا تھا جنھیں خزانے سے تنخواہ ملتی اور وہ فوجی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، چھٹے گروہ میں سرکاری ملازمین جیسے پرچہ نویس مالگزاری کے عہدہ دار وغیرہ داخل تھے اور آخری گروہ راجہ کے مشیر یا چیدہ مصاحبوں کا تھا اور غالباً یہ وہ برہمن تھے جنھیں سیاسی معاملات میں خاص دخل ہوتا تھا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگرچہ میگاس تھنیز نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تا امکان تحقیق و صداقت سے کام لیا ہے تاہم وہ پردیسی اور ایک ایسے ملک کا باشندہ تھا

جس کی معاشرت ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ پس یہاں کے حالات کے سمجھنے میں اس سے غلطیاں ہوئی ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کے بارے میں بھی اس کی تحریر پر کامل اعتماد نہیں ہوسکتا اور اس نے بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جن کی غلطی بودھ مت والوں کی قدیم کتابوں سے ثابت ہوسکتی ہے۔

بادشاہ اور اس کے اختیارات

مگاس تھنیز لکھتا ہے کہ تمام زمین بادشاہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور کسان کو قریب قریب چوتھائی پیداوار سرکار کو دینی پڑتی تھی اس کے علاوہ چاہی زمینوں پر آبیانہ بھی مقرر تھا لیکن عموماً کسانوں کی حالت بہت اچھی تھی جنگ وجدال کے وقت بھی وہ اطمینان سے کاشتکاری میں مصروف رہتے تھے کوئی ان کو آزار نہ پہنچاتا تھا۔ جنگ کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اب قوم یا جمہور کو جنگ و صلح کا اختیار نہ رہا تھا بلکہ مطلق العنان بادشاہ محض اپنی ذاتی ہوس یا دشمنی سے ایک دوسرے پر فوج کشی کرتے اور بندگانِ خدا کا خون بہاتے تھے۔

پاٹلی پترا کا شاہی محل شان وشوکت اور زیب وزینت میں ایرانی محلوں سے بڑھا چڑھا تھا۔ اس کے چاروں طرف باغ اور حوض بنے ہوئے تھے اور عمارت زیادہ تر چوبی تھی جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ ہر قسم کا سامان عیش وعشرت اور بادشاہ کی تفریح کے اسباب وہاں موجود تھے جس وقت وہ شکار کو باہر نکلتا تو عورتوں کا پہرہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور ان کے ہاتھ میں دونوں طرف رسیاں تنی ہوئی رہتی تھیں جن کے اندر کوئی غیر شخص داخل نہ ہوسکتا تھا۔ اپنے محل میں بھی بادشاہ روزانہ خواب گاہ بدلتا رہتا تھا کہ دشمنوں کی دشمنی سے محفوظ رہے مگر دن کو ایک مرتبہ دربار عام ہوتا ضروری تھا اور اس وقت بادشاہ دادخواہوں کی فریاد سنتا تھا۔

صوبوں کی حکومت صوبہ داروں کی سپرد تھی۔ لیکن ان پر جاسوس یا خفیہ نویس مقرر تھے اور بات بات کی خبر بادشاہ کو پہنچ جاتی تھی۔ یہ پرچہ نویس عام طور پر نہایت رکیک لوگوں کو مخبری کے کام پر لگاتے کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ ذلیل خدمت کوئی شریف آدمی گوارا نہ کرسکتا تھا اور مگاس تھنیز تصدیق کرتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ بالعموم شریف اور دیانت دار تھے۔ یوں بھی چندر گپت کے عہد میں سنگین جرائم کا بہت کم ارتکاب ہوتا تھا

اور ذرا ذرا سے قصور پر بھی بڑی بڑی سزائیں دی جاتی تھیں ۔

عہد اشوک

چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا بندُسار (بندوسارا) تخت نشین ہوا (۲۹۸ ق م) پرانوں میں اس کا نام کسی قدر مختلف پایا جاتا ہے اور یونانی تاریخیں بھی اسے دوسرے لقب سے یاد کرتی ہیں۔ دو یونانی بادشاہوں سے اسکی خط و کتابت کا بھی پتہ چلا ہے مگر افسوس ہے کہ کوئی تفصیلی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی اور اس میں بھی قدرے شبہ ہے کہ وہ کتنے سال تک حکمرانی کرتا رہا۔ بہرحال سلطنت کی وسعت یا قوت میں اس کے زمانے میں کوئی کمی نہیں آئی اور چھبیس یا ستائیس برس کے بعد اس کا نامی فرزند اشوک (اسوکا) ۲۷۲ یا ۲۷۳ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا، یہ ہندوستان کا سب سے مشہور فرمانروا گزرا ہے اور اس کے بہت سے حالات ہمیں اس کے ان کتبوں سے معلوم ہوتے ہیں جو اس نے چٹانوں یا پتھر کی لاٹھوں پر جابجا کندہ کرا دیے تھے۔ ان میں اس کے احکام اور اخلاقی تعلیم درج ہے اور ان کی بدولت کم سے کم احکام جاری کرنے والے کی طبیعت کا بہت اچھا اندازہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے ان کتبوں کا دور دور پایا جانا ہی اس بات کی شہادت ہے کہ اشوک راجہ کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ اس قسم کی بعض لاٹھیں حال میں ایک طرف **پشاور** و **کشمیر** سے اور جنوب میں **میسور** کے علاقے سے برآمد ہوئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ ان سب علاقوں میں خاص راجہ **اشوک** کی عملداری تھی کیونکہ بہت ممکن ہے کہ بودھ مت کے "بھکشو" اور داعی جنھیں **اشوک** نے دور دور تلقین و ہدایت کے واسطے بھیجا تھا، اس کے فرامین و مذہبی احکام کندہ کرا گئے ہوں اور خود وہاں کے مقامی راجاؤں نے اس بات کو جائز رکھا ہو یا یہ کہ ان بعید علاقوں کے رئیس و راجہ خود مختاری کے باوجود **اشوک** کو اپنا سرور یا "راجہ ادھی راج" تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ شمالی ہندوستان کے بہت بڑے اور سب سے زرخیز حصے پر اس کا راج تھا اور اس کی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ مسلمانوں سے پہلے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی[۱]۔

عہد اشوک کی تاریخی واقعات مختصر طور پر یہ ہیں کہ باپ کے بعد اسے تخت و تاج

[۱] دیکھو اسمتھ کی تاریخ ہند صفحہ ۹۴ طبع دوازدہم ۱۹۲۰ء

کے لئے کئی سال تک بھائیوں سے لڑنا پڑا اور تخت نشینی کی رسم بھی سنہ ۲۶۹ ق م سے پہلے ادا نہیں ہوئی حالانکہ وہ غالباً اس سے تین سال پہلے (سنہ ۲۷۲ ق م) باپ کا جانشین ہو چکا تھا بہرحال تخت نشینی کے آٹھ برس بعد اس نے کلنگ یعنی خلیج بنگالہ کے بندرگاہوں پر فوج کشی کی اور فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا (سنہ ۲۶۱ ق م) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے اس تجربے نے اشوک کے دل میں خدا کا خوف بھر دیا، خونریزی سے نفرت ہوگئی، اور اس کے کتبے گواہ ہیں کہ بنی نوع کا مرنا دیکھ کر اسے کتنا رنج و ملال ہوا۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ اس ایک جنگ میں ایک لاکھ بندگان خدا کا خون بہا اور اس سے بھی زیادہ بندگان خدا کو غلامی اور قید کی مصیبت جھیلنی پڑی، ہزاروں گھر تباہ ہو گئے، گوشہ نشین عابدوں کی عبادت میں فرق آگیا اور دیندار برہمنوں کی جمعیت خاطر میں پریشانی پیدا ہوگئی۔ آئندہ سے اشوک نے اس وحشیانہ مشغلے کو ترک کیا اور اپنے دین کی خدمت و اشاعت میں مصروف ہوگیا۔ جس قدر اس کا سن بڑھتا جاتا تھا اسیقدر وہ بودھ مت کی طرف زیادہ مائل ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ جلوس کے اکیسویں سال (سنہ ۲۴۹ ق م) اس مذہب کے مقدس مقامات کی جا بجا کے زیارت کی۔ اخیر میں وہ بالکل فقیر اور بودھ مت کا پورا پیرو ہو گیا تھا اور اس کی بیٹی چارومتی بھی "بھکشن" بن کے نیپال کی کسی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ وہ کتبے جنھیں "چھوٹی چٹان کے کتبے" کہتے ہیں، غالباً اسی آخری سال حکومت کی یادگار ہیں کیونکہ ان میں اجمالاً اس نے اپنی عمر بھر کی کوششوں کا نتیجہ بیان کیا ہے۔

اشوک کے اسباب نام آوری

اشوک کی کوشش و محنت کا مدعا جنگی فتوحات نہ تھیں۔ اس کا مقصد اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ تھا یعنی انسانوں کے بجائے وہ برائیوں کو مغلوب کرنا چاہتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ اپنی رعایا میں "دھرم" یعنی حق شناسی کی اشاعت کرے اور مہاتما بودھ کے دین کا ڈنکا بجائے، چنانچہ ایسے الفاظ میں جن سے جذبۂ صداقت ٹپکتا ہے اس نے اس تحریر کو پتھر کی لکیر بنا کر چھوڑا ہے کہ

"رعایا کی خدمت میرا فرض ہے۔ میری زندگی کام کے لیے ہے۔ جان داروں کا فرض میری گردن پر ہے اور جہاں تک ہو سکے اس کو ادا کرنا میری محنت کا مقصود ہے۔ . . . . مجھ سے پہلے اکثر بادشاہوں نے میری طرح لوگوں کو سکھ پہنچایا۔

لیکن میرے کام کی غایت صرف ایک ہے کہ لوگ تقویٰ اور پرہیز گاری کے قانون کے آگے اپنا سر جھکا دیں"

اشوک کے ذہن میں "حق شناسی" کا جو کچھ مطلب تھا اس کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ اس کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں کا ادب، فرائض انسانی کا پہلا جزو ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ ماں باپ کا حکم مانا جائے، فقرا اور برہمنوں کی تعظیم و تکریم کی جائے اور انھیں نذر و تحائف کے دینے میں دریغ نہ ہو۔ فرائض انسانی کا دوسرا حصہ "بے آزاری" ہے کہ کسی جاندار کو دکھ نہ دیا جائے، چنانچہ بودھ مت قبول کرنے کے بعد اشوک کے بہت سے تفریحی مشاغل جن سے آدمی یا جانور کو تکلیف پہنچتی ہے، چھوڑ دیے اور بادشاہی شکار کا تمام کارخانہ درہم برہم کر دیا۔ اپنے باورچی خانے میں اس نے ہرن اور مور تک مارے جانے کی ممانعت کر دی اور جہاں تک بن سکا ان میلوں اور تہواروں کو بھی روکا جن میں قربانی کی رسم جاری تھی۔ اس نے سنگین سزا کو موقوف تو نہیں کیا لیکن قیدیوں کو جو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں ان کی ممانعت کر دی اور اپنی ہر سالگرہ کے دن جس قدر قیدی زندان میں ہوتے تھے، سب کو رہا کر دیتا تھا۔ اشوک نے آدمی کے سب سے ضروری فرائض میں تیسرا فرض راست بازی یا سچائی کو قرار دیا ہے، اور آخر میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ آدمی اپنے نفس کو اتنا کمزور کرے کہ وہ بالکل مردہ اور مغلوب ہو جائے۔

اس مذہبی قانون پر عمل کرانے کے واسطے ایک محکمۂ احتساب قائم کیا گیا تھا کہ لوگوں کے چال چلن کی ہر وقت نگرانی کرے۔ دوسرے ہر پانچویں سال ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جاتا تھا جس میں سرکاری عہدہ دار جمع ہوتے اور مذہبی قوانین کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔ اشوک اپنے کتبات میں بار بار عہدہ داروں کو تاکید کرتا ہے کہ لوگوں کی راحت رسانی اور خدمت گزاری کو اپنا اصلی فرض سمجھیں اور ان کے ساتھ نہایت نرمی اور شفقت سے پیش آئیں۔ اس خدمت کو ادا کرنے میں خود بادشاہ کو اپنے راحت و آرام کی پروا نہ تھی اور حکم تھا کہ جس وقت کوئی فریادی حاجتمند آئے، اسے فوراً مہاراجہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ پہاڑ کی چٹانوں اور لاٹھوں پر ان ہدایات کے کندہ کرا دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کے جانشین بھی اسی راستے پر چلیں۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ میں نے ان ہدایتوں کو پتھر کی لکیر بنا دیا ہے کہ مدت تک یادگار رہے اور میرے بیٹے اور پوتے اپنی رعایا کے ساتھ بھلائی کرنے میں غفلت نہ کریں۔

مسکی کا کتبہ

اشوک کے کتبوں کا تفصیلی حال تم آیندہ بڑی تاریخوں میں یا بودھ مت کی سرگذشت میں پڑھو گے لیکن مناسب ہے کہ یہاں مختصر طور پر ان تین کتبوں کا ذکر کر دیا جائے جو چند سال ہوئے ممالک محروسہ میں کے علاقے میں برآمد ہوے ہیں۔ ان میں سے پہلا موضع مسکی ضلع رائچور میں دریافت ہوا (سنہ ۱۹۱۵ء) اور دو حال میں نواب سالار جنگ کی جاگیر کپل کے قریب نکلے ہیں (سنہ ۱۹۳۱ء) نظامت آثار قدیمہ سرکار عالی نے ان کتبوں کی حفاظت کا پورا اہتمام کیا، ان کی تصویریں اور چربے لیکر یورپ بھیجے اور ان کی عبارتوں کو صحت کے ساتھ پڑھوایا اور ترجمہ کرالیا ہے۔ ان کے برآمد ہونے کی کیفیت، تصویریں، اصل عبارت اور ان کے انگریزی ترجمے بہت خوبی سے (مولوی غلام یزدانی صاحب) ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی نے کتابی صورت میں علیحدہ علیحدہ شایع کر دیے ہیں[1]۔ ان تینوں میں مسکی کا کتبہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں اشوک نے اپنا اصلی نام درج کیا ہے اور دوسرے کتبوں میں صرف اس کا لقب ("پیا داسی" وغیرہ) تحریر ہے جس کے معنی "دیوتاؤں کا چاہیتا"

کتبے کی آٹھ سطریں جس کے بعض لفظ اڑ گئے ہیں، تقریباً تین گز لمبی اور دو گز چوڑی سلیبہ کی چٹان پر کندہ پائی گئیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"دیوتاؤں کے چہیتے (راجہ) اشوک کا (فرمان ہے)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اڑھائی سال تک میں مرید رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (پھر) (بودھ مت کے) فقرا کی جماعت میں گیا اور جوش کیساتھ داخل ہوا۔ (وہ جو) پہلے جمبو دیپ (ہندوستان) کے دیوتا تھے۔ ۔ ۔ باطل ہو گئے۔ اس نتیجہ تک ادنی انسان بھی جو دہم خود اختیار کرے پہنچ سکتا ہے۔ کسی کو یہ خیال کرنا نہیں چاہئے کہ صرف بڑے لوگ یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے ہر آدمی سے کہدیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مدت تک (رہے گا) اور پھلے پھولے گا۔ ۔ ۔"

اشوک کے زمانۂ حکومت اور سن وفات کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا مگر اکثر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۳۶ یا ۳۷ سال حکومت کی اور ۲۳۷ یا ۲۳۶ ق م میں فوت ہوا[2]۔

---

[1] سلسلہ مطبوعات آثار قدیمہ حیدرآباد۔ نمبر ۱ و ۱۰

[2] کیمبرج ہسٹری۔ ۱ صفحہ ۵۰۲۔ بعض تاریخوں میں سن وفات ۲۳۲ ق م تحریر ہے۔

سنگ اور کانو خاندان

اشوک کے بعد موریا خاندان کے پانچ راجہ سلطنت کے وارث ہوئے لیکن ان کی قوت میں ضعف آ گیا اور سلطنت کے اکثر صوبے ہاتھ سے نکل گئے۔ آخری راجہ کو (غالباً سنہ ۱۸۵ ق م میں) اس کے ایک سپہ سالار نے قتل کر دیا جس کا نام پشپی متر تھا اور خود راجہ بن بیٹھا۔ یہ اور اس کی اولاد سنگ (یا شنگا) خاندان سے موسوم ہے، اس کے عہد میں یونانی نسل کے بادشاہ مناندر نے ہندوستان پر یورش کی اور پنجاب سے گزر کر شہر متھرا تک آ پہنچا، بلکہ خود مگدھ دیس کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی تھی لیکن آخر اسے پسپا ہونا پڑا اور وہ ہندوستان سے واپس چلا گیا۔ اس بلا سے شاید نجات نہ ہونے پائی تھی کہ مشرق سے ایک اور خطرہ پیدا ہوا۔ اشوک کے بعد کلنگ کا ملک خود مختار ہو گیا تھا اور پشپی متر کے زمانے میں وہاں کے راجہ کھارول نے مگدھ کی فوجوں کو شکست دی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں غلبہ مگدھ ہی کو حاصل ہوا اور پشپی متر کے بیٹے اگنی متر نے اپنے عہد میں بہت دھوم دھام سے "اشوک مدہ" یعنی گھوڑے کی قربانی کی رسم ادا کی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ سنگ خاندان کے راجہ اپنے قدیم برہمنی مذہب کی طرف مائل تھے اور بودھ مت کو جو بادشاہی مذہب ہونے کا فخر حاصل تھا وہ پشپی متر کے زمانے میں نہیں رہا۔

بیان کرتے ہیں کہ اس خاندان میں دس پیڑھی تک راج رہا مگر ان راجاؤں کے عہد حکومت کا کچھ حال معلوم نہیں۔ آخری وارث کا نام دیوبھومی بتایا گیا ہے جو نہایت ناکارہ اور عیش پرست بادشاہ تھا۔ ایسے حاکم کے زمانے میں اگر لوگوں میں بے اطمینانی اور ملک میں بدنظمی پھیلی ہو تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ شخصی حکومت میں بادشاہ کی نالائقی ہمیشہ سلطنت کے حق میں مُضر ہوتی ہے، دیوبھومی کو بھی اس کے برہمن وزیر نے قتل کرا دیا اور سنہ ۷۲ ق م کے قریب خود مگدھ کا راجہ بن گیا، اس شخص کی اولاد میں سے جسے کانو خاندان کے نام سے یاد کرتے ہیں، ۴۵ برس تک حکومت رہی۔ آخری جانشین کا نام شرمت بتایا گیا ہے جسے آندھرا خاندان کے راجہ نے قتل کیا اور مگدھ کی قدیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا (سنہ ۲۷ ق م)۔

جنوبی سلطنتیں

اس دور میں ہندوستان کے جنوبی ممالک کی قدیم تاریخ کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ مگر اس تخمینہ کی معلومات گنگا جمنا کے قریب قریب کے علاقوں تک تھی، اگرچہ گنگا کے جنوب میں

آندھرا خاندان کی دولتمند اور طاقتور سلطنت کا بھی ضمناً اس نے ذکر کیا ہے (دکن کی اس وسطی سلطنت کا حال کسی قدر وضاحت سے آگے آئے گا) ۔ تاہم سنسکرت کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی (ق م) میں دکن تین ریاستوں میں منقسم تھا، پانڈیا ۔ چولا ۔ چیرا ۔ دکن کا مشرقی ساحل جسے اب کورومنڈل کہتے ہیں اصل میں چوڑا یا چولا منڈل ہے اور اس علاقے پر چولا خاندان کی حکومت تھی ۔ ساحل ملیبار چیرا خاندان کے زیرنگیں تھا ۔ مگر اشوک کے کتبات سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید بعد میں اس کے دو حصے ہوگئے تھے اور شمالی ٹکڑا ریاست کرالا کے نام سے موسوم ہوتا تھا اور جنوب میں جہاں اب کوچین وٹراونکور کی ریاستیں ہیں ستیاپتر نامی ریاست واقع تھی ۔ دکن کے انتہائے جنوب کا گوشہ پانڈیا خاندان کی حکومت میں تھا ۔ مگر ان ناموں کے سوا ہمیں یہاں کے تاریخی واقعات کا کچھ پتہ نہیں ۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراوڑی سلطنتیں ایک زمانے میں بہت خوش حال اور بارونق تھیں ۔ ان کی صناعی اور بحری تجارت کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں اور غالباً صدیوں سے یہاں مسالے اور موتی عرب کے مشرقی بندرگاہوں تک دساور جاتے رہتے تھے ۔

موریا، سنگ اور کانو عہد کے مشہور واقعات و سنین

(از سنہ ۳۲۱ تا سنہ ۲۷ ق م)

سنہ ۳۲۱ یا سنہ ۳۲۲ ق م . . . . . چندر گپت کی تخت نشینی مگدھ میں اور موریا خاندان کی حکومت کا آغاز۔

سنہ ۳۰۵ . . . سلیوکس کا حملہ ہندوستان پر۔

سنہ ۳۰۲ . . . مگاس تھنیز کی سفارت پاٹلی پترا میں۔

سنہ ۲۹۷ . . . بندوسارا کی تخت نشینی۔

سنہ ۲۷۰ . . . اشوک کی تخت نشینی۔

سنہ ۲۶۱ . . . کلنگ کی فتح اور الحاق سلطنت مگدھ میں۔

سنہ ۲۵۷، سنہ ۲۵۶ چٹانوں کے کتبات کا کندہ ہونا۔

سنہ ۲۴۹ . . . اشوک بدھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کو جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۴ (یا سنہ ۱۸۵) پشی متر موریا خاندان کے آخری راجہ کو مار کر اپنے خاندان سنگ کی حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے۔

سنہ ۷۲ . . . کانو خاندان کا آغاز ۔
سنہ ۲۷ . . . آندھرا خاندان کے راجہ کے ہاتھ سے کانو خاندان اور قدیم سلطنت مگدھ کا خاتمہ ۔

ف یاد رکھنا چاہیے کہ ان واقعات کے اکثر سنین قیاسی ہیں ۔

باب ہفتم

مختلف شاہی خاندانوں کی پیچ در پیچ داستان

(از ۲۵۰ سنہ ق م تا ۳۰۰ سنہ ع)

چندر گپت کی وسیع سلطنت کو پرہیز گار اشوک نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ مگر اس کے بعد مگدھ کی قوت میں زوال آگیا اور آخر میں پاٹلی پتر کے تخت نشینوں کی حکومت صرف چند اضلاع تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کے جنوب اور مغرب میں بعض اور ریاستوں نے زور پکڑا اور اس باب میں ہم انھی کی تاریخ بیان کریں گے، اگرچہ یہ کہانی بہت اُلجھی ہوئی ہے اور اکثر واقعات کی صحت بھی یقینی نہیں ہے۔

آندھرا خاندان

دکن میں آندھرا خاندان کے راجاؤں نے بڑی قوت حاصل کی اور اپنے عروج کے زمانے میں کوہ بندھیاچل کے نیچے غالباً ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک ان کا راج تھا، اور ان کا اصلی مقام اس علاقے کو سمجھنا چاہئے جسے دریائے گوداوری سیراب کرتا ہے۔ پران میں ان کے تیس اکتیس راجاؤں کا نام گنایا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ خاندان ساڑھے چار صدی تک فرماں روائی کرتا رہا۔ مگاس تھینز کی تحریر اس بات کی گواہ ہے کہ تیسری صدی (ق م) بھی آندھروں کی سلطنت خوب رونق پر تھی اور لڑائی کے لئے راجہ کے پاس سپاہیوں کی

بہت بڑی تعداد رہتی تھی۔ راجہ اشوک کے کتبات میں اس راج کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ گویا وہ مگدھ کا خراج گزار تھا، لیکن موریا خاندان میں ضعف آیا تو یہ سلطنت بھی خود مختار ہوگئی اور کچھ عجب نہیں کہ کلنگ کے راجہ کھاروِل نے اسی جنوبی سلطنت سے مدد لینے کے بھروسے پر پشپی متر سے لڑائی مول لی ہو۔

آندھروں کی سلطنت کے دو حصے تھے مشرقی حصے کا صدر مقام دھرنی کوٹ دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ مغربی صوبے پر سلطنت کا ولی عہد حکومت کیا کرتا تھا اور اس کا مستقر گوداوری کے کنارے پٹن (یا پرِ اِتشتان) تھا جو آج کل سرکار عالی کے ضلع اورنگ آباد میں واقع ہے۔

اس خاندان کے بادشاہوں میں صرف دو زیادہ مشہور ہیں۔ (۱) راجہ ہل یا ہالا اور (۲) بل بائے کر (یا ولی ویاکورا)، شاید پہلے راجہ کی حکومت کا زمانہ پہلی صدی عیسوی ہے اور کہانیوں میں اسے علم ادب کا بڑا مربی بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں "سپت شتک" نامی نظم اسی کی تصنیف ہے اور اسی طرح پرانی مرہٹی زبان میں کئی کتابیں اس کے اور اس کے وزیروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ راجہ بل بائے کر کی شہرت دو کتبوں سے ہوئی جو ناسک میں ملے ہیں اور ان میں تحریر ہے کہ اس نے سکا اور یون وغیرہ بہت سی سرکش قوموں کا سر نیچا کیا۔ اور نہاپان کو شکست دے کر مارا۔ یہ نہاپان سکا قوم کا راجہ یا صوبہ دار تھا اور اس قوم نے یورشیں کر کے پہلی صدی عیسوی میں آندھرا سلطنت کے بعض مغربی صوبے دبا لئے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بل بائے کر نے ۱۲۶ء میں انھیں شکست دے کر اپنا قدیم علاقہ پھر چھین لیا اور اسی لڑائی میں نہاپان مارا گیا۔ ان فتوحات کے کوئی ڈیڑھ صدی بعد (تیسری صدی عیسوی کے آخر میں) آندھرا خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

ہند کے نیم یونانی بادشاہ

اس عرصے میں جب کہ دکن پر آندھرا خاندان کے بادشاہ فرمانروائی کر رہے تھے شمال مغربی علاقہ خاموش نہ تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ سرحد کے پھاٹک بار بار کھلتے اور حملہ آوروں کے سیلاب ملک کے اندر آتے رہتے تھے۔

یون

واضح ہو کہ سکندر اعظم اور اس کے یونانی جانشینوں نے ایشیا کے اکثر مقامات میں اپنے ہم وطن یونانیوں کو بسا دیا تھا۔ اس

قسم کی نوآبادیوں کو اور کہیں فروغ ہوا ہو یا نہ ہو، باختریہ کے زرخیز علاقے میں وہ خوب پھلیں پھولیں چنانچہ عرصے تک یہاں یونانی نسل کے بادشاہوں کی حکومت رہی اور یونانی تمدن چھایا رہا۔ انھی بادشاہوں میں **یوتی دموس** اور اس کے بیٹے **دمت ریوس** نے کوہ ہندوکش کو عبور کیا اور افغانستان اور شمال مغربی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ فتح کرلیا۔ بعد میں بھی دو ڈھائی سو برس یونانی نسل کے لوگ ہندوستان کے شمالی ملکوں پر حکمرانی کرتے رہے اور قدیم سکوں سے ان کے تیس چالیس بادشاہوں کا سراغ لگتا ہے۔ لیکن ان میں صرف ایک بادشاہ **مناندر** بہت نامور ہوا جسے بودھ مت کی کتابوں میں **ملندا** کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ ۱۵۰ ق م کے قریب فرمانروائی کرتا تھا اور پنجاب فتح کرکے متھرا پر قابض ہوگیا تھا۔ بعض قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ خاص پاٹلی پترا تک پہنچا۔ لیکن اسکی یہ کامیابی محض عارضی تھی اور اسے بہت جلد اپنے وطن کی طرف واپس ہونا پڑا جہاں اس کے ہم قوم امیروں نے فساد کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔

ان یونانی یا نیم یونانی حملہ آوروں کو قدیم اہل ہند "یون" کہتے تھے۔ مگر یہ بات ابھی تک پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی ہے کہ جسے وہ ملندا کہتے ہیں وہ واقعی مناندر ہی تھا بہرحال مناندر کے بعد پھر کسی یونانی بادشاہ کو فروغ نہیں ہوا۔ صرف مشرقی پنجاب میں ان کی حکومت رہی اور جب یہاں کے یونانی امیر ہرمیوس کو ۵۰ء میں شکست ہوئی تو "یون" قوم کے حکمرانوں کا چراغ گل ہوگیا اور پھر ہندوستان کی تاریخ میں ان کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

سیتھی اقوام

جب خاندان سلیوکوس کی قوت میں زوال آیا تو باختریہ کے ساتھ خاص ایران کے صوبے بھی خودمختار ہوگئے اور پارتھیہ کے خونخوار شہسواروں کی ایک آزاد سلطنت علٰحدہ قائم ہوگئی۔ پارتھیہ بحر خزر کا وہ شمال مشرقی علاقہ ہے جسے اہل فارس **کہستان** کہتے ہیں۔ **اشکان** (ارساکیس) انہیں جنگجو قبائل کا پہلا بادشاہ تھا جس کی اولاد رفتہ رفتہ تمام ایران کی مالک ہوگئی اور اپنے جد امجد کے نام پر خاندان اشکانیان کہلاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حکومت کے دامن کسی وقت میں ہندوستان تک پھیل گئے تھے اور انھی کے قوم کے لوگ تھے جنھیں ہندوؤں کی قدیم روایتوں میں **پالوا** (پہلوی) کے نام سے یاد کیا ہے۔

سکا

بہرحال یہ اور ان کے جانشین **سکا** خواہ کہیں سے آئے ہوں اس میں

کلام نہیں کہ یہ سب سیتھی نسل کی شاخیں تھیں اور سیستان کے راستے سے ہندوستان تک پہنچیں۔ خاص کر سکا (یاسس) قوم کے لوگ اتنی کثیر تعداد میں آئے تھے کہ ایران کا مشرقی علاقہ انھی کے نام پر سیستان کہلانے لگا۔ اور پہلی صدی (ق م) میں وہ سندھ و پنجاب سے گزر کر دریائے جمنا تک پھیل گئے۔ اس کے قریب قریب دو صدی بعد ہم کاٹھیاواڑ اور مالوے میں ان کی حکومت دیکھتے ہیں اور نہاپان جسے دکن کے راجہ بل بائے کرنے شکست دی سکا قوم ہی کا حاکم تھا، لیکن اس شکست کے باوجود مالوے پر سکا قوم کے حاکم بہت دن حکومت کرتے رہے۔ ان کا صدر مقام اُجین تھا۔ اور ان کی حکومت کا خاتمہ راجہ بکرماجیت کے ہاتھوں ۳۹۰ء میں ہوا۔

قبائل یوچی اور کشان خاندان

سکا یا سس قوم کے اتنی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آنے کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے وطن یعنی جیحون و سیحوں کے علاقوں سے نکال دیئے گئے تھے اور ان کی بجائے وہاں سیتھی نسل کی ایک اور قوم یوچی قابض ہوگئی تھی۔ اس قوم کے متعدد قبائل تھے اور انھی کے ایک خاندان کا نام **کشان** ہے جس کے بعض بادشاہوں کی حکومت شمال مغربی ہندوستان تک پھیلی اور ان کا سب سے مشہور بادشاہ **کنشک** گزرا ہے جو ۱۲۰ء کے قریب تخت پر بیٹھا۔ ترکستان و باختریہ کے علاوہ افغانستان، پنجاب کشمیر کے ملک بھی اس کی سلطنت میں داخل تھے اور چین و تبت کے لوگ اسے اپنے بودھ مت کا بڑا حامی مانتے ہیں۔ غالبًا اسی بادشاہ کے عہد میں اس مذہب کے علما کی بہت بڑی مجلس کشمیر میں منعقد ہوئی کہ بعض مذہبی اختلافات کا تصفیہ اور اپنی کتب دینی کی شرح تیار کرے۔ خود کنشک کا پائے تخت **پرش پور** یعنی پشاور میں تھا اور بودھ مت کے نامی حکما اس کے دربار کی زینت تھے۔ ان میں بودھ چرت کا مصنف **آسوگھوش** سب سے زیادہ مشہور ہے۔

جنوب میں کنشک کی حکومت غالبًا **بندھیاچل** تک پھیلی ہوئی تھی اور موجودہ بہار کے سرحدی مقام **غازی پور** تک اس کے سکے جس کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے قیاس ہوتا ہے کہ مشرق میں بھی اس کا علاقہ گنگ و جمن کے دوآبے سے آگے تک وسیع ہوگا۔ ایک روایت میں اس کے **پاٹلی پترا** پر حملہ کرنے کا بھی ذکر آتا ہے اور بعض مورخ صوبۂ بہار کو اس کی سلطنت میں داخل سمجھتے ہیں[1]۔ مغرب کی طرف ملک افغانستان پر جیسا کہ

[1] ونسنٹ اسمتھ (طبع ۱۹۲۴ء) صفحہ ۲۷۵۔

اوپر بیان ہوا کنشک کا قبضہ تھا اور ایران کے پہلوی بادشاہ سے بھی اس نے جنگ کی اور اسے اپنے علاقہ سے پسپا کیا۔ سلطنت چین سے اس نے اکثر شمشیر آزمائی کی ختن و کاشغر کا علاقہ فتح کیا اور وہاں کے شہزادوں کو بطور یرغمال ساتھ لایا۔ رومتہ الکبریٰ کے بادشاہوں سے بھی اس کے رسل و رسائل کا پتہ چلتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں کنشک ایک لا مذہب سا آدمی تھا لیکن تخت نشینی کے چند سال بعد اس نے بودھ مت اختیار کر لیا اور اس کا پرجوش حامی بن گیا اسی زمانے میں اس نے ایک عالی شان خانقاہ اور تیرہ منزل کا برج تعمیر کرایا جو دنیا کے عجائبات میں شمار ہونے کے لائق تھا اور کئی صدی تک شکستہ حالت میں قائم رہا۔

کنشک کی وفات کے متعلق بھی ایک عجیب کہانی مشہور ہے کہ اس نے دنیا کے تین دانگ یا گوشے فتح کر لئے اور چوتھی سمت جانے کا ارادہ کر رہا تھا مگر فوج والے ناراض ہو گئے اور علالت کی حالت میں اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ یہ غالباً ۱۶۲ء کے قریب کا واقعہ ہے۔ کنشک کے بعد (۱۶۲ء) کشان خاندان کی قوت میں رفتہ رفتہ زوال آگیا۔ یہ سیتھی نو وارد بھی تین چار صدی کے اندر ہندو تمدن کے رنگ میں رنگ گئے اور ان کے بعض سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شو کی پوجا کرنے لگے تھے کشان بادشاہوں کے یہ سکے پانچویں صدی عیسوی تک شمال مغربی ہندوستان میں رائج تھے اور قرائن کہتے ہیں کہ اس وقت بھی کابل کی طرف اسی خاندان کی حکومت تھی لیکن جب پانچویں صدی عیسوی میں ہون (یا تاتاری) قوم نے ہندوستان پر یورش کی تو کشان بادشاہوں کی رہی سہی حکومت بھی اسی سیلاب میں بہ گئی۔

اس عہد میں باختری بادشاہوں کے اثر سے یونان کی بعض صنعتیں اور زبان ہندوستان میں آئی اور یہاں کی فن عمارت اور علم نجوم پر بھی یونانیوں کا اثر پڑا لیکن ان خفیف اثرات کے سوا تمدن کی اور کوئی یادگار یہاں باقی نہیں رہی۔

اسی طرح جب پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں سلطنت روما کی حدود دریائے فرات کے کناروں تک پھیل گئیں تو روما کے تمدن کا اثر ایران سے گزر کر ہندوستان تک پہنچنے لگا شاید سکا اور کشان بادشاہوں کے سفیر بھی رومی دربار میں بھیجے جاتے تھے اور ان بادشاہوں نے رومی قیاصرہ ہی کی دیکھا دیکھی اپنے ملک میں سونے کا سکہ جاری کیا تھا۔ رومیوں کے ساتھ تجارتی تعلقات کی ایک عمدہ شہادت یہ ہے کہ دکن کے علاقوں میں بے شمار رومی

اشرفیاں دستیاب ہوئی ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان علاقوں کا رومی صوبوں کے ساتھ ضرور لین دین تھا، اور ہندوستان کا مال کثرت سے شام و مصر کی منڈیوں میں دساور جاتا تھا۔

مذہب کی حالت

اس عہد میں بودھ مت کی حالت بہت کچھ بدل گئی۔ یہ مذہب سیدھے سادے اخلاق کی تعلیم دیتا تھا اور اس میں مورتی پوجا یا مرنے کے بعد عذاب و ثواب کا بہت کم ذکر آیا ہے، مگر کنشک ہی کے زمانے میں جو بودھ مت کا بڑا حامی تھا، ہمیں مذہب کی حالت بدلی ہوئی نظر آتی ہے، یعنی خود مہاتما بودھ کی لوگوں نے پوجا شروع کر دی ہے اور شمال مغربی علاقوں میں بہت سے سیتھی، ایرانی، اور ہندو بتوں کی پرستش کا زور ہے۔ مندروں کے گرد دھوم دھام کے میلے ہوتے ہیں اور عوام الناس کو اسی قسم کی رسموں سے خوش کیا جاتا ہے جو پہلے برہمن تعلیم دیا کرتے تھے۔

اس طرح جب بدھ مت کی اصلی تعلیم مٹ گئی تو اس میں اور ہندوؤں کے قدیم مذہب میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا، اور وہ رفتہ رفتہ ہندوستان سے غائب ہونے لگا۔

حکمائے ہند کے مشہور فرقے

اس اثنا میں بعض ہندی حکما کی تعلیم بھی رائج ہوتی جاتی تھی۔ ان میں سب سے قدیم سانکھیا کا فلسفہ ہے جس کی بنیاد غالباً چھٹی یا پانچویں صدی (ق م) میں پڑی لیکن اس کا باقاعدہ نظام تیسری صدی (ق م) سے پہلے درست نہ ہوا تھا۔ اس فلسفے کے ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ روح اور مادّہ دونوں قدیم ہیں یعنی ازل سے ہیں اور ابد تک یونھی رہیں گے۔ انھی دونوں کے ملنے سے جانداروں کا وجود ہوا اور حواس ظاہری اور عقل بنی۔ جس طرح مادّے کی بے شمار صورتیں ہیں اسی طرح روحوں کی بھی تعداد کا حساب نہیں لیکن مادی جسم میں آکر روح بغیر حواس ظاہری کے ادراک نہیں کرسکتی۔

حکما کا دوسرا فرقہ یوگی کہلاتا ہے حقیقت میں "یوگ شاستر" (جس کا بانی پتنجلی غالباً دوسری صدی ق م، کا حکیم ہے) سانکھیا کے فلسفے ہی کی ایک اصلاح یافتہ شکل کا نام ہے۔ اس میں خدائے تعالیٰ کو سمیع و بصیر مانا گیا ہے اور بعض ریاضتوں کی تعلیم دی گئی ہے جن کے کرنے سے انسان روح اور مادے کی حقیقت تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔

اِس عہد کے مشہور واقعات اور سنین

سنہ ۲۲۰ ق م . . . . آندھرا خاندان کا آغاز

سنہ ۱۷۵ ق م . . . . دمتریوس یونانی، شاہ باختر کی حکومت ہندوستان تک پھیلتی ہے۔

سنہ ۱۶۰ تا سنہ ۱۴۰ ق م . . . . قبائل سکا باختر کی یونانی حکومت کا خاتمہ اور ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔

سنہ ۱۵۰ ق م . . . . یونانی بادشاہ مناندر کا عہد عروج۔

سنہ ۱۰ ق م تا سنہ ۵۰ء . . . . ہرمیوس آخری یونانی بادشاہ کی حکومت کابل کا خاتمہ۔

سنہ ۷۸ء . . . . . . سکا یا سالباہن سمت کا آغاز۔

سنہ ۷۸ء . . . . . . راجہ کنشک کی حکومت کا آغاز۔

سنہ ۱۲۶ء . . . . . . آندھرا خاندان کا راجہ بل بائے کر نہاپان کو شکست دیتا ہے۔

سنہ ۱۸۵ء . . . . . . کشان خاندان کی قوت کا زوال۔

سنہ ۲۳۰ء . . . . . . آندھرا خاندان کی حکومت کا خاتمہ۔

باب ہشتم

گپت خاندان ہون اور راجہ ہرش

سنہ ۳[illegible]ء تا سنہ [illegible]ء

قدیم ہندوستان کی تحریری تاریخ موجود نہ ہونے کی وجہ سے بار بار واقعات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور جہاں ہمیں کسی قسم کی شہادت یا تحریر میسر نہیں آتی تو مجبوراً ہم اس زمانے کو چھوڑ دیتے ہیں مسلمانوں کے آنے سے پہلے ایسے کئی فصل ہیں۔ اور تیسری صدی عیسوی بھی وہ زمانہ ہے جس کے حالات کا کوئی پتہ ابھی تک نہیں چل سکا۔

آخری چوتھی صدی کے شروع میں یہ تاریکی چھٹتی ہے اور پھر مگدھ کے تخت پر ہمیں ایک راجہ کی دھندلی صورت نظر آتی ہے۔ جو چندر گپت کے نام سے مشہور اور کسی لچھوی راج کماری کا شوہر تھا۔ سکوں میں ان دونوں کی تصویریں پہلو بہ پہلو بنی ہوئی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس رشتے نے چندر گپت کی قوت اتنی بڑھا دی تھی کہ اس نے پھر مگدھ میں ایک طاقتور خاندان شاہی کی بنیاد ڈالی جو سنہ ۳۲۰ء سے شروع ہوتا ہے مگدھ کی اس دوسری سلطنت کے راجہ "گپت خاندان" کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

سمدرگپت

سنہ ۳۳۰ یا سنہ ۳۳۵ء میں چندر گپت کا بیٹا سمدر گپت باپ کا جانشین ہوا اس کے بہت سے حالات ایک لاٹھ پر کندہ ملے ہیں

جو الہ آباد میں موجود ہے، لاٹھ پر مہاراجہ اشوک کا ایک مختصر کتبہ ہے مگر ہمارے کام کی چیز وہ طویل قصیدہ ہے جو سمدر گپت کے درباری بھاٹ ہرشین نے لکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس میں راجہ کو خوش کرنے کے لئے بہت کچھ مبالغے سے کام لیا گیا ہو گا لیکن اس کے زمانے کی تاریخ کے ماخذ اسی قسم کے ہیں جن سے کام لینے میں مورخ کو بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ ہرشین اپنے ممدوح کو سو لڑائیوں کا سورما بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے "سڈول جسم پر تیر و تبر کے اتنے ہی زخموں نے گل کاری کی تھی" آگے چل کر شاعر نے بعض مشہور لڑائیوں کا نام بہ نام ذکر کیا ہے اور اگر اس کی بات صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ دکن میں بھی بہت دور تک سمدر گپت کی حکومت پھیل گئی تھی۔ اگرچہ خود شاعر کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ براہ راست راجہ کے تحت میں صرف بندھیاچل کا شمالی علاقہ تھا۔

اپنی فتوحات کی یادگار میں سمدر گپت نے جشن اشومیدھ برپا کیا تھا لیکن واضح رہے کہ اگر میدان جنگ میں اس کی شجاعت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے تو علم و فن کی مجلس کا بھی وہ صدر نشین تھا۔ یوں تو گپت خاندان کے سب راجہ برہمنوں کے حامی اور سرپرست رہے لیکن برہمنی مذہب کو جلا دینے والی چیز قدیم علم ادب کی ترقی تھی اور اس میں جو حصہ سمدر گپت نے لیا وہ شاید کسی راجہ کے نصیب میں نہ آیا ہو گا۔ ہرشین لکھتا ہے کہ اس کی نظموں کے سامنے کسی شاعر کو ہمسری کی مجال نہ تھی اور گانے کے فن میں اندر دیوتا کا استاد اس کے آگے کان پکڑتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ سمدر گپت کو موسیقی کا شوق ضرور تھا۔ چنانچہ بعض سکوں میں اس کی تصویر اس شان میں نظر آتی ہے کہ وہ باجا لئے بیٹھا ہے۔

فاہیان چینی کی سیاحت ہند

سمدر گپت کے بعد ۳۷۵ء میں اس کا بیٹا چندر گپت بکرماجیت تخت نشین ہوا اور چونکہ سکا قوم کے والیوں کی حکومت کا اس نے خاتمہ کیا اور ان کی راج دھانی اُجین پر قابض ہوا اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی "بیر بکرماجیت" ہے جس کے بہت سے افسانے بن گئے ہیں اور جس کے دربار کے "نورتن" مشہور تھے لیکن سچ یہ ہے کہ اس عہد کا سب سے مشہور شخص اس چینی فقیر کو ماننا چاہئے جس کا سفرنامہ قدیم تاریخ کا نہایت قیمتی ماخذ ہے۔ بودھ مت کے اس عقیدت مند کو یہ شوق ہندوستان میں کھینچ لایا تھا کہ اپنی دینی کتابوں کی نقل خاص وہاں سے حاصل کی جائے جہاں بانی مذہب نے وہ باتیں اپنی

زبان سے کہی تھیں۔ دوسرے مہاتما بودھ مت کے جنم بھوم میں جو روایتیں اور حالات مل سکیں، انھیں جمع کرنا بھی فاہیان، چینی کا مقصود تھا، اسی غرض سے وہ ہندوستان پہنچا (۴۰۵ء) اور تین برس تک پاٹلی پترا کی خانقاہ میں اُس نے طالب علمی کی۔ ہندوستان میں وہ کل چھ برس رہا اور ۴۱۱ء میں واپس چلا گیا لیکن اس عرصے میں اس نے سندھ سے بنگالے تک اکثر مشہور مقامات کی سیاحت کی اور سفر کے تحریری حالات اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے۔ اہل تاریخ کا قیاس یہ ہے کہ راجہ سمدر گپت نے ہی پاٹلی پترا کو چھوڑ کر اپنی راج دھانی اجودھیا کو بنا لیا تھا۔ فاہیان راجہ چندر گپت بکرماجیت کے عہد میں آیا۔ اس وقت پاٹلی پترا کی رونق اور دولت بہت کچھ گھٹ چکی تھی، تاہم اشوک کے محلات اور چند عالیشان خانقاہیں موجود تھیں اور بدھ مت والوں کی حالت بھی کچھ بری نہ تھی۔ فاہیان نے ان کے سالانہ میلے کی مفصل کیفیت بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ان کی ظاہری شان و طمطراق میں کوئی کمی نہ آئی تھی مگر ہمارا چینی زائر سب سے زیادہ مالوے کی سیاحت سے خوش ہوا۔ اس ملک میں ابھی تک جین مت اور بدھ مت کو غلبہ حاصل تھا۔ گوشت اور شراب کے استعمال سے لوگ پرہیز کرتے تھے اور فاہیان کا قول ہے کہ وہ نہایت امن و اطمینان کی زندگی گزارتے تھے کیونکہ حکام بھی قوانین کی آڑ میں انھیں زیادہ پریشان نہ کرتے تھے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ بدھ مت کی بہت سی خانقاہوں کا بارونق ہونا یا کہیں کہیں اس کی اخلاقی تعلیم کی پابندی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ عوام الناس کے دلوں پر کوئی گہرا اثر رکھتا تھا یا یہ کہ برہمنوں کے مذہب کو اس نے دبا لیا تھا۔ اس کے برعکس اندازہ ہوتا ہے کہ جب طبقۂ اعلیٰ خاص کر بادشاہوں کی سرپرستی نہ رہی تو پھر بدھ مت کی قوت کا قائم رہنا بھی دشوار ہو گیا اور یہ ہم اشارۃً اوپر لکھ آئے ہیں کہ گپت کے خاندان کے راجہ برہمنی مذہب کے حامی تھے، پس غور سے دیکھا جائے تو فاہیان کے زمانے ہی میں بدھ مت کے زوال کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔

گپت خاندان کے آخری راجہ

چندر گپت بکرماجیت نے ۳۸ برس راج کرنے کے بعد ۴۱۳ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا کمار گپت جانشین ہوا۔ اس راجہ کی حکومت ۴۱۳ء سے ۴۵۵ء تک رہی، لیکن نام کے سوا تاریخ میں اور کوئی یادگار اس کی نہیں ہے اور اس عہد کے واقعات سے

ہم بالکل بے خبر ہیں۔ البتہ کمار گپت کے بیٹے سکندر گپت کا عہد (۴۵۵ء سے ۴۶۷ء تک) اس لحاظ سے یادگار ہے کہ اس کے زمانے میں شمال سے (گورے) ہون قوم کا سیلاب آیا اور گپت کی سلطنت کو بہالے گیا۔ یہ وحشی ان حملہ آوروں کی برادری میں داخل ہیں جنھوں نے مشرقی یورپ کو تاراج و برباد کر ڈالا تھا اور اپنی خونخواری اور وحشیانہ صورت و سیرت کا دور دور تک دلوں پر خوف بٹھا دیا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ منگول (مغل) نسل کے لوگ تھے جن کی ناک چپٹی رخسارے کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھیں دھنسی ہوئی ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں داخل ہوتے ہی اس ٹڈی دل نے پنجاب کو پامال کر دیا اور اگرچہ سکندر گپت نے شاید ۴۶۵ء میں ان کی پہلی یورش روک لی تھی لیکن چند ہی سال کے بعد پھر حملے شروع ہوئے اور لڑتے لڑتے آخر کار گپت خاندان کی سلطنت ان وحشیوں کی پیہم حملوں کی تاب نہ لاسکی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ پھر بھی بعض حصّوں میں اس خاندان کے لوگ علیحدہ علیحدہ حکومت کرتے رہے اور شمال میں راجہ پورگپت اور نرسم گپت کا راج برقرار رہا۔ نرسم گپت کی نسبت مورخوں کا خیال ہے کہ یہی وہ راجہ ہے جو بالادت کے نام سے مشہور تھا اور اس نے ۵۳۰ء میں ہونوں کو کارور کے مقام پر بڑی شکست دے کر ان کا زور توڑ دیا تھا۔

مالوے میں بھی بدھ گپت اور بھان گپت کی بدولت چند سال تک گپت خاندان کا نام زندہ رہا لیکن بعد کے زمانے میں مشرقی مگدھ کے سوا اور کہیں اس خاندان کے راجاؤں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ مشرقی مگدہ میں بعضے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک وہاں راجہ جیوت گپت کی حکومت باقی تھی۔

والبھی راج

گپت خاندان کے عہد زوال میں بھٹارک نامی ایک رئیس غالباً پانچویں صدی کے شروع میں خودمختار ہو گیا اور کاٹھیاواڑ کے علاقے میں والبھی راج کی بنیاد ڈالی۔ یہ علاقہ پہلے گپت کا باج گزار تھا لیکن خودمختاری حاصل ہونے کے بعد عرصے تک یہاں ایک بارونق سلطنت قائم رہی اور ۷۷۰ء کے قریب عرب حملہ آوروں نے اس کا خاتمہ کیا۔ یہاں کے بعض راجہ جینی یا بدھ مت کے پیرو تھے۔ اور جب چینی فاضل ہوئین چوئنگ ان کے پائے تخت کی سیر کو آیا تو یہ شہر تجارت کا مرکز اور نہایت بارونق و مرفہ الحال تھا۔

ہون[1]

سلطنت گپت کو درہم برہم کرنے والے بھی کچھ زیادہ عرصے تک جم کر حکومت نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سردار ترامن خود مختار بادشاہ نہ تھا بلکہ ہون قوم کے ایک بڑے بادشاہ کا (جس کا صدر مقام ہرات تھا) باج گزار تھا۔ بہر حال یہ حملہ آور پہلے شمال مغربی ہندوستان میں آئے اور پنجاب کو فتح کر کے شہر ساکل کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں یعنی سنہ ۵۰۰ء سے پہلے انھوں نے مالوے پر قبضہ کر لیا، لیکن یہاں ان کے قدم نہ جم سکے اور ترامن کے جانشین مہرگل کو شکست کھا کے مالوے سے دست بردار ہونا پڑا۔ یہ شکست بھی جس نے مغربی ہند میں ہونوں کی طاقت کا خاتمہ کیا، ہندوستان کی تاریخ میں عجب واقعہ ہے کہ آج تک یقینی طور پر یہی پتہ نہ چل سکا کہ یہ شکست کس نے دی تھی۔ اجین کے قریب منڈسور کا تاریخی شہر ہے اور وہاں بعض کتبات ملے ہیں جن میں یہ فتح جسودھرمن (یسودھرمن) سے منسوب کی گئی ہے لیکن ان منڈسوری کتبات کے سوا اور کہیں اس اقبال مند فاتح کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون اور کس خاندان کا آدمی تھا اور اتنی بڑی سلطنت اور فتح حاصل کرنے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ کہانیوں میں جس راجہ بیر بکرماجیت کی شجاعت و اقبال مندی کا ذکر آیا ہے وہ دراصل یہی جسودھرمن مالوے کا کوئی راجہ تھا جس نے دشمنوں کو مار کر ملک سے دفع کیا اور گپت کی قدیم سلطنت کا مالک ہو گیا لیکن یہ سب قیاسات ہیں۔ تحقیق صرف اس قدر ہے کہ چھٹی صدی کے اوائل میں ہونوں کو کسی ہندو راجہ نے شکست دی اور ان کا سردار مہرگل مالوے سے بھاگ کر کشمیر میں چھپا۔

کشمیر کے راجہ نے مہرگل کو اپنا مہمان کیا مگر اس نے اپنے میزبان کو ہٹا کر ملک پر خود قبضہ کر لیا اور چند سال تک کشمیر اور پنجاب کے بعض شمالی اضلاع پر حکومت کرتا رہا۔ عادات و اطوار کے اعتبار سے وہ اپنی وحشی قوم کا وحشی فرد تھا اور بدھ مت کے گوشہ گیر فقیروں پر سخت ظلم و تعدی کرتا رہا جس کا احوال اس مذہب کی روایتوں میں موجود ہے۔ کشمیری مورخ کلہن نے لکھا ہے کہ ایک روز کوئی ہاتھی پہاڑ کے غار میں گر کر شدت تکلیف و خوف سے

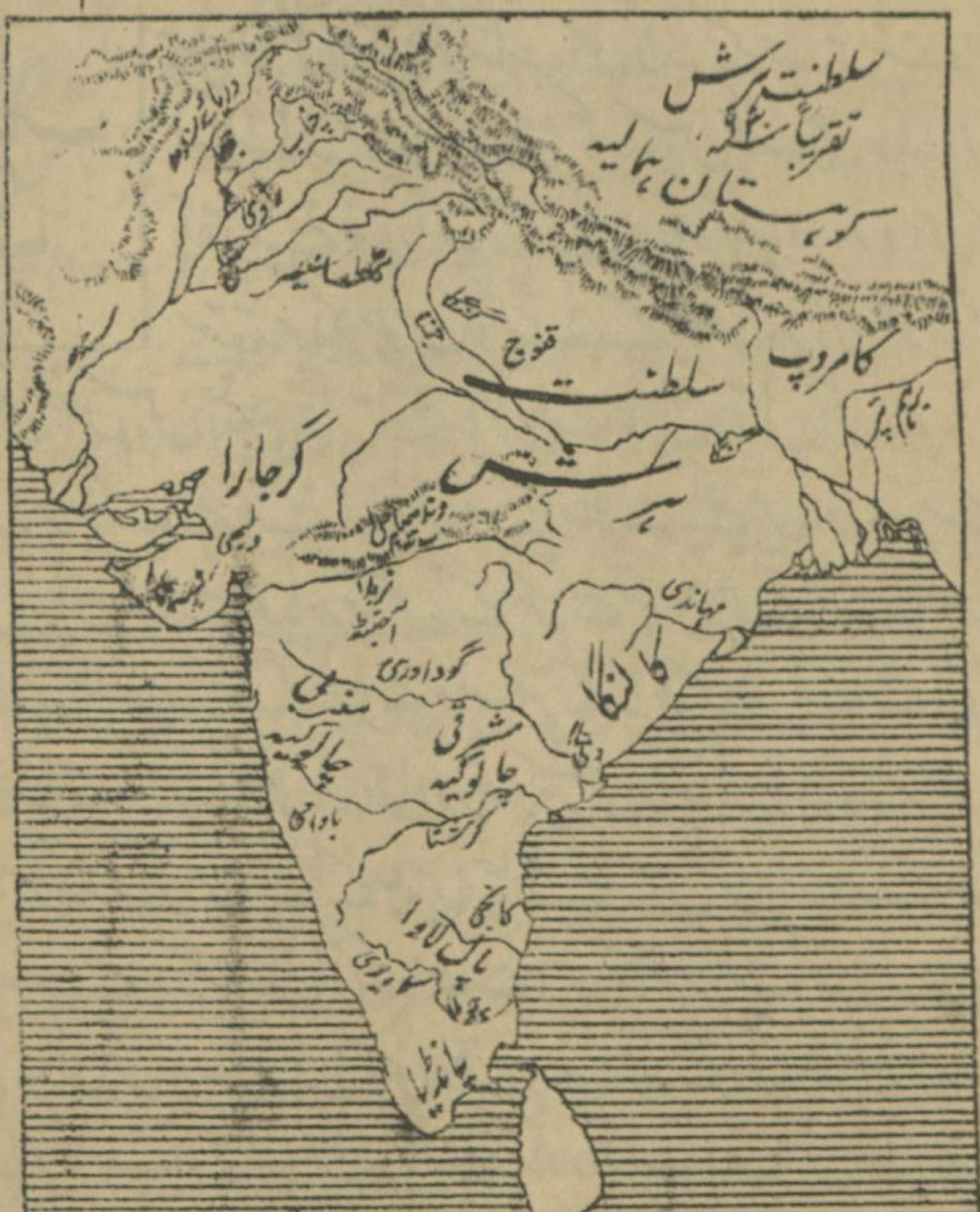
[1] ہون (ہُن یا ہَن) اس لفظ میں واو کی آواز قریب قریب ایسی ہے جیسے "اُن" کے پیش کی ہے۔

جنگھاڑنے لگا تو اس کی چیخیں سن سن کر **مہرگل** نے بہت مزے لئے اور بیحد خوش ہوا۔

ہون قوم کا ذکر ہندوؤں کی بہت بعد کی کتابوں اور کتبات میں بھی موجود ہے انھیں وہ ہونٹر کہتے تھے اور راجپوتانے کے چھتیس شاہی خاندانوں میں سے اب تک ایک کا نام ہونٹر ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گو ہونوں کی سلطنت زیادہ عرصے تک ہندوستان میں قائم نہ رہی تاہم ان کی بعض ریاستیں اور بستیاں یہاں آباد ہو گئیں اور ہندوستان کی وسیع آبادی میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوگیا۔

ہرش راجہ قنوج
سنہ ۶۰۶ء تا سنہ ۶۴۷ء

ہونوں کی شکست کے بعد پھر ایک صدی تک ہندوستان کے واقعات تاریکی میں ہیں۔ آخر ایک چینی سیاح کی بدولت ہمیں روشنی کی جھلک نظر آتی ہے اور ایک ہندو افسانہ نویس کی مدد سے دوبارہ واقعات کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ یہ **ہرش چرت**



کا مصنف **بان** (بانڑ) ہے جس نے **ہرش** راجہ قنوج کی داستان لکھی ہے۔ اس کا خلاصہ

یہ ہے کہ تھانیسر کے بہادر حاکم راج وردھن کی بہن راجیسری قنوج کے راجہ کو بیاہی تھی اور اس راجہ کو مالوے کے راجہ نے مارا اور راجیسری کو پکڑ لے گیا بہنوئی کے قتل اور بہن کی گرفتاری کا بدلہ لینے راج وردھن چلا تو وہ بھی دشمن کے فریب کا شکار ہوا۔ اور سلطنت اس کے بھائی ہرش وردھن کے ورثے میں آئی جس نے دشمنوں کا قلع قمع کیا اور اپنی مصیبت زدہ بہن کو نجات دلائی۔ قید سے چھوٹنے کے بعد راجیسری نے بدھ مت کی بھکشن بن کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر اس کے بھائی نے اپنی فتوحات سے خاندان کا نام روشن کیا اور قنوج کو اپنا پایۂ تخت بنا کے ایک وسیع سلطنت قائم کی۔

اس میں شک نہیں کہ ہرش اپنے زمانے میں ہندوستان کا سب سے طاقتور فرمانروا گزرا ہے اور کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات سے آسام اور شمال میں نیپال تک اس کی حکومت تھی اور وادی گنگا کے تمام راجہ اسے اپنا مہاراج تسلیم کرتے تھے۔

ہوئین چوئنگ کی سیاحت

چینی فاضل ہوئین چوئنگ اسی راجہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور ۶۲۹ء سے ۶۴۴ء تک اس ملک میں رہا۔ اس کی عالمانہ تقریر نے خود راجہ کے دل میں گھر کر لیا اور وہ اس کا اس درجہ معتقد ہوا کہ ہوئین چوئنگ کے خلاف زبان کھولنا ممنوع کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی شخص اس اجنبی سیاح کے ساتھ بحث یا قیل و قال نہ کرے۔

ہوئین چوئنگ نے اپنے زمانۂ قیام کے حالات لکھے ہیں اور بدھ مت کے ایک جشن کا مفصل بیان کیا ہے جو راجہ ہرش کے حکم سے قنوج میں کیا گیا تھا اور باجگزاروں میں جو اس جلسے میں طلب کئے گئے گجرات و آسام کے راجہ بھی شریک تھے۔ گوتم بدھ کا طلائی بت جلوس کے ساتھ روزانہ نکالا جاتا تھا اور خود ہرش راجہ اور بہت سے چھوٹے رئیس راجہ دیوتاؤں کا بھیس بدل کر اس بت کے جلو میں چلتے تھے۔ اس جشن یا میلے کے بعد پریاگ میں بڑی دھوم دھام سے یہ رسم منائی گئی کہ راجہ نے اپنی تمام دولت محتاجوں اور مذہبی لوگوں میں تقسیم کر دی۔ ان میں بدھ، برہمن، جینی وغیرہ ہر فرقے کے لوگ شامل تھے اور خزانے میں جتنا روپیہ تھا وہ سب ان کو بانٹ دیا گیا تھا اور ایک دفعہ بالکل خالی ہونے کے بعد دوبارہ ہرش نے اپنی رعایا اور باج گزار رئیسوں سے لیکر خزانے میں روپیہ بھرا۔

اس فیاض اور وسیع مشرب راجہ نے ۶۴۷ء میں وفات پائی۔ اقبال نے

ہر جنگ میں اس کا ساتھ دیا تھا اور دکن میں چالوکیہ خاندان کے طاقتور راجہ پل کیسن (ثانی) کے سامنے پسپا ہونے کے سوا ہر میدان میں ہرش کی فوجوں کو کامیابی ہوئی تھی لیکن اس دلیری اور سپہ گری کے ساتھ وہ قلم کا بھی ایسا ہی دھنی تھا اور رتناولی کے مشہور ناٹک کی تصنیف اسی سے منسوب کیجاتی ہے لیکن اس کے بعد کوئی اس کا جانشین ایسا نہ ہوا کہ اس وسیع سلطنت کو برقرار رکھتا۔ آریاورت کا شیرازہ پھر بکھر گیا اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے اپنے مقام پر خود مختار ہو گئیں (دکن میں جو راجہ اس زمانے میں حکمراں تھے ان کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

سنسکرت کا دوسرا دور

مذہبی فرقہ بندیوں سے اور اہل علم کی کوشش سے اس دور میں سنسکرت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کئی پران اسی زمانے میں قلم بند ہوئے اور سب سے قدیم وایو پران کی نسبت خیال ہے کہ وہ بھی چوتھی صدی عیسوی میں مرتب ہو چکا تھا[۱] بہرحال موجودہ زمانہ تک ہندوؤں کی مذہبی کتابیں یہی پران ہیں اور ان میں ان تمام مقامی یا خاص خاص فرقوں کے دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے جنھیں گذشتہ چند صدیوں میں برہمنوں نے اپنے مذہب میں شامل کر لیا تھا۔ ہندوؤں کے علاوہ خود بدھیوں اور جینیوں نے پراکرتوں کا استعمال چھوڑ کر اپنے مذہب کی روایات و کتب سنسکرت ہی میں منتقل کر لی تھیں مختصر یہ کہ ساتویں صدی تک سنسکرت ہی ہندوستان کی خاص علمی اور مذہبی زبان بن گئی تھی۔

منو کا مشہور دھرم شاستر غالباً اس دور سے پہلے کی (یعنی سنہ ۲۰۰ء کے قریب کی) کتاب ہے لیکن اس بارے میں اہل تحقیق متفق ہیں کہ "یاج نول کیا" نامی دھرم شاستر اسی عہد کے شروع میں لکھا گیا اور یہ احوال ظاہر اسے شہر متھلا کے کسی برہمن نے لکھا تھا[۱] لیکن مذہب و فلسفہ پر منحصر نہیں، اس دور میں ہر قسم کی کتابیں لکھی گئیں اور (کلاسکل یعنی مستند) قدیم سنسکرت اپنے معراج کو پہنچ گئی۔ اس قدیم سنسکرت سے مراد وہ زبان ہے جس میں بڑے بڑے مرکب الفاظ اور نہایت نازک خیالی سے کام لیا جاتا تھا عشقیہ داستانیں یا راجہ رانیوں کے قصے اس قدیم سنسکرت کی نظم و نثر کے سب سے عام مضمون ہیں اور ان تحریروں سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے

[۱] دیکھو متھا سمتھ صفحہ ۱۸۱ و ۲۸ - نیز کیمبرج ہسٹری - باب نمبر دہم -

اس زمانے میں فن شعر حد کمال کو پہنچ گیا تھا۔

اس دور کا سب سے نامی مصنف **کالی داس** ہے۔ عاشقانہ شاعری، ناٹک اور رزمیہ نظم ہر صنف شعر میں اسے سب پر ترجیح ہے اس کی نظم **میگھ دوت** اور ناٹک **شکنتلا** شاعری کے بے مثل نمونے ہیں جن کی قدر و منزلت میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ شاعر بکرماجیت کے دربار کا رتن مانا جاتا ہے اور قرائن کہتے ہیں کہ وہ پانچویں صدی عیسوی میں راجہ چندرگپت بکرماجیت کا ہمعصر تھا۔ اسی صدی یا شاید اگلی صدی کے دو اور مقبول عام مصنف **بھارَوی** اور **ڈنڈن** گزرے ہیں جن میں پہلے نے کرتارجنیا لکھی اور دوسرے نے **وش کمار چرت** تصنیف کی جو بہت سی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

اِس دور کے مشہور واقعات اور سنین

سنہ ۳۰۰ء تا سنہ ۷۰۰ء

سنہ ۳۱۰ء . . .	چندرگپت کی شادی لچھوی قوم کی رئیس زادی کمار دیوی سے ۔	سنہ ۳۰۰ء تا سنہ ۴۰۰ء وایوپران اور باج نول کے دھرم شاستر مرتب ہوے۔
سنہ ۳۲۰ء . . .	گپت سمت کا آغاز ۔	
سنہ ۳۲۶ء . . .	سمدرگپت کی تخت نشینی اور فتوحات ۔	
سنہ ۳۷۵ء . . .	چندرگپت بکرماجیت کی تخت نشینی ۔	
سنہ ۴۰۹ء . . .	سکا قوم کے مغربی والیوں کی حکومت کا خاتمہ ۔	سنہ ۴۰۰ء تا سنہ ۴۵۰ء کالی داس کی مشہور تصانیف کا زمانہ ۔
سنہ ۴۰۵ء تا سنہ ۴۱۱ء	فاہیان چینی کی سیاحت ہند	
سنہ ۴۱۳ء . . .	کمارگپت کی تخت نشینی سکندرگپت کی حکومت کا آغاز ۔	سنہ ۴۵۰ء تا سنہ ۵۵۰ء بھاروی اور ڈنڈن کا زمانہ
سنہ ۴۶۵ء . . .	وہ ہونوں کی پہلی یورش روکتا ہے،	
سنہ ۴۷۵ء . . .	ہونوں کی دوسری یورش اور گپت خاندان کی سلطنت کا خاتمہ ۔	
سنہ ۴۹۰ء تا سنہ ۵۱۰ء	تورامن ہون کی حکومت مغربی ہند پر ۔	سنہ ۵۰۰ء تا سنہ ۶۰۰ء آریا بھٹ اور براہمی ہر اکی علمی تصانیف کا زمانہ

سنہ ۵۰۰ء . . . . بھٹارک والبھی سلطنت کی بنیاد ڈالتا ہے ۔	
سنہ ۵۳۰ء . . . . مہر گل کا جس دھرمن سے شکست کھا کے کشمیر میں چلا جانا ۔	
سنہ ۶۰۶ء . . . . راجہ ہرشش کی حکومت کا آغاز ۔	سنہ ۶۰۶ء تا سنہ ۶۵۰ء بان شاعر اور بھرت رھاری مصنف کا زمانۂ تصانیف ۔
سنہ ۶۲۹ء . . . . ہوئین چوئینگ کی بغرض سیاحت روانگی چین سے ۔	
سنہ ۶۴۴ء . . . . قنوج اور پریاگ کا جشن اور مذہبی میلے۔ ہوئین چوئینگ کی مراجعت وطن کو ۔	
سنہ ۶۴۷ء . . . . ہرشش کی وفات ۔	
سنہ ۷۷۰ء . . . . والبھی سلطنت کا خاتمہ عربوں کے ہاتھ سے ۔	سنہ ۶۵۰ء کاشی کا ورتی کا زمانہ تصنیف

باب نہم

ساتویں صدی عیسوی سے ہند کی اسلامی فتح تک

قنوج کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خودسر ہوگئیں اور ان میں آئے دن لڑائیاں اور فساد رہنے لگے۔ ہندوستان میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی اور ہر زمانے میں کسی بڑی طاقت کے ضعیف ہوتے ہی جا بجا طوائف الملوک اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن ہندوؤں کی تاریخ میں اس دفعہ کا بگڑنا ایسا تھا جس کے بعد پھر پنپنا انھیں نصیب نہ ہوا یعنی ہرش راجہ کی سلطنت کے پارہ پارہ ہونے کے بعد پھر ان میں کوئی ایسا اقبال مند فرمانروا نہ پیدا ہوا جو عہد اشوک و چندر گپت کی یاد تازہ کر دیتا۔ یہی سبب ہے کہ قدیم تاریخ کے اس آخری دور میں ایسی ہندو ریاستیں ہمارے سامنے آئیں گی جن کی حدود حکومت ہندوستان کے ایک دو صوبوں سے آگے نہ پھیلیں اور جن کے مفصل حالات جمع کرنا صرف اس مورخ کا کام ہے جو کسی خاص ریاست کی مقامی تاریخ تیار کرے۔ مگر ہم اپنی تاریخ ہند میں سوائے اس کے کچھ نہ کریں گے کہ اس عہد کی مشہور مشہور ہندو ریاستوں اور شاہی خاندانوں کے مجمل حالات لکھ دیں تاکہ طالب علم کو اس بات کا سرسری اندازہ ہو جائے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے کچھ پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت کیا تھی۔

ترتیب زمانی کے اعتبار سے مسلمانوں کے ہندوستان پر ابتدائی حملوں کا ذکر بھی یہی جگہ آنا چاہئے کیونکہ ساتویں صدی عیسوی ختم ہونے سے پہلے عربوں نے اس ملک سے

چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی اور آٹھویں صدی کا ایک چوتھائی حصہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ملک سندھ فتح ہو کر خلافت بغداد کا صوبہ بن چکا تھا۔ لیکن ان واقعات کا ہم تفصیل کے ساتھ کتاب کے دوسرے حصے میں ذکر کریں گے یہاں صرف اتنا ہی یاد دلانا کافی ہے کہ ہندوؤں کے اس آخری دور میں بھی ملک سندھ اور کاٹھیاواڑ کا علاقہ مستقل طور پر ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اب ان مغربی صوبوں کو ہندوستان میں داخل نہ سمجھا جائے۔

راجپوت اور شمالی حکومتیں۔

اس زمانے میں سب سے نمایاں شئے راجپوت قوم کا غلبہ ہے جن کے کئی خاندانوں کی شمالی ہندوستان میں جا بجا حکومتیں قائم ہوئیں۔ ہندوؤں کی قدیم روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ راجپوت سورج چاند اور اگنی (یا آگ) دیوتا کی اولاد میں ہیں، اور اسی لئے ان کی تین ذاتیں سورج بنسی، چندر بنسی اور اگنی کل کے ناموں سے موسوم ہوئیں لیکن ان کہانیوں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتوں کا ہر قبیلہ یا گوت ایک ہی مورث کی اولاد میں ہوتا تھا۔ گوت کے سب افراد نسب کے اعتبار سے برابر کے بھائی سمجھے جاتے تھے راجہ یا بادشاہ کو حکومت کا شرف ضرور حاصل تھا لیکن اصل و نسل کے لحاظ سے ادنیٰ سے ادنیٰ راجپوت بھی اس سے ہم خاندانی اور ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا۔ ملکی انتظام کی عام صورت یہ تھی کہ راجہ کی طرف سے سرداروں کو جاگیریں دے دی جاتی تھیں اور شرط کر لی جاتی تھی کہ ضرورت کے وقت راجہ کے حکم سے وہ اپنی اپنی فوجی جمعیت لے کر ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے۔ یہ طریقہ مغل شہنشاہوں کے منصبداری آئین سے ملتا جلتا ہے اور اسی زمانے میں یورپ کے ملکوں میں بھی اسی نظام کی ایک صورت (یعنی فیوڈل سسٹم) موجود تھی، لیکن ان دونوں میں اور راجپوتوں کے جاگیرداری کے طریقے میں بڑا فرق یہ تھا کہ راجپوت جاگیردار راجہ کے خویش و اقارب ہوتے تھے اور ماتحتی کے علاوہ انھیں راجہ کی ذات کے ساتھ برادری کا بھی تعلق ہوتا تھا۔

راجپوتوں کی بہادری مشہور ہے۔ ہندوؤں میں یہ سب سے زیادہ آن بان کے لوگ تھے کسی طرح کا عار اٹھانا انھیں گوارا نہ ہوتا تھا، اور عزت کی خاطر جان دے دینا ان کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ ان کی عورتیں بھی ایسی ہی دلاور اور باوفا ہوتی تھیں کہ

ننگ و ناموس کی خاطر جان پر کھیل جاتی تھیں بے آبروئی یا فتحمند دشمن کے ہاتھ پڑنا انھیں گوارا نہ تھا اور تاریخ میں کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جب ایسی نوبت آئی تو راجپوت عورتوں نے اپنے ہاتھ سے آگ جلائی اور اس میں کود کر ہلاک ہوگئیں۔ اس رسم کا نام "جوہر" تھا اور اس میں اور "ستی" میں یہ فرق ہے کہ "جوہر" میں بعض اوقات خاندان کی کل عورتیں بچے جل کر ہلاک ہو جاتے تھے کہ کسی غالب دشمن کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ ستی بیوہ عورتوں کی رسم ہے جو صرف شوہر کے مرنے کے بعد ادا ہوتی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب بیرونی حملہ آوروں نے ہندوستان کے زرخیز و شاداب علاقوں میں یورش کی تو راجپوت اپنی زمینوں کو ان سے نہ بچا سکے، کیونکہ ان کے قبیلوں میں باہم اتفاق نہ تھا لیکن آزادی کی ایسی محبت تھی کہ انھیں غیروں کا محکوم بن کر رہنا بھی گوارا نہ ہوا۔ ان سے جو آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑ بیٹھتے تھے اغیار کی حکومت کو برداشت کرنا دشوار تھا۔ پس ان کے اکثر گروہ اٹھ اٹھ کر راجپوتانہ کے علاقوں میں پھیل گئے جہاں دشوار گزار پہاڑ اور بے آب ریگستانوں میں دشمن کا زور نہ چل سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی سرزمین میں وسائل معاش کی آسانیاں نہ تھیں۔ انسانی تمدن یہاں ترقی نہ کر سکتا تھا چنانچہ آخر تک تمام راجپوتانے میں کوئی ایسی منظم سلطنت قائم نہ ہوئی جو قوم کے منتشر افراد کو ایک رشتۂ اتحاد میں وابستہ کر لیتی، لیکن یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آزاد اور جنگجو قبائل از خود متنفر ہوتے ہیں۔ راجپوتوں کو بھی اپنے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو چھوڑ کر کسی بڑے راجہ کے سامنے سر جھکانا پسند نہ تھا، اور ان میں مدنیت یا کسی بڑی سلطنت کا انتظام کرنے کی عقل و صلاحیت ہی نہ پیدا ہوئی یہاں تک کہ مسلمانوں کا دور آیا اور خود راجپوتانے کے بے پروا منچلوں کو نظر آنے لگا کہ اس قوت کے مقابلے میں ان کی آزادی کا سلامت رہنا محال ہے۔

عقائد کے اعتبار سے راجپوت لوگ پکے ہندو تھے اور برہمنوں کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے اور یہ سچ پوچھئے تو یہی مذہب کا ایک ہونا ایسی شے ہے جس نے ان میں کسی قدر اتحاد اور یکرنگی پیدا کر دی ورنہ نسلاً وہ سب ایک نہ تھے۔ بھاٹوں کے گیت اور کہانیوں میں ان کے نسب کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ جدید تحقیقات کی رو سے اعتبار کے لایق نہیں، اور یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اگرچہ راجپوتوں کی زیادہ تعداد قدیم آریوں کی اولاد ہے لیکن ان میں سیتھی، ہون اور دراوڑی نسل کے بھی

خاندان شامل ہو گئے ہیں[۱]۔ البتہ ان سب نے آریوں کا تمدن اور برہمنوں کا مذہب اختیار کر لیا اور انھی میں گھل مل گئے، مگر ان عام حالات کے ساتھ مناسب ہوگا کہ اب ہم راجپوتوں کے بعض مشہور اور زیادہ طاقتور گروہوں کا مختصر ذکر کریں جن کے خاندان میں (مسلمانوں کے آنے کے وقت) بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں۔



گورجرا اور راٹھور

راجپوتوں کے مختلف گروہوں میں سب سے کثیر التعداد اور طاقتور گروہ گورجروں کا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت بعد کے زمانے میں (یعنی سکا اور ہون قوم کے یورشوں کے وقت)

---

[۱] تھامسن ۸۹۔ "اسمتھ کی تاریخ ہند قدیم"۔

ہندوستان آئے اور پنجاب اور کاٹھیاواڑ کے جنوبی علاقوں میں پھیل گئے پنجاب میں ان کی حکومت وریاست کی ایک یادگار ابتک باقی ہے یعنی گجرات کا ضلع، جس کا نام "گورجراترا" تھا۔

جنوب مغرب کے علاقوں میں بھین مال اور بھڑوچ گورجروں کے صدر مقام تھے اور دسویں صدی کے شروع میں انھی کا ایک خاندان انھلواڑے میں (جسے اب پاٹن کہتے ہیں) حکمراں تھا، اور غالباً ۹۶۱ء میں اسی خاندان کے راجہ سے مول راج نے حکومت چھین کر چالوکیہ خاندان کی بنیاد ڈالی، مگر خود یہ چالوکیہ بھی گورجروں ہی کی ایک شاخ سمجھے جاتے ہیں۔ انھلواڑہ اس زمانے میں تجارت کا مرکز اور بہت بارونق مقام تھا اور سلطان علاء الدین نے تیرھویں صدی کے اخیر میں اسے فتح کیا۔

لیکن گورجروں کی حکومت کو سب سے زیادہ فروغ مالوے کے علاقے میں حاصل ہوا اور بعض علمائے تاریخ کا قول ہے کہ ۸۳۰ء میں مالوے کا بٹس راجہ اسی قوم کا آدمی تھا۔ اس کا پائے تخت اجین تھا اور راجہ بھوج جس کی دولت وشوکت کے قصے ابتک مشہور ہیں اسی بٹس راجہ کا پوتا تھا مگر بھوج نے شمالی علاقوں میں فتوحات حاصل کیں تو اجین کو چھوڑ کر اپنا صدر مقام بھی شہر قنوج کو بنا لیا اور نویں صدی میں دور دور تک اس کی سلطنت پھیلی۔

اس کے بعد جب مالوے میں **پرمار**، اجمیر میں **چوہان** اور بندیل کھنڈ میں چندیل خاندان کا زور ہوا تو قنوج کی حکومت کمزور ہو گئی اور وہاں کے موروثی راجہ سے **گھرواڑ** یا **راٹھور** خاندان کے ایک ٹھاکر نے حکومت چھین لی اور اسی کی اولاد بارھویں صدی کے آخر تک قنوج کی حکمراں رہی، جے چند جسے سلطان محمد غوری نے ۱۱۹۴ء میں شکست دی، اسی راٹھور خاندان کا آخری راجہ تھا۔ وہ خود لڑائی میں مارا گیا اور قنوج کی ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی مگر بیان کرتے ہیں کہ اسی خاندان کے بعض افراد راجپوتانے کے ریگستانی علاقوں میں اٹھ آئے اور انھوں نے یہاں جودھپور کی ریاست قائم کی۔

تُمیر اور چوہان اور چندیل۔

جس زمانے میں قنوج کے گورجر حاکموں کا تخت الٹا تو اسی طرف کا ایک سردار اننگ پال دہلی کی طرف آیا اور ۷۹۰ء میں اس نے یہاں لال کوٹ کا قلعہ بنایا جس کے کھنڈر اب پرانی دہلی میں

موجود ہیں۔ عجب نہیں کہ اننگ پال راجہ بھوج ہی کے خاندان کا آدمی ہو اور اپنی قنوج کی سلطنت چھن جانے کے بعد دلی میں آگیا ہو لیکن خود اس کی اولاد تمیر خاندان کہلاتی ہے اور ایک صدی تک یہاں حکومت کرتی رہی۔ اس خاندان کے آخری راجہ کا نام بھی اننگ پال تھا اور اس کی صرف ایک بیٹی تھی جسے اس نے اجمیر کے چوہان راجہ سے بیاہ دیا تھا۔ دلی کا نامی راجہ پرتھی راج اسی کے پیٹ سے چوہان خاندان کا راجپوت تھا اور جب (اننگ پال) مرا تو دلی کی حکومت بھی پرتھی راج کے ورثے میں آئی کیونکہ اننگ پال کے کوئی زرینہ اولاد نہ تھی۔

اجمیر کی گدی باپ کی طرف سے پرتھی راج کو ورثے میں ملی اور دو علاقوں کے ملنے سے اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ ذاتی صفات کے اعتبار سے بھی وہ بہت منچلا راجپوت تھا اور ہندی کی مشہور نظم "پرتھی راج راسو" اسی کے کارناموں کی داستان ہے جب قنوج کے راجہ جے چندر (یا جے چند) نے اسی خوشی سے اپنی بیٹی نہ دی تو وہ اچانک قنوج پہنچا اور سر دربار اپنی محبوبہ کو گھوڑے پر بٹھا کر لے اڑا، مگر بعض اور فتوحات کے مقابلے میں یہ قصہ مورخ کے نزدیک پرتھی راج کی جنگی قوت کا نمایاں ثبوت نہیں ہے۔ البتہ مہوبا کے راجہ پر فوج کشی اور فتح اس کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔

یہ ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ بندیل کھنڈ میں چندل خاندان کے راجپوتوں کا راج تھا۔ مہوبا، کالنجر اور کھجراہو اس علاقے کے مشہور شہر تھے یہیں کے راجہ سے پرتھی راج لڑا اور ۱۱۸۲ء میں شکست دیکر اس کے صدر مقام پر قابض ہو گیا تھا لیکن چندلوں کی اصلی قوت اور حکومت کا خاتمہ ۱۲۰۳ء میں ہوا جب کہ سلطان قطب الدین ایبک نے کالنجر و مہوبا کو بزور شمشیر فتح کر لیا اور بندیل کھنڈ کے راجہ معمولی درجے کے باجگزار رئیس رہ گئے۔

کلچری اور پرمار

پرتھی راج کی مسلمانوں سے لڑائیوں اور ہزیمت کا حال ہم کتاب کے اگلے حصے میں پڑھیں گے یہاں چندلوں کے سلسلے میں کلچری خاندان کا مجمل ذکر مناسب ہے کہ اس زمانے میں جبل پور کے قریب چیدی کی قدیم ریاست اسی خاندان کے راجاؤں کے ماتحت تھی۔

چیدی کے مغرب میں دریائے نربدا کے اوپر پرمار یا پنوار خاندان کی ریاست تھی اور اس کا صدر مقام دھار تھا علمی شوق کے طفیل اس خاندان کے دو راجہ تاریخ میں

مشہور ہیں پہلے کا نام منج (یا منجا) تھا اور اس کی حکومت ۹۷۴ء تک رہی چالوکیہ خاندان کا راج تیلا اس کا حریف تھا۔ اس کی سلطنت وسیع اور قوت زیادہ تھی اور آخر ساتویں مرتبہ منج نے اس کے ہاتھ سے شکست کھائی اور لڑائی میں مارا گیا۔ منج کا بھتیجا بھوج تھا جو ۱۰۱۰ء میں گدی پر بیٹھا اور چالیس سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ وہ علم ادب کا شایق اور سرپرست تھا چالوکیہ خاندان کے ساتھ جو قدیم دشمنی چلی آتی تھی اس میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ بھوج کی جنگجوئی نے اس کے کئی نئے دشمن کھڑے کر دیئے۔ چیدی اور گجرات کے راجاؤں نے مل کر اس پر فوج کشی کی اور وہ ۱۰۵۳ء کے قریب شکست کھا کے مارا گیا۔ فرق غالب نے دھار پر قبضہ کر لیا تھا لیکن پرماڑوں کا خاندان بارھویں صدی عیسوی تک یہاں برسر حکومت پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پرماڑوں کی جگہ بعض دوسرے راجپوت خاندان کے راجاؤں نے لے لی تھی جن سے مسلمانوں نے ریاست چھینی اور آخر میں اکبر نے یہ سب علاقے فتح کر کے کل مالوے کو مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا۔

مالوے کے بعد شمالی ہندوستان کی سرحد ختم ہوتی ہے اور ہم دکن کے علاقے میں آجاتے ہیں لیکن ابھی شمالی ہندوستان کا ایک وسیع و سرسبز حصہ باقی رہ گیا ہے اور حال کی تحقیقات سے وہاں کے راجاؤں کے بہت کچھ حالات تاریخ کی روشنی میں آئے ہیں مناسب ہوگا کہ یہاں ان کا بھی مختصر ذکر کر دیا جائے۔

پال اور سین خاندان کے راجہ

مشرقی مگدھ میں گپت خاندان کی ایک شاخ حکومت کرتی تھی، لیکن ان سے ایک اور خاندان نے راج چھین لیا جو پال کے نام سے موسوم ہے، پھر کچھ عرصے بعد اس کا رقیب سین خاندان پیدا ہو گیا اور مسلمانوں کے آنے تک تمام بنگالہ اور مشرقی بہار کا علاقہ انھی دو خاندانوں میں بٹا ہوا تھا۔ پالوں کا صدر مقام شہر بہار تھا اور بنگالے کا شہر ندیا سین خاندان کی راجدھانی تھا۔ پالوں کی نسبت یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ بدھ مت کے پیرو تھے اور سب سے آخری زمانے میں اس مذہب کی سرپرستی ہندوستان میں انھی نے کی لیکن وہ اسی صدی کے بعد یہ اور ان کے سین ہمسائے اسلامی فوجوں سے مغلوب ہو گئے ان پر محمد بن بختیار خلجی نے ۱۱۹۷ء میں حملہ کیا تھا اور وہی پہلا اسلامی سپہ دار ہے جس نے

مشرقی ہندوستان میں اپنی شجاعت و کاردانی کے جوہر دکھائے۔ اس کی فتوحات کا بیان تاریخ ہند کی ایک ولولہ انگیز داستان ہے اور جس وقت اس نے شہر بہار پر دھاوا کر کے قلعہ سر کیا تو صرف دو سو جاں باز سپاہی اس کے ہمرکاب تھے۔

ندیا میں بوڑھے راجہ لکھمن کی حکومت تھی اور انصاف و پرہیزگاری کی بدولت رعایا میں اس کا بہت احترام تھا۔ ملک بہار میں محمد بن بختیار خلجی کی یلغار اور فتوحات کی خبریں لکھمن کے دربار تک پہنچ گئی تھیں اور اس کے امیر وزیر، نجومی اور جوتشی سب کی صلاح یہ تھی کہ اس بے پناہ سیلاب سے بچ کر کہیں نکل چلئے۔ چنانچہ خود اس کے اکثر درباری اڑیسہ اور آسام کے علاقوں میں چلے گئے تھے جہاں اس وقت کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن راجہ نے ان باتوں کو نہ مانا اور اپنے مقام سے ٹلنا پسند نہ کیا۔ شاید اسے اپنی فوجی قوت اور کثرت سپاہ پر بھروسہ تھا کہ وہ اسلامی فوجوں کو بنگالے میں قدم نہ رکھنے دیں گی، لیکن اس کے ساز و سامان کی کچھ پیش نہ گئی۔ محمد بن بختیار دوسرے ہی سال صرف اٹھارہ سواروں کے ساتھ یکایک ندیا آیا اور خاص محل کے دروازے پر پہنچ کر اس کی اصلیت ظاہر ہوئی۔ مٹھی بھر مسلمان پاسبانوں کو مارتے کاٹتے محل میں گھس گئے۔ راجہ کے ایسے حواس گئے کہ کھانا کھاتے کھاتے بھاگا اور اپنی جان بچانی غنیمت سمجھ کر شہر سے نکل گیا۔ اس طرح وہی چند تن جو جان پر کھیل کر ہزاروں دشمنوں میں گھس گئے تھے سنہ ۱۱۹۹ء میں ملک بنگالہ کے مالک ہو گئے۔

باب دہم

دکن کے راجہ

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے کچھ پہلے شمال میں جو حکمران راجپوت خاندان اور ہندو ریاستیں تھیں ان کا بیان پچھلے باب میں تمہاری نظر سے گزرا۔ مناسب یہ ہے کہ اب دکن کے علاقوں پر توجہ کی جائے کہ پانچویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے دکن میں پہنچنے تک وہاں کیا ہوتا رہا۔

چالوکیہ خاندان کا پہلا دور (سنہ ۵۵۰ء تا سنہ ۷۵۰ء)

محل وقوع کے اعتبار سے چالوکیہ حکومت کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے اور طاقت و شہرت میں بھی یہاں کے راجہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ عام روایتوں میں اس خاندان کو چندر بنسی راجپوتوں کی شاخ بتایا گیا ہے، لیکن یہ بات صحیح ہو یا غلط، اتنا ذہن میں رکھنا چاہئے کہ خود یہاں کی رعایا آریا نسل سے نہ تھی اور آبادی میں دراوڑی عنصر اس قدر غالب تھا کہ گو دکن کے شمالی اور بعض وسطی علاقوں میں مرہٹی زبان پھیلی لیکن اس کے سوا اور کسی آریا بولی کو یہاں دخل نہ مل سکا، اور اب تک دکن کے بڑے حصے میں وہاں کی اصلی اور قدیم زبانیں رائج ہیں۔ سبب یہ تھا کہ آبادی میں دراوڑی نسل کے باشندوں کی کثرت تھی اور ان کا تمدن اور علوم و فنون بھی اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ آریوں کو اپنی چیزیں یہاں داخل کرنے کی گنجائش نہ مل سکی۔ ان کے آنے کے وقت ہی

تلنگی، تامل، کنڑی اور ملایالم بولیوں میں ادبی زبان کی شان پیدا ہوگئی تھی اور جو زمانہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں سب سے پہلی دراوڑی کتابیں بھی تصنیف و تالیف ہونے لگی تھیں۔

چالوکیہ خاندان کے راجاؤں میں سب سے مشہور راجہ پل کیسن ثانی ہے اس کے ہم نام دادا نے اپنے عہد میں اشومدھ کی شاہانہ رسم منائی تھی لیکن پوتے نے اس سے بھی زیادہ نام پایا اور سنہ ۶۵۵ء تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔

ہوئین چوئنگ چینی کی سیاحت کا یہی زمانہ ہے اور وہ پل کیسن کے دربار میں کچھ عرصے تک مقیم رہا۔ راجہ کے اوصاف و اخلاق کی اس نے تعریف کی ہے حالانکہ پل کیسن بودھ مت کا پیرو نہ تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں کا بہت معتقد اور پرجوش حامی تھا۔

ہوئین چوئنگ لکھتا ہے کہ اس ملک کی رعایا کے سادگی پسند اور ایک حد تک راست باز ہونے میں کلام نہیں مگر یہ لوگ نہایت مغرور ہوتے ہیں اور ان کی دلیری اور جنگ جوئی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کسی سپہ سالار کا شکست کھا کے واپس آنا نہایت ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی حتیٰ کہ وہ خودکشی کر لیتا یا اسے عورتوں کے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ فوج میں ایک خاص جمعیت ایسے سرفروشوں کی تھی جو لڑائی کے وقت سب سے آگے رہتے اور جب شراب پی پی کر طبل جنگ کی آواز پر مقابلے میں نکلتے تو نشے میں ان کا ایک ایک شخص ہزاروں کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ ان سورماؤں کو جہاں اور امتیاز حاصل تھے انھیں میں ہمارے چینی سیاح نے ایک یہ بھی بات لکھی ہے کہ اگر وہ راستے میں کسی شخص کو قتل کر دیں تو عدالت انھیں کوئی سزا نہیں دیتی تھی . . . . غرض اس قسم کی جرار فوج اور جنگی ہاتھیوں کی تعداد کثیر تھی جن پر پل کیسن کو ناز تھا۔ ہمسایہ قوموں کی اس کی نظر میں کچھ وقعت نہ تھی اور قنوج کے ہرش راجہ نے جب دکن پر یورش کی تو پل کیسن ثانی ہی کی فوجیں تھیں جنھوں نے حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا اور آخر قنوج کا یہ زبردست راجہ بھی یہاں سے ناکام پسپا ہوا۔

چالوکیہ سلطنت کا پایۂ تخت موجودہ بیجاپور کے ضلع میں بادامی (یا واتاپی) نامی شہر تھا اور یہیں شہنشاہ ایران کے سفیر پل کیسن کے حضور میں باریاب ہوئے تھے بلکہ بعض اہل تحقیق کے نزدیک اجنتا کے غاروں کی چند تصویروں میں انھی سفیروں کا پل کیسن کے دربار میں آنا دکھایا گیا ہے

راشٹر کوٹ خاندان

(سنہ ۷۵۰ء تا سنہ ۹۷۳ء)

پل کیسن کے آخری زمانے میں سلطنت کے دو حصے ہو گئے تھے اور ان کے

حاکم آپس میں لڑتے رہتے تھے لیکن جب آٹھویں صدی کے وسط میں ایک نئے خاندان نے فروغ پایا تو معاملات کی صورت بدل گئی۔ یہ لوگ راشٹر کوٹ کہلاتے ہیں اور غالباً مرہٹواڑی میں چالوکیہ سلطنت کے باجگزار رئیس تھے۔ عہد عروج میں ان کا پایۂ تخت مالکھیڑا تھا اور اسی خاندان کے راجہ تھے جن سے الورا کے بعض شہرۂ آفاق مندروں کی تعمیر منسوب کی جاتی ہے جو پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔

چالوکیہ خاندان کا دوسرا دور (۹۷۳ء تا ۱۲۰۰ء)

باہمی نفاق اور راشٹر کوٹوں کے غلبے نے چالوکیہ خاندان کو نظروں سے گرا دیا تھا۔ اور دو سو برس تک تاریخ دکن میں ان کا نام کسی امتیاز کا مستحق نہیں رہا لیکن دسویں صدی کے آخر میں اس خاندان کی ایک قدیم شاخ نے پھر فروغ پایا اور اپنے رقیبوں سے ریاست چھین لی۔ یہ تیل (یا تیلا) راجہ تھا جس نے راشٹر کوٹوں کو دفع کیا اور ۹۷۳ء سے ۹۹۷ء تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ پرمار خاندان کے راجہ منج کے ساتھ اس کی صف آرائیوں کا ذکر اوپر آچکا ہے آخر میں اس چالوکیہ راجہ کو اپنے شمالی حریف پر فتح حاصل ہوئی اور منج مارا گیا لیکن چالوکیہ سلطنت کو اس زمانے میں اصلی خطرہ چولا خاندان کے راجاؤں سے تھا اور انھی کے پیہم حملوں سے تنگ ہو کر یہ خاندان کلیانی میں ہٹ آیا تھا جہاں آخر میں مغربی سلطنت چالوکیہ قائم ہوئی۔

شہر کلیانی اور مغربی چالوکیوں کا بانی راجہ سومیشور کو کہتے ہیں جس نے ۱۰۴۲ء سے ۱۰۶۹ء تک حکومت کی لیکن اس کلیانی کے خاندان کو عروج بکرمادت کے عہد میں (۱۰۷۶ء تا ۱۱۲۷ء) حاصل ہوا۔ متاکشرا نامی قانون کی مستند کتاب اسی راجہ کی سرپرستی میں لکھی گئی تھی۔

انقلاب حکومت اور ”ویرشیوا“

بکرماوت کی وفات کے چند سال بعد بجیلا یا وجالا نامی سپہ سالار نے سرکشی کی (۱۱۵۷ء) اور خود راجہ بن بیٹھا۔ اس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ دکن میں ویرشیوا (یا لنگ پوجا) کے فرقے کو اسی زمانے میں فروغ ہوا۔ وجالا کا ایک برہمن وزیر بسو (بسپا یا بساوا) اس مذہب کا سرگروہ سمجھا جاتا ہے لیکن خود اس فرقے کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ مذہب بہت قدیم ہے بسو نے محض اس کی اشاعت و تجدید کی تھی۔ بہرحال

اس فرقے کے لوگ شیو اور اس کے سانڈ نندی کی پوجا کرتے ہیں، انھیں ویدوں کے اہم اصول و عقاید سے انکار ہے اور ابتدا سے ان میں اور برہمنوں میں شدید مخالفت رہی ہے۔[1]

لیکن وجالا اپنے وزیر کی اس سرگرمی کا غالباً اس قدر مخالف نہ تھا جس قدر کہ اس کی فضول خرچی دیکھ کر ناخوش ہوا، کیونکہ لوگ الزام دیتے تھے کہ اپنے نئے فرقے کو پھیلانے کی دھن میں بسوسر کاری روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ چنانچہ محاسبہ کیا گیا تو اس نے علانیہ سرکشی کی اور انھی خانہ جنگیوں کے ہنگامے میں راجہ اور اس کا وزیر دونوں ہلاک ہو گئے۔

بارھویں صدی کے اخیر میں چالوکیہ خاندان نے کچھ روز کے لئے سنبھالا لیا تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں ان کا ملک جادو ونسی اور ہوے سل خاندان کے راجاؤں نے چھین کر ہمیشہ کے لئے اس خاندان کی خودمختاری کا خاتمہ کر دیا۔

ہوے سل خاندان
از ۱۰۵۰ء تا ۱۳۱۱ء

گردش روزگار کی مثالیں دیکھنی ہوں تو ہندوستان میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں دنیا کی بیوفائی اور انسانی خوشیوں کی ناپایداری کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ میسور کے علاقے میں ہلبیڈ نامی کھیڑا اسی قسم کے عبرت ناک انقلاب کی مثال ہے۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں دکن کا مشہور بارونق شہر دوار سمدر اسی مقام پر آباد تھا۔ ہوے سل خاندان کے راجہ مہاراجہ یہیں کے عالیشان ایوان و محلات میں بیٹھ کر عیش و حکومت کا لطف اٹھاتے تھے مگر آج اس شہر کی پرشکوہ عمارات میں دو مندروں کے سوا کچھ باقی نہیں ہے اور ہر طرف فلاکت و شکستہ حالی کے آثار ہیں۔

دوار سمدر کے راجہ پہلے راشٹر کوٹوں کے باجگزار تھے لیکن بارھویں صدی کے آخر میں انھوں نے خودمختاری حاصل کر لی اور چودھویں صدی کے شروع ہونے تک یہی ہوے سل خاندان حکومت کرتا رہا۔ آخر ۱۳۱۱ء میں ملک کافور نے اس ریاست پر حملہ کیا اور یہ علاقہ مسلمانوں کی عملداری میں شامل ہو گیا۔

جادو ونسی خاندان
۱۱۸۷ء تا ۱۳۰۹ء

لیکن ملکی قوت میں جادو ونسی خاندان کے راجہ ہوے سلوں سے بھی بڑھ کر تھے ہوے سلوں کی طرح یہ پہلے راشٹر کوٹ اور چالوکیہ

[1] محاسن، ۹۷۔

حکومت کے باجگزار رہے اور جب ان کی قوت میں ضعف آیا تو خود مختار بن گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ شمالی ہندوستان کے راجپوت ہیں اور متھرا اور دوار کا سے دکن آئے مگر اول اول فقط سیون دیس یعنے ناسک سے دیوگری کے علاقے تک جادو بنسی خاندان کا راج تھا البتہ جب راجہ سنگھن دیوگری کی گدی پر بیٹھا تو اس کے عہد میں (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) جادو بنسی خاندان کی سلطنت نے نہایت وسعت پائی اور اگر جنوب میں ہوئے سلوں کی یہ مجال نہ تھی کہ دیوگری کی فوجوں سے مقابلہ کریں تو شمال میں گجرات کے راجہ جادو بنسیوں کے حملے سے خوف کھاتے تھے اور ان کی فوج کشی سے بچنے کی خاطر خراج ادا کر دیتے تھے۔

اس خاندان کے آخری راجاؤں کے عہد میں ہمادری یا ہماد پنت نامی سنسکرت کا مشہور ادیب گزرا ہے جو راجہ مہادیو اور اس کے بیٹے رام چندر کے زمانے میں (۱۲۷۱ء تا ۱۳۰۹ء) میر منشی کے عہدے پر ممتاز تھا۔ وہ سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ اور "موڑی" یا خط شکستہ کی ایجاد بھی لوگوں نے اسی سے منسوب کر دی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں اور بہت ممکن ہے کہ بعض وہ کتابیں بھی جن کی تصنیف کا اسے فخر حاصل ہے در اصل اس کی لکھی ہوئی نہ ہوں۔ بہر حال ان کتابوں میں سب سے بڑی "چتر ورگ چنتامنی" ہے جس میں موجودہ ہندومت کی مذہبی رسوم و عقائد کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ضمیمے میں تمام دیوی دیوتاؤں کے نام، پوجا پاٹ کے طریقے اور تاریخیں وغیرہ لکھی ہیں۔

دیوگری پر مسلمانوں کی سب سے پہلی فوج کشی ۱۲۹۴ء میں ہوئی اور اس کے بعد جب یہاں سے خراج نہیں بھیجا گیا تو ملک کافور نے ۱۳۰۷ء میں دوبارہ حملہ کیا اور راجہ رام چندر کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ اس کے داماد ہرپال نے ۱۳۱۸ء میں پھر سرکشی پر کمر باندھی لیکن گرفتار ہو کے مارا گیا اور اسی کے ساتھ اس علاقے کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا۔

پالوا یا پلوی
۲۰۰ء تا ۱۱۰۰ء

دکن کی قدیم تاریخ میں پالوا (پلو) یا پلوی قوم کا جا بجا نام آتا ہے اور بعض مصنفین کے نزدیک یہ تحقیقی نسل کے وہ پہلوی یا پارتھین قبائل ہیں جو ایران سے ہندوستان آئے اور نامعلوم اسباب کے سیلاب میں بہتے ہوئے دکن کے مشرقی ساحل تک پہنچ گئے جہاں تیسری صدی کے شروع سے ہم ان کے بعض خاندانوں کو کنجی ورم یا (کانچی) ونگی اور پال گھٹ میں حکمراں پاتے ہیں۔ لیکن ان کے عروج کا زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی ہے

اور غالباً اسی زمانے میں ان کے بادشاہوں نے مدراس کے قریب وہ "ہفت منادر" تعمیر کئے تھے جن سے آج تک بنانے والوں کی عظمت وشان کا اندازہ ہوتا ہے۔

پلویوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز شہر کنجی ورم تھا اور ہندوستان کا سب سے جنوبی مقام جہاں تک ہوین چوئینگ نے سیاحت کی یہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ سلطنت ایک ہزار میل کے دور میں پھیلی ہوئی ہے۔ جینی اور بودھ مت والوں کی یہاں کثرت ہے اور بدھ مت کے خاص بھکشو دس ہزار ہیں۔ ہوین چوئینگ کی تحریر کے علاوہ اور شہادتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں بودھ مت خوب رونق پر تھا اور کم سے کم ایک پلوی راجہ بھی اس مت کا پیرو گزرا ہے۔

پلویوں کا اپنے چالوکیہ ہمسایوں سے دست وگریباں رہنا گویا قدرتی بات تھی۔ ان کی باہمی جنگ وجدال کا اشارۃً پہلے ذکر آچکا ہے اور آخر کار انھی لڑائیوں نے پلویوں کی قوت توڑی۔ آٹھویں صدی کے تقریباً وسط میں ان کا شاہی خاندان خانہ جنگی میں مصروف تھا۔ اس سے راجہ بکرمادت (ثانی) نے فائدہ اٹھایا اور انھیں شکست دے کر پائے تخت پر قابض ہو گیا یہ ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ پھر اس قوم کی سلطنت کو کبھی ابھرنا نصیب نہ ہوا۔ البتہ گیارھویں صدی عیسوی تک ان کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں علاقہ تامل میں قائم تھیں اور یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ پڈاکوٹ کا راجہ آج کے دن تک اپنے تئیں "راجہ پالوا" کہتا ہے۔

چولا اور پانڈیا

انتہائے جنوب میں دراوڑی قوم کی دو نہایت قدیم سلطنتیں تھیں جن کا عہد اشوک سے بھی پہلے سنسکرت کتابوں میں ذکر آتا ہے۔ اس بات کے نہایت قوی قرائن موجود ہیں کہ ولادت مسیح علیہ السلام سے کہیں پہلے یہ چولا اور پانڈیا سلطنتیں متمدن اور بارونق تھیں لیکن نویں صدی عیسوی سے پہلے کے معتبر تاریخی واقعات نہیں ملتے۔

تاریخی زمانے میں چولا سلطنت کا سب سے قدیم پائے تخت اُرے یور تھا جسے اب پرانی ترچنا پلی کہتے ہیں ہنیار سے دلار وندی تک اور مغرب میں کورگ تک یہ سلطنت پھیلی ہوئی تھی اور اس خاندان کا سب سے طاقتور فرماں روا راج راج (از ۹۸۵ء تا ۱۰۱۲ء) گزرا ہے جس نے بندھیاچل تک قریب قریب تمام ملک دکن کو فتح کر لیا تھا۔ پھر اس نے بیڑا تیار کر کے لنکا پر حملہ کیا اور یہ جزیرہ بھی تسخیر ہو کر اس کی عملداری میں داخل

ہو گیا۔ راج راج کا پائے تخت تنجور میں تھا اور وہاں کا بڑا مندر اسی کے حکم سے تعمیر ہوا۔
جزیرہ نمائے ہند کے انتہائے جنوب میں ریاست پانڈیا قائم تھی اور مسیح علیہ السلام کی ولادت سے بھی پہلے یہاں کا قدیم پائے تخت کرکے موتی کی تجارت کا مرکز تھا لیکن بعد میں مدورا پائے تخت اور کایل یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا۔
غالباً چولا اور پانڈیا علاقوں کی آبادی کو مذہب سے بیگانہ اور تجارت پیشہ سمجھ کر ہوئین چوئنگ نے ادھر کا سفر نہیں کیا اور اس کا خیال تھا کہ یہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ بہر حال یہاں کے حالات کے متعلق ہم اس چینی عالم کی عینی شہادت سے محروم ہیں۔ مذہب کے اعتبار سے چولا راجہ "ویر شیوا" فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی کی حمایت نے ان کے ہاتھ سے جینیوں پر بارہا ظلم کرائے۔ دسویں صدی میں پانڈیا راجہ سندر کی شادی چولا خاندان میں ہوئی اور اس نے بھی جین مت چھوڑ کر "ویر شیوا" مت اختیار کر لیا۔ پھر نئے مذہب کے جوش میں اپنے سابق ہم مذہبوں پر سخت تعدی شروع کی اور اس کے مظالم کے حالات اب تک جینی مندروں کے بعض کتبات میں محفوظ ہیں۔
لیکن چولا خاندان میں راجہ سندر کی شادی ہو جانے سے یہ قیاس کرنا درست نہیں کہ ان ہمسایہ حکومتوں کے باہمی تعلقات عزیزانہ یا دوستانہ تھے۔ مثل ہے کہ دو تلواریں ایک میان میں اور دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں سما سکتے۔ ہندوستان کا یہ بعید گوشہ بیرونی حملوں سے محفوظ تھا مگر اتنا وسیع نہ تھا کہ اس میں دو راجہ راج کریں اور آپس میں لڑائی نہ ہو۔ پانڈیا اور چولا خاندان کے راجاؤں میں بھی ہمیشہ تیغ آزمائی ہوتی رہتی تھی اور اس میں غلبہ اکثر شمالی حریف کو رہتا تھا۔

اس دور کی خصوصیات[1]

سنہ ۶۵۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک کے جو مختصر واقعات ہم نے گزشتہ دو باب میں بیان کئے انہیں پڑھ کر اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ ہندوستان میں ہر طرف بد امنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ہر حصۂ ملک میں آئے دن نئی سلطنتیں بنتیں اور نئے راجہ علم بادشاہی بلند کرتے اور اپنے ہمسایوں سے جنگ و جدال میں

[1] یہ تمام تبصرہ (صفحہ ۸۷ تک) ہتا حسن صاحب کی تاریخ ہند برائے مدارس فوقانیہ (طبع سنہ ۱۹۳۰ء) باب نہم سے ماخوذ ہے۔

مصروف ہو جاتے تھے۔ مگر ان تمام خوں ریزیوں کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ کوئی بھی ایسا بیدار مغز و با اقبال سردار نہ پیدا ہوا کہ ملک کے کسی بڑے حصے میں امن و تسلط قائم کر لیتا اور موریا یا گپت خاندان کی طرح کسی نامور خاندان شاہی کا بانی ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کا رُخ کیا تو انہیں شمال میں نہایت قوی دشمنوں سے مقابلے پیش آئے۔ مگر اول تو اغیار کے حملوں نے عارضی طور پر اہل ہند کو متحد ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے محض اتفاقی بات تھی کہ بارھویں صدی کے آخر میں دلی کا راجہ اجمیر کا بھی وارث ہوا اور ان دو گدیوں کے مل جانے سے ایک طاقتور سلطنت بن گئی۔ ورنہ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو راجاؤں میں کسی وسیع سلطنت کے قیام و انتظام کی قابلیت باقی نہ رہی تھی۔

بدھ مت اور جین مت

اس خوں ریزی اور ہل چل کے ساتھ مذہب میں بھی بہت کچھ انقلاب ہوئے اور اس دور کے شروع میں بدھ مت کی قوت و اثر میں بظاہر زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ اس کی بارونق خانقاہوں میں مذہب کی تعلیم و اشاعت جاری تھی اور مسلمانوں کے آنے تک شمال مغربی علاقوں میں اس مذہب کے بھکشو موجود تھے۔ محمد بختیار خلجی نے بنگالہ فتح کیا ہے تو وہاں کا ایک راجہ بھی اس مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن درحقیقت ہندوستان میں بودھ مت کی یہ آخری یادگاریں تھیں اور بارھویں صدی کے اخیر میں اس کے پیرو خال خال کہیں رہ گئے ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ باقاعدہ اور مستقل مذہب کی حیثیت باقی نہ تھی اور پران[1] اہنسا کا عقیدہ اپنی یادگار چھوڑ کر خود یہ مذہب ہندوستان سے غائب ہو گیا تھا۔ لیکن اس دور کے شروع میں جب بودھ مت کو زوال ہو رہا تھا، اس وقت جینیوں کی قوت بڑھ رہی تھی، بلکہ عجب نہیں کہ بدھ مت کے اتنے جلد ہندوستان سے مفقود ہو جانے کا ایک سبب یہ ہو کہ تجارت پیشہ اور متوسط الحال طبقوں میں جین مت کا اثر پھیل گیا تھا حالانکہ یہی وہ گروہ تھے جن میں بدھ مت کی اشاعت سب سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ راجپوتانے اور دکن میں اب جینیوں کا غلبہ تھا اور

[1] پران اہنسا سے مراد یہ ہے کہ انسان اس بات کو اپنے فرائض میں داخل سمجھے کہ کسی جاندار کو آزار نہ پہنچائے گا۔

انتہائے جنوب یعنی پانڈیا راج کے علاقوں میں بھی وہی چھائے ہوئے تھے اس کے بعد دکن میں "ویرشیوا" مذہب کو رواج ہوا تو جینیوں کی قوت کم ہوگئی اور ان پر بعض راجاؤں نے سخت ظلم کئے لیکن اس مذہب کے زوال کا بھی اصلی سبب اِس نئے ہندو مت کو سمجھنا چاہئے جسے برہمنوں نے اس دور میں ہر طرف پھیلا دیا تھا۔

پرانوں کا ہندو مت

اس نئی مذہبی تحریک نے ہر فرقے اور ہر مقام کے دیوی دیوتاؤں کو ایک ہی لڑی میں پُرو دیا تھا۔ گاؤں گاؤں کا بت برہمنوں کی "دیو بانی" کا رکن بن گیا تھا اور اس کے عوض میں ہر جگہ لوگوں نے برہمنوں کی رسمیں اور پوجا پاٹ کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ یہ سب دیوی دیوا وشنو کے اوتار مانے جاتے تھے۔ وشنو برہمنوں کی قدیم تثلیث کا تیسرا رکن ہے۔ ویدوں میں "خالق" کا مرتبہ برہما کو دیا گیا ہے۔ مگر ہندو عوام اس کی ہستی کا تصور نہ کر سکتے تھے اور اس لئے عام طور پر وشنو اور شو کی پوجا ہوتی تھی، پہلے کو پالنے والا اور دوسرے کو ہلاک کرنے والا کہتے تھے، اور ان ہی کی ہزاروں صورتیں اور اوتار بن گئے تھے۔ ندی نالوں، درخت پہاڑوں کی پوجا کو اور مقامی میلے تہواروں کو برہمنوں نے جائز کر دیا تھا اور مختلف گروہوں کے رسم ورواج کی تفصیل اور دیوتاؤں کی تعریف میں بہت سی کتابیں تیار ہوگئی تھیں جنھیں پران کہتے ہیں۔ غرض اب ایک نہایت وسیع مذہب بن گیا تھا جس میں سب طرح کے عقائد شامل تھے۔ اسی کے ساتھ ہر گروہ کو ذات کی پابندی کے لحاظ سے ایک علیحدہ فرقہ قرار دے دیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی نسل کی بعض تعلیم یافتہ اور مذہبی خاندان "برہمن" مان لئے گئے تھے۔ یہ بڑی رعایت تھی اور اس فراخ حوصلگی کے بعد دراوڑی رئیسوں کے نسب کو کشتریوں سے ملا دینا کچھ دشوار نہ تھا۔ نیچ ذات کے مختلف پیشوں اور ناموں کی توجیہ میں بھی بہت سے افسانے تیار کر لئے گئے تھے۔ ان تمدنی اور دینی سرگرمیوں کا خاص مرکز وسطی اور جنوبی ہندوستان میں تھا، کیونکہ یہاں قریب قریب ایک ہی نسل کے لوگ آباد تھے اور آئے دن کے بیرونی حملے بھی لوگوں کے امن واطمینان میں مخل نہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے باشندے شمال کی جنگجو اقوام کی طرح چست وچالاک نہ تھے بلکہ ان میں کام کی بجائے گیان دھیان کا مادہ زیادہ تھا۔ غرض برہمنوں کی رہنمائی سے جنوب ہی میں سب سے زیادہ ان پیچیدہ رسوم وعقائد کی تکمیل ہوئی جو آج ہندو مت کی خصوصیات ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تمام نظام

چند سال میں یا بلا شدید مزاحمت کے لوگوں میں رائج نہ ہو گیا تھا۔ بلا شبہ جاہل عوام الناس کو اپنی تدبیروں سے برہمنوں نے ملا لیا تھا مگر شمال میں برہمنوں کا سب سے قوی حریف بدھ مت تھا تو جنوب میں جینیوں کی حکومت تھی اور ان کے یا دیگر آزاد خیال فرقوں کے ساتھ اکثر سخت گوئی بلکہ خونریزی کی نوبت آئی، اسی طرح شیو اور وشنو کے پرستاروں میں بعض اوقات سخت نزاعیں برپا ہوئیں۔

مذہبی سرگروہ

مذہبی بحث و مناظرے کا سب سے پہلا مرد میدان کمارل بھٹ کو کہتے ہیں۔ یہ بہار میں پیدا ہوئے۔ کہ مشہور ہے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی دلائل کے زور سے برہمنوں کے مخالفین کو عاجز و سرنگوں کر دیا۔ مگر ان کے چیلے شنکر اچارج علم و فضل میں اپنے گرو سے بھی بڑھ کر نکلے۔ یہ ملیبار میں ۷۸۸ء کے قریب پیدا ہوئے تھے اور صرف ۳۲ برس کی عمر میں ہمالیہ کے پہاڑوں پر چلے گئے اور کدار ناتھ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن ترک دنیا سے پہلے چند ہی سال کی مدت میں انھوں نے ویدوں کی شرح لکھی جواب تک شہرۂ آفاق ہے اور جس میں رہبانیت کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ربّانی ہستیوں میں شنکر اچارج کے نزدیک ترجیح شیو کو حاصل ہے۔

اس دور میں دو صدی بعد ہندوستان کے ایک اور نامی سرگروہ رامانج احاطۂ مدراس کے ضلع چنگل پٹ میں پیدا ہوئے بعض روایتوں میں ان کا سنہ ولادت ۱۰۱۷ء اور ایکسو بیس برس کی عمر بتائی گئی ہے اور اس کا بیشتر حصہ انھوں نے تعلیم و تلقین میں صرف کیا۔ انھوں نے ترک دنیا کے اصول میں اعتدال پیدا کیا اور شیو کی بجائے وشنو کے نام سے خدا کی عبادت پر بہت زیادہ زور دیا اس لئے ان کی پیرو "شری وشنو" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان عقائد کی بدولت رامانج کو اپنے وطن سے نکلنا پڑا کیونکہ وہاں چولا خاندان کا راجہ شیو مذہب کا پیرو تھا لیکن ہوسل خاندان کے راجہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور جب انھوں نے مناظرے میں جینیوں کو شکست دی تو یہ راجہ (بیر گنگا یا بتی دیو) ان کا چیلہ ہو گیا اور اپنا پہلا نام چھوڑ کر اس نے "وشنو وردھن" کا نام اختیار کر لیا۔

بارھویں صدی کے آغاز میں ایک اور مشہور ہندو فاضل مادھو اچارج جنوبی کنارا کے علاقے میں پیدا ہوئے انھوں نے رامانج سے بھی زیادہ وشنو کی پرستش پر زور دیا مگر ان کی

تعلیم میں "ثنویت" یعنی نیکی اور بدی کے دو خداؤں کا جلوہ نظر آتا ہے۔

دراوڑی زبانوں کی ترقی

ان ہندی بزرگوں کی تمام تصانیف اور تعلیم سنسکرت زبان میں تھی لیکن اس قسم کی علمی سرگرمی سے ملکی زبانوں کو فائدہ پہنچنا لازمی امر تھا۔ چنانچہ دراوڑی زبانوں کے علم ادب کو اس دور میں فروغ حاصل ہوا اور تامل زبان نے ان سب سے زیادہ ترقی کی۔ قدیم اور وسیع ہونے کے علاوہ اس کے علم ادب کو سب سے زیادہ امتیاز اس وجہ سے ہوا کہ اس نے سنسکرت الفاظ سے بہت ہی کم مدد لی تھی اور اسی سے تامل میں جو قوت پیدا ہوگئی ہے وہ اور کسی دراوڑی زبان کو نصیب نہیں۔

تامل کی سب سے پہلی تصانیف کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہ گزشتہ دور (یعنی ۶۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس قدر البتہ معلوم ہے کہ اس کے قدیم علم ادب میں بڑا حصہ جینیوں کا ہے۔

اختلاف عقائد کی وجہ سے لوگوں نے اپنے اپنے فرقے اور مذہب کی حمایت میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "ترووا شگم" نامی کتاب ہے جو شو کے پرجوش پرستار واسگر نے نظم میں لکھی تھی۔

تامل کے بعد کنڑی زبان کا علم ادب بھی خاصا وسیع ہے اور جینی "شیوا" برہمن وغیرہ ہر فرقے کی کتابیں اس میں پائی جاتی ہیں مگر تلنگی علم ادب اس قدر قدیم نہیں نہ اس میں اتنی کتابیں ہیں۔

ہندوؤں کے تمدن پر ایک اجمالی نظر

اب ہماری تاریخ ہیں "قدیم ہندوستان" اور عہد ہنود کے خاتمے تک لے آئی ہے یعنی ہندوؤں کا دور حکومت ختم ہوتا ہے اور ان کی بجائے دوسری قوم دوسرے مذہب کے لوگ ہندوستان کے مالک ہونے والے ہیں۔ زوال حکومت سے ہندوؤں کی کثرت تعداد پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا اور صدیاں گزرنے پر بھی وہ کروروں کی تعداد میں موجود رہیں گے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اکثر قوموں کے سیاسی زوال کے زمانے میں ان کے علم ادب کو

فروغ ہوتا ہے گویا قدرت مٹانے سے پہلے قوموں کی تہذیب و مذہب کی یادگاروں کو بچا لینا چاہتی ہے کہ آنے والی نسلیں گزر جانے والوں کے حالات سن کر عبرت اور سبق حاصل کر سکیں۔ ہندوستان میں بھی قدیم مذہب اور فلسفیانہ خیالات کی جن مضمونوں نے تکمیل کی وہ سب آخری دور کے لوگ تھے، چنانچہ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق جس قدر دقیق و بلند خیالات شنکراچارج نے قلمبند کئے ہیں ان تک کسی ہندو صاحب فکر کا ذہن نہ پہنچا تھا۔ دوسرے یہی وہ دور ہے جس میں ہندو قانون کی تدوین عمل میں آئی اور ذات کی پابندی قائم ہوئی، پس مناسب ہوگا کہ ہم اپنی تاریخ کا یہ حصہ ختم کرنے سے پہلے اس موقع پر ہندوؤں کے تمدن پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔

برہمنوں کا اصول تمدن

برہمنوں کے قدیم قوانین نیز اپنے زمانے کے ہندوؤں کی معاشرت دیکھنے سے یہ ثابت ہے کہ ان کا تمدن خاص خاص مذہبی عقائد پر مبنی تھا چنانچہ برہمنوں کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے جنم میں جس نے جیسے کرم کئے ہوں گے اس کے مطابق وہ کسی اعلیٰ یا ادنیٰ درجے کے خاندان میں پیدا ہوگا۔ کسی کا برہمن، کشتری، ویش یا شودر ہونا اسی کے پچھلے کرموں کا پھل ہے جو کسی طرح ملے بغیر نہیں رہتا اور ان چاروں طبقوں کے انھوں نے کام مخصوص کر دیئے تھے۔ مذہب کا پیشوا اور ہر معاملے میں مشورہ دینے والا گروہ برہمنوں کا تھا۔ ان کے مشورے سے سلطنت اور ملک رانی کرنا کشتریوں سے مخصوص تھا۔ جو شخص کسی ویش کے گھرانے میں پیدا ہوا ہو اس کا فرض یہ تھا کہ تجارت اور اسی قسم کے کاروبار میں اپنی زندگی بسر کرے اور شودر صرف مزدوری اور دوسروں کی خدمتگاری کے واسطے تھے۔

اس تمدن پر ایک نظر ڈالتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس میں برہمنوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں رکھی گئی تھیں۔ راجا اور پرجا سب کے فرائض میں یہ بات داخل تھی کہ وہ برہمنوں کی خدمت کریں اور زر و مال سے ان کا گھر بھریں، مگر برہمنوں پر ہی کچھ منحصر نہیں اس تمام نظام تمدن کی یہ نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے کہ اس میں تمام بنی نوع انسان کو مساوی نہیں رکھا تھا۔ کسی شودر کی مجال نہ تھی کہ اپنی حالت بہتر بنائے یا ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید بننے کا آرزومند ہو۔ اسی طرح ویشوں کے واسطے بھی ترقی کا میدان تنگ تھا اور جس ملک میں ایسی تفریق و تقسیم روا رکھی جائے اس کی تمام آبادی میں مساوات اور قومی اتحاد کا قائم رہنا محال ہے

مگر جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا مذہبی عقیدے نے اس تقسیم پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ اپنی اپنی جگہ ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی راضی برضائے تقدیر تھا۔ ہر موقع پر وہ اپنی ذلت ہوتے دیکھتا تھا اور خاموش رہتا تھا۔ روزانہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کے ساتھ ناانصافی یعنی عدم مساوات کا سلوک کیا جاتا تھا اور ایک ہی قصور پر عدالت اس کو زیادہ اور دوسرے طبقے کے افراد کو خفیف سزا دیتی تھی، بایں ہمہ وہ اس حالت کو اپنے پچھلے کرم کا پھل سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک برہمن اور شودر کی یہ تفریق منجانب اللہ تھی۔

ذات کی پابندی کا اصول۔

لیکن آبادی کے یہ طبقے بھی اپنی اپنی جگہ ایک متحد گروہ نہ تھے بلکہ ہر طبقے میں الگ الگ بہت سی ذاتیں بن گئی تھیں اور تمام باشندے انھی ذاتوں میں منقسم تھے۔ ہر شخص اپنی ذات یا (برادری) کے رسم و رواج اور آئین و ضوابط کا پابند تھا اور اس کی اصلی قوم یا ملک جو کچھ سمجھو وہی جماعت تھی۔ واضح رہے کہ ہر ملک میں جب انسان نے مل کر رہنا سہنا شروع کیا تو اس کے تمدن کی پہلی صورت خاندان یا قبیلہ یا برادری تھی اور ہر فرد اسی قبیلے یا برادری کو اپنی دنیا سمجھتا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد جب تمدن کی ضرورتیں بڑھیں تو مختلف قبائل کے میل جول سے لوگوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا اور کسی ملک کی تمام آبادی متحد نہ ہوئی یا سیاسی طور پر کسی ایک حکومت کے ماتحت شیرازہ بند نہ ہو سکی تو بھی ان کی رسم و رواج اور معاشرت کے اصول بہت کچھ یکساں ہو گئے اور ان میں باہم شادی بیاہ یا کھانے پینے کی ایسی کوئی قید باقی نہیں رہی کہ ایک برادری کا آدمی دوسری برادری میں شادی نہ کر سکے یا ان کے ساتھ کھانا پینا ممنوع سمجھے لیکن ہندوؤں کے قبائل یا برادریوں میں جس قسم کی "پابندی" کا آئین چلا آتا ہے، اس کی نظیر کسی ملک میں نہیں۔ ہندوستان میں اس کی بنا اس وقت پڑی جب کہ غیر نسل کے آریا یہاں آئے اور انھوں نے قدیم باشندوں کو اپنا محکوم بنایا، مگر بعد میں اور اور اسباب نے اس طریق معاشرت کو مدد دی اور بیسیوں ملکی انقلابات کے باوجود ذاتوں کی تقسیم میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ قدامت پسندی کی وجہ سے جو رسم و رواج پہلے ضروری تھے وہ بعد میں بھی موجود رہے اور آج تک ہندوؤں کی آبادی میں یہ تفریق موجود ہے۔ مختلف ذاتوں کے افراد اپنے اپنے آئین و رواج کے پابند تھے۔ اور ذات بجائے خود ایک چھوٹی سی قوم ہوتی تھی، جس کے اندرونی معاملات کا فیصلہ اور انتظام

اسی کے بڑے بوڑھے کیا کرتے تھے۔

دیہات کی آبادی

اس پابندی کے نظام کی تکمیل دیہات میں ہوتی تھی جہاں بالعموم ایک ہی ذات کے لوگ زمین کے مالک ہوتے تھے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان اب تک دیہاتیوں کا ملک ہے لیکن قدیم زمانے میں یہاں کی معاشرت کا سب سے دلچسپ نمونہ گاؤں ہی میں نظر آتا تھا کہ وہ بجائے خود ایک جداگانہ عالم ہوتا تھا جس کے تمام اندرونی انتظامات خود گاؤں کے لوگ انجام دیتے تھے۔ گاؤں میں بڑھئی، لوہار وغیرہ پیشہ وروں کے دو ایک گھر ضرور ہوتے اور چوکیداری کی خدمت بھی موروثی سمجھی جاتی تھی۔ مگر یہاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل یہ امر ہے کہ گاؤں کی زمینیں اکثر غیر منقسم یا "شاملات" رہتی تھیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ "ذات" حقیقت میں برادری یا خاندان ہی کی ایک صورت تھی۔

فرقہ بندی کے فائدے اور نقصان۔

ایسے ملک میں جہاں مختلف قوم و ملت کے لوگ ملے جلے ہوں، نظم و ترتیب قائم رہنے کی صورت یہی ہے کہ آبادی کے الگ الگ گروہ ہو جائیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اس گروہ بندی میں چند نہایت اہم فائدے ہیں۔ اول تو یہ کہ ذات کے لوگ اپنی وضع کے پابند ہوتے ہیں اور اخلاق و اطوار کے جو ضابطے بندھے ہوئے ہیں اس کے خلاف کام کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی، پس ان لوگوں میں بہت کم کسی کے چال چلن بگڑنے کی نوبت آتی ہے۔ دوسرے وہ آپس میں ایک دوسرے کے معین و مددگار ہوتے ہیں اور معذور و محتاج افراد کی برادری کفیل ہو جاتی ہے، ایک اور فائدہ جس کی اس زمانے میں بہت قدر ہوتی ہے یہ ہے کہ ہر گروہ کا خاص کام مقرر ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے (موروثی) پیشے میں بڑی مہارت اور کمال پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ طرز تمدن وقتی ضرورتوں کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ہندوؤں نے اس میں جو سخت قیدیں بڑھادی تھیں اس کی وجہ قدامت پرستی تھی اور اسی لئے جس قدر یہ قیدیں سخت ہوئیں اسی قدر علم و فن کی ہر شاخ میں جدت اور نئی بات نکالنے کا میدان تنگ ہو گیا۔ ہر نئی بات "بدعت" سمجھی جانے لگی اور ترقی کے راستے رُک گئے۔ دوسرے اسی کی بدولت اونچی ذات کے لوگوں میں نسب اور خاندان کا غرور بڑھتا گیا اور نیچ ذات والوں میں پست ہمتی اور مردہ دلی پیدا ہوئی اور یہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ ذاتوں کی اس تفریق نے مختلف گروہوں کے درمیان ایسی دیواریں کھڑی کر دیں ان کا ایک قوم کی صورت میں شیر و شکر ہو جانا دشوار ہو گیا۔

اس دور کے مشہور واقعات و سنین

(از سنہ ۶۵۰ء تا سنہ ۱۲۰۶ء)

شمالی ہند کی ریاستیں	جنوبی ہند کی ریاستیں	علم ادب اور مذہبی تحریکات	مسلمانوں کی فتوحات
سنہ ۷۸۳ء ..... اجین پر گرجروں کی حکومت ۔ سنہ ۸۰۰ء تا سنہ ۱۱۹۳ء پال خاندان کی حکومت بہار میں ۔ سنہ ۸۴۰ء ... راجہ بھوج قنوج کی سلطنت قائم کرتا ہے سنہ ۹۰۰ء تا سنہ ۱۱۰۰ء کلچری خاندان کی حکومت وسط ہند میں	سنہ ۲۰۰ء تا سنہ ۱۰۰۰ء پلوی خاندان کی حکومت جنوبی ہند اور مشرقی سواحل پر سنہ ۵۰۰ء تا سنہ ۷۵۰ء مغربی چالوکیہ خاندان کی حکومت ۔ سنہ ۶۰۹ء تا سنہ ۶۵۵ء پلکیسن ثانی کا عہد ۔ سنہ ۷۴۰ء ... پلویوں کی شکست مغربی چالوکیوں سے سنہ ۷۵۰ء تا سنہ ۹۷۳ء راشٹر کوٹوں کا غلبہ دکن میں	سنہ ۷۸۸ء تا سنہ ۸۲۰ء شنکر اچارج کا زمانہ ۔	سنہ ۷۱۲ء ... عربوں کا تسلط سندھ پر

سنہ ۹۷۴ء ..... راجہ منج کی حکومت دھار میں سنہ ۹۸۵ء تا سنہ ۱۰۱۲ء چولا خاندان کے راجہ راج راج کی حکومت اور فتوحات ۔ سنہ ۱۰۶۰ء سین خاندان کی حکومت ندیا (مشرقی بنگال) میں	سنہ ۹۷۳ء ۔ راجہ تیل کی حکومت اور چالوکیہ خاندان کے دوسرے دور کا آغاز	سنہ ۱۰۱۷ء رامانج کی ولادت سنسکرت علم ادب کا فروغ وسط ہند اور دکن میں ۔	سنہ ۱۰۰۰ء تا سنہ ۱۰۲۶ء سلطان محمود غزنوی کے حملے ہندوستان پر اور پنجاب اور سندھ کی فتح ۔
	سنہ ۱۰۴۰ء تا سنہ ۱۰۶۰ء چالوکیہ راجہ سومیشور اپنا پایۂ تخت کلیانی میں منتقل کرتا ہے ۔ سنہ ۱۰۷۰ء تا سنہ ۱۱۱۸ء راجندرا کا عہد حکومت اور چولا اور چالوکیہ ریاستوں کا مل کر ایک سلطنت ہو جانا ۔ سنہ ۱۰۷۶ء تا سنہ ۱۱۲۶ء بکرمادت کا عہد حکومت ۔ سنہ ۱۱۵۷ء ..... وجالا کی سرکشی ۔ سنہ ۱۱۷۳ء ..... ہوسل خاندان کا دوار سمدر میں خود مختار ہونا سنہ ۱۱۸۷ء ۔ جادو نسی خاندان کا فروغ دکن میں ۔	سنہ ۱۱۱۹ء مادھوا چارج کی ولادت ۔ علم ادب کی قدر دانی چالوکی دربار میں لنگ پوجا کا آغاز دکن میں ۔ بودھ مت کا محو ہو جانا ہندوستان سے	
سنہ ۱۱۷۰ء پرتھی راج کی حکومت اجمیر و دہلی پر ۔ سنہ ۱۱۸۲ء پرتھی راج کی فتح راجہ مہوبا پر ۔ سنہ ۱۱۹۲ء جنگ تھانیسر اور پرتھی راج کی شکست ۔			سنہ ۱۱۹۲ء سلطان شہاب الدین محمد غوری کا دوسرا حملہ اور تسخیر دہلی ۔ سنہ ۱۱۹۶ء تا سنہ ۱۱۹۹ء محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات بہار و بنگال میں سنہ ۱۱۹۴ء ۔ قنوج کی فتح ۔ سنہ ۱۲۰۳ء ..... کالنجر اور مہوبا کی تسخیر ۔

باب یازدہم

مسلمانوں کے ابتدائی حملے اور فتح سندھ

آفتاب رسالت طلوع ہونے کے چند ہی سال بعد تمام قوم عرب دین اسلام سے مشرف ہوگئی اور بیتاب تھی کہ دوسرے ملکوں میں بھی خدا کا پیام پہنچائے اور نام بلند کرے لیکن ہندوستان عرب سے دور تھا۔ راستے میں ایران و افغانستان کی جنگجو قومیں اور سربفلک پہاڑ کھڑے تھے۔ ان مراحل کو طے کرنا کوئی آسان بات نہ تھی اور عربوں کو ان راستوں سے پوری آگاہی بھی نہ ہوئی تھی۔ البتہ ہندوستان کے بحری راستے کی انھیں پہلے سے واقفیت تھی اور ان کے تاجر جنوبی ہند کے مشرقی سواحل بلکہ جزائر سماترا و جاوا تک پہنچتے تھے۔ عرب کا مغربی ساحل اور عمان کا ملک ہندوستان کی جانب ہے۔ یہیں کے باشندے ہندوستان کی بندرگاہوں پر زیادہ آتے جاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کی ہندوستان پر تاخت یہیں سے شروع ہوئی۔

عثمان ابن ابی عاص کی بحری تاختیں

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں عثمان ابن ابی عاص (ثقفی) عمان کے والی مقرر ہوئے اور انھوں نے ۱۵؁ ہجری نبوی میں جنگی کشتیوں کا بیڑا اپنا کے سندھ کے ساحل پر بھیجا۔ مجاہدین اسلام نے سب سے پہلے شہر تھانہ کے قریب لنگر ڈالے اور اس شہر کو فتح کر کے چند مہینے کے بعد سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل[1] اور اس سے آگے گجرات کے شہر بروچ پر حملہ کیا۔

لیکن یہ بحری اولوالعزمی حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھی۔ سمندر کا سفر اس زمانے میں بہت مخدوش تھا اور اس قسم کی تاختوں سے کسی مستقل فتح کی امید بھی نہ تھی۔ دوسرے ہر طرف بری فتوحات کا میدان کھلا ہوا تھا اور سندھ کے راجہ سے کہیں زیادہ صاحب سطوت حریف شمشیر آزمائی کے لئے موجود تھے۔ پس کئی سال تک وہ مصر و شام، عراق و ایران کی فتوحات میں مصروف رہے اور ایسے قیامت خیز معرکوں میں نصرت و ظفر حاصل کی جن کی بدولت فاروق اعظمؓ کا مبارک عہد اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

سلطنت عجم کو فتح کرنے کے ساتھ ہی عربی تلواریں سیستان و مکران کے کوہستانی ریگزاروں میں چمکنے لگیں۔ مکران کی سرحد اس وقت سندھ سے ملی ہوئی تھی اور جب اس علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو بارگاہ خلافت میں سندھ کے متعلق بھی چرچے ہونے لگے۔ لیکن عرصے تک کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا۔ مسلمان کچھ تو ان وسیع ممالک کے نظم و نسق میں مصروف رہے جن پر چند ہی سال میں خدا نے انھیں حاکم کر دیا تھا اور کچھ اندرونی نزاعات نے ان کی توجہ کو منتشر رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ مکران سے بار بار عرب سرداروں نے سندھ پر تاختیں کیں، اور حضرت عبدالرحمٰن ابن سمرہؓ سیستان کے والی ہوئے تو انھوں نے اہل سندھ کو کئی شکستیں دیں اور سندھ کا کچھ علاقہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا، مگر محمد ابن قاسم کی لشکر کشی سے پہلے عربوں کا سب سے مشہور حملہ وہ ہے جو ۴۴؁ھ ۶۶۴؁ء میں مہلب ابن ابی صفرہ نے پنجاب پر کیا۔

مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ ہے جو افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر ہوا اور

---

[1] یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے موجودہ شہر کراچی کے قریب آباد تھا۔

انگریزی تاریخوں میں اسی کو مسلمانوں کا پہلا حملہ قرار دیا گیا ہے۔ مہلب حضرت عبدالرحمٰن ابن سمرہؓ کی فوج کے سردار تھے اور کچھ مدت بعد شام و عراق کے معرکوں میں انھوں نے بہت ناموری حاصل کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ جو امیر معاویہ کے زمانے میں ان کی اجازت سے کیا گیا، صرف نئے راستے اور نئے ملکوں کی دیکھ بھال کی غرض سے تھا کہ آیندہ اسی طرف سے ہندوستان پر فوج کشی کی جائے۔ خود مہلب کو اپنی یورش میں ہر جگہ کامیابی ہوئی اور غالباً انھوں نے لاہور کو بھی فتح کر لیا تھا مگر واضح رہے کہ اس راستے پر سے کوئی بڑی فوج اس وقت تک پیشقدمی نہ کر سکتی تھی جب تک کہ ملک افغانستان پر پورا قبضہ نہ حاصل ہو جائے اور افغانستان کے دشوار گزار کوہستانی حصے درکنار ابھی تک خود سیستان و مکران میں حکومت کو پورا استقلال نہ تھا۔ یہ غیر آباد علاقے دار الخلافت سے اتنی دور تھے کہ کبھی کوئی عرب سردار بگڑ بیٹھتا تو اس کو مطیع و مغلوب کرنا دشوار ہوتا تھا۔

محمد ابن قاسم کا حملہ

عبدالملک ابن مروان کی خلافت کے دسویں سال حجاج ابن یوسف ثقفی والی عراق مقرر ہوا۔ ان دنوں اس ولایت کا مستقر بصرہ تھا۔ اور فارس و سیستان کے صوبے اسی والی کے ماتحت ہوتے تھے۔ اس عرصے میں سیستان و مکران کے عرب بارہا سندھ میں یورشیں کرتے رہے اور اب ان کی اس ہندی ریاست سے اتنی واقفیت اور آمد و رفت ہو گئی تھی کہ بعض عرب سردار سندھ میں بھاگ کر اپنی جان بچاتے۔ حجاج کے آہنی پنجے سے بھی ایک ہاشمی سردار نے نکل کر سندھ میں پناہ لی تھی اور شوق جہاد و ملک گیری کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی وجہ تھی کہ حجاج فتح سندھ پر آمادہ ہو گیا ۔

یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ عرب تاجروں کی بعض یتیم لڑکیاں اور بیوہ عورتیں ہندوستان سے کوفے آتی تھیں۔ راستے میں ان کی کشتی دیبل کے بحری قزاقوں نے لوٹی، اور انھیں گرفتار کر لیا؛ انھوں نے حجاج کی دہائی دی اور اس واقعے کی خبر حجاج کو بھی پہنچ گئی پس ایک طرف تو اس نے دربار خلافت سے فوج کشی کی اجازت لی اور دوسری طرف سندھ کے راجہ سے مطالبہ کیا کہ ان عورتوں کو رہائی دلائی جائے۔ راجہ نے عذر کیا اور قرینہ کہتا ہے کہ ساحل کے بحری قزاقوں پر اس کا کچھ زور بھی نہ چلتا تھا۔ غرض حجاج نے اپنی طرف سے عبیداللہ ابن نبہان کو روانہ کیا کہ وہ دیبل پر قابض ہو جائے۔ اس عرب سردار نے جوشِ دلاوری میں

اپنی جان دی اور اس کے بعد بدیل بن طہفہ بجلی بھی سندھ کے معرکوں میں شہید ہوا، ان دونوں حملوں میں مسلمانوں کی فوج تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی اور اسی سے ظاہر ہے کہ ان کی غرض صرف اہل سندھ کی تنبیہ و تادیب تھی۔ لیکن جب دونوں مرتبہ ناکامی ہوئی تو حجاج نے زیادہ وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاریاں کیں اور مہم کی سرداری پر اپنے داماد **محمد ابن قاسم ابن محمد ثقفی** کو نامزد کیا۔

دیبل کی تسخیر

محمد ابن قاسم ۹۲ھ (مطابق ۷۱۱ء) میں ایران سے مکران آیا اور وہاں کا عرب والی بھی اپنی تھوڑی سی فوج لے کر اس کے ہمراہ ہو گیا۔ اس موقع پر **حجاج** نے ضروری ساز و سامان کی بہم رسانی میں خاص اہتمام کیا تھا اور سوئی تاگا تک فوج کے ساتھ تھا کہ وقت پر کام آئے۔ پانچ بڑی بڑی منجنیقیں جہاز پر لاد کر روانہ کر دی گئی تھیں کہ دیبل میں حملہ آوروں کے پاس پہنچ جائیں۔ بار برداری کے لئے تین ہزار اونٹ تھے کہ مکران کے سفر میں فوجوں کو رسد کی تکلیف نہ ہو۔ حملہ آوروں کی کل تعداد چھ ہزار سے زیادہ نہ تھی اگرچہ بعد میں بہت سے سندھی سپاہی بھی ان میں شامل ہو گئے۔

لیکن سب سے پہلی اور دشوار مہم دیبل کی تسخیر تھی۔ سندھ کے ساحل پر یہ نہایت بارونق اور مستحکم شہر تھا اور جب میدان میں مسلمانوں کو روکنا ممکن نہ ہوا تو شہر والوں نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا۔ سامان رسد اور محافظین کی شہر میں کچھ کمی نہ تھی۔ قلعے کے مورچوں پر انہیں پورا بھروسا تھا اور جانتے تھے کہ کچھ عرصے میں محاصرین تنگ آ کر چلے جائیں گے۔ لیکن **محمد ابن قاسم** اس مرتبہ واپس جانے کے لئے نہ آیا تھا۔ خود حجاج اگرچہ ہزاروں کوس دور تھا مگر اس کی آنکھیں دیبل پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر تیسرے دن اپنے داماد کو خط لکھتا اور اس سے مفصل حالات کی اطلاع منگاتا اور ڈاک کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ ساتویں دن دیبل کا خط بصرے پہنچ جاتا تھا۔

محمد ابن قاسم کے دیبل پہنچنے کے چند روز بعد ہی وہ جہاز آ گیا جس میں قلعہ شکن منجنیقیں تھیں۔ ان منجنیقوں کو پانچ پانچ سو آدمی چلاتے تھے اور معمولی قلعے ان کے سنگ باری کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ بایں ہمہ دیبل کئی مہینے تک فتح نہ ہو سکا اور آخر میں جب وہاں کے سب سے بڑے بت خانے پر سنگ باری ہوئی تو خود محصورین ہی جوش غضب میں مقابلے

کے لئے قلعے سے نکل آئے۔ مسلمان تو خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طرح دست بدست جنگ کا موقع ملے۔ حریف کے سامنے آتے ہی ٹوٹ کر گرے اور اسی حملے میں تعاقب کرکے شہر پناہ تک جا پہنچے۔ شکست خوردہ فوج نے پھر قلعے کی پناہ لینی چاہی لیکن عرب سپہ سالار نے سمجھ لیا تھا کہ فیصلے کا وقت یہی ہے۔ اس کے سپاہی جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ حکم ہوتے ہی فصیلوں پر چڑھ گئے اور شہر میں گھس کر دشمنوں کو قتل کرنا شروع کیا اور بھاگ جانے والوں کے سوا بہت کم قابل جنگ مرد ایسے تھے جو عربوں کے ہاتھ سے زندہ بچے :

اس معرکہ آرا فتح نے تمام سندھ میں کھلبلی ڈال دی ہر طرف سے لوگ آآ کے نوجوان فاتح کی اطاعت قبول کرنے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں دریائے سندھ کا بہت سا مشرقی علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ واضح رہے کہ دریائے سندھ کی سب سے بڑی شاخ اس وقت مغرب میں ہٹ کر بہتی تھی اور نیروان جہاں اب حیدرآباد سندھ آباد ہے اس کے مشرق میں واقع تھا :

اب محمد ابن قاسم نے نیروان آکر علاقے کا نظم و نسق درست کیا جا بجا اپنے عامل اور والی مامور کئے مسلمانوں کو بسایا۔ مسجدیں تعمیر کیں اور ان حالات کی مفصل اطلاع حجاج کو بھیجی، پھر یہ انتظام کرنے اور ستانے کے بعد جب دو ہزار تازہ دم سپاہی ایران سے اور آگئے تو اس نے غالباً سندھ کی آخری شاخ کو عبور کیا۔ راجہ داہر کی فوجیں سامنے کے کنارے پر تھیں۔ اور انہیں برابر احکام پہنچ رہے تھے کہ مسلمانوں کو دریا نہ اُترنے دیں لیکن اس موقع پر محمد ابن قاسم نے عجیب فراست سے کام لیا اور مشرقی کنارے پر طول بہت سی کشتیاں بندھوا کے انہیں اس طرح چھوڑا کہ دریا کے بہاؤ سے وہ قطار خود بخود سیدھی ہو کر دوسرے کنارے پر جا لگی۔ اس نرالی وضع کے "پل" بنانے میں راجہ کی فوجیں کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکتی تھیں وہ حیرت سے کھڑی یہ تماشا ہی دیکھ رہی ہوں گی کہ ہراول کے سردار جہم نے دھاوا کیا۔ اور اسی ڈگمگاتے پل پر سے اپنی جمعیت کو صحیح سلامت مغربی کنارے تک لے آیا عربوں نے تیر مار مار کے سندھیوں کو دور ہٹا دیا تھا اور اب پل کو دوسرے کنارے پر مضبوطی سے قائم کر لینے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ لہٰذا اسی روز محمد ابن قاسم کا پورا لشکر دریا کو عبور کر آیا :

داہر کی شکست

مسلمانوں کے حملے کے وقت سندھ میں برہمنوں کا خاندان حکمران تھا۔ اور اس کی حکومت کا آغاز غالباً ساتویں صدی عیسوی کے وسط

میں ہوا اور واہر، جسے قسمت نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے منتخب کیا اس خاندان کا تیسرا فرمانروا تھا ساحل سمندر سے ملتان تک اور تھر کے ریگستان سے موجودہ بلوچستان تک تمام علاقہ اس کی حکومت میں داخل تھا۔ موجودہ صوبۂ سندھ سے اس رقبے کو ہم قیاساً دگنا سمجھ سکتے ہیں ؂

جب دریا اور جھیل مسلمانوں کے سیلاب کو نہ روک سکے تو راجہ واہر اپنا لشکر لے کر مقابلے کو نکلا اور پایۂ تخت کے قریب ہی ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ سندھی فوج سازوسامان اور تعداد میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن حملہ آوروں کی آتشباری نے جنگی ہاتھیوں کو اور سواران عرب نے سندھی سپاہیوں کو بے حواس کر دیا۔ خود راجہ واہر بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور مسلمانوں کو کامل فتح حاصل ہوا، یہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی (سنہ ۹۳ھ مطابق سنہ ۷۱۲ء) اور اکثر مسلمان فتح کی شکر گزاری میں رات بھر جاگتے اور عبادت گزاری کرتے رہے ؂

راجہ واہر کے بعد اس کے بیٹے اور بیوہ رانی کچھ عرصے تک قلعہ بند ہو ہو کر مسلمانوں سے الجھتے رہے لیکن کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی اور سال ڈیڑھ سال ہی میں تمام ملک حریفوں سے صاف ہو گیا۔ دوسرے سال جب ملتان فتح ہوا تو راجہ واہر کی پوری سلطنت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ شمال مغرب میں دریائے جہلم تک ان کا تسلط تھا اور شمال میں ان کی سرحد کشمیر سے جا ملی تھی ؂

محمد ابن قاسم کا انجام

فتح ملتان کے وقت نوجوان فاتح نے قریب قریب پچاس ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کر لی تھی نو مسلم سندھی جوق درجوق اس کے زیر علم جمع ہو رہے تھے اور مال غنیمت اس کثرت سے ہاتھ آیا تھا کہ روپے کی اسے کچھ کمی نہ تھی۔ اب اسے آرزو تھی کہ ہندوستان کے اور علاقوں میں صدائے تکبیر بلند کرے بلکہ خلیفہ ولید ابن عبد الملک کی اجازت سے اس نے قنوج کے راجہ کے پاس سفارت بھی روانہ کی تھی اور قصد تھا کہ اس کی وسیع سلطنت پر فوج کشی کی جائے کہ اتنے میں حجاج کے انتقال کی خبر آئی اور چند ماہ بعد ہی خلیفہ ولید نے بھی رحلت کی مگر محمد ابن قاسم کے لئے ان دونوں خبروں سے زیادہ قابل تشویش یہ اطلاع تھی کہ سلیمان ابن عبد الملک نے مسند خلافت پر قدم رکھا جس کی حجاج اور اس کے اہل خاندان مخالفت کرتے رہے تھے اور وہ ان کا جانی دشمن ہو گیا تھا۔ چنانچہ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے حجاج کے رشتہ داروں کو چن چن کر مارا یا گرفتار کیا اور یزید ابن

ابی کبشہ کو ولایت سندھ پر مامور کیا کہ محمد ابن قاسم کو معزول و گرفتار کر کے عراق بھیج دے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور عراق ہی کے قید خانہ میں یہ نامور فاتح چند روز سخت تکلیف اٹھانے کے بعد فوت ہو گیا۔ اس کی قید اور وفات کے متعلق انگریزی اور بعض فارسی مورخوں نے بیہودہ افسانے گھڑ دیئے ہیں۔ مگر عربی تاریخوں میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔

محمد ابن قاسم کے بعد

عربوں کا حملہ اور سندھ کی فتح تاریخ ہندوستان کا نہایت اہم واقعہ ہے اور عام انگریزی تاریخوں میں اس کے جو حالات لکھے ہیں وہ بہت ناقص ہیں اسی لئے ہم نے یہاں کسی قدر تفصیل سے کام لیا۔ لیکن سندھ کو فتح کرنے کے بعد عربوں نے پھر قدم آگے نہ بڑھایا اور اسی گوشۂ ملک پر قانع رہے پس سندھ کی بعد کی تاریخ کو یہاں وضاحت سے لکھنا بے محل ہوگا۔ مختصر طور پر یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ عباسی خلافت کی قوت میں ضعف آیا تو سندھ کے عرب امیر قریب قریب خود مختار ہو گئے اور نویں صدی عیسوی کے آخر میں یہاں ان کی دو ریاستیں بن گئیں ایک تو جنوبی حصے میں تھی جس کا صدر مقام شہر منصورہ تھا اور اس میں تقریباً تمام وہ علاقہ شامل تھا جو اب صوبۂ سندھ کہلاتا ہے دوسری اور شمالی ریاست کا صدر مقام شہر ملتان تھا۔ اور ان دونوں شہروں میں ایک عرصے تک اسلامی علوم و فنون اور عباسی آئین و تمدن جاری تھے حسن انتظام کی بدولت ملک نہایت سرسبز و خوشحال تھا اور سندھی تاجر ایک طرف خراسان و سیستان اور دوسری طرف جہازوں میں لنکا اور چین تک پہنچتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب ہندوستان پر حملے شروع کئے تو سندھ میں باطنی یا اسمعیلی مذہب کے لوگوں کا زور تھا۔ محمود نے ملتان فتح کر کے یہ علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا لیکن اس کے جانشین جنوبی سندھ کو قبضے میں نہ رکھ سکے اور وہاں سومرہ خاندان کے نومسلم حاکم خود مختار بن بیٹھے (۱۰۵۳ء)۔ چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطان علاء الدین خلجی نے انہیں مغلوب کیا اور گو بعد میں بھی یہاں دو تین خود مختار خاندانوں کی فرماں روائی رہی لیکن سلطان فیروز شاہ تغلق کی فتح (۱۳۶۱ء) کے بعد سے یہ علاقہ سلطنت دہلی ہی کا ایک صوبہ شمار ہوتا ہے اور اس کی تاریخ بڑے بڑے واقعات سے خالی ہے۔

باب دوازدہم

خاندانِ غزنوی اور پنجاب کی فتح

خلافت عباسیہ کی قوت میں ضعف آیا تو دستور کے مطابق اس کے علاقوں میں جا بجا خود مختار سلطنتیں قائم ہوگئیں انھی میں آل سامان کی وسیع سلطنت تھی جس کی حدیں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے آملتی تھیں۔ مگر سامانیوں کا اصلی ملک ماوراء النہر اور پایۂ تخت بخارا میں تھا اور مغرب اور شمال و جنوب میں ان کے اتنے دشمن تھے کہ انھیں ہندوکش کی خطرناک گھاٹیاں اترنے کی کبھی فرصت نہ مل سکی؛ امیر الپتگین اسی خاندان کا ترکی نژاد غلام تھا جو معتوب ہوکر دربار بخارا سے نکلا اور شہر غزنی پر قابض ہوگیا۔ یہ شہر کابل سے پچھتر میل جنوب میں کوہستان بابا کی شاخ گل کوہ پر واقع ہے اور ان دنوں علاقۂ زابلستان کا صدر مقام تھا؛ الپتگین نے یہاں کے قدآور جنگجو قبائل کو ترتیب دے کر ایک نہایت جری فوج مرتب کرلی اور اپنی زندگی میں غزنی کی آئندہ عظمت و ناموری کا سنگِ بنیاد جما گیا؛

الپتگین کو دربار بخارا نے غزنی کا حاکم تسلیم کرلیا تھا اور اس کی وفات کے چودہ برس بعد غزنی کے امیروں نے سبکتگین کو اپنا حاکم بنایا تو وہ بھی قریب قریب خود مختار بادشاہ تھا؛

راجہ جے پال کا حملہ اور شکست

سبکتگین کے ہمسائے یں ان دنوں پنجاب کے راجہ جے پال کی حکومت تھی اور پشاور سے جلال آباد تک کا علاقہ لمغان کہلاتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے راجہ اس کو اپنے ملک کا حصہ سمجھتے تھے ؛ بہرحال جنگ کی ابتدا جے پال نے کی اور سبکتگین اس کا حملہ دفع کرنے مقابلے کو نکلا۔ مگر لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ لمغان کی خوفناک برفباری نے اہل ہند کو بے حواس کر دیا اور جے پال نے صلح کے پیام سلام شروع کئے ؛

اس موقع پر محمود اپنے باپ امیر سبکتگین کے ہم رکاب تھا اور اس نے صلح کی مخالفت کی اور جب تک جے پال نے بہت سا خراج دینے کا وعدہ نہ کیا صلح نہ ہوئی ؛

لیکن لاہور پہنچ کر جے پال نے عہد شکنی کی اور مسلمان سفیروں کو جو خراج لینے ساتھ گئے تھے گرفتار کر لیا۔ امیر سبکتگین اس حرکت کو معاف نہ کر سکتا تھا۔ فوج لیکر ہندوستان پر چلا اور ادھر سے جے پال، راجگان دہلی، وقنوج و کالنجر کے امدادی دستے اور اپنا لشکر لئے مقابلہ کو نکلا۔ لڑائی درۂ خیبر اور پشاور کے درمیان ہوئی اور اگرچہ ہندی لشکر کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن امیر سبکتگین کی جنگی تدابیر نے بہت جلد اس کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا گئی پیہم حملوں کے بعد جب اس نے تمام فوج سے دھاوا کیا تو ہندی میدان میں نہ ٹھیر سکے اور بھاگنے میں ہزاروں مارے گئے راجہ کے خیمے اور جنگی ساز و سامان فاتح کے ہاتھ آیا اور پشاور تک اٹک پار کے ملک پر سلاطین غزنوی کا قبضہ ہو گیا؛ لیکن جنگ کا سب سے زیادہ قابل لحاظ نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سے اہل غزنی کو اپنے دولتمند ہمسایوں کی کمزوری معلوم ہو گئی اور ادھر ہندیوں کے دل پر اسلامی تلوار کا رعب جم گیا ؛

سلطان محمود کی تخت نشینی

اس معرکہ کے بعد امیر ناصر الدین سبکتگین چھ سال تک سمرقند و بخارا کی لڑائیوں میں مصروف رہا اور اپنی وفات (۳۸۷ھ / ۹۹۷ء) سے پہلے نہ صرف ملک خراسان کا مقبوضات غزنی میں اضافہ کر گیا بلکہ ایک مستقل سلطنت کی بنیاد ڈال گیا جو بخارا کی محکوم نہ تھی بلکہ برابر کی حلیف بن گئی تھی ؛ مگر اس سلطنت کے دو وارث دعویدار تھے :- ایک تو اس کا سب سے بڑا بیٹا محمود المخاطب بہ سیف الدولہ[1] جو اس وقت نیشاپور کا حاکم تھا دوسرے

---

[1] "سیف الدولہ" پہلا خطاب تھا جو سلطان محمود کو ایام شہزادگی میں شاہ بخارا کی طرف سے عطا ہوا۔ چند سال کے بعد

محمود کا سوتیلا بھائی شہزادہ اسمٰعیل جو غزنی میں باپ کا جانشین بن گیا تھا۔ اول اول سلطان محمود صرف شمالی علاقے پر قناعت کرنی چاہتا تھا لیکن اسمٰعیل نے کوئی ایسی شرط منظور نہ کی۔ آخر لڑائی میں شکست کھا کے گرفتار ہوا[1] تخت غزنی نے سلطان محمود کے قدموں سے زینت پائی اور کچھ عرصے کے بعد سامانی بادشاہوں کے بجائے خطبے میں بھی اسی کا نام پڑھا جانے لگا (۳۸۹ھ مطابق ۹۹۹ء) جب یہ قضیہ فیصل ہوگیا تو جوان ہمت اور اولوالعزم سلطان کو ترکتازی کے لئے ہر طرف وسیع میدان نظر آیا یعنی مغرب میں ترکستان سے عراق تک اس کے ہمسائے آپس کی لڑائیوں میں مصروف تھے اور محمود کے سامنے جم کر مقابلہ کرنے کی کسی میں قوت و قابلیت نہ تھی۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپنی سپاہ لے کر بڑھا، فتح پائی۔ اور کبھی اس کی تلوار قزوین میں چمکی، کبھی بلخ میں، لیکن اقبال مند سلطان کے مغربی کارنامے جو اُسے سکندر نپولین[2] کا ہم رتبہ بناتے ہیں، ہماری تاریخ کے دائرے سے باہر ہیں۔ ہمیں صرف ہندوستان کے میدانوں میں اس کی سپہ سالاری کے جوہر دیکھنے کا موقع ملے گا اور ہم صرف وہ واقعات بالاجمال یہاں بیان کریں گے جن کا نتیجہ کچھ عرصے بعد یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اقلیل تعداد باہر سے آکے ہندوستان کی مالک ہوگئی۔

ہندوستان پر ابتدائی حملے

محمود کو ہندوستان پر حملے کی ایسی دھن لگی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے مغربی حریف (ایلک خاں) سے صلح کرنے میں عجلت کی اور ادھر سے اطمینان ہوتے ہی دس ہزار چیدہ سوار لے کر ہندوستان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ القادر باللہ خلیفۂ بغداد نے "امین الملۃ یمین الدولہ" کا خطاب دیا اور اسلامی تاریخوں میں وہ اسی خطاب سے اور اس کی اولاد "سلاطین یمینیہ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

[1] گرفتاری کے بعد محمود بھائی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک روز باتوں باتوں میں دریافت کرنے لگا کہ اگر لڑائی میں تم مجھے گرفتار کرلیتے تو کیا سلوک کرتے؟ اسمٰعیل نے کہا "کسی قلعے میں اسباب و آرام و آسائش دے کر قید کر دیتا"۔ سلطان محمود نے یہ سُن کر دور دراز ایک قلعہ میں آرام و آسائش کے سامان جمع کرائے اور بھائی کو وہاں نظر بند کر دیا ۱۲

[2] چنانچہ گبن جیسا مصنف بھی سلطان محمود کو فتوحات جنگی کے لحاظ سے نپولین اعظم کا ہم رتبہ تسلیم کرتا ہے دیکھو تاریخ ہند مولفۂ گبن۔ باب سوم فصل اوّل ۱۲

کا رخ کیا۔ مقابلے کے لئے اس مرتبہ بھی جے پال تیس ہزار پیادہ اور بارہ ہزار سوار اور تین سو جنگی ہاتھی لے کر آیا تھا لیکن پشاور کے قریب شکست کھائی اور تمتی بیٹوں سمیت اسیر کر لیا گیا۔ (ماہ محرم ۳۹۲ھ مطابق ۱۰۰۱ئ) ایک اعتبار سے پنجاب کے ہندوؤں کی یہ آخری کوشش تھی اور اس جنگ میں راجہ کی ہزیمت کے بعد افواج سلطانی کو روکنے والا کوئی نہ رہا لیکن محمود نے پھر آئندہ اطاعت و باجگزاری کا اقرار لے کر جے پال اور اس کے بیٹوں کو رہا کر دیا اور غزنی کو مراجعت کی۔

جے پال نے ان ناکامیوں کی شرم سے اور شاید اپنی رعایا کے اوہام کی بنا پر تنگ آکر خودکشی کر لی اور اس کا بیٹا انند پال پنجاب کا فرمانروا ہوا مگر خود سلطان محمود کے آئندہ تین چار سال سندھ و ملتان کی فتح میں صرف ہوئے۔

نگر کوٹ اور متھرا۔ الحاق پنجاب

اسی زمانے میں ایلک خاں نے دریائے سیحوں اُتر کر خراسان و ہرات پر حملہ کیا اور محمود کو بہت جلد ملتان سے واپس ہونا پڑا؛ پھر تاتاریوں کو اس نے بلخ کے قریب ایسی شکست دی کہ آیندہ ایلک خاں کو سلطنت غزنی سے لڑائی مول لینے کی جرأت نہ ہوئی؛ لیکن ہندوستان میں ابھی انند پال کو سزا دینی باقی تھی۔ کیونکہ اس نے باجگزار ہونے کے باوجود ملتان کے باغیوں کا ساتھ دیا اور خود سلطان سے لڑنے آیا تھا پس ایلک خاں کے فرار ہونے کے بعد محمود نے پھر پنجاب کا رُخ کیا اور فوج کثیر لے کر انند پال کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا اُس عرصے میں یہ راجہ بھی آنے والی مصیبت سے غافل نہ رہا تھا اور اس نے دور دور سفیر بھیجکر مدد کی درخواست کی تھی چنانچہ اجین و اجمیر، و قنوج و کالنجر تک کے سپاہی دین و وطن کی حمایت کے لئے لڑنے آئے تھے اور پشاور کے قریب اتنی بڑی فوج فراہم ہوگئی تھی کہ پنجاب میں کبھی جمع نہ ہوئی ہوگی لیکن تقدیر نے مسلمانوں کا ساتھ دیا راجہ کا ہاتھی تیر کھا کے بھاگا اور اسی کو فرار ہوتا جان کر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور چند ہی روز میں یہ لشکر عظیم ایسا پراگندہ ہوا کہ پھر نگر کوٹ کے مستحکم قلعے اور وہاں کے مشہور مندر کو بچانے کے لئے بھی کوئی معقول فوج جمع نہ ہو سکی اہل غزنی وہاں پہنچے تو نہتے پجاریوں نے خود کنجیاں لا کے حوالے کر دیں۔ سلطان نے خوشی سے ان کی جان بخشی کی۔ اس حملے میں اس قدر مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا کہ ہفتوں غزنی میں وعوتیں اور جشن

ہوتے رہے۔ اتنی زکوٰۃ تقسیم ہوئی کہ محتاج غنی ہوگئے اور اسیرانِ جنگ کی وہ کثرت تھی کہ غزنی ہندوستان ہی کا شہر نظر آتا تھا ؛ (سنہ ۴۰۲ھ مطابق سنہ ۱۰۱۱ء)

گرجستان و غور فتح کرنے کے بعد پھر سلطان نے ہندوستان پر یورش کی اور اس تیزی سے بڑھا کہ حریف کو مقابلے کے لئے جمع ہونے کی فرصت نہ ملی اور وہ تھانیسر پہنچ گیا جو غالباً راجہ دہلی کے علاقے میں تھا۔ اس مرتبہ کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی اور سلطان تھانیسر کے مندر سے معقول مالِ غنیمت لے کر واپس چلا گیا؛ اسی طرح کشمیر پر اس نے دو مرتبہ تاخت کی اور سوائے اس کے کہ آخری دفعہ فوج راستہ بھول گئی اور سردی سے اکثر جانیں تلف ہوئیں ان حملوں میں اور کوئی معرکہ پیش نہ آیا ؛

مگر معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزم سلطان کو ایسی مہمات میں لطف نہ آتا تھا، اور اب وہ آگے بڑھ کے "ہندوستان خاص" کے راجاؤں سے شمشیر آزمائی کا مشتاق تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۰۱۸ء میں ایک لاکھ سے زیادہ پیادہ و سوار کا لشکر لیکر نویں مرتبہ سرزمین ہند میں داخل ہوا اور سیل بے پناہ کی طرح پست و بلند طے کرتا ہوا قنوج پہنچ گیا جو ان دنوں شمالی ہندوستان کا سب سے وسیع و دولتمند شہر تھا ؛ لیکن اس وقت وہاں ہرش یا بھوج کی حکومت نہ تھی کہ حملہ آوروں کو قوت آزمائی کا لطف آتا۔ دوسرے محمود کی سرعت رفتاری نے راجہ کو بے حواس کردیا تھا مسلمانوں کے سامنے پہنچتے ہی وہ شہر سے نکل آیا اور اپنے تئیں سلطان کے حوالے کردیا، سلطان نے بھی نہ صرف اس کی جاں بخشی کی بلکہ اپنی پناہ میں لے لیا اور آئندہ دو مرتبہ محض اسی کو بچانے اور اس کا انتقام لینے کو ہندوستان پر فوج کشی کی ؛

لیکن اس مہم سے واپس جاتے وقت متھرا کے قریب دیسی رئیسوں سے دو مقابلے ہوئے مسلمانوں کو ہر جگہ کامیابی ہوئی اور قنوج سے خالی آنے کی کسر اس طرح پوری ہوگئی کہ متھرا کے مندروں سے بہت کچھ مال و دولت ان کے ہاتھ آئی مگر مندروں کی سنگین و عالیشان عمارتیں دیکھ کر محمود بہت خوش ہوا اس نے حکم دیا کہ انھیں کوئی گزند نہ پہنچایا جائے۔ البتہ مندروں میں جو سونے کے بت دھرے تھے وہ سب اونٹوں پر لاد کے غزنی بھیج دیے گئے ؛

مسلمانوں کی اطاعت اور دوستی کے جرم پر کالنجر کے راجہ نندا نے راجہ قنوج سے جنگ کا حیلہ نکالا اور اسے قتل کردیا۔ اس کا انتقام لینے کے لئے سلطان نے سنہ ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ و ۲۲ء میں پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور کالنجر کے راجہ کو سخت شکست دی، اس موقع پر پنجاب کے

راجہ انند پال نے جو اپنے باپ جے پال کا جانشین ہوا تھا بغاوت کی اور جمنا پر اسلامی فوجوں کا راستہ روکا پس کالنجر کی مہم سے فرصت ہونے کے بعد جب فتح مند لشکر دوبارہ لاہور پہنچا اور انند پال نے بھاگ کر اجمیر میں پناہ لی تو محمود نے پنجاب میں مسلمان عامل مقرر کئے اور یہ علاقہ مستقل طور پر سلطنت غزنی کا صوبہ بن گیا۔ (۴۱۳ھ م ۱۰۲۲ء)

سلطان کی یلغار سومنات پر

ہندوستان پر گیارھویں حملے میں سلطان نے کالنجر کے راجہ کو مطیع و منقاد کیا کالنجر غزنی سے ایک ہزار میل سے کم فاصلے پر نہ تھا اور اس زمانے میں فوجوں کو سال بہ سال اتنی دور لے کر آنے کے معنی یہ تھے کہ اقبال مند فاتح کی اولوالعزمی ایسے فاصلوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ مگر اس اعتبار سے بھی اس کی آخری مہم سب سے زیادہ یادگار رہی۔

گجرات کے جنوبی ساحل پر مغربی ہندوستان کا سب سے بڑا تیرتھ سومنات میں تھا بڑے بڑے راجہ اس کے خرچ کی کفالت کرتے تھے اور وہاں کے وسیع مندر میں زر و جواہر کی کچھ کمی نہ تھی۔ گو سلطان کی عمر اب پچاس سے متجاوز تھی لیکن دل میں جوش آیا کہ خدا کا نام لے کر ایک مرتبہ اور ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ ۴۱۵ھ م ۱۰۲۴ء کے سرما میں غزنی سے چل کر ملتان آیا اور سامان سفر درست کر کے اس ریگستان میں گھس گیا جسے طے کرنا آج کل بھی آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ اس ساڑھے تین سو میل چوڑے بے گیاہ بیابان سے آج کل گزرنا" اس حالت میں بھی کہ وہ کسی حلیف کا علاقہ ہو نہایت دشوار مرحلہ ہے اور اسے پہلی دفعہ اس طرح طے کرنا کہ دوسرے کنارے پر دشمن کے ملنے کا خدشہ موجود ہو، غیر معمولی جرات اور اسی قدر غیر معمولی قابلیت کا محتاج تھے۔"[لہ]

سپاہیوں نے اپنی خرجیاں اور مشکیزے بھر لئے تھے مگر سلطان نے احتیاطاً بیس ہزار اونٹوں پر پانی کی پکھالیں اور دانہ چارہ لدوا کر ساتھ لے لیا اور چند روز میں بخیر و عافیت بیابان کو طے کر گیا۔ غالباً کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ کوئی فوج اس راستے راجپوتانہ میں قدم رکھنے کی جرأت کرے گی پس جب سلطان یک بہ یک اجمیر کے سامنے نمودار ہوئے تو وہاں کے راجہ کو بچ کر نکل جانے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی تارا گڑھ کا قلعہ قریب تھا مگر محمود کو محاصروں کی فرصت نہ تھی اور منزل مقصود بھی ابھی دور تھی لہٰذا جو راستے میں پڑا اسے مٹاتا اور پامال کرتا ہوا گجرات کے سرسبز علاقے تک جا پہنچا۔ یہ اس قیامت کی یلغار تھی کہ انہلواڑے

لہ الفنسٹن۔ تاریخ ہند۔ طبع نہم۔ صفحہ ۳۲۶ -

کا طاقتور فرمانروا بھی اس کی آمد سن کر حیران رہ گیا اور اجمیر کے راجہ کی طرح بھاگ کر جان بچائی ؛

یہاں سے چل کر فوج نے خاص سومنات کی فصیلوں کے سامنے دم لیا اور پجاریوں کے کوسنے اور دھمکیوں کے جواب میں اتنے تیر مارے کہ مدافعین فصیلیں چھوڑ چھوڑ کر مندر میں جا گھسے لیکن جب مسلمانوں نے کمندیں ڈال کر چڑھنا شروع کیا تو راجپوت مذہب کے جوش میں از خود رفتہ ہو کر دوڑے اور اس طرح جم کر مقابلہ کیا کہ دو روز تک قلعہ فتح نہ ہو سکا اور بہت سے حملہ آور کام آئے ؛ اس عرصے میں مندر کو بچانے کے لئے کئی راجہ بھی فوجیں لیکر آ پہنچے اور قلعے کے باہر نہایت خونریز جنگ ہونے لگی۔ لڑائی کے وقت ہندوؤں کو تازہ کمک پہنچ رہی تھی اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا لیکن جس وقت محمود نے اپنا گھوڑا بڑھایا اور ساتھیوں کو جوش دلا کر خود لڑائی کے گھمسان میں پھاند پڑا تو سپاہیوں نے بھی یک بارگی ایسا حملہ کیا کہ پھر کسی کے روکے نہ رکے اور اپنے سامنے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ہندیوں کو کامل ہزیمت ہوی اور قلعے والوں کو بھی سمندر کے راستے بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا اسلامی فوجیں **سومنات** میں داخل ہوگئیں ؛

کہتے ہیں کہ محمود کو گجرات کی آب و ہوا اور مناظر ایسے پسند آئے کہ وہ انہلواڑے کو اپنا پائے تخت بنا کے کم سے کم چند سال یہیں رہنے کا خیال کرنے لگا اور سراندیپ و سیام پر اپنے بحری مہم لیجانے کی آرزو پیدا ہوئی لیکن رفیقوں نے سمجھایا اور خود سلطان کو خراسان و بلخ کے وہ پہاڑ یاد آئے جن کی ایک ایک گھاٹی پر لڑ کر قبضہ کیا تھا۔ غرض یہ خیال چھوڑ دیا اور قریب قریب ایک سال تک انہلواڑے میں قیام کرنے کے بعد گرمیوں کے آغاز میں (۱۰۲۶ء) اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اور اس مرتبہ قریب کا راستہ یعنی صحرائے تھر کا جنوب مغربی گوشہ طے کر کے ملک سندھ میں آگیا ؛ محمود نے راستے کی نزدیکی کا جو اندازہ کیا وہ بالکل ٹھیک تھا لیکن **سومنات** کے بعض پجاریوں نے رہبروں کا بھیس بدل کر مسلمانوں کو صحرا میں بھٹکا دیا اور کئی روز تک وہ ایسی شدید تکلیف میں مبتلا رہے کہ اب تک کسی سفر میں نہ ہوئی تھی۔ بہت سی جانیں ضائع ہوئیں آخر بہ دشواری وہ سندھ کے علاقے میں داخل ہوئے پھر سندھ کے بحری قزاقوں کو سزا دینے کے بعد سلطان ۴۱۷ھ یا ۱۰۲۶ء میں مع الخیر غزنی پہنچ گیا ؛

محمود کی وفات اور اوصاف

ہندوستان پر محمود کی یہ آخری فوج کشی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے مغربی ہمسایوں سے مصروف جنگ رہا اور ہمدان و عراق

میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں سلطنت غزنی کی حدود اب سندھ و پنجاب سے لے کر بلخ و عراق تک پھیل گئی تھیں اور دنیا کا کوئی بادشاہ دولت و قوت میں محمود کی ہمسری نہ کر سکتا تھا کہ اتنے میں اجل کا ہرکارہ آ پہنچا جس کے آگے تمام مال و زر اور فوج و لشکر بے بس ہیں (۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء)۔

اس نامور فاتح نے تیتیس تینتیس برس جس شان کے ساتھ فرماں روائی کی تاریخ میں اس کی نظیریں کم ہیں لیکن فتوحات اور وسعت سلطنت سے قطع نظر کر لی جائے تو بھی ذاتی اوصاف کے اعتبار سے بادشاہوں میں محمود کا مرتبہ بہت بلند ہے کہ اتنی بڑی بادشاہت کے باوجود وہ نہایت سادہ مزاج، زندہ دل، خلیق و شائستہ سلطان تھا۔ صاحبان کمال کی قدردانی اور مظلوموں کی حمایت و دستگیری میں اس کا دربار ضرب المثل ہو گیا تھا اور اس کی دادرسی کی بہت سی روایتیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔

بعض مصنفوں نے محمود پر مذہبی تعصب اور بخل کا الزام لگایا ہے۔ مگر الفنسٹن کہتا ہے کہ یہ "الزام" غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں سلطان محمود نہایت متقی اور سچا مسلمان تھا اور شاید ایک بھی لڑائی ایسی نہیں جس میں سربسجود ہو کر اس نے خدا سے نصرت و مدد کی دعا نہ کی ہو لیکن ہم ایک مثال بھی ایسی نہیں سنتے کہ اس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان کیا ہو۔ ہندوستان میں اس نے کسی کو حلیف بنایا تو وہ بھی ایک غیر مسلم ہندو تھا۔ (یعنی راجہ قنوج) اور ایک شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ جنگ یا قلعہ گیری کے وقت کے سوا اس نے کسی ہندو کو قتل کیا ہو[1]۔

اس کے بخل کے ثبوت میں یہ روایت بہت مشہور ہے کہ سلطان نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور تکمیل کے بعد ساٹھ ہزار اشرفی کے بجائے ساٹھ ہزار درہم صلہ دیا۔ فردوسی ناراض ہو کر گھر چلا آیا اور سلطان کی ہجو لکھی اس ہجو کی اطلاع جب محمود کو ہوئی تو وہ شرمندہ ہوا اور اس نے ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے گھر بھیج دیں۔

مگر اول تو یہی بات غلط ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمائش پر لکھا گیا۔ دوسرے حال میں بعض اہل تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ ہجو فردوسی کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ بہت عرصے بعد محض محمود کو بدنام کرنے کے لئے لکھ دی گئی تھی۔

---

[1] تاریخ ہند طبع نہم صفحہ ۳۲۶ یاد رکھنا چاہئے کہ الفنسٹن مسلمان بادشاہوں کا نہایت مخالف مصنف مشہور ہے اور اس کے قول کے متعلق یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس نے مسلمانوں کی طرفداری میں کوئی مبالغہ کیا ہوگا۔ ۱۲

لیکن اس قسم کی روایتوں کو چھوڑ کر محمود کے سوانح پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسے دولت جمع کرنے کا شوق تھا تو اسی کے ساتھ برمحل خرچ کرنے میں بھی وہ کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اس کی فوجیں بہترین ساز و سامان سے آراستہ ہوتی تھیں اور اتنی دشوار و بعید مہمات میں سپاہی صرف اس وقت جانبازی دکھا سکتے ہیں جبکہ انھیں انعام و قدر دانی کا پورا یقین ہو۔ اس کے علاوہ خود غزنی میں عمارات کی تعمیر و آراستگی، معلمین و طلبہ کی شاہانہ پرورش، علما اور اہل کمال کی عزت افزائی جن کی بدولت غزنی دنیا کا نہایت بارونق شہر ہو گیا تھا؛ سلطان محمود کی فیاضی اور سخاوت کی ایسی روشن دلیل ہے کہ اس کے سامنے بخل و جزرسی کے تمام الزام باطل ہو جاتے ہیں۔

محمود کے جانشین

سلطان محمود کے بعد ڈیڑھ صدی تک اس کی اولاد غزنی اور پھر لاہور میں حکومت کرتی رہی لیکن ان میں سے کوئی ایسا اقبالمند نہ ہوا جو اپنے جد امجد کا نام روشن کرتا۔ ان کی خانہ جنگی یا سلجوقیوں سے لڑائی کا حال ہماری تاریخ کے احاطے میں داخل نہیں اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ لکھنا کافی ہوگا کہ شاہان غزنوی کے والی برابر پنجاب میں مقرر ہوتے رہے اور بعض اوقات ان کے دیسی رئیسوں سے بھی معرکے رہتے تھے۔

محمود کے گیارھویں جانشین سلطان ابراہیم نے غوریوں کے ہاتھ سے شکست کھائی اور علاء الدین جہاں سوز نے پائے تخت غزنی کو جلا کے خاک سیاہ کر دیا تو غزنوی تاجدار نے پنجاب کا رخ کیا (۵۴۳ھ مطابق ۱۱۵۰ء) مگر ناکامی کے رنج و مصائب سفر سے راستے ہی میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سلطان خسرو لاہور پہنچ کر باپ کا جانشین ہوا۔ اہل لاہور نے خسرو کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور اپنے شہر کا پائے تخت بنتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے لیکن ۳۴ برس کے بعد غوریوں نے یہاں بھی آل سبکتگین کو قائم نہ رہنے دیا اور لاہور پر قابض ہو گئے (۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء) ملک خسرو گرفتار ہو کر ایک قلعے میں نظر بند کر دیا گیا اور اسی پر خاندان غزنوی کا خاتمہ ہو گیا۔

شجرۂ سلاطین غزنویہ

- (۱) سبکتگین
  - (۲) سلطان محمود غزنوی
    - (۳) سلطان محمد
    - (۴) سلطان مسعود
      - (۸) سلطان فرخ زاد
      - (۵) سلطان مودود
        - (۶) سلطان علی بن مودود
      - (۹) سلطان ابراہیم
        - (۱۰) سلطان مسعود ثانی
          - (۱۱) سلطان شیرزاد
          - (۱۲) سلطان ارسلان
          - (۱۳) سلطان بہرام شاہ
            - (۱۴) سلطان خسرو شاہ (لاہور)
              - (۱۵) سلطان ملک خسرو
    - (۷) سلطان عبدالرشید

باب سیزدہم

شمالی ہندوستان کی فتح

افغانستان کے مغربی حصے میں وہ کوہستانی علاقہ غور کہلاتا تھا جو ہرات نامی ندی کا طاس ہے۔ یہاں کی وادیوں میں میوہ دار درختوں کی افراط ہے اور ان میں آنے کے راستے اتنے دشوار گزار ہیں کہ آزاد و جنگجو قبائل کے لئے اس سے بہتر مامن نہ ہو سکتا تھا۔ سلطنت غزنی کے عہد عروج میں یہاں کے سرداروں کو اطاعت قبول کرنی پڑی تاہم جب کبھی انہیں موقع ملا وہ آزاد ہو گئے اور آخر میں خود سلاطین غزنی کی ہمسری کا دعوی کرنے لگے۔ اس زمانے میں (پانچویں صدی ہجری) ان کا پایۂ تخت فیروزکوہ نامی قلعہ تھا۔

آخری شاہان غزنوی کے پنجاب میں چلے جانے کے بعد یہاں کے حاکم علاء الدین جہاں سوز نے جو نئی سلطنت قائم کی اس کا علاقہ قریب قریب وہی تھا جو اب دولت خداداد افغانستان میں داخل ہے۔ جب اس بادشاہ نے انتقال کیا اور ایک سال کی حکومت کے بعد اس کا بیٹا بھی ایک خونی کے ہاتھ سے مارا گیا تو امرا نے اس کے بھتیجے شمس الدین کو غور کا بادشاہ بنایا اور وہی سلطان غیاث الدین کے نام سے ۵۵۶ھ (۱۱۶۱ء) میں تخت نشین ہوا۔

اس بادشاہ نے اپنے بھائی شہاب الدین کو غزنی کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اسی نے آئندہ پنجاب اور ہندوستان پر حملے کیے اور اس کا دوسرا لقب "سلطان معز الدین محمد بن سام" یا سلطان محمد غوری زیادہ مشہور ہے۔

ہندوستان پر حملے اور دہلی کی فتح

محمود غزنوی کے نئے جانشینوں کو یہ گوارا نہ ہو سکتا تھا کہ اس کی میراث میں پنجاب جیسا شاداب صوبہ بچا رہے۔ چنانچہ دوسری طرف سے اطمینان ہوتے ہی شہاب الدین نے مشرق کا رُخ کیا۔ اور پہلے اُچھ کو فتح کیا جو دریائے سندھ اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے۔ دو سال بعد اس نے سندھ کے راستے سے گجرات پر فوج کشی کی مگر تھر کے ریگستان میں مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اور کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

ماورائے سندھ کے علاقے پر قبضہ ہونے کے بعد شہاب الدین یا محمد غوری نے لاہور پر تین حملے کئے اور آخر سلطان خسرو ملک کی گرفتاری کے ساتھ خاندان غزنویہ کا چراغ گل ہو گیا (۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء)۔

"ہندوستان" پر فوج کشی کرنے میں اب کوئی سدِ راہ حائل نہ تھی لیکن گو ہندو رجواڑے متحد نہ تھے، پھر بھی اتنے طاقتور ضرور تھے کہ اسلامی فوجوں کو احتیاط سے آراستہ کرنے کی ضرورت تھی۔ دوسرے مغربی ہمسایوں سے بھی چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ غرض کئی سال تک غوریوں کو پنجاب سے آگے بڑھنے کا موقع نہ ملا۔

۵۸۶ھ/۱۱۹۰ء میں محمد غوری نے ستلج کو عبور کیا اور بھٹنڈے قلعے پر قابض ہو گیا جو ان دنوں پرتھی راج کی عملداری میں داخل یا اس کی سرحد کے بالکل قریب تھا، یہ ہم پہلے حصے میں پڑھ چکے کہ اس سن چلے راجہ کو دہلی اور اجمیر کی وہ ریاستیں ورثے میں ملی تھیں اور اسی لئے گو بعض ہمسایوں سے اس کی ان بن تھی، پھر بھی وہ بہت طاقتور اور دولت مند راجہ تھا اور سلطان سے مقابلے کے وقت بہت سے راجپوت سردار بھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے؛ اس کے دہلی آنے کی خبر سُن کر محمد غوری بھی (اگرچہ وہ کسی بڑی لڑائی کے لئے تیار ہو کر نہ آیا تھا) بھٹنڈے سے آگے بڑھا اور تھانیسر کے قریب موضع تراین پر فریقین کا مقابلہ ہوا کثرتِ تعداد کے سامنے بہت جلد بعض افغان سرداروں کے قدم اکھڑ گئے خود محمد غوری نے جان بازی دکھانے میں کمی نہ کی تھی لیکن جب وہ زخم کھا کر بیہوش ہوا تو پھر اس کی فوج کو سنبھالنے والا کوئی نہ رہا اور مسلمانوں کو سخت شکست ہوئی۔

پرتھی راج کی یہ کامیابی دیرپا نہ تھی۔ دوسرا سال محمد غوری نے ازسرِ نو فوجوں کو

[1] یہاں سے باب ہفتم کے اخیر صفحہ ۱۵۱ تک تمام مضمون گھین کی تاریخ ہند جلد اوّل (صفحہ ۳۹ تا ۹۰) سے ماخوذ ہے۔

مرتب کرنے میں صرف کیا اور کوہ و بیابان میں جہاد کی قرنا پھونک دی۔ چنانچہ ایک سال بعد ۱۱۹۲ء میں وہ پھر پنجاب میں داخل ہوا اور گو اس کے لشکر میں ملک ملک کے سپاہی جمع تھے تاہم سب کے دل میں ایک ہی مذہب کا جوش بھرا ہوا تھا۔ ایک عینی شاہد کے قول کے بموجب ایک لاکھ سات ہزار سر فروش صبا رفتار ترکمانی گھوڑوں پر سوار سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہنے لشکر میں شامل تھے۔ پچھلی شکست سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے سیدھے سادے طریق جنگ کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ ان پر جب حملہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنی صفیں کھول دیتے ہیں اور دشمن صفوں کے اندر بڑھ آتا ہے تو پلٹ کر بازوؤں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اس دفعہ بھی اسی ترائن کے میدان میں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور اس مرتبہ پرتھی راج کی طرف پہلے سے زیادہ حلیف اور باجگزار راجہ لڑنے آئے، لڑائی میں اس نے پھر وہی بازوؤں کو لپیٹنے کی چال چلنی چاہی تھی مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی گھرنے سے پہلے غوریوں نے ہٹ ہٹ کر حملے شروع کئے اور اپنے پیہم حملوں سے ہندوؤں کی پھیلی ہوئی صفوں کو بیچ میں اکٹھا کر دیا۔ سلطان محمد غوری رسالہ لئے تیار کھڑا تھا یہ دیکھتے ہی اس نے دھاوے کا حکم دیا اور گھوڑے اڑا کر دشمن پر جا پڑا، ادھر تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ برسا دیا کہ پہلوؤں سے کوئی حملہ نہ ہو سکے۔ غرض راجپوتوں کا ٹڈی دل لشکر منتشر ہو گیا۔ پرتھی راج ہاتھی سے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جانا چاہتا تھا کہ کسی نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ غزنی روانہ کر دیا گیا تھا لیکن راستے ہی میں مر گیا، اور اس کی مصیبت و شجاعت کے فسانے چاند بھاٹ کی بدولت باقی رہ گئے جو اپنے محبوب آقا کے بہت دن بعد تک زندہ اور اس کی تعریف کے گیت گاتا رہا۔

شمالی ہند کی فتوحات

ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد مسلمانوں کا ریاست دہلی اور قریب کے علاقوں پر قبضہ ہو گیا۔ دہلی اس زمانے میں چھوٹی سی بستی تھی لیکن پنجاب کے جنوبی علاقے کے واسطے مسلمانوں نے اسی کو اپنا صدر مقام بنایا اور ان کے یہاں آ کر آباد ہونے سے اس کی آبادی اور عمارتوں میں بہت جلد ترقی ہونے لگی۔

سلطان محمد غوری نے ان علاقوں کا صوبہ دار ایک ترک غلام قطب الدین ایبک کو بنا دیا تھا لیکن سال ڈیڑھ سال بعد اسے قنوج کے طاقتور راجہ جے چند سے

لڑنے کے لئے پھر ہندوستان آنا پڑا۔ ہندوؤں سے پھر ایک بہت بڑی لڑائی ۵۹۰ھ یا ۱۱۹۴ئہ میں اٹاوے کے قریب ہوی جس میں جے چند مارا گیا اور **دوآب** کے تمام زرخیز علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بعد خود سلطان محمد غوری کو ہندوستان خاص علاقوں میں آنے کی ضرورت نہیں ہوی اور اس کے عہدہ دار یہاں کی چھوٹی بڑی ریاستوں کو فتح کرتے اور ان کی مالگزاری سلطان کو غزنی بھیجتے رہے۔ اور جب اس عالی حوصلہ سلطان کو چند خونیوں نے دھوکے سے حملہ کر کے قتل کیا (۶۰۲ھ ۱۲۰۶ئہ) تو اس وقت بھی نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے سلطنت کے وارث اس کے ترک غلام ہوے جن میں تین بہت مشہور ہیں:

(۱) **تاج الدین یلدز** جو غزنی میں سلطان محمد غوری کا جانشین ہوا۔

(۲) **ناصر الدین قباچہ** جو سندھ میں خود مختار ہوگیا۔

(۳) **قطب الدین ایبک** جو تمام شمالی ہندوستان میں سلطان محمد غوری کا جانشین ہوا۔

حصّہ دوم

دورِ وسطیٰ

از ۱۲۰۶ء تا ۱۷۶۵ء

بابِ اوّل

سلطنتِ دہلی

ہندوستان کا دوسرا دور ۱۲۰۶ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ سلطنت دہلی کی بنیاد پڑی۔ شہاب الدین غوری سے پہلے جن اسلامی طاقتوں نے ہندوستان پر حملے کئے تھے وہ دیرپا نہ تھے۔ ان حملہ آوروں نے جن میں محمود غزنوی اور اس کے پیشرو شامل ہیں ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم نہیں کی اور ان حملوں کے باوجود ہندوستان کی پرانی راجدھانیاں جوں کی توں قائم رہیں اور آج سے پانچ صدی پہلے عربوں نے جو سندھ فتح کیا تھا تو ان کی فتوحات سندھ سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ اس کو سلطنت دہلی نہیں کہہ سکتے۔ البتہ شہاب الدین غوری کی فتوحات مستقل ثابت ہوئیں۔ شہاب الدین پہلا اسلامی فاتح ہے جس نے ہندوستان میں آیندہ سلطنت دہلی کا سامان پیدا کر دیا۔ لیکن جب تک شہاب الدین

زندہ رہا ہے اس نے ہندوستان کو اپنا گھر نہیں بنایا تھا بلکہ وہ غزنی اور غور میں بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کرتا تھا چنانچہ اس کی زندگی تک ہندوستان پر جو حکومت تھی وہ باہر کی تھی اور اس طرح وہ سلطنت دہلی نہ تھی۔ لیکن جب ۱۲۰۶ء میں شہاب الدین غوری کا انتقال ہوا اور قطب الدین ایبک ہندوستان میں اس کا جانشین ہوا تو صحیح معنوں میں سلطنت دہلی کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ قطب الدین ایبک کو غزنی اور غور سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ دہلی اس کا پائے تخت تھی اور اسی جگہ سے وہ ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔

ایک تو قطب الدین ایبک کا ۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں خود مختار ہونا سلطنت دہلی کی مبارک فال تھی دوسرے اسی سنہ سے قطب الدین نے یہ کوشش شروع کر دی کہ تمام ہندوستان کو مسخر کر کے ایک متحدہ سلطنت قائم کرلے اور ہندوستان کو اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ راجہ ہرش کے بعد سے اب تک ساڑھے پانچ سو سال ہو چکے تھے اور اس دوران میں کوئی متحدہ سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ ہندوستان مختلف راجپوت خاندانوں میں بٹا ہوا تھا۔ قطب الدین ایبک زمانہ وسطی کا پہلا حکمراں ہے جس نے شمالی ہندوستان کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کی کوشش کی۔ ہندو طاقتوں کے مقابلے میں وہ ایک حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن یلدوز اور قباچہ کے مقابلے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ وہ اس کے ہمسر تھے اور طاقت میں اسکے ہم پلہ تھے۔ اس لئے قطب الدین نے ان لوگوں کو شادی بیاہ کے ذریعے اپنے دام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ اس طریقے سے اس نے متحدہ سلطنت دہلی کا ایک خاکہ تیار کر دیا جو بعد کے آنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔

اجمیر شمالی راجپوتانہ اور بہار و بنگالہ سلطان محمد غوری کی زندگی میں مفتوح ہو چکا تھا اور اگرچہ بنگالے کے وسیع مشرقی صوبوں کو محمد بن بختیار خلجی نے محض اپنی جوانمردی سے فتح کیا تھا اور سلطان یا قطب الدین ایبک سے کوئی مدد نہیں لی تھی تاہم اس نے اور اس کی وفات (۶۰۳ھ ۱۲۰۷ء) کے بعد اس کے جانشینوں نے ہندوستان کے دوسرے عہدہ داروں کی طرح قطب الدین ایبک کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ہندوستان کا سب سے پہلا اسلامی بادشاہ وہی ہے۔ البتہ پنجاب کے لئے یلدز اور قباچہ سے قطب الدین کی کئی بار لڑائی ہوئی کیونکہ وہ اس ملک کو اپنی اپنی عملداری میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قطب الدین کی جنگی قوت اور تدابیر کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی اور قطب الدین بادشاہ ہونے کے بعد ہی لاہور پہنچ گیا اور زیادہ تر وہیں مقیم رہا کہ اس کے حریفوں کو پنجاب پر قبضہ کرنے کی ہمت نہ ہو۔

قطب الدین ایبک نے دہلی میں رائے پتھورا کے قلعے کو شاہی محل بنا لیا تھا لیکن محل کے اندر جو مندر تھے ان کے بجائے اس نے ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کرائی جسے "قوت الاسلام" کہتے ہیں۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اور مسجد کے مشرقی گوشے کے

باہر مشہور و معروف قطب صاحب کی لاٹھ مخروطی شکل میں ۶۸ گز اونچی بنی ہوئی ہے۔ زمین پر اس کا دور کا قطر ۱۶ گز کے قریب ہے مگر اوپر جا کے صرف تین گز رہ جاتا ہے۔ اس منار کے سات درجے یا کھنڈ تھے اور اب پانچ باقی رہ گئے ہیں مگر اول اول صرف دو درجے بنائے گئے تھے اور یہ جس جگہ ختم ہوتے ہیں وہاں باہر کی طرف جھروکے نکال کے انہیں قابل دید توسوں پر جو منار کے پورے محیط کے گرد بل کھائی ہوئی ہیں قائم کر دیا ہے منار و مسجد دونوں پر سلطان شہاب الدین محمد غوری کی یادگار میں بڑے بڑے عربی کتبے کندہ ہیں۔

اپنی بادشاہی کے باقی چند سال میں ایبک نے دکھا دیا کہ وہ جیسا لائق اور وفا شعار خادم تھا ویسا ہی بیدار مغز اور دلیر آقا بننے کی بھی قابلیت رکھتا ہے۔ لیکن بادشاہی پانے کے بعد وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہا اور لاہور میں چوگان (پولو) کھیلتے میں گھوڑے سے گرا اور اسی چوٹ سے سنہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں وفات پائی۔ اس کے زمانے میں ہندوؤں کی قوت ٹوٹی اور مسلمانوں کی حکومت استوار ہوئی اور ایک مورخ کے الفاظ میں "سلطنت دوستوں سے آباد اور دشمنوں سے پاک ہوئی کیونکہ جس طرح سلطان کی فیاضیاں لا انتہا تھیں اسی طرح اعدا کی خون ریزی کا سلسلہ بھی غیر منقطع تھا"۔

سلطان شمس الدین التمش

لاہور میں قطب الدین ایبک کے ایک بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا لیکن پائے تخت دہلی کے امیروں نے شمس الدین (التمش) کو جسے قطب الدین کی بیٹی بیاہی تھی بلا بھیجا کہ آئے اور اپنی بادشاہی کا دعویٰ کرے۔ شمس الدین کو بچپن میں اس کے بھائیوں نے بیچ دیا تھا اور بخارا کے بردہ فروشوں نے اسے لا کے سلطان ایبک کے ہاتھ فروخت کیا تھا اپنی قابلیت سے اس نے یہاں بہت جلد رسوخ و امتیاز حاصل کر لیا اور سواران خاصہ کی سرداری پر مامور کیا گیا۔ پھر سلطان کے انتقال سے کچھ عرصے قبل رسالے کا سپہ سالار اور بداؤں کا صوبہ دار ہوا۔ ابھی اس کا زمانۂ شباب تھا اور ایک با اثر جماعت اس کی طرفدار ہو گئی تھی۔ اپنے برادر نسبتی کے حامیوں کو مغلوب کرنے میں بھی کچھ بہت عرصہ نہ لگا اور ایک معمولی کشمکش کے بعد (سنہ ۶۰۷ھ مطابق سنہ ۱۲۱۰ء میں) شمس الدین التمش دہلی کے تاج و تخت کا مالک ہو گیا۔

نئے سلطان کو اول یلدز کے مقابلے میں سب سے زیادہ زحمت اٹھانی پڑی اور ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں اس کا یہ شمالی حریف مغلوب و اسیر ہوا تو دو برس بعد قباچہ نے پنجاب پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ قباچہ نے بہت سے کافر مغلوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا تھا اور ان خونخوار وحشیوں نے اس زمانے میں اپنے مشہور سردار چنگیز خاں یا تموجین کے ماتحت ہر طرف ہلچل ڈال رکھی تھی چنانچہ جس وقت ہندوستان کی زمام سلطنت التمش کے ہاتھ میں تھی، اس وقت یہ خراسان پر قابض ہو چکے تھے اور ان کا سیلاب وادی ہلمند کی طرف امنڈ رہا تھا بلکہ (۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں) خود چنگیز خاں شاہ خیوا کے تعاقب میں دریائے سندھ تک بڑھ آیا تھا لیکن اس نے دریا کو عبور نہیں کیا اور اس وقت یہ بلا ٹل گئی پنجاب پر سلطان شمس الدین کا پوری طرح قبضہ جم گیا۔

۶۲۲ھ مطابق ۱۲۲۵ء میں سلطان التمش نے مشرق کی جانب فوج کشی کی کیونکہ محمد بن بختیار کے خلجی وارث اب علانیہ بنگالے میں علیحدہ سلطنت بنانے کا سامان کر رہے تھے۔ لشکر شاہی نے شہر گور پر قبضہ کر لیا اور وقت کے وقت خلجیوں نے اطاعت کر لی۔ لیکن جب سلطان وسط ہند میں مزید فتوحات حاصل کر رہا تھا، بنگالے کے خلجیوں نے پھر انحراف کیا۔ اس مرتبہ سلطان کے بیٹے نے ان کی سرکوبی کی اور یہ شرقی علاقے مستقل طور پر سلطنت دہلی کے صوبے بن گئے۔

سلطان شمس الدین آیندہ تین سال تک برابر جنگ و جدال میں مصروف رہا پہلے اس نے رنتھنبور کا مستحکم قلعہ فتح کیا جو مشرقی راجپوتانے اور شمالی مالوے کی کنجی تھا اور اس قلعے کا راجپوتوں کے ہاتھ سے نکلنا تھا کہ یہ تمام زرخیز علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا پھر ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء میں قلعۂ گوالیار کو محصور کر کے فتح کیا اور اب کہنا چاہئے کہ کل "ہندوستان" مسلمانوں کے زیر فرمان آگیا۔ مگر وہ علاقے بھی جو براہ راست مسلمانوں کی عملداری میں آئے، اپنے دینی اور عدالتی معاملات میں آزاد چھوڑ دیئے گئے تھے اور ان کے پرانے رسم و رواج میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی۔

یہ ابتدائی ترکمان بادشاہ اگرچہ ان دشمنوں پر جو مقابلے پر اڑے رہیں رحم نہ کرتے تھے لیکن جس علاقے کی آبادی یا رئیسوں نے مخالفت نہ کی ان کے ساتھ وہ ہمیشہ نرمی سے پیش آئے اور ان کی رواداری اسی سے ظاہر ہے کہ سرکاری سکوں پر ہندوؤں کی . جو

خاص علامتیں قدیم سے کندہ ہوا کرتی تھیں انھیں اسی طرح رہنے دیا۔ دوسرے یہی زمانہ ہے جس سے ہندو شاستر کی آخری تدوین منسوب کرنے لگے ہیں اور اصلاح قوانین کی کسی تحریک کا اس زمانے میں پیدا ہونا گواہی دیتا ہے کہ ہندوؤں کو امن و اطمینان حاصل تھا۔

اپنی جنگی مصروفیت کے باوجود سلطان امن کے کام کرنے کی بھی فرصت نکال لیتا تھا اور مسجد قوت الاسلام کے قریب ایک مدرسہ اور مقبرہ اب تک اپنے بانی شمس الدین التمش کی یاد دلاتا ہے۔ مسجد کے دالانوں کو بھی اس نے بہت کچھ وسیع کیا کہ قطب مینار احاطے کے اندر آجائے اور خود اس مینار کے بالائی درجے تعمیر کئے۔ حق یہ ہے کہ سلطان کی ناموری میں اب کوئی کسر باقی نہ تھی۔ ہمالیہ سے بندھیاچل تک اور سندھ سے برہم پتر تک سارا ہندوستان اس نے فتح کیا اور ہر جگہ اقبال وظفر مندی نے اس کی تلوار کا ساتھ دیا۔ پھر یہ کہ اس کی بادشاہی صرف تلوار کے زور پر مبنی نہ تھی بلکہ خلیفۂ بغداد نے اسے خلعت حکومت بھیج کر اس کی تصدیق کر دی تھی۔ کیونکہ گو خلافت بغداد کی سیاسی قوت میں زوال آگیا تھا لیکن اس کا دینی اعزاز و احترام تمام دنیائے اسلام کی نظر میں اسی طرح قائم تھا اور اب بھی وہ مذہب کا سب سے برگزیدہ پیشوا مانا جاتا تھا۔ خلافت کی جانب سے دہلی میں جو سفیر مامور ہو کر آیا وہ نہایت متین و فہیم شخص تھا اور اس کے مشورے کا ہمیشہ لحاظ اور ادب کیا جاتا تھا۔ دیگر صاحبان علم و فضل کی بھی دربار میں کمی نہ تھی اور چنگیز خانی یورشوں سے جان بچا کر بہت سے نامور مسلمان شہزادے اور علماء دہلی میں آرہے تھے۔

سلطانہ رضیہ

اس اقبال مند بادشاہ نے ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں دار آخرت کی راہ لی۔ بنگال کا فاتح اور اس کا بڑا بیٹا پہلے انتقال کر چکا تھا چھوٹا بیٹا رکن الدین بلا خرخشے وارث تاج و تخت ہو گیا۔ مگر اس میں فرائض بادشاہی بجالانے کی اہلیت نہ تھی اور بالکل اپنی ماں کے اشارے پر چلتا تھا۔ یہ ترکمان خاتون اگرچہ دھن کی پکی تھی لیکن دور اندیش نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ خود اہل محل نے فساد کیا اور سلطان اور اس کی ماں قید ہو گئے۔ تخت شاہی نے سلطان کی بہن رضیہ سے زینت پائی۔ مسلمانوں کے دور میں سلطنت ہند پر کسی عورت نے کبھی فرماں روائی کی تو یہی تیز فہم و بلند ہمت شہزادی ہے جو نہایت پر آشوب زمانے میں

کچھ عرصے تک اپنی سلطنت سنبھالے رہی، وہ مردانہ لباس پہن کر بے نقاب باہر نکلتی تھی جنگ میں ہاتھی پر سوار ہو کر فوجوں کو لڑاتی تھی۔ دربار میں تختِ عدالت پر جلوس کرتی اور تمام فرائض شاہی انجام دیتی تھی، لیکن اس شور و شر کے وقت میں عورت ایک طرف، خود کسی معمولی قابلیت کے مرد کا جگہ پر برقرار رہنا محال تھا، رضیہ سلطانہ سے لوگوں نے سرکشی کی اور تین سال کی حکومت کے بعد معزول کر کے قید کر دیا لیکن جس امیر کے پاس قید کی گئی تھی اس نے رضیہ سے نکاح کر لیا۔

یہ واقعات دہلی کے باہر کے ہیں۔ خاص پایۂ تخت میں رضیہ کے بھائی بہرام نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ اور جب رضیہ مقابلے کے لئے ازسرِ نو فوج لے کے چلی تو لڑائی میں اسے شکست ہوئی۔ وہ اور اس کا شوہر دونوں میدان سے فرار ہو گئے پھر وہ قصبۂ کیتھل کے قریب جان بچا کر کہیں بھاگنا چاہتے تھے کہ بعض گنواروں نے انھیں پکڑ لیا اور ماہ ربیع الاول ۶۳۷ھ مطابق اکتوبر ۱۲۳۹ء میں دونوں کو قتل کر ڈالا۔[۱]

دوسرے سال کفار مغل نے شہر لاہور چھین کر خون کی ندیاں بہا دیں اور تھوڑے ہی عرصے میں ہجوم آفات نے بہرام کو بتا دیا کہ جس کلاہ کو بدنصیب بہن سے لے کر اپنے سر پر رکھا تھا وہ دردِ سر سے خالی نہ تھی مغلوں سے لڑنے کے لئے اس نے جو فوج جمع کی تھی اس نے خود بادشاہ کو محل میں محصور کر لیا اور ۶۳۹ھ مطابق ۱۲۴۱ء میں زبردستی اندر گھس آئی۔ اسی فساد میں بہرام مارا گیا۔

سلطان رکن الدین کا بیٹا اور التمش کا پوتا علاء الدین تخت کا وارث ہوا۔ محل کے ناز و نعم میں پل کر عام طور پر جو حالت ہو جاتی ہے وہی اس شہزادے کا حال تھا کہ نہ کام کی لیاقت تھی نہ فرض شناسی کی پروا۔ سلطنت مسلمان امیروں نے آپس میں بانٹ لی تھی پنجاب کو مغلوں کی یورشیں پامال و خراب کر رہی تھیں سلطان علاء الدین مغلوں کے مقابلے کو نکلا اور ایک لحاظ سے فتح بھی سلطان کی ہوئی لیکن اس کامیابی نے بادشاہ کی رہی سہی عقل کو بگاڑ دیا اور اس نے وہ وہ حرکتیں کیں کہ لوگوں نے بیزار ہو کر اس کے خلاف سازش کی اور قتل کر دیا۔ یہ ماہ محرم (۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء) کا واقعہ ہے اور اس کے بعد سلطنت

[۱] سلطانہ رضیہ بیگم کی نعش دلی سے چند میل کے فاصلے پر جمنا کے کنارے دفن کی گئی اور وہاں زائروں کا ہجوم رہتا تھا۔

سلطان ناصر الدین محمود

ناصر الدین کے حصے میں آئی جو شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا؛ یہ بادشاہ نہایت مرنجان و مرنج اور متقی پرہیز گار شخص تھا۔ اور خود اس کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ رہتی تو شاید وہ اس کی مشکلات پر غالب نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ ایک طرف ہندؤوں نے سر اٹھا رکھا تھا اور دوسری طرف مغلوں نے غزنی پر مستقل قدم جمانے کے بعد ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو اپنی جولان گاہ بنا لیا تھا؛ لیکن سلطنت کے ایک جواں مرد سردار کی لیاقت و مستعدی سے ان تمام خطرات کا دفیعہ ہوگیا۔ اس سے ہماری مراد اُلغ خاں (بلبن) سے ہے جو بہت تیز ترقی کر کے وزارت کے منصب جلیل پر سرفراز ہوگیا تھا اور آئندہ اس سے بھی بڑا رتبہ اور زیادہ ناموری کے کام اس کے نصیب میں تھے؛ وہ ترکی خانان البری کے خاندان سے تھا اور بردہ فروشوں نے اسے اور اس کے ساتھ کئی اور لڑکوں کو شمس الدین التمش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یاد ہوگا کہ خود یہ سلطان اسی نسل سے تھا اور اپنے ہم وطنوں پر نوازش و کرم کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا؛ غرض ۶۲۹ھ سنہ میں جب کہ سلطان شمس الدین کے ملوکوں نے اپنے محبوب آقا کے نام پر "خواجین شمسی" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت مرتب کی؛ الغ خاں ہندوستان آیا اور سلطانہ رضیہ کے عہد میں ترقی کر کے میر شکار کے عہدے پر مامور ہوا آئندہ شورش و انقلاب میں بھی وہ اسی عہدے پر بحال رہا اور ہانسی اور ریواڑی کا علاقہ اسے جاگیر میں عنایت ہوا۔ سلطان علاء الدین کے زمانے میں مغلوں سے پنجاب میں مقابلہ ہوا تو بادشاہی فوج کا سپہ سالار وہی تھا۔ اور وہاں سے واپس آنے کے بعد اس انقلاب کے منصوبے میں علانیہ شریک اور کوشاں تھا جس نے بالآخر ناصر الدین کو تخت شاہی پر متمکن کر دیا؛ سلطان کے عہد کی باقی تاریخ محض اس کے وزیر کے کارناموں کی سرگذشت ہے اور اسی لئے اُلغ خاں کی وفاداری اور آخر تک اپنے دیندار حلیم الطبع آقا کی خدمت میں سرگرم اور اپنی ماتحتی پر قانع رہنا اور بھی زیادہ ستایش کا مستحق ہے خواہ اسے مصلحت اندیشی کہا جائے خواہ فرض شناسی؛ اس میں کچھ کلام نہیں کہ یہ طرز عمل اس کے حق میں باعث فلاح و اعزاز ثابت ہوا۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اتنی قوت حاصل کرنے کے بعد یہ خوش نصیب وزیر دشمنوں کی ریشہ دوانی سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا اور کم سے کم ایک مرتبہ جب وہ معتوب ہوا تو

معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اقبال کا ستارہ روبہ زوال ہے لیکن یہ چند روز کی بات تھی۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد وہ پھر سرخرو اور اپنے عہدے پر بحال ہوگیا۔ انھی دنوں کچھ عرصے تک لوگوں کو قحط کی تکلیف اٹھانی پڑی تھی اور الغ خاں کی مراجعت کے بعد ہی باران رحمت نے اس بلا سے نجات دی۔ ہمعصر مؤرخ نے اس واقعے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ اگر لوگوں نے اس کے دہلی واپس آنے کو فالِ نیک تصور کیا اور خدا کا شکر بجالائے تو یہ تعجب کی بات نہ تھی۔

اس کے دشمنوں نے دوسری مرتبہ دوآب کے لوگوں کو بغاوت کا اشتعال دلایا اور اس شورش کے پردے میں اس کی بیخ کنی کرنی چاہی لیکن الغ خاں نے یہ شورش فرو کردی اور یہی انجام ایک دوسری شورش کا ہوا جس کی آگ چتوڑ کے قلعے سے بھڑکائی گئی تھی۔ اسی سال خود پائے تخت میں ایک خوفناک سازش کا حال کھلا اور اس کا قرار واقعی تدارک کردیا گیا۔ سنہ ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) میں پھر مغلوں نے ملتان کے راستے یورش کی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عام گزرگاہ یہی تھی لیکن اس مرتبہ وہ اتنی تعداد میں آئے اور ایسا ہراس پیدا ہوگیا تھا کہ مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے شعرا کو قومی نظمیں لکھنے پر مامور کیا گیا۔ مگر الغ خاں نے دوبارہ ان شمالی دشمنوں کو ملک سے رفع کردیا۔

مغلوں کی سفارت

جن دنوں ہندوستان میں یہ واقعات پیش آرہے تھے، وسط ایشیا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا یعنی چنگیز خاں کے پوتے اور ماوراءالنہر کے سردار ہلاکو خاں نے شہر بغداد کو فتح کرکے خلفائے عباسیہ کے آخری تاجدار مستعصم باللہ کو قتل کردیا اور اپنی قوت کو وسط ایشیا میں مستحکم کرنے کی غرض سے ارادہ کیا کہ ہندوستان کی طرف جو مغل فوجیں پھیلی ہوئی تھیں انھیں واپس بلائے۔ کیونکہ اوّل تو اسی زمانے میں منگو خاں مرگیا جو جنوب میں مغلوں کے ٹڈی دل کا سپہ سالار تھا اور دوسرے شاید الغ خاں وزیر کی تلوار نے بھی اپنا رعب جمادیا تھا غرض سنہ ۶۵۷ھ (۱۲۵۹ء) میں مغلوں نے دربار دہلی سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے چاہے اور اپنے ایلچی روانہ کئے۔ ادھر الغ خاں وزیر نے بڑی شان و شکوہ کے ساتھ مغل سفیروں کے استقبال کا سامان کیا۔

اس زمانے میں سلطان ناصرالدین پرانی دہلی کی سکونت چھوڑ کر جمنا کے کنارے

کلو کھڑی کے محل میں آگیا تھا۔ سفارت اسی جگہ باریاب ہوی۔ پیشوائی کے لئے محل کے دروازے تک مسلح پیادہ و سوار سپاہ کی بیس صفیں کھڑی تھیں اور عقب میں عماری دار ہاتھیوں کی قطاریں تھیں۔ اس جنگی ساز و سامان کے علاوہ خاص محل کے دروازے پر چند قیدیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں جنھیں غالباً اسی پرہیبت موقع کے واسطے قتل کرا کے کافور وغیرہ بھروا دیا تھا۔ یہ گویا ہندوستان کے وزیر نے اپنی سیاست کا نمونہ دکھایا تھا۔

غرض سفیر اس راستے سے گزر کر دربار کے ایوان میں پہنچے جہاں انھوں نے ہندوستان کے معمر و سادہ مزاج فرماں روا کو دیکھا جس کے گرد امیر وزیر راجہ اور راج کمار صف بستہ کھڑے تھے، پھر اپنے بادشاہ کا پیام عرض کرنے کے بعد انھیں داب شاہانہ کے ساتھ رخصت کیا گیا اور وہ اپنی فرودگاہ میں پہنچا دیے گئے۔

الغ خاں یہ سب کام سلطان کے نام سے انجام دیتا تھا اور اس کا سبب خوانین شمسی کی رقابت تھی جو عرف عام میں "چہل گانی" کہلاتے تھے لیکن جب کبرسنی اور مسلسل ناکامی نے انھیں رفتہ رفتہ ضعیف کر دیا تو وزیر کی قابلیت اور کارناموں کی شہرت روز بروز زیادہ ہوتی گئی حتیٰ کہ بوڑھے بادشاہ نے رحلت کی اور الغ خاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا (ماہ جمادی الاول سنہ ۶۶۴ھ مطابق سنہ ۱۲۶۶ء) اس سے ٹھیک چوالیس برس پہلے وہ شہر دہلی میں داخل ہوا تھا اور شمس الدین التمش نے بردہ فروشوں سے چند دینار کے عوض اسے خریدا تھا۔ اس کے ابتدائی زمانۂ ترقی میں خاص طور پر دیکھنے کے لائق یہ امر ہے کہ اس عہد میں کس طرح ادنیٰ درجے کے غلاموں کو عروج حاصل کرنے کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ بڑھتے بڑھتے تخت شاہی تک پہنچ جاتے اور اسی پر ایک حد تک اسلامی سلطنت کا قیام اور استحکام مبنی تھا۔ سبکتگین سے لے کر کئی صدی آگے تک وسط ایشیا کے بردہ فروشوں ہی کے طفیل ہندوستان کے نامی و بلند حوصلہ فاتح میدان عمل میں آئے تھے اور اگرچہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کہ یہاں بھی جاں نثاروں کی ایک باقاعدہ فوج مرتب ہو جاتی، تاہم یہ گویا ایک جماعت محفوظ تھی، جس سے حسب ضرورت مدبرین سلطنت اور سپہ سالاروں کی اتنی کافی تعداد مہیا ہو جاتی تھی کہ بادشاہی فوجوں کی میدان جنگ میں سپہ سالاری کرے اور زمانۂ امن میں نظم و نسق قائم رکھے۔ اور ان کے حسن انتظام کی بڑی شہادت یہ ہے کہ رعایا آسودہ حال تھی کیونکہ اس کے بغیر بادشاہی درباروں کی شان و شوکت سمر کاری

عمارات کی تعمیر اور دیوانی اور فوجی مصارف کا پورا ہونا ممکن نہ تھا۔ بہر حال غلاموں کے اس طرح چھوٹے عہدوں سے بڑھ کر مسند وزارت اور تخت شاہی تک پہنچنے کا طریقہ، "قانون بقائے اصلح" کے عین مطابق تھا اور غیر ملک میں بہتر سے بہتر آدمی کا برسر اقتدار ہونا ہمیشہ سلطنت کے لئے موجب استحکام ہوتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان "غلام بادشاہوں" کے عہد میں قریب قریب ڈیڑھ صدی تک ہندوستان کی سلطنت نہایت طاقتور رہی اور اس دور میں ایک ناصرالدین ہی ایسا موروثی بادشاہ گزرا ہے جو مدت دراز تک بادشاہی کرتا رہا۔

سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ تا ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۷ء

الغ خاں جس وقت بادشاہ ہوا تو اس کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ تختِ سلطنت پر جلوس کرتے وقت اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کا لقب اختیار کیا اور اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اس قدر سن رسیدہ ہونے کے باوجود ابھی اسے بہت دن جینا تھا اور جس قوت و قابلیت سے اس نے وزارت کے زمانے میں کام کیا تھا وہی اس کے عہد شاہی کی خصوصیات ہیں۔ البتہ اب وہ شان و شکوہ جو اس کے رتبۂ شاہی کے شایان تھی، اور بڑھ گئی تھی۔ عہد بلبن کے حالات ہمیں زیادہ تر ضیاءالدین برنی سے ملے ہیں جس نے سو برس بعد اپنی تاریخ تالیف کی تھی اور مورخ کا خاص اس زمانے میں نہ ہونا ہی اس کی تحریر کو زیادہ مستند کر دیتا ہے کیونکہ اس کی نسبت کسی خوشامد یا طرف داری کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس نے اپنے دلی شوق سے طبقات ناصری کے آگے کے حالات لکھے ہیں تاکہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سلسلہ قائم رہے (طبقات ناصری وہ کتاب ہے جس میں عہد ناصرالدین تک کے واقعات جمع ہیں) اور برنی نے جو کچھ لکھا ہے وہ خاص اپنے دادا یا ان راویوں سے سن کر لکھا ہے جو بلبن کے زمانے میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔

سابق وزیر کے بادشاہ ہوتے ہی عہدہ داروں کی سرکشی اور نافرمانی نسیاً منسیاً ہو گئی فوج کی نئے سرے سے تنظیم عمل میں آئی اور سپہ سالاری کی خدمت صرف ان سرداروں کے واسطے مخصوص کر دی گئی جو اس کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتے تھے عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی جانے لگی کہ بادشاہ کے پہلے رفیق بھی اپنے قصور کی سزا پانے سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے

خود بادشاہ نہایت منصف مزاج متقی اور متین تھا اور کبھی زور سے نہ ہنستا تھا نہ کسی دوسرے کی مجال تھی کہ اُس کے سامنے مزاح یا تمسخر کی کوئی بات زبان سے نکالے نئے علاقوں کی فتوحات و کشور کشائی کا اس نے خیال ہی چھوڑ دیا تھا اور ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے میں اپنی تمام قوت لگا دی تھی ۔ اس کے امیر وزیر ہر چند عرض کرتے کہ یہ بات شان جہاں داری کے خلاف ہے ۔ مگر بلبن ان کی باتیں سن کر ملک گیری کے لالچ میں نہ آتا اور کہتا تو یہی کہتا کہ "ہمیں پہلے مغلوں کے مقابلے کا سامان کرنا ہے ۔ اس فکر سے نجات مل جائے گی تو پھر راجہ و رانا کو بھی زیر کر لیں گے" مگر شاہی فوجیں بیکار وقت گزارنے کے لئے نہ تھیں سابق میر شکار (یعنی بلبن) انھیں ہمراہ لے کے شکار کے لئے بھی جاتا تو اسی ضابطے اور داب شاہانہ کے ساتھ جو اس کی خاص طرز تھی ۔ دہلی کے ارد گرد چالیس میل تک تمام جنگل بادشاہی شکار گاہ میں داخل تھا ۔ اور سردی کے موسم میں بلبن ہزار سپاہیوں کو ساتھ لئے دن دن بھر شکار کے تعاقب میں جنگل چھانتا پھرتا تھا ، مغلوں کو بادشاہ کے صید افگنی کی خبر پہنچی اور اسے سن کر ان کا سردار چلایا "شکار کے دھوکے میں نہ رہنا ۔ بلبن بڑا آزمودہ کار سپاہی ہے اس کا یہ شکار محض سیر و تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ کچھ زیادہ پُر معنی مشغلہ ہے" اور حقیقت میں بہت دن نہ گزرے تھے کہ زیادہ پُر معنی شکار کا بھی موقع پیش آ گیا ۔ اگرچہ اوّل اوّل اس کا ہدف مغل نہ تھے بلکہ سب سے پہلے جو انسانی شکار سلطان کے سامنے آیا وہ میوات اور دوآب کے ڈاکو تھے جنھوں نے پائے تخت کے جنوب مغرب اور شمال مشرق میں سر اٹھا رکھا تھا ۔ ان دونوں گروہوں کو سخت سزا ملی جس کے وہ مستحق تھے ؛ مگر خاص مغلوں پر ہر وقت نظر رکھنے کے لئے سلطان کا بڑا بیٹا متعین تھا اور شہر ملتان اس کا مستقر تھا ؛

اس شہزادے کا نام محمد تھا وہ اپنے باپ کی طرح نہایت شائستہ اخلاق اور اعلیٰ سپاہیانہ اوصاف سے متصف اور اسی کے ساتھ علم و فن کا فیاض مربی تھا طوطی ہند امیر خسرو [۱] اس شہزادے کے خاص مصاحب تھے ۔ اور اس کے دربار میں زندہ دلی اور بذلہ سنجی کی بہت قدر تھی ؛ پنجاب میں اس نے نہایت خوبی اور دانائی سے حکومت کی اور صوبے کے حالات کی مفصل اطلاع اور خراج کی رقم ہر سال نہایت پابندی سے اپنے باپ کے پاس دہلی بھیجتا رہا ؛

مخدوش ہونے کے اعتبار سے پنجاب کے بعد دوسرا درجہ بہار و بنگال کے مشرقی صوبوں کا تھا کہ مرکزی حکومت سے دور ہونے کے باعث یہاں کے لوگ ہمیشہ آمادۂ فساد رہتے تھے اور پہلی خطرناک شورش اسی علاقے میں پیدا ہوئی یعنی سپہ سالار طغرل نے سلطان کی سخت گیری فراموش کی اور چند باغیوں پر عارضی فتح پاکر اتنا دلیر ہو گیا کہ سنار گاؤں میں اس نے علیحدہ بادشاہی کا ڈھنگ ڈالا اور دو دفعہ سلطانی افواج کو شکست دی۔ تب بوڑھے سلطان نے سنار گاؤں پر خود فوج کشی کی اور باغی امیر کا اڑیسہ تک پیچھا کیا اور وہیں لڑتے یا بھاگتے وقت وہ ۶۷۸ھ مطابق ۱۲۷۹ء میں مارا گیا؛ مگر عنقریب سلطان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹنے والا تھا۔ بہار کی مہم کو پانچ سال گزرے تھے کہ مغلوں کی بہت بڑی تعداد نے پنجاب پر یورش کی اور اگرچہ انھیں شکست کھا کے پسپا ہونا پڑا لیکن انھیں معرکوں میں شہزادہ محمد کی جان گئی اور اس کے مصاحب امیر خسرو، مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے بوڑھے باپ سے جس کا سن اسی سال کے قریب تھا ایسے لائق اور جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ ہو سکا اور اس کی طاقت جسمانی زائل ہونے لگی۔ بستر مرگ کے گرد اس نے آخری مرتبہ اہل دربار کو جمع کیا اور وصیت کی کہ مرحوم شہزادے کے بیٹے کو تخت کا آئندہ وارث مانا جائے۔ گزشتہ تجربے کی بنا پر اسے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خاں سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ وہ اچھی طرح سے حکومت کا بار سنبھال لے گا۔ لہٰذا اسے محروم کر دیا؛ امرا نے بھی تعمیل حکم کا اقرار کر لیا تھا لیکن سلطان کے وفات پاتے ہی انھوں نے اس کے آخری احکام منسوخ کر دیئے اور شہزادے محمد کے بیٹے کو اپنے باپ کی جگہ ملتان بھیج کر بغرا خاں کے بیٹے کے سر پر تاج رکھ دیا۔

سلطان معزالدین کیقباد

معزالدین ابن بغرا خاں کی رسم تخت نشینی ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء کے شروع میں ادا ہوئی اور نوجوان شہزادے نے سلطان کیقباد کا ایرانی لقب اختیار کیا لیکن اس کی قسمت میں بھی اس بات کی ایک اور شہادت فراہم کرنا لکھا تھا کہ گو تعلیم و تربیت کی طرف سے تغافل نہ کیا جائے۔ بایں ہمہ موروثی بادشاہی کا اصول اکثر ناقص ثابت ہوا ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ اپنے سخت گیر اور پابند وضع دادا کی نگرانی میں

نوجوان شہزادے نے شاہد و شراب کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اب جو یکبارگی اختیار حاصل ہوا تو اس کا ساختہ زہد و تقویٰ سلامت نہ رہ سکا۔ کوئی ایسی بدعنوانی نہ تھی جس سے اس نے پرہیز کیا ہو۔ خود باپ (بغرا خاں) پر اس نے فوج کشی کی تیاری کی۔ عمزاد بھائی کو ملتان میں اس نے قتل کرایا۔ غرض وہ وہ حرکتیں کیں کہ خاندان کے قدیم نمکخواروں کو بھی اس پر کوئی اعتماد نہ رہا۔ خلجیوں کی قوت اگرچہ بنگالے میں ٹوٹ چکی تھی مگر خاص دربار میں ان کا زور تھا۔ انقلاب کے تفصیلی حالات نہیں ملتے لیکن اتنا معلوم ہے کہ نوجوان سلطان جو اپنی عیاشی کی بدولت پہلے ہی کمزور و علیل اور قبل از وقت ضعیف ہو گیا تھا تقریباً تین سال کی بادشاہی کے بعد اپنے بچھونے پر قتل کر دیا گیا اور خلجی سردار جلال الدین اس کا جانشین ہوا صرف مغل سپاہیوں کے سردار نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اور کیقباد کے صغیر سن بیٹے کو بادشاہ بنانا چاہا تھا کہ حکومت بلبن ہی کے خاندان میں رہے۔ لیکن یہ مخالفت کامیاب نہ ہوئی اور خلجیوں کا سن رسیدہ اور آزمودہ کار سپہ سالار سلطان جلال الدین کے نام سے نئے خاندان شاہی کا بانی ہوا۔ (۶۸۹ھ مطابق ۱۲۹۰ء)

باب دوم

خاندان خلجی

کیقباد تک جس قدر مسلمان بادشاہ تخت دہلی پر بیٹھے وہ سب نسل کے اعتبار سے خالص ترک تھے۔ برخلاف اس کے خلجیوں کا قبیلہ اگرچہ ترکی نسل سے تھا لیکن افغانستان آکر اس کے خون میں اس قدر آمیزش ہوچکی تھی کہ وہ نیم افغانی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس لئے جلال الدین خلجی کی تخت نشینی شہر کے شرفا کو بہت ناگوار گزری تھی لیکن خلجیوں کی فوجی قوت کے سامنے کسی کو سرتابی کی مجال نہ ہوئی اور بعد میں جلال الدین خلجی کے حلم وانکسار اور خلق وتواضع نے سب کے دل اپنی مٹھی میں لے لئے۔ بے شبہ اس نے کیقباد کے شیر خوار بچے کو کچھ عرصہ حراست میں رکھ کر قتل کرا دیا تھا لیکن اس ظلم کا سبب بھی یہ ہوا کہ بعض مفسد اس بچے کو تخت پر بٹھانے کے حیلے سے شورش وخانہ جنگی کا سامان کرنے لگے تھے۔ ورنہ مجموعی طور پر دیکھئے تو تاریخ میں ایسے بردبار نیک دل بادشاہوں کی مثالیں کم ملیں گی جیسا کہ سلطان جلال الدین خلجی گزرا ہے۔ وہ ستر برس کی عمر میں سپہ سالاری سے ترقی کرکے مسند شاہی تک پہنچا تھا اور اب تک اس کی تمام زندگی سپاہیانہ مشاغل اور جنگ وجدال میں بسر ہوئی تھی۔ لیکن عصائے شاہی لیتے ہی اس نے تلوار کو ایسا ہاتھ سے رکھا کہ پھر کسی دشمن اور مجرم پر بھی اس کا استعمال نہ کیا۔ انکسار کا یہ حال تھا کہ اس ایوان میں جہاں اس کا پہلا آقا سلطان بلبن دربار کیا کرتا تھا، جلال الدین خلجی نے تخت پر بیٹھنا بے ادبی

سمجھا اور اپنے رہنے کے لئے قدیم محلات سے کچھ دور پر محل بنوایا اور اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ وہ بالکل اسی دوستانہ بے تکلفی بلکہ فروتنی سے ملتا رہا جس طرح کہ سپہ سالاری کے زمانے میں اس کا معمول تھا۔ اسی ضمن میں یہ واقعہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے دوسرے ہی سال بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بغاوت کی اور اپنے مستقر کڑہ سے بہت بڑی فوج لے کر دہلی کی جانب بڑھا سلطان کو جب یہ خبر ملی تو اپنے بیٹے ارکلی خاں کو چیدہ فوج دے کے آگے روانہ کیا اور خود اس کے عقب میں روانہ ہو کر بداؤں تک آیا۔ اس شہر سے کچھ آگے فریقین میں جنگ ہوئی ملک چھجو شکست کھا کے بھاگا اور اس کے کئی سردار گرفتار ہوگئے۔ انہیں ارکلی خاں نے گردنوں میں دوشاخے ڈال کر اونٹ پر بٹھایا اور اسی ہیئت سے باپ کے پاس روانہ کر دیا لیکن جب سلطان کے سامنے یہ اسیر پہنچے تو وہ بے قرار ہو کر اپنی جائے سے اٹھا اور بیٹے کو بہت برا بھلا کہا کہ اس نے خاندان بلبن کے نمک حلال امرا کی یہ توہین کی! پھر سلطان کے حکم سے وہ نہا دھو کر اور لباس فاخرہ پہن کر آئے تو اس وقت بھی انھیں الزام دینے کے بجائے وہ یہی کہتا رہا کہ تم نے جو کچھ کیا وہ بالکل حق بجانب تھا۔

اسی طرح مالوے میں بغاوت ہوئی تو گو سلطان نے میدانی لڑائیوں میں فتح پائی اور شورش فرو کر دی لیکن بعض قلعوں پر اس نے محض اسی لئے حملہ نہیں کیا کہ خلق خدا کا خون بہے گا اور واپس پنجاب چلا آیا جہاں پھر کفار مغل نے یورش کی تھی! اس لڑائی میں بھی سلطان کو کامل فتح حاصل ہوئی لیکن اس نے کمال رحم دلی سے دشمن کو بلا گزند پہنچائے واپس چلے جانے کی اجازت دے دی اس عفو کریمانہ سے یہ وحشی بھی رام ہوگئے اور کئی ہزار نے سلطان کی ملازمت اور مسلمان ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔

علاء الدین کی یلغار دکن پر

دوسرے سال بادشاہ نے پھر مالوے پر فوج کشی کی اور اپنے نوجوان بھتیجے اور داماد ملک علاء الدین خلجی حاکم کڑہ کی بہادری سے بہت خوش ہوا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں اکثر باغیوں کا قلع قمع کر دیا اور کئی قلعے چھین لئے تھے۔ چچا کو خوش دیکھ کر علاء الدین نے چندیری پر فوج کشی کی اجازت لی اور اس بہانے چار ہزار چیدہ سوار لے کر کڑے سے دکن کی جانب روانہ ہوا جہاں کے راجہ دیوگری کی دولت و مال کے اس نے بہت کچھ

افسانے سنے تھے۔ (۶۹۴ھ مطابق ۹۵-۱۲۹۴ء)

دکن پر مسلمانوں کی یہ سب سے پہلی فوج کشی ہے۔ جنگی ساز و سامان سپاہ کی قلت اور مہم کی خطرات کا لحاظ کیا جائے تو سلطان محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ اتنا مخدوش نہ تھا جتنا کہ علاء الدین خلجی کا حملہ دیوگری پر۔ وہ بادشاہ کی بغیر اجازت بلکہ اپنی ساس ملکہ جہاں سے لڑ کر متوکلاً علی اللہ چل کھڑا ہوا تھا۔ بندھیل کھنڈ اور وسط ہند کے خوفناک جنگل بندھیاچل کے دشوار گزار کوہستانی راستے، بڑی بڑی ندیاں، دریا اور دشمنوں کی کئی ریاستیں بیچ میں تھیں اور ان سب کے بعد ایک دشمن قوی سے مقابلہ درپیش تھا جس کے لئے اس کی فوج کسی طرح کافی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خلجیوں کو جیسی جوانمردی اور اولوالعزمی عنایت ہوئی تھی اسی کے مطابق خدا نے انہیں فوجی قابلیت اور اقبال مندی دی تھی کہ جس دشوار سے دشوار مہم پر قدم اٹھائے کامیاب ہو کر آتے تھے۔ علاء الدین خلجی تمام مشکلات سفر پر غالب آیا اور دو مہینے کے اندر ایلچپور پہنچ کر یک بیک دیوگری (موجودہ دولت آباد) کی طرف پلٹ پڑا جہاں اس زمانے میں راجہ رام دیو فرمانروا تھا۔

دکن کے لوگوں نے اسلامی حملہ آوروں کے قصے ضرور سنے ہوں گے۔ لیکن انہیں خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ کوہستان بندھیاچل کو طے کر کے یوں اچانک اُن کے سر پر آکھڑے ہوں گے۔ رام دیو کے بہت سے سپاہی اس کی رانی اور بیٹے کے ساتھ پہلے ہی کہیں تیرتھ کرنے گئے تھے۔ باقی ماندہ مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لائے اور بہت جلد لڑائی میں پیٹھ پھیر دی۔ رام دیو نے اپنے مستحکم قلعے کی پناہ لی اور شہر فتح مندوں کے قبضے میں آگیا علاء الدین نے مشہور کر دیا تھا کہ اس کی فوج محض ہراول ہے اور اصلی لشکر پیچھے آرہا ہے۔ یہ خبر بالکل قرین قیاس نظر آتی تھی۔ پس راجہ رام دیو نے ڈر کر صلح کر لی اور بہت کچھ زر و جواہر دے کر اس من چلے حملہ آور کو رخصت کیا لیکن اس عرصے میں اس کا نوجوان بیٹا تیرتھ سے واپس آیا اور بہت بڑی فوج فراہم کر کے لایا کہ حملہ آوروں کو ملک سے زندہ نہ جانے دے۔ رام دیو نے ہر چند پیام بھیجے کہ اب علاء الدین سے جنگ کرنا عہد شکنی ہے مگر اس کے بیٹے نے سماعت نہ کی اور دولت آباد کے باہر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اور تھوڑی دیر کی تیز و تند جنگ کے بعد سخت شکست کھائی۔ اب اقبال مند فاتح نے اپنی شرائط صلح بھی سخت کر دیں۔ راجہ کو ایلچپور کا علاقہ بھی حوالے کرنا پڑا اور چند روز کے بعد علاء الدین خاندیس اور مالوے سے ہوتا ہوا

واپس چلا گیا ؛

جلال الدین کا قتل

اس دو تین مہینے میں بوڑھے سلطان کو بھتیجے کی کوئی خیر خبر نہ ملی تھی وہ نہایت متفکر تھا اور جب اس نے سنا کہ علاء الدین اتنی بڑی مہم سر کر کے دکن سے بیحساب دولت اور غنائم لایا ہے، تو بھتیجے کو ملنے کے لئے دہلی بلایا ؛ سلطان کے ہوا خواہ علاء الدین کے بے اجازت دکن چلے جانے ہی سے اندیشہ مند ہو گئے تھے اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کڑے میں تازہ فوج فراہم کر رہا ہے تو انھوں نے سلطان کو سمجھایا کہ اپنے من چلے بھتیجے کی طرف سے ہوشیار رہے لیکن جلال الدین خلجی نے ان کی رائے پر مطلق اعتبار نہ کیا اور جب علاء الدین نے بہانہ کیا کہ فدوی کو دہلی آنے سے خوف ہے، مبادا میرے دشمنوں کی دراندازی اور بغیر اجازت دکن جانے کا خیال بادشاہ کو مجھ سے بدگمان کر دے، تو جلال الدین خود کڑے جا کر بھتیجے کا شبہ دور کرنے پر آمادہ ہوا اور ماہ رمضان ۶۹۵ھ (مطابق ۱۲۹۵ء) میں کڑے کے قریب پہنچ گیا۔ گنگا کے دوسرے کنارے پر علاء الدین فوج لے کر بادشاہ کے استقبال کو آیا تھا۔ بھتیجے سے ملنے جلال الدین خود کشتی میں بیٹھ کر ادھر آیا اور عین اس وقت کہ علاء الدین کو گلے لگا کر شکوہ کر رہا تھا مشہور ہے کہ بھتیجے کے اشارے سے دو خونیوں نے اس نیک دل سلطان کو گرا کر سر کاٹ لیا ؛ کہا جاتا ہے کہ علاء الدین نے اس جرم کا ارتکاب اس لئے کیا کہ خود وہ اپنے چچا کی طرف سے خائف و اندیشہ مند تھا ؛

علاء الدین کی تخت نشینی اور فتوحات

اس عبرتناک واقعے کے بعد علاء الدین کو سلطنت پر قبضہ کرنے میں زیادہ دقت نہ پیش آئی۔ جلال الدین کا بڑا بیٹا وفات پا چکا تھا۔ اس کی بیوی ملکۂ جہاں نہایت بدمزاج اور علاء الدین کی دشمن تھی لیکن اتنی دوراندیش نہ تھی کہ اپنے جنگ جو بھتیجے پر غلبہ حاصل کر لیتی۔ چند روز میں وہ اور اس کے دونوں بیٹے گرفتار ہو گئے۔ دیوگری کی اشرفیوں نے بہت سے مخالفین کو علاء الدین کا رفیق بنا دیا اور اس کا کوئی حریف باقی نہ رہا ؛

تخت پر متمکن ہوتے ہی اس نے گجرات پر فوج روانہ کی جہاں کا راجہ خودمختاری کا

دعویٰ کرتا تھا۔ درحقیقت یہ علاقہ پوری طرح فتح ہی نہ ہوا تھا اور سلطان شہاب الدین غوری کے بعد کسی سلمان بادشاہ نے اس پر باقاعدہ فوج کشی نہ کی تھی۔ اب ۶۹۷ھ (۱۲۹۷ء) میں ملک نصرت وزیر اور سلطان کے بھائی الغ خاں نے اس ملک پر حملہ کیا اور فتح کامل حاصل کی۔ راجہ نے دکن میں بھاگ کر جان بچائی اور گجرات کو سلطنت دہلی کا صوبہ بنا لیا گیا۔

اس اثنا میں مغلوں نے پنجاب پر دوبارہ یورش کی اور بادشاہی فوجوں کو شکست دے کر خاص پائے تخت دہلی تک بڑھ آئے۔ شہر میں سخت انتشار پیدا ہو گیا اور آس پاس کے اتنے پناہ گزیں آبھرے کہ بازاروں میں راستہ چلنا دشوار تھا۔ آخر سلطان فوج لے کر شہر کے باہر نکلا۔ شہر میں جس قدر غلہ بھرا ہوا تھا وہ چند ہی روز میں ختم ہونے لگا اور چار و ناچار بادشاہ کو باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا اور دہلی کے قریب ہی فریقین کا مقابلہ ہوا۔ مورخ محمد ابوالقاسم (فرشتہ) لکھتا ہے کہ تعداد سپاہ کے اعتبار سے اتنی بڑی لڑائی میرے زمانے تک ہندوستان میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ مغلوں کی بہادری اور خونخواری میں کلام نہیں لیکن سپہ سالار ظفر خاں نے دہلی کی فوج کو اس خوبی سے لڑایا کہ ہر مقام پر مغلوں کو شکست ہوئی اور اگرچہ خود یہ بہادر سپہ سالار اسی میدان میں کھیت رہا تاہم مغلوں کے قدم نہ جمے اور جس تیزی سے آئے تھے اسی سرعت کے ساتھ واپس چلے گئے ؛

رنتھنبور و چتوڑ کی تسخیر

اس آفت سے نجات پانے کے ایک سال بعد سلطان علاء الدین کے حکم سے الغ خاں اور ملک نصرت خاں نے رنتھنبور پر فوج کشی کی اور جب عرصے تک سلطانی فوجیں بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں تو خود بادشاہ نے مالوے کا رخ کیا لیکن وہ دہلی سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ اس کے ایک بھتیجے نے چچا کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو اس نے اپنے چچا سلطان جلال الدین کے ساتھ کیا تھا یعنی شکارگاہ میں تنہا پا کر چند نو مسلم سواروں سمیت یک بیک سلطان پر حملہ کیا اور اپنے نزدیک جان سے مار کر شاہی لشکرگاہ میں آیا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا لیکن علاء الدین زخمی ہو کر صرف بیہوش ہو گیا تھا اور جب تھوڑی دیر بعد وہ لشکر کے سامنے زندہ و سلامت نمودار ہوا تو غدار بھتیجے کی کسی نے رفاقت نہ کی۔ وہ تنہا گھوڑے پر چڑھ کر بھاگا تھا لیکن گرفتار ہو کر مارا گیا ؛

رنتھنبور پہنچنے کے بعد اطلاع ملی کہ سلطان کے دو بھانجوں نے بداؤں میں بغاوت کی۔ مگر خود سلطان کو واپس آنے کی ضرورت نہ ہوئی اور امرائے شاہی نے یہ فساد فرو کر دیا۔ باغی گرفتار ہو کر سلطان کے پاس بھیج دیئے گئے اور اس نے سخت عقوبت کے بعد ان کا سر قلم کرا دیا ؛

لیکن ان دونوں بغاوتوں سے بڑھ کر عجیب حاجی مولیٰ کا فساد ہے۔ یہ شخص سلطان جلال الدین خلجی کے ایک امیر فخر الدین (کوتوال سابق) کا پروردہ تھا اور جانتا تھا کہ لوگ شہر کے نئے کوتوال سے خوش نہیں ہیں۔ پس ایک دن بہت سے آدمیوں کو لے کر کوتوالی میں پہنچا اور اچانک حملہ کر کے کوتوال کو قتل کر دیا۔ پھر بادشاہی خزانے پر قبضہ کر کے علوی نام ایک شخص کو جس کا نسب ماں کی طرف سے سلطان شمس الدین التمش تک پہنچتا تھا، اس نے جبراً تخت پر بٹھایا اور لوگوں سے نذریں دلوانی شروع کیں (۶۹۹ھ)۔ سلطان کو اس فساد کی اطلاع رنتھنبور میں دی گئی تھی لیکن اس نے خبر کو اپنے ہی حد تک رکھا اور قلعہ فتح کرنے میں پہلے سے زیادہ کوشش کی ؛ پھر جب چند ہفتے کے بعد یہ فتنہ فرو ہو گیا تو اس وقت سلطان نے اپنے بھائی الغ خاں کو دہلی روانہ کیا کہ جن لوگوں سے حاجی مولیٰ کا کچھ تعلق تھا ان سب کو قتل کرا دے۔

رنتھنبور میں قلعے کے استحکامات کے علاوہ سرکش راجہ کو مسلمانوں کی ایک جماعت سے بہت تقویت پہنچ گئی تھی۔ ان کا سرغنہ میر محمد شاہ تھا جو بادشاہ سے باغی ہو کر کئی سال پہلے راجہ سے آملا تھا۔ عرصۂ دراز کے محاصرے اور حملوں کے بعد آخر کار جب قلعہ فتح ہوا تو مشہور ہے کہ میر محمد شاہ زخمی پڑا تھا کہ اسی حال میں سلطان علاء الدین کی اس پر نظر پڑی اور اس نے از راہ ہمدردی دریافت کیا کہ اگر علاج کیا جائے اور تجھے صحت ہو جائے تو کیا صلہ دے گا؟ میر محمد شاہ نے جواب دیا کہ اگر شفا حاصل ہو جائے تو پھر تجھ سے لڑوں گا اور تیرا سر کاٹ کے راجہ کے بیٹے کو بادشاہ بنا دوں گا۔ یہ سن کر سلطان کو غصہ آیا اور اس نے میر محمد کو اسی وقت مروا ڈالا لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی بہادری کو یاد کر کے نادم ہوا اور حکم دیا کہ اس کی تجہیز و تکفین عزت کے ساتھ کی جائے۔

۷۰۳ھ مطابق ۱۳۰۳ء میں سلطان نے چتوڑ کے قلعے پر فوج کشی کی جس کی مضبوطی ضرب المثل ہو گئی ہے۔ کئی معرکوں کے بعد یہ قلعہ سر ہوا۔ سرکش راجہ گرفتار کر لیا گیا اور یہ

ریاست براجہ **مالدیو** کو عطا ہوئی جو اپنے عہد حکومت تک برابر خراج ادا کرتا رہا۔ ان مہمات سے علاؤالدین واپس آیا تھا کہ پھر مغلوں نے یورش کی اور دہلی کے قریب تک آپہنچے۔ ان کی تعداد اس مرتبہ اس قدر زیادہ تھی کہ سلطان نے باہر نکل کر لڑنا مخدوش سمجھا اور خندقیں کھدوا کر قلعہ بندی کا سامان کرنے لگا مگر وحشی حملہ آور زیادہ عرصے تک نہ ٹھیرے اور بغیر لڑے بھڑے واپس چلے گئے۔

ملک کافور کے حملے دکن پر

ان تمام لڑائیوں اور مفسدوں کے باوجود دکن کا خیال سلطان کے دل سے نہ گیا تھا اور مغلوں کی تاخت سے فرصت ملتے ہی اس نے **دیوگری** پر حملے کے واسطے بہت بڑا لشکر تیار کیا کہ وہاں کے راجہ کو سزا دے جس نے کئی سال سے خراج کی رقم نہیں بھیجی تھی۔ فوج کی سپہ سالاری پر بادشاہ نے اپنے منظور نظر خواجہ سرا **ملک کافور** کو نامزد کیا جو چند سال میں ایک ادنیٰ غلام کے رتبے سے ترقی کرکے سلطنت کا رکن رکین بن گیا تھا۔ عالی خاندان امرا اس انتخاب سے خوش نہ تھے لیکن تمام عیوب کے باوجود ملک کافور نہایت کامیاب اور اولوالعزم سپہ سالار گزرا ہے کہ مالوے سے فوج لے کر بڑھا تو اس کی آمد نے تمام شمالی دکن میں تہلکہ ڈال دیا (۱۳۰۶ء) اور سیلاب کی مثل وہ تمام علاقے میں اس طرح پھیل کہ راجہ دیوگری کو سامنے بڑھنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ قلعے سے نکل کر آیا اور اطاعت قبول کرلی۔

اسی زمانے میں راج کماری، دیول دیوی یا دول رانی کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا جسے امیر خسروؒ کی دل آویز مثنوی نے زندۂ جاوید کردیا ہے۔ پھر دکن اور جنوبی ہند پر کافور نے پے در پے تین حملے کئے اور دوسرے حملے میں **دوارسمدر** کے راج کو پامال کرتا ہوا راس کماری تک پہنچا اور وہاں سب سے پہلی مسجد تعمیر کی۔

علاءالدین کی وفات

یہ نمایاں فتوحات حاصل کرکے دکن کا فاتح واپس ہوا تو سلطان علاءالدین کی صحت میں فتور آچکا تھا۔ آئے دن کی بیماری نے اسے نہایت بدمزاج اور پہلے سے زیادہ سخت گیر و شکی بنا دیا تھا۔ ادھر کافور نے اسے سب سے بدگمان کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے تمام رقیبوں کو دربار سے نکلوا دیا۔ خضر خاں، اس کا بھائی اور ماں بھی سازش سے نہ بچ سکے اور بادشاہ کے حکم سے گرفتار ہوکر دور بھیج دئے گئے۔ سب کے آخر میں الپ خاں والی گجرات کے قتل کی باری آئی جس کی

قابلیت اور اقتدار سے کافور بہت خائف رہتا تھا۔ ایسے نامور سردار کے اس طرح مارے جانے سے ملک میں ہر طرف شورش اور برہمی پیدا ہوگئی۔ گجرات نے علم سرکشی بلند کیا، دکن میں راجہ ہرپال نے بغاوت کی اور کئی قلعے مسلمانوں سے چھین لئے۔ ان متوحش خبروں نے بادشاہ کو غصہ دلایا۔ اس کی حالت روز بروز ردی ہوتی گئی اور آخر شوال ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء میں اس نے انتقال کیا۔

گو یہ بادشاہ نہایت ضدی اور سخت گیر تھا لیکن اس کے عہد میں کسی مفسد کو سر اُٹھانے کی مجال نہ تھی۔ راستے محفوظ، شہر آباد اور اہل ملک خوش حال تھے۔ زراعت و تجارت، صنعت و حرفت اور فن عمارت کو اس عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ عمال کی رشوت ستانی اور مظالم کا سدباب ہوگیا۔ بیرونی مہمات میں بھی فتح و ظفر نے سلطان کا ساتھ دیا۔ بنگال سے گجرات اور پنجاب سے دکن تک سب علاقوں میں مسلمانوں کا گزو سکہ جاری ہوا اور قریب قریب تمام کشور ہند پر وہ علاءالدین ہی کے زمانے میں قابض ہوئے۔ اس اقبال مندی اور اتنی وسیع سلطنت پر سلطان کو جس قدر فخر ہو بجا ہے۔ لیکن علاءالدین اَن پڑھ آدمی تھا اور اس قدر اقتدار و فتوحات حاصل کرکے عجیب منصوبے سوچنے لگا۔ کبھی نشے میں ایک نیا دین جاری کرنے کا ارادہ کرتا اور کبھی تمام دنیا کی تسخیر پر آمادہ نظر آتا۔ چنانچہ خطبوں میں اس نے اپنے نام کے ساتھ "سکندر ثانی" کے لقب کا اضافہ کرا دیا تھا۔ ایسے بد مزاج بادشاہ کی تردید کرنے کی کسی امیر وزیر کو جرأت نہ ہوتی تھی اور مذہبی معاملات میں بھی لوگ اس سے گفتگو کرتے ڈرتے تھے۔ بایں ہمہ عمل کے وقت سلطان نہایت منتظم اور کامیاب مدبّر نظر آتا ہے چنانچہ ملک سے بد اخلاقی اور فتنہ جوئی دور کرنے کی یا ایک بڑی اور باقاعدہ فوج تیار رکھنے کی جو تدبیریں اُس نے اختیار کیں وہ بہت کارگر ثابت ہوئیں۔ رعایا کی بد اخلاقی اور شورش کا سب سے بڑا سبب اس نے شراب خواری کو قرار دیا تھا۔ لہٰذا اس عادت بد کے خلاف ایسے سخت قانون بنائے کہ ملک میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت بالکل موقوف ہوگئی۔ اس نے زمینوں کی پیمائش اور مالگزاری کی نئی تشخیص کرائی اور سرکاری طور پر اجناس کی قیمتیں مقرر کر دیں تاکہ سپاہیوں کو جو تنخواہ ملتی تھی اس میں بہ آسانی گزارہ کر سکیں۔

سلطان مبارک

سلطان علاء الدین کی وفات کے وقت اس کے چار بیٹے تھے۔ ملک کافور نے ان میں سب سے چھوٹے کو بادشاہ بنایا اور خود اتالیق بن کر تمام حکومت پر حاوی ہوگیا لیکن لوگ کافور کو غاصب اور نمک حرام جانتے تھے اور سلطنت کے تین وارث ابھی موجود تھے۔ لہذا سب سے پہلے اس نے خضر خاں اور اس کے بھائی کی قید خانے میں آنکھیں نکلوا دیں۔ پھر سنجھلے بھائی شہزادہ مبارک کے قتل کرنے کے لئے چند آدمی متقرر کئے۔ مگر یہ داؤں پٹ پڑا اور اسی کے سپاہیوں نے مبارک سے مل کر خود کافور کو مار ڈالا۔

سلطان مبارک نے تخت نشینی کے بعد اپنے ادنیٰ ادنیٰ غلاموں کو سلطنت کے بڑے بڑے عہدے دیئے اور انھی میں ایک نومسلم خسرو خاں نامی کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ پھر باپ کے زمانے کے تمام قوانین یک قلم منسوخ کردئے۔ اور کئی ہزار قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اس شاہانہ فیاضی کے ساتھ اسے باپ کی جنگجوئی بھی ورثے میں ملی تھی ادھر گجرات و دکن میں سپہ سالاری کی قابلیت دکھانے کا موقع موجود تھا۔ کیونکہ وہاں سلطان علاء الدین کے آخری ایام حکومت میں باغیوں نے سر اٹھایا تھا اور سلطنت دہلی سے منحرف ہوگئے تھے۔

سلطان مبارک نے گجرات پر فوج بھیجی اور خود دکن پر چڑھائی کی یہاں ہرپال نے سخت فساد بپا کر رکھا تھا اور بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہوگئے تھے۔ لیکن سلطانی فوج کے سامنے باغیوں کی کچھ پیش نہ گئی۔ ہرپال گرفتار ہوکر مارا گیا۔ شورش کرنے والوں کا بالکل قلع قمع ہوگیا۔ بادشاہ نے ملیبار کی تسخیر کے لئے خسرو کو آگے بھیجا اور خود مظفر و منصور دہلی کو مراجعت کی۔ (۷۱۷ھ مطابق ۱۳۱۷ء)۔

مگر نوجوان سلطان کو میدان رزم سے جسقدر دلچسپی تھی اسی قدر بزم عیش کا دلدادہ تھا۔ اور یہ ایسی دنیا ہے جس میں ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد پھر نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ مبارک بھی دہلی پہنچ کر اسی کا ہو رہا اور امیروں نے اس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں شروع کیں بادشاہ کو جب ان سازشوں کی اطلاع ہوتی تو وہ مجرموں کو سخت سزائیں دیتا اور تھوڑے ہی دن میں نہایت تنگی اور ظالم ہوگیا تھا۔ لیکن یہ باتیں بھی اس کے عیش میں خلل ڈالتی تھیں لہذا خسرو خاں ملیبار کو

فتح کرکے واپس آیا تو بادشاہ نے بڑی خوشی سے تمام کاروبار سلطنت اس کے حوالے کردیئے۔ (۷۱۹ھ / ۱۳۱۹ء)

خسرو کے مظالم اور خلجی خاندان کا خاتمہ

خسرو نے کل اختیار ملتے ہی چند امیروں کو قتل کرادیا اور سختیاں شروع کیں کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ لرزاں و ترساں رہنے لگا تھوڑے ہی عرصے میں اکثر امرا دربار چھوڑ چھوڑ کر چلدیئے اور خسرو خاں نے اپنے ہم قوموں سے شہر کو بھردیا۔ وہ خود قوم کا پرواری تھا جو ہندوؤں میں نہایت ادنیٰ مانے جاتے ہیں اور اب اس نے اپنی برادری کے لوگوں کو تخت گاہ میں جمع کرکے بڑی قوت پائی اور دھوکے سے اپنے سرپرست سلطان مبارک خلجی کو مار کر خود بادشاہ بن گیا۔ (۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء)

اپنے آقا کو اس کی مہربانی کا یہ بدلہ دینے کے بعد نمکحرام خسرو خاں نے خاندان شاہی اور اہل شہر پر جو جو ظلم کیئے اُن کو یاد کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خلجی خاندان میں بچہ یا بوڑھا جس قدر ذکور تھے اس نے سب کو چن چن کے مارا۔ خواتین محل کی طرح طرح سے آبروریزی اور دل آزاری کی اور اس کے رفیقوں نے اہل شہر کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا اور شہر میں ہر طرف ایک طوفان بپا کردیا۔

مگر ان بے رحم شیاطین سے خدا نے جلد انتقام لیا۔ وہ چند ہی مہینے دہلی پر مسلط رہے تھے کہ ایک رات **جوناخاں** صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوکے شہر سے نکل گیا وہ پنجاب کے بہادر صوبہ دار **غازی ملک تغلق** کا بیٹا تھا۔ اور خسرو خاں نے اُسے اپنے پاس بطور یرغمال روک رکھا تھا کیونکہ اس نمکحرام کو سب سے زیادہ جونا کے باپ غازی ملک کا خوف تھا جس نے سالہا سال تک مغلوں سے شمشیر زنی کی تھی اور اب خاندان خلجی کا انتقام لینے کے لئے بیقرار تھا۔ ظالم کے پنجے سے بیٹے کا نکلنا سنتے ہی وہ اپنی آزمودہ کار فوج لیکر بڑھا اور خسرو کے رفیقوں کو بآسانی شکست دی۔ خسرو کسی باغ میں جا چھپا تھا وہیں سے گرفتار ہوکر آیا اور قتل کردیا گیا۔ دہلی میں غازی ملک داخل ہوا تو اہل شہر سمجھے کہ انھیں دوبارہ زندگی ملی۔ گھر گھر خوشیاں ہونے لگیں۔ اور جب خلجی خاندان کا کوئی نرینہ وارث نہ ملا تو امرا نے بالاتفاق غازی ملک تغلق سے تخت دہلی پر جلوس کرنے کی درخواست کی اور کچھ تامل کے بعد اس نے یہ منصب جلیل قبول کرلیا جس کا وہ درحقیقت اہل تھا۔ (۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء)

باب سوم

خاندان تغلق

غلجیوں کی حکومت تیس برس سے زیادہ نہیں رہی لیکن اس قلیل مدت میں ملک کی حالت بہت کچھ بدل گئی تھی چنانچہ اسی زمانے میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں ہندوستان میں مستحکم ہوئیں اور اس کی حدود ملک دکن تک پھیلیں ؛ ادھر مغلوں کی یورشیں بھی ایک حد تک کم ہوگئی تھیں کیونکہ ان وحشیوں نے دین اسلام قبول کر لیا۔ اور وسط ایشیا کے ملکوں میں آباد ہو گئے۔ یا انھوں نے ہندوستان کی فوجوں میں ملازمت اختیار کر لی تھی ؛ ہندوستان کے چند رئیس اور راجہ جو اپنی مدافعت کی قابلیت رکھتے تھے اپنا آزاد رہنا غنیمت جانتے ہوں گے ورنہ باقی سب رئیسوں نے شاہان دہلی کی اطاعت قبول کر لی تھی اور باج گزار بن گئے تھے ؛ مسلمانوں کے عمدہ انتظام اور قوی پنجے نے عام رعایا کو مسکین اور فرماں بردار بنا دیا تھا اور جرائم کی کمی ہوگئی تھی اس کے علاوہ ملک میں اسلامی آبادی بھی ترقی کر رہی تھی یعنی باہر کے اسلامی ملکوں سے لوگ آن آن کر ہندوستان میں بس گئے تھے اور ان میں قابلیت کے وہ جوہر تھے کہ غریب الوطن ہونے کے باوجود سلطنت کے اعلیٰ فوجی اور دیوانی عہدوں پر بالعموم انھی کو مقرر کیا جاتا تھا۔

زبان اردو کی ابتدا قوموں کے اختلاط ہی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں ایک نئی زبان بن رہی تھی کہ آبادی کے مختلف طبقوں میں باہمی گفتگو کا ذریعہ ہو۔

یہ زبان جو انگریزوں میں "ہندوستانی" کے مناسب نام سے معروف ہے، خود ہندوستان میں اُردو کہلاتی ہے، اور در اصل اسی پراکرت کی ترقی یافتہ صورت کا نام ہے جو دہلی اور شمالی دوآب میں بولی جاتی تھی اسی کو عربی رسم کتابت کے فارسی خط (نستعلیق) میں لکھنے لگے اور ہندی فارسی، ترکی یا اور جن زبانوں سے اُسے سابقہ پڑا اُن کے الفاظ اُس میں شامل ہو گئے بالیدگی کی یہ صلاحیت اس کے آیندہ فروغ کا سبب ہوئی اور وہ محض مختلف حصوں کے باشندوں میں عام ذریعۂ گفتگو نہ رہی بلکہ بہت جلد اس میں قومی علم ادب بن جانے کے آثار نظر آنے لگے یہ نام "اردو" اسی ترکی لفظ سے تعلق رکھتا ہے جس سے انگریزی لفظ "ہورڈ" (بمعنے انبوہ) نکلا ہے اور اسی نام سے زبان کے آغاز کا سراغ بخوبی چل جاتا ہے۔ کیونکہ ترک سلاطین ہی کے اردو یا لشکرگاہ میں ایسی بولی اس قابل ہو سکتی تھی کہ اہل لشکر اور رسد لانے والوں کے درمیان گفتگو اور داد و ستد کا ذریعہ بن جائے۔ الغرض یہ زبان اس فطری قانون کی نہایت عمدہ نظیر ہے کہ نسل کا غرور، مذہب کا تعصب یا محکوم قوم کی حاکموں سے نفرت کتنا ہی قوموں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بنانا چاہے بنی نوع انسان میں باہمی میل جول کی ضرورت ان سب پر غالب آجاتی ہے۔

سلطان غیاث الدین کے اوصاف اور فتوحات

وہ جہاں دیدہ سپاہی جس نے اس بے نفسی سے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، حقیقت میں اس عزت کا مستحق تھا۔ اس نے جو کچھ ترقی کی وہ محض حسن تدبیر اور ذاتی قابلیت کا صلہ تھی۔ بادشاہ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی وضع پر قائم رہا اور یہ خوش نصیبی اور حشمت و کامرانی اس کے اخلاق میں کوئی فتور نہ ڈال سکی۔ ملکی نظم و نسق میں کئی سال کی بدعملی سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، انھیں جہاں تک ممکن تھا اس نے دور کیا۔ اسی کے ساتھ ایک طرف شمالی سرحدوں کا خیال رکھا اور دوسری طرف دکن کا انتظام درست کرنے کی غرض سے اپنے بیٹے الغ خاں یا شہزادہ جونا کو جنوب میں روانہ کیا وہ اوّل اوّل راجہ ورنگل (اُرنگل) کو قابو میں نہ لا سکا۔ مگر دوسری دفعہ ۷۲۳ھ مطابق ۱۳۲۳ء میں اقبال نے یاوری کی یا سروار اچھے ملے غرض مسلمانوں نے کثیر تعداد کے ساتھ شہر پر چڑھائی کی اور بیرونی مورچے لینے کے بعد اندر کا سنگین قلعہ

ہلہ کر کے فتح کر لیا راجہ پرتاب رور اکو انھوں نے گرفتار کیا اور فاتحانہ شان سے اپنے ہمرکاب دہلی لے آئے؛ اس کے بیٹے کرشنا کو گدی پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی لیکن پہلے کی بہ نسبت اب اس کا علاقہ کم رہ گیا۔

سال آئندہ سنارگاؤں (مشرقی بنگال کے حاکم نے بغرا خاں کی اولاد سے انحراف کیا اور سلطان غیاث الدین باغیوں کو ہزادینے خود مہم لے کر گیا اور وہاں کا انتظام درست کرنے کے بعد واپسی میں اس نے ترہت کے باغی راجہ کو بھی مغلوب و اسیر کر لیا۔ شہر دہلی میں بادشاہ کے کامیاب واپس آنے کی سب کو خوشی تھی اور ایک مقام آگے استقبال کا سامان کیا گیا تھا اس جگہ بادشاہ کے واسطے ایک خاص کوشک بنوائی تھی اور اسی میں وہ کھانا کھا رہا تھا کہ ناگہاں چھت گری اور یہ شریف بادشاہ نیچے دب کر راہی عدم ہوا (۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء)

سلطان محمد تغلق

شہزادہ جونا نے بادشاہ ہو کر سلطان محمد تغلق کا لقب اختیار کیا۔ شخصی حکومت کے بادشاہ عام طور پر جس مزاج کے ہوا کرتے ہیں اس کی مطلق العنانی کی وہ شان نہ تھی کیونکہ وہ نہایت جدت پسند طبیعت رکھتا تھا۔ اس کی بہادری اور ہنرمندی میں بھی کلام نہیں، لیکن ضیاء الدین برنی جو اس کے حالات و مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہے وہی رائے دیتا ہے جو اس کے متعلق افریقی سیاح ابن بطوطہ نے قائم کی تھی۔ یعنی یہ کہ یہ عجیب و غریب شخص نہایت فیاض، فاضل اور نہایت مہذب تھا مگر رحم و خدا ترسی اسے چھو کر نہ نکلی تھی۔

عجیب عجیب تجاویز

اول اول تو ہر معاملے میں اس کی مداخلت سے دہلی اور نواح دہلی میں اجناس نہایت گراں ہو گئیں، پھر اس خرابی کو دور کرنے اور اسی کے ساتھ دکن میں مسلمانوں کا قبضہ اچھی طرح جمانے کے لئے اس نے تجویز کی کہ دہلی کی تمام آبادی دیوگری میں منتقل کر دی جائے۔ یہ جگہ دہلی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور بادشاہ نے اسی کو دولت آباد کے دلپذیر نام سے مسلمانوں کی نوآبادی بنانے کا منصوبہ سوچا تھا اور اسے زمانے کی ستم ظریفی کہنا چاہئے کہ وہاں کے کھنڈر ابھی تک اسی نام سے موسوم ہیں! بہر حال جب اس تجویز پر عمل ہوا تو راستے میں سفر کی ماندگی سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے، اس کے بعد بادشاہ نے

دہلی کے ویران علاقے میں اِدھر اُدھر کے لوگ لاکے بسانے شروع کئے۔ لیکن دوسرے ملک والوں سے ہندوستان کے باشندے اگر کسی بات میں ہیٹے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ان میں نقل مکان کا مادّہ نہیں۔ غرض لوگوں کو بہت تکلیف ہوئی اور وہ بادشاہ سے ناراض ہو گئے ۞

سلطان محمد تغلق نے کچھ روز سونے چاندی کے سکّے کے بجائے تانبے کا سکہ بھی چلایا تھا۔ لیکن اس میں آخر بہت نقصان اُٹھایا اور اس کی یہ مفید تجویز بھی ادھوری اور مضر ثابت ہوئی ۞

۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء میں سلطان محمد تغلق نے ہمالیہ کے راستے چینی ترکستان یا تبت پر فوج بھیجی اور جب رسد کی دشواری اور کوہستانی علاقے کی برف سے وہ نقصان اُٹھا کر واپس ہوئی تو محمد تغلق نے اُن سپاہیوں کو خود سزائیں دیں۔ جو پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ اس تشدد کی وجہ بھی برنی سے بیان کر دیا کرتا تھا کہ آیندہ نسلوں کی عدالت میں یہ مورخ اس کی جانب سے وکالت کرے۔ اور حیرت ظاہر کرتا کہ میں جس قدر سزا دیتا ہوں اسی قدر لوگ میری نافرمانی کرتے ہیں۔ مگر جب تک زندہ ہوں یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی تجاویز تکمیل کو پہنچائے بغیر چھوڑ دوں ۞

بغاوتیں

ایسے خودرائے حاکم کے زمانے میں اگر سلطنت کے بعض علاقے نکل گئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس میں شک نہیں کہ سلطان نے اوّل اوّل دوآبۂ بنگال اور مالوے کے باغیوں کو زیر کر لیا اور سخت سزائیں دیں لیکن اسی زمانے میں دکن کے امیروں نے بھی سرکشی کی اور کچھ روز کے بعد ظفر خاں کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا ۞

سلطان محمد تغلق نے اہل دکن کو پہلی مرتبہ خود جا کر شکست دی لیکن ابھی شورش پوری طرح فرو نہ ہوئی تھی کہ اسے گجرات آنا پڑا اور پھر وہ ٹھٹے کی طرف ایک سندھی راجہ کی سرکوبی کرنے فوج لے کے چلا جس نے گجرات کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ یہ مقام کراچی کے قریب واقع ہے اور دریائے سندھ کی طغیانیوں سے ہر طرف جو دلدلیں بن گئی ہیں ان کے باعث یہاں کی ہوا قدیم سے خراب اور وبائی مشہور تھی۔ اسی علاقے میں محمد تغلق کو تپ وبائی نے آگھیرا۔ ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء میں

اس نے قضا کی۔ اور غالباً دنیا میں ایسا مطلق العنان یہی بادشاہ ہے جو غیر طبعی موت مرنے سے بچ گیا۔ بیان کرتے ہیں کہ بستر مرگ پر اُس نے ایک فی البدیہہ قطعہ موزوں کیا تھا جس میں گوشۂ اعمال کی بے ثباتی کا اشارہ نکلتا ہے۱؎ مگر اُس کے زمانے سے نرالی فطرت نے مرنے کے بعد بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ دہلی سے چند میل مشرق میں املی تک چار میل کے قریب وسیع احاطے میں کئی بڑی بڑی بہت چوڑے آثار کی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ سامنے کے رُخ ایک آبشار بنا ہوا ہے اور نیچے سے سلامی دے کر احاطے کی فصیل اٹھائی ہے جس میں بڑے بڑے تراشیدہ پتھر چُن دئے ہیں۔ یہ قلعہ اپنے بانیوں کی یادگار میں تغلق آباد ہی کے نام سے مشہور ہے اور اس کے صدر دروازے کے مقابل جو رفیع الشان مقبرہ بنا ہوا ہے اس کی دیواریں اور استحکام دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ واقعے کسی جنگجو کے مقبرے کے لئے اس سے بہتر عمارت نہ ہو سکتی تھی۲؎۔ اس کے اندر مقتول غازی ملک اور اس کے دو بیٹوں کی قبریں ہیں اور سنا ہے کہ محمد تغلق کی گور میں بہت سی دستاویزیں مدفون ہیں جنھیں اس کے جانشین نے خدا کے ڈر سے مرحوم سلطان کی بخشش کے واسطے فراہم کیا تھا۔ چنانچہ خود تحریر کرتا ہے کہ "سلطان مرحوم نے جن لوگوں کو قتل کرایا تھا، میں نے اُن کے زندہ ورثا کی تلاش میں کوشش کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور پھر خون بہا دے کر اُن سے باضابطہ گواہوں کے روبرو تحریریں لیں کہ ہمیں خاطر خواہ خوں بہا مل گیا۔ پھر ان سب دستاویزوں کو صندوق میں بھر کر مرحوم کی بالیں کے جانب دفن کرا دیا کہ خدائے رحمٰن و رحیم میرے مرحوم سرپرست کی خطائیں معاف فرمائے!"

۱؎ قطعہ یہ ہے۔۔۔ بسیار دریں جہاں چمیدیم | بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم | ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر | چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

۲؎ یہ قلعہ اور مقبرہ سلطان غیاث الدین تغلق اول نے بنوایا تھا۔ محمد تغلق کی یادگار میں اس قلعے کے باہر ایک بیرونی عمارت اور جہاں پناہ نامی محل ہے جس کے پرانی دہلی کے شمال مشرق میں صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ ۱۲

سلطان فیروز تغلق
۷۵۲ھ تا ۷۸۹ھ
۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء

یہ شریف و حق شناس بادشاہ جس نے اپنے پیش رو کے لئے بخشش و نجات کا پروانہ فراہم کرنے کی اتنی ورد سری اٹھائی محمد تغلق کا عم زاد بھائی فیروز تغلق تھا اور اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث سلطان سابق نے اسی کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا۔ ابن بطوطہ نے محمد تغلق کی دریا دلی اور اوصاف ستودہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور نیز برنی نے اُس کے ذاتی اخلاق میں جس انکسار و فروتنی کی تصویر دکھائی ہے مذکورۂ بالا (یعنی بھائی کو ولیعہد بنانے کے) واقعے سے اس کی تائید ہوتی ہے اور اسی پر اس مجموعۂ اضداد شخص کا تذکرہ تمام ہو جاتا ہے۔ شاید اس کا یہی کام تھا جس کے طفیل اس کا انجام بخیر ہوا یعنے کسی کو اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کا خیال نہ آیا اور نیز نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر کسی رقیب نے زیادہ فساد بپا نہ کیا۔ البتہ جب فیروز کے مرنے کی خبر اُڑی تو ایک شخص کو جو سلطان سابق کا بیٹا مشہور تھا، بعض لوگوں نے دہلی میں تخت پر بٹھا دیا تھا فیروز ٹھٹے کی مہم میں محمدؐ تغلق کے ساتھ سندھ گیا تھا۔ وہاں سے بہ عجلت دہلی کی طرف روانہ ہوا اور اس کے پہنچتے ہی سب فتنہ و فساد فرو ہو گئے فیروز بن رجب کے لقب سے اُس نے تخت دہلی پر جلوس کیا۔ مگر اس کی بادشاہی اپنے پیش رو کی وفات ہی کے وقت سے شروع ہوتی ہے (۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء)۔

اوصاف اور رفاہ عام کے کام

سلطان فیروز کے زمانے میں اسلامی حکومت ہند کی طاقت میں زوال آ گیا اور ملک میں کوئی اور قوت ایسی پیدا نہ ہوئی جو اس کی جانشین ہو جاتی در اصل علاء الدین خلجی نے علاقے سمیٹ سمیٹ کر سلطنت کو وسیع کیا، لیکن اس کے مستحکم ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی اور گو اس نے نہایت شوق و تن دہی سے فرماں روائی کی مگر بعید علاقوں میں پورا تسلط نہ ہو سکا۔ محمد تغلق کی تخت نشینی کے وقت سلطنت کے (۲۳) صوبے تھے۔ مگر جب اس کا انتقال ہوا تو تین چوتھائی سے بھی کم بادشاہ کے وفادار رہ گئے تھے اور سلطان فیروز میں یہ قابلیت نہ تھی کہ باغی سرداروں کو سزا دیتا یا جو صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے، انھیں واپس حاصل کر لیتا۔ البتہ مسلمان مورخوں کو وہ دل سے عزیز ہے۔

کیونکہ نہایت راسخ الاعتقاد مسلمان تھا۔ اپنے سرپرست محمد تغلق کی روح کو ثواب پہنچانے کے علاوہ اس نے بعض پچھلے سلاطین کے نام بھی خطبے میں داخل کرادئے تھے اور جمعہ کو اس کے نام سے پہلے اُن کو دھرایا جاتا تھا۔ پھر اس نے عمارات پر توجہ کی تو محض نمود و نمایش کو مدِ نظر نہ رکھا بلکہ اُس زمانے کے خیالات کے مطابق فائدۂ عام کا لحاظ کیا۔ نیا شہر جو اس نے موجودہ دہلی کے جنوب میں آباد کیا تھا، جمنا کے کنارے سے "ہندوراﺅ کے باڑے" تک چھ میل لمبا اور کم بیش دو میل چوڑا تھا۔ شاہی محل اور عبادت کے علاوہ آٹھ جامع مسجدیں تھیں اور ہر ایک میں دس ہزار نمازیوں کی گنجایش رکھی تھی۔ اگر انھیں صرف مسلمان مردوں کے واسطے مخصوص سمجھا جائے تو اس سے شہر کی کثرت آبادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہریانے کے علاقے میں اس نے حصار کے مقام پر شہر بسایا اور لوگوں کو عمدہ پانی پہنچانے کے لئے کمال فیاضی سے وہ نہر کھدوادی جس میں جمنا کے علاوہ بعض اور چھوٹی ندیوں کا بھی پانی آتا تھا ملتان کے راستے میں دیپال پور کے مقام پر اس نے ایک بڑی مسجد تعمیر کی سورت میں فوجی چوکی بنائی اور دوسری طرف بہار کے مغربی گوشے میں شہر جونپور کی بنیاد رکھی یہی دونوں مقام غالبًا فیروز کی حدود سلطنت ظاہر کرتے ہیں کیونکہ آگے مشرقی صوبوں یا دکن کے علاقوں میں وہ دہلی کی شہنشاہی تسلیم نہ کرا سکا تھا بہرحال کم سے کم ہندوستان خاص کی حدود میں امن و آسودگی کا دور دورہ تھا۔ فوجی عہدہ داروں کو جاگیر دینے کا قاعدہ جاری کیا گیا تھا کہ وہ اسی آمدنی سے اپنے ماتحت سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کریں جو علاء الدین خلجی کے زمانے میں خزانۂ شاہی سے نقد دی جایا کرتی تھیں۔ بادشاہ کی آمدنی کی فرد علیحدہ رکھی جاتی تھی۔ اور بعض تکلیف دہ ابواب کو منسوخ کردینے کے بعد بھی اس کی میزان (۶) کروڑ روپے سالانہ سے کچھ اوپر ہوتی تھی۔ سلطان کے کارناموں کی سرگزشت ہر اعتبار سے اس کی سیرچشمی کشادہ دلی بلند نظری اور محنت کی گواہ ہے۔ مساجد و محلات کی تعمیر کے ساتھ اس میں نہریں، بند، پل اور تالاب بنوانے کا ذکر آتا ہے اور قطب کے منار یا شاہان سلف کی دیگر عمارات کی مرمت و نگہداشت سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان فیروز تغلق کو قدیم یادگاریں قائم و دائم رکھنے کا کس قدر خیال تھا اور افسوس ہے کہ یہ صفت مشرقی بادشاہوں میں شاذ و نادر ہی نظر

آتی ہے۔ فیروز تغلق کی "نثر تاریخی" جن خاکساری کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے وہ اس کی شرافت کا بہترین ثبوت ہے:-

"یہ حقیر و گنہگار **فیروز بن رجب**، شہنشاہ محمد تغلق کا بندہ کمینہ ہے" پھر جہاں اس نے اللہ تعالیٰ کی اپنے حال پر عنایات کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں شوق تعمیر کو بھی خدا کی نعمت سے تعبیر کیا ہے جس کی بدولت "میں نے خدا کے نیک اور عبادت گزار بندوں کے لئے یہ عمارتیں بنائیں کہ ان میں وہ آرام سے بیٹھ کر اللہ کی یاد کر سکیں اور بنانے والے کو بھی خیر سے یاد کریں، ان عمارتوں میں اس نے بہت سی مسجدیں، خانقاہیں، اور پلے گنائے ہیں۔ مگر اسی ضمن میں ایک دار الشفا کا بھی ذکر ہے کہ "یہاں بلا لحاظ مذہب و حیثیت ہر شخص کا علاج کیا جاتا ہے اور خدا کے حکم سے اسے شفا ہوتی ہے۔ اس میں مریضوں اور معذوروں کے واسطے بادشاہ کی طرف سے دوا اور غذا کا انتظام اور لائق طبیبوں کا پورا محکمہ قائم تھا۔

بعید علاقوں کی خود مختاری

جیسا کہ اوپر اشارۃً آچکا ہے اس نیک نفس بادشاہ کی قناعت پسندی ہندوستان کے لئے موجب فلاح و برکت تھی لیکن سلطنت کے دور دست علاقے اس کے قابو میں نہ آسکتے تھے چنانچہ بنگالے کے حاکموں نے اپنا گز و سکہ الگ جاری کیا نیز دہلی میں سفیر بھیجکر اپنی خود مختاری کا ثبوت دیا۔ ادھر ہندوستان اور دکن کی نئی اسلامی سلطنت کے درمیان اڑیسہ اور تلنگانہ (ورنگل) کی ہندو ریاستوں کا جتھا حائل ہو گیا تھا۔ دکن کی اسلامی سلطنت کے اقبال مند بانی نے سنہ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء میں وفات پائی اور اب اس کا بیٹا **محمد شاہ اوّل** وہاں فرماں روائی کرتا تھا۔ جنوب مغربی علاقے میں کنڑوں کے خاندان نرسنگھ نے ایک ریاست علیحدہ قائم کر لی تھی۔ اس کا صدر مقام وجیانگر میں تھا اور یہاں کا سب سے پہلا خود مختار راجہ جس کا تاریخ میں نام آتا ہے بکا رائے ہوا ہے مگر ہم دکن کے باقی ماندہ واقعات کو آگے چل کر مختصر طور پر بیان کر دیں گے۔

غرض اس طرح کہ باہر کے علاقے ہاتھ سے نکل گئے تھے اور گھر میں فراغ و آسودگی تھی۔ یہ امن پسند سلطان ۳۸ برس تک حکومت کرتا۔ سنہ ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں اس کے فرزند شہزادۂ **فتح محمد** نے قضا کی۔ وہ کئی سال سے کار و بار سلطنت میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا

اور اس کی وفات کے بعد اسی کے بیٹے کو سلطان نے اپنا ولیعہد بنایا اور اُس کے سنِ بلُوغ کو پہنچنے تک اپنے فرزند ظفر خاں کو شریک حکومت کرلیا۔ لیکن اس نے بھی باپ کی زندگی میں رحلت کی اور اب پیرانہ سالی میں اہل محل نے بادشاہ کے خلاف سازشیں شروع کیں چنانچہ تیسرے بیٹے محمد شاہ نے تخت و تاج پر خود قابض ہونا چاہا۔ لیکن اُسے شکست ہوئی اور وطن کو خیرباد کہنی پڑی۔ اس کے بعد خود سلطان فیروز ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں تخت سے دست بردار ہوگیا۔ ہجری حساب سے اس نے ۳۸ برس تک حکومت کی اور گوشہ نشینی کے تقریباً ایک سال تک زندہ رہ کر بہت بڑی عمر میں وفات پائی۔

تغلق ثالث سلطان ابوبکر اور محمد شاہ

شہزادہ فتح محمد کا بیٹا، سلطان غیاث الدین تغلق ثالث فیروز شاہ کا جانشین تھا اور سلطان کی گوشہ نشینی اور چچا کی شکست کے بعد سے اس کی حکومت شروع ہوتی ہے لیکن اس نے فرائض شاہی کی انجام دہی پر مطلق توجہ نہ کی اور ایک سال کے اندر ظفر خاں کے بیٹے شہزادہ ابوبکر نے اس کی جگہ چھین لی غیاث الدین بھاگتے میں گرفتار ہوا اور قتل کرادیا گیا۔

کچھ مدت تک دہلی کے امرا اور درباری سلطان ابوبکر کی ہواخواہی میں سرگرم رہے لیکن جب اس کے چچا محمد شاہ نے عالم جلا وطنی سے نکل کے پے در پے حملے شروع کئے اور تین مرتبہ شکست کھانے کے باوجود اپنی کوشش سے ہاتھ نہ اٹھایا تو ایک فریق اس کا بھی طرفدار ہوگیا اور انھی امرا نے اسے دہلی میں بلاکر بادشاہ بنادیا (۷۹۱ھ ۱۳۸۹ء) سال آیندہ اس نے اپنے بھتیجے کو گرفتار کرکے میرٹھ بھجوادیا اور وہیں قید میں اس نے وفات پائی۔

سلطان محمد شاہ نے جس جد و جہد کے ساتھ بادشاہی حاصل کی تھی اسی متعدی سے کے ساتھ آیندہ بھی حکومت کی۔ اس نے دوآب کے مفسدے فرو کئے اور مزید فتوحات حاصل کرنے کی اس سے توقع تھی مگر اجل نے اتنی مہلت نہ دی اور وہ مرض تپ سے انتقال کرگیا۔ (۷۹۴ھ مطابق ۱۳۹۲ء)

محمود شاہ اور عام بدعملی

۵۴ دن ایک اور وارث کی بادشاہی کے بعد محمد شاہ کا

چھوٹا بیٹا محمود شاہ تخت نشین ہوا جس کے عہد میں خاندان تغلق کی سطوت کا آفتاب غروب ہوگیا۔ شہزادہ فتح محمد کا ایک اور بیٹا اس کا رقیب اور سلطنت کا مدعی تھا۔ وہی تین سال تک فیروز شاہ کے نئے شہر میں حکومت کرتا رہا۔ اور تخت کا اصلی وارث یعنی محمود شاہ محمد تغلق کے قدیم شہر جہاں پناہ کے اندر قلعہ بند رہا۔ اس عجیب دوعملی کا آخر اقبال خاں نامی ایک امیر نے قصہ فیصل کیا اور خود محمود شاہ کی طرف سے حکومت کرنے لگا اصلی وزیر خواجہ جہاں یہ رنگ دیکھ کر دہلی سے چلدیا اور جونپور پہنچ کر وہاں ایک آزاد ریاست (سلطنت شرقیہ) کی بنیاد ڈالی۔

مختصر یہ کہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر سنین میں دہلی کے گرد صرف پانچ پرگنے بادشاہ محمود شاہ اور اس کے دارو غہ محل کے قبضے میں باقی رہ گئے۔

امیر تیمور کا حملہ

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مغل دوبارہ ہندوستان میں نمودار ہوئے۔ مگر اس دفعہ وہ خانہ بدوش کافروں کے انبوہ کی طرح جیسے پہلے آیا کرتے تھے نہیں آئے تھے کہ جن میں کوئی ترتیب ہوتی تھی نہ انتظام بلکہ اب کے دنیا کے ایک نامور سپہ سالار کے زیر علم باقاعدہ فوج کی صورت میں مرتب ہوکر آئے تھے۔ یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ بلبن کے زمانے میں امیر خسروؒ کو منگو خاں کے بعض جرگے پکڑے گئے تھے اور انھوں نے ان مغلوں کی شکل وشمائل کی نہایت دلچسپ کیفیت قلمبند کی تھی۔ اس کو پڑھ کر ان لٹیروں کی تصویر آنکھوں میں پھرجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں پر تمدن وشائستگی کا سایہ تک نہ پڑا تھا اور ان کے سردار یعنی چنگیز یا اس کے بیٹے بھی اپنے ہم قوموں سے کچھ زیادہ مہذب نہ تھے۔

لیکن امیر تیمور بالکل دوسری قسم کا "مغل" تھا۔ ہرچند وہ اپنا شجرۂ نسب چنگیز کی پردتی تک پہنچا دیا کرتا تھا مگر باپ کی طرف سے وہ ترکوں کے مشہور خاندان برلاس کا آدمی ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم سُغد کے قدیم پائے تخت سمرقند میں ہوئی اسی مقام کو اس نے اپنی سلطنت کا مرکز قرار دیا۔ اور یہیں اس کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ تیمور نہایت تعلیم یافتہ شخص تھا اور پاکیزہ ترکی میں جو تزک اس نے لکھی وہ مستند اہل نظر کے نزدیک قابل تحسین ہے۔

یہ اقبالمند بادشاہ وسط ایشیا و ایشیائے کوچک میں جتنی لڑائیاں لڑا سب میں بلا استثنا فتح پائی اور ان مسلسل فتوحات کے بعد ۶۳ برس کی عمر میں اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ جہاں پہلے ہی بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ۷۹۶ھ مطابق ۱۳۹۸ء کے شروع میں اس کا حملہ پنجاب پر ہوا اور سلطانی افواج کو شکست دے کے وہ دہلی میں داخل ہو گیا۔ ان فوجوں کے لڑنے کی اس نے تعریف کی ہے مگر شہر میں داخلے کے وقت اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ کیونکہ اہل شہر نے محافظت کے وعدے پر قلعے خود حوالے کر دئے لیکن اہل شہر اور بعض سپاہیوں کی باہمی نزاع نے غارتگری اور قتل عام کی نوبت پہنچائی اور مغلوں نے ہزاروں آدمیوں کو مار کر محلات میں آگ لگا دی۔ آخر امیر تیمور فیروز آباد کے نئے شہر میں آیا جہاں سلطان فیروز تغلق کی بڑی مسجد میں مسلمان جمع تھے۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کی سفارش پر اس نے ان لوگوں کی جان بخشی کی اور اپنے لشکر کو لئے ہوئے مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ مسجد جہاں لوگ جمع ہوئے تھے اب تک سلامت ہے۔

خاندان تغلق کا خاتمہ

سلطان محمود اور اقبال خاں ان مصیبتوں میں نہیں پھنسے کیونکہ لڑائی میں شکست ہوتے ہی وہ گجرات کی جانب چل دئے تھے پھر جب امیر تیمور مشرق میں قنوج تک اور شمال میں جموں تک گشت لگانے کے بعد ملتان کے قدیم راستے سے رخصت ہوا تو یہ بادشاہ و وزیر اپنی اجڑی نگری میں واپس آئے۔ مگر سلطان کا نام ہی نام رہ گیا تھا ورنہ اصلی حکومت اقبال خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اور اب اس بات کو وہ چھپاتا بھی نہ تھا بلکہ ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء میں خود اپنی مرضی سے اس نے پنجاب پر فوج کشی کی تھی کہ خراج وصول کرے۔ لیکن وہاں کے صوبہ دار خضر خاں کے ہاتھ سے شکست کھا کے مارا گیا۔ سلطان محمود اس وقت قنوج میں تھا اقبال خاں کا مرنا سنا تو پھر دلی آیا اور اسی کس مپرسی کے ساتھ بارہ تیرہ برس جی کر وفات پائی اس کے بعد خاندان تغلق کا بھی خاتمہ ہو گیا اور تمام قوت چند فوجی سرداروں کے ہاتھ میں آگئی جن کا سرگروہ

دولت خاں لودھی نامی ایک پٹھان امیر تھا اور اس نے یہ حیلہ بنا رکھا تھا کہ میں امیر تیمور کی طرف سے اس شکستہ حال سلطنت کا نائب اور محافظ ہوں لیکن کچھ عرصے کے بعد خضر خاں نے پنجاب سے کوچ کیا۔ اور قلعۂ جہاں پناہ کو جہاں دولت خاں قلعہ بند تھا فصیل میں شگاف ڈال کے یا سیڑھیاں لگا کے فتح کر لیا۔ (۸۱۷ھ مطابق ۱۴۱۴ء)۔

باب چہارم

سیّد اور لودھی خاندان۔ سلطنت مغلیہ کی ابتدا

خاندان سادات

خضر خاں ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء کے شروع میں تخت پر بیٹھا اور وہ اور اس کی اولاد خاندان سادات کے نام سے مشہور ہے اور یہ بادشاہ اسی بدامنی اور شورش میں تیس برس تک حکمراں رہے۔ مگر ان ضعیف بادشاہوں کی اگر صحیح معنی میں کہیں حکومت تھی تو وہ دہلی اور اس کے مضافات میں صرف چند میل تک تھی ورنہ سلطنت اور شہنشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مشرق میں جونپور کا علاقہ خود مختار اور ایک باوقعت سلطنت بن گیا تھا۔ اور اسی طرح جنوب میں مالوہ آزاد تھا۔ البتہ شمال مغرب میں خضر خاں کے بیٹے سلطان مبارک نے جو ۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء میں باپ کا جانشین ہوا اپنا تسلط رکھنے کی کوشش کی اور اگرچہ اسے ملتان کے علاقے سے امیر تیمور کے بیٹے نے نکال دیا تاہم دیگر اطراف میں قسمت نے یاوری کی اور اسے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہو گئی مگر ۸۳۹ھ / ۱۴۳۵ء میں بعض سازشی امیروں نے اسے فریب سے ہلاک کر دیا اور خضر خاں کا ایک پوتا سیّد محمد شاہ اس کا جانشین ہوا کئی برس تک اس نے رہی سہی حکومت کے کام سے دل بہلایا اور جونپور و مالوے کے سلاطین نے اس پر نرغہ کیا تو لاہور کے صوبہ دار کی کوشش اور وساطت آڑے آ گئی جو بجائے خود اپنے علاقے کا آزاد حاکم تھا سیّد محمد نے ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا علاء الدین شاہ عالم کے لقب سے باپ کا جانشین ہوا اور اس کے اسی لقب سے یہ ضرب المثل بہت جلد ہندوستان میں زبان زد عام و خاص ہو گئی کہ بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم" (پالم شہر سے قریب ایک گاؤں کا نام ہے)۔

لودھی خاندان ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء تا ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء

لاہور کا صوبہ دار بہلول جس کا اوپر ذکر آیا

ہندوستان ہی کا باشندہ اور لودھی خاندان کا پٹھان تھا۔ سید خضر خاں اسی علاقے کی صوبہ داری سے تخت حکومت تک پہنچا تھا بہلول نے بھی اس کی پیروی کی اور دہلی کو خطرے میں دیکھ کر سید بادشاہ کو خیریت اسی میں نظر آئی کہ روہیلکھنڈ کے علاقے میں پناہ لے چنانچہ اس نے یہیں کے صدر مقام بداؤں میں زندگی کے باقی دن گمنام رہ کر بسر کئے اور دہلی میں افغان سرداروں نے بہلول کو بادشاہ بنالیا۔ (ربیع الاول ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء)۔

سلطان بہلول لودھی

بہلول لودھی نے ۳۷ برس تک بادشاہی کی۔ اور اتنے عرصے تک حکومت کا سلامت رہنا ہی اس زمانے میں بہت غیر معمولی بات تھی مگر اس نے سلطنت کے قدیم علاقے واپس لینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ البتہ مقامی صوبہ داروں کی شورشیں فرو کیں اور رہے سہے علاقے کو پارہ پارہ ہونے سے بچالیا۔ ملتان، لاہور اور این روئے ستلج (تا پانی پت) کے اضلاع کا وہ خود پہلے سے حاکم تھا اور جب دہلی کے تخت پر بیٹھا تو یہ علاقے (از خود اس کی سلطنت میں شامل ہوگئے لیکن مشرق میں اسے جونپور کے سلطان حسین شاہ سے شمشیر آزمائی کرنی پڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی ابتدا حسین شاہ کی طرف سے ہوئی اور اسی نے حملہ کرکے سلطان بہلول سے لڑائی مول لی۔ جنگ و پیکار کا سلسلہ تقریباً تیس برس تک جاری رہا اور آخر ۸۸۳ھ ۱۴۷۹ء میں لودھی بادشاہ غالب آیا اور "مشرقی سلطان" نے بھاگ کر بنگالے میں پناہ لی۔ وہاں اس زمانے میں سلطان علاء الدین علی شاہ کی حکومت تھی اور بنگالہ بجائے خود ایسی قوی سلطنت بن گیا تھا کہ بہلول نے اس کے ساتھ چھیڑ نکالنی مناسب نہ سمجھی البتہ وسط ہند کے بعض علاقے اس نے فتح کئے اسی بنا پر الفنسٹن نے جو لکھا ہے کہ اس کی سلطنت دہلی سے کوہستان ہمالیہ تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بعض کونے بندھیل کھنڈ کی طرف آگے کو نکلے ہوئے تھے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے ذاتی اوصاف کے اعتبار سے یہ بادشاہ سیدھا سادہ سپاہی مزاج آدمی تھا اور اس کی سرکار میں ہندو مسلمان ہر قوم کے آدمی ملازم تھے۔ اس نے ۸۹۴ھ مطابق ۱۴۸۸ء میں وفات پائی اور عزت و آبرو کے ساتھ دہلی ہی میں دفن ہوا جہاں اس کا مقبرہ اب تک سلامت ہے۔

سلطان سکندر لودھی

بہلول کے بعد اس کے بیٹے نظام نے سکندر شاہ کا لقب اختیار کیا

اور دہلی میں تخت نشین ہوا لیکن اس کا باپ ولایت جونپور اپنے دوسرے بیٹے باربک کو دے گیا تھا اور اس نے بھائی کی بادشاہی تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فہمائش سے کام نہ چلا تو سکندر نے بزورِ شمشیر بھائی کو زیر کیا۔ باربک کو اطاعت و ماتحتی قبول کرنی پڑی۔ سلطنت دہلی کے دامن پھر ایک مرتبہ بنارس اور دوسری طرف بندھیل کھنڈ سے بھی آگے تک پھیل گئے۔ ۹۰۹ھ ۱۵۰۴ء میں سلطان نے دہلی کی بودوباش چھوڑ کے آگرے کی نواح میں رہنا شروع کیا اور وہ جگہ (یعنی سکندرہ) اب تک اس کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بادشاہ نہایت فاضل، متقی اور کسی قدر متعصب مسلمان تھا لیکن ایسی کوئی شے نسلوں کے باہمی اختلاط اور ہندو مسلمانوں کے میل جول میں مانع نہ آسکتی تھی۔ چنانچہ خود مسلمان امیر ہندوؤں کی طرفداری کرتے تھے اور عقائد میں ہمرنگی پیدا ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کبیر پنتھی[1] اصول کا نہ صرف خواص بلکہ عوام میں بھی رواج ہوتا جاتا تھا۔ اس عہد کی یاد رکھنے کے قابل ایک اور بات یہ ہے کہ اول اول فارسی زبان ہندوؤں نے اس زمانے میں عام طور پر پڑھنی شروع کی

سلطان ابراہیم لودھی

سلطان سکندر نے ۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سلطان ابراہیم جانشین ہوا جو اس خاندان کا آخری بادشاہ گزرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں روپے اور اجناس کی شرح مبادلہ میں غیر معمولی فرق پیدا ہوا اور ایک ہمعصر مورخ کے الفاظ میں "سونا چاندی نہایت مشکل سے دستیاب ہوتا تھا اور سو تنکہ (یا روپیہ) مہینے کا خرچ بڑی ثروت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ سونے چاندی کی قیمتوں میں یہ گرانی اگر پہلے نہیں تو لودھی خاندان کے اوائل عہد ہی سے نمایاں ہوگئی تھی اور شاید اس کی وجہ امیر تیمور کا حملہ یا بدامنی تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے مال زمین کے اندر دبائے۔ اور پھر وارثوں کو بتانے کا موقع پائے بغیر مارے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتی دھاتیں ملک میں کمیاب ہوگئیں سلطان کو خود جواہرات جمع کرنے کا شوق تھا اس نے اور زیادہ ان کی مانگ بڑھادی بہرحال اس کے اثر سے اجناس میں جو ارزانی پیدا ہوئی

[1] ان لوگوں نے بہت سے اسلامی عقائد کو اختیار کرلیا تھا اور انھی بنیادوں پر بعد میں گرو نانک صاحب نے سکھ مت کی عمارت اٹھائی حتیٰ کہ اول اول سکھ مت محض دین اسلام کا ایک فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو ہیوز کی ڈکشنری اوف اسلام) ۱۲

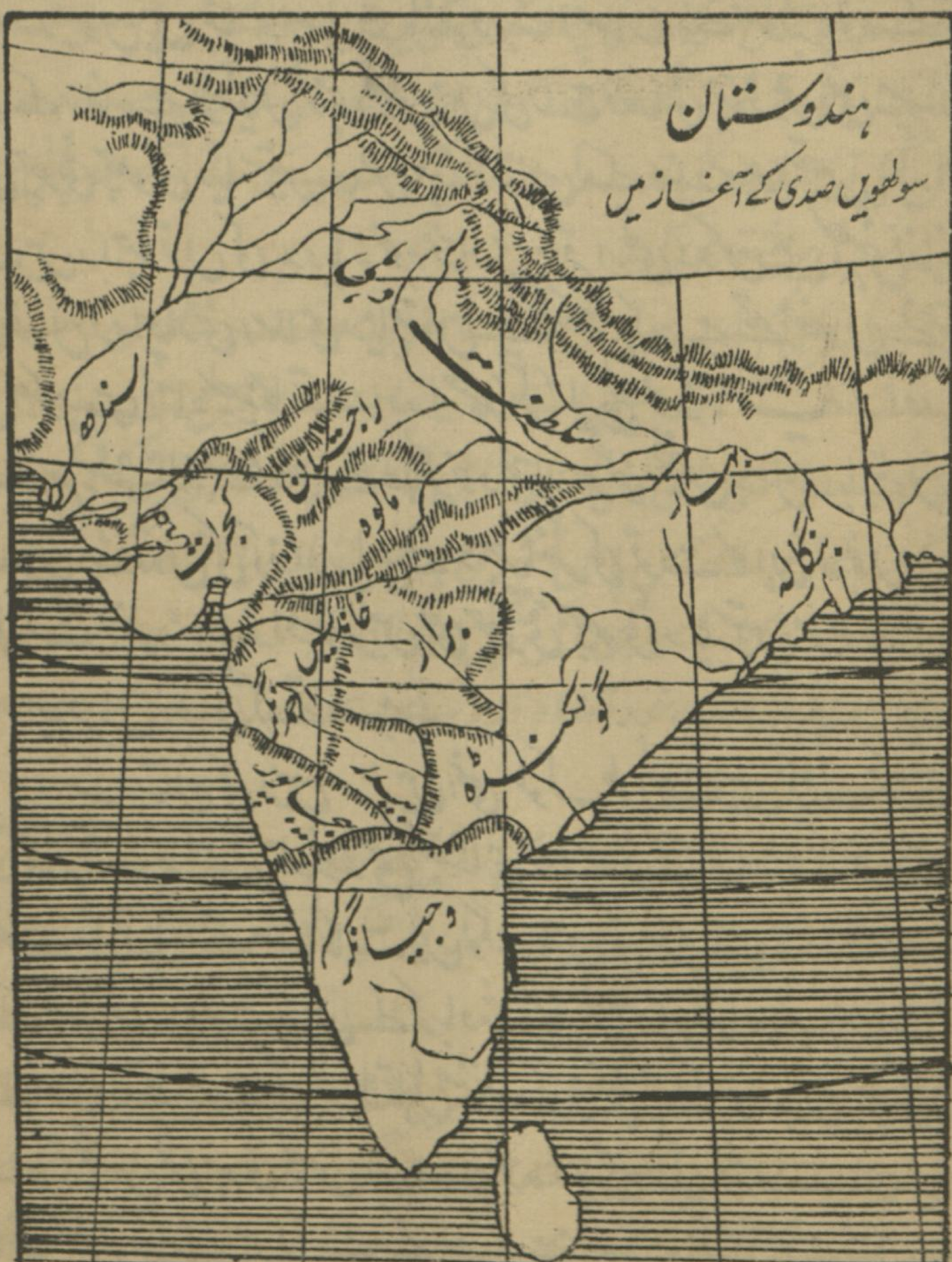
اس کا ہر شخص ذکر کرتا تھا۔ مگر کسان کو اس سے محض نفع ہی نفع نہ تھا بلکہ سرکاری مال گزاری وہی دینی پڑتی تھی جو پہلے سے مقرر تھی حالانکہ منڈی میں پیداوار کی قیمت اب اتنی نہ ملتی تھی۔

سلطان ابراہیم کو بھی ابتدا میں اسی قسم کے واقعات پیش آئے جیسے اس کے باپ کو پیش آئے تھے یعنی جونپور کے متعلق بھائی سے جھگڑا ہوا اور اسی طرح جمنا کے پار بلکہ زیادہ دُور تک فوج کشی کرنی پڑی۔ مگر سلطان کا اصلی اور زیادہ قوی دشمن وہ تھا جو شمال مغرب کے پہاڑوں میں تاک لگائے بیٹھا تھا (یعنی بابر بادشاہ) کہ کب موقع ملے اور کب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ کیونکہ گو ابراہیم بہادر بادشاہ تھا لیکن رعایا اس سے خوش نہ تھی۔

مغل حملہ آور ادھر مغلوں کی حالت بالکل بدل گئی تھی اور امیر تیمور ہی کے زمانے میں ہم انھیں بدلا ہوا دیکھ چکے ہیں۔ تیرھویں صدی میں امیر خسرو نے انھیں پست قامت، کثیف اور زرد فام بتایا ہے جن کے چہرے چپٹے اور غنغنی آواز تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بات ان کے منہ سے نکلتی تھی اور تہذیب کے کسی آداب و فن سے مطلق واقفیت نہ رکھتے تھے، شاعر نے انھیں "ترکان قے" کا ذو معنی لقب دیا ہے کیونکہ ان کے ایک قبیلے کا نام بھی اس لفظ سے ملتا جلتا تھا اور دوسرے معنی تو ظاہر ہیں کہ گویا ان کی شکل و شمائل دیکھ کر قے آتی تھی۔ یہ امیر خسروؒ کے زمانے کی حالت تھی۔ دین اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی تمدن اور دوسری قوموں سے رشتے ناتے نے ان کی دو سو برس کے اندر جو کایا پلٹ کر دی تھی اس کی شہادت میں ارسکن نے ایک نہایت ثقہ سیاح کا بیان نقل کیا ہے جو مغلستان کے حاکم یونس خاں سے ملنے گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یونس خاں کو قوم کا مغل سن کر میں نے خیال کیا تھا کہ وہ ضرور ایک ڈاڑھی منڈا جنگلی وضع کا آدمی ہوگا لیکن دیکھا تو وہ بہت وجیہ اور خوبصورت شخص نکلا جس کے گھن کی ڈاڑھی تھی دوسرے گفتار و کردار آداب و اخلاق غرض اس کی ہر بات میں وہ نفاست و شائستگی تھی کہ نہایت مہذب اور اعلیٰ صحبتوں کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

محمد ظہیر الدین بابر اسی یونس خاں کا جو چنگیز کی اولاد میں تھا نواسہ ہوتا ہے کیونکہ بابر کا باپ امیر تیمور کے جانشین فرزند مرزا شاہ رخ کا پرپوتا تھا اور اسے

یونس خاں کی بیٹی بیاہی تھی ۔ بابر فرغانہ میں جسے اب ملک **قوقند** کہتے ہیں ۸۸۸ھ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اور موجودہ افغانستان کا علاقہ لینے سے پہلے ادھر ادھر قسمت آزمائی کرتا پھرا ۔ آخر ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء میں قندھار سے خیبر تک اس کا تسلط جم گیا تو کچھ مدت بعد اس نے پنجاب پر یورش کی ۔ لیکن اب کہ میدان جنگ میں فریقین ایک دوسرے کے مقابل پہنچ رہے ہیں مناسب ہوگا کہ سرسری طور پر ہم اس متاع گراں بہا کی اندرونی حالت پر ایک نظر ڈالیں جس کے واسطے یہ کشت وخون اور قوت آزمائی ہونے والی ہے ۔



والئ ہندوستان کی سلطنت کو ایک حال پر قرار نہ تھا اور بدمزاج وسخت گیر

ہونے کے باوجود وہ اپنے شورہ پشت افغان امیروں کو پوری طرح قابو میں نہ رکھ سکتا تھا۔
بہار و جونپور کی فرماں برداری پہلے ہی بھروسے کے لایق نہ تھی اور بنگالہ قطعی طور پر آزاد
ہو چکا تھا جس کے خود مختار سلاطین کا مستقر کبھی کبھی ڈھاکہ کے قریب لیکن بالعموم شہر گور
(لکھنوتی) میں رہتا تھا۔ اس ملک کی کامل خود مختاری کا بانی علاؤ الدین گزرا ہے
جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ مگر اب نصرت شاہ اس کا جانشین تھا۔ ملک گجرات
یعنے بند ھیلہ جل سے سومنات وسورت تک تمام علاقہ، مسلمان سلطان منظفر شاہ نامی کے
باج گزار رئیسوں میں بٹا ہوا تھا اور مانڈو کے اضلاع یعنے صوبۂ مالوہ کے لئے اس کی
میواڑ کے رانا سے لڑائیاں رہتی تھیں جس کی راج دھانی چتوڑ میں تھی۔ میواڑ کے شمال
میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خاص ہندوستان کے اندر موجود تھیں اور اجمیر کے
جنوب میں راجپوتوں کی بدویانہ خود مختاری برقرار تھی۔ دکن میں بہمنی خاندان کے
آخری فرماں روا چار نئی اسلامی ریاستوں سے کشمکش کر رہے تھے جنھوں نے سلطنت دکن
کا طوق حکومت اُتار پھینکا تھا۔ اور احمد نگر، ایلچ پور، بیدر اور بیجاپور
(۸۹۷ھ م ۱۴۸۹ء) کے علاقے دبا کر خود مختار ہو گئی تھیں۔ ان ریاستوں سے آگے
جنوب میں ہندوؤں کی آزاد ریاست وجیانگر کی قوت کا ان دنوں عروج تھا۔
اور کالی کٹ، تنجور، اور ٹراونکور میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں جن پر ہمیشہ
ہندو راجہ فرماں روائی کرتے رہے۔

ہندوستان کی وسیع سرزمین انھی ملوک طوائف میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی
اور اس تمام ملک پر ابراہیم لودھی شہنشاہی کا دعوی کرتا تھا حالانکہ خود اس کے
پائے تخت یعنی دہلی کے مضافات میں لوگ اس کی حکومت نہ مانتے تھے اور ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء میں
لاہور کے صوبہ دار دولت خاں نے کہ بادشاہ کا رشتہ دار تھا علانیہ انحراف کیا اور بابر
سے امداد کی درخواست کی جو بلا تامل منظور کر لی گئی کیونکہ پنجاب پر بابر کی بہت
دن سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور اسے وہ امیر تیمور کی فتوحات میں اپنی میراث
سمجھتا تھا لیکن پنجاب میں آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ دولت خاں یہ علاقہ
اس کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں۔ ادھر سلطان ابراہیم کے بعض عمال نے ایکا کر کے
لاہور کے قریب بابر کا مقابلہ کیا اور جب تک انھیں میدان میں شکست نہیں ملی،

بابر شہر پر قبضہ نہ کر سکا دولت خاں نے اب بھی حملہ آوروں کو مدد دینے سے پہلو تہی کی اور انھیں تنہا دیپال پور پر حملہ کرنا پڑا لیکن اقبال نے یاوری کی اور بابر کامیاب ہوا اس وقت دولت خاں نے ظاہر داری سے اس کی رفاقت کی مگر چند روز کے بعد علانیہ برگشتہ ہو گیا۔ اور بابر نے اپنے کوہستانی وطن کی راہ لی وہ دیپال پور کی حکومت بھی ابراہیم لودھی کے ایک چچا کو سونپ گیا جو مغلوں سے مل گیا تھا: بابر بادشاہ کے رخصت ہونے کے بعد دولت خاں نے خود اپنی بادشاہی کا سامان کیا اور تمام پنجاب پر مسلّط ہو گیا۔ بابر اُس وقت اپنی شمالی سرحدوں پر ازبکوں کی یورش روکنے میں مصروف تھا اور دولت خاں کا وقت کے وقت کوئی تدارک نہ کر سکا لیکن جب ادھر سے فرصت مل گئی تو پھر لاہور آیا اور دولت خاں کو مغلوب کرنے کے بعد پانی پت کے راستے اُس نے دہلی پر پیشقدمی کی:

پانی پت کی پہلی لڑائی

اس میدان کا ایک مغربی مصنّف نے ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:۔ یہ نہایت وسیع و مسطح زمین ہے جس میں کہیں کہیں نشیب و فراز ہیں بھی تو چند اں قابل لحاظ نہیں۔ بھوڑ مٹی میں کسی کسی جگہ کوئی نالہ نکل گیا ہے تو نمی سے آس پاس ٹھٹھری ہوئی جھاڑیاں یا سخت گھاس اُگ آئی ہے ورنہ جدھر دیکھئے بھورا بھورا سبزی مائل چٹیل میدان نظر آتا ہے۔ ہر طرف کچھ ایسا ہو کا عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود قضا و قدر نے اسے قوموں کے کشت و خون کے واسطے مخصوص کر دیا تھا:

اسی میدان میں سلطان ابراہیم حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے ہندوستان کا لشکر عظیم لایا تھا۔ ہندی امرا زرق برق زرہ بکتر پہنے، صدہا جنگی ہاتھی سجا سجا کر اپنے ساتھ لائے تھے، اور ان سرداروں کے زرّیں خیام اور شامیانوں سے میدان جنگ زربفت کا تھان بن گیا تھا۔ یہ ۷ر رجب ۹۳۳ھ یا ۲۰ر اپریل ۱۵۲۶ء کا ذکر ہے اور وہ تمام دن ہندوستانی فوجوں نے جشن اور سیر تماشے میں گزارا۔ مگر ان تھکے ہارے آوارہ گرد حملہ آوروں کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی جو اپنے گھر کی پہاڑیاں چھوڑ کے اتنی دور لڑتے بھڑتے اس بے آب صحرا کی لو میں آئے تھے اور ان کے صاف گو سردار نے خود بیان کیا ہے کہ ان میں سے اکثر نہایت اندیشہ مند تھے کہ دیکھئے میدان

کس کے ہاتھ رہتا ہے اور یہ لکھ کر کہ اس قسم کا خوف مردان جنگ کی شان کے خلاف ہے؛ بابر اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ انصاف سے دیکھیے تو ایک غیر ملک میں دشمن کی اتنی کثیر فوج کے مقابل سپاہیوں کا ہراساں ہونا کچھ قابل گرفت بات نہ تھی؛ لیکن فریقین کی تعداد میں جو کمی بیشی تھی دونوں طرف کے سرداروں کی قابلیت کے فرق نے اس کی تلافی کر دی۔ خود بابر تصدیق کرتا ہے کہ "شہنشاہ ہندوستان ناتجربہ کار و ناتربیت یافتہ تھا۔ جنگی چالوں پر اُسے توجہ نہ تھی اور فوجوں کے لڑانے میں کسی ترتیب کا خیال نہ کرتا تھا۔ چنانچہ بلا وجہ کہیں تو اُنھیں ٹھہرا دیتا اور کہیں سوچے سمجھے بغیر لڑنے کا حکم دے دیتا تھا اس کے مقابلے میں بابر کو مشکلات نے احتیاط و دانائی سکھا دی تھی اور کسی چیز کو حسن اتفاق پر چھوڑنا نہ چاہتا تھا" اس کا میمنہ پانی پت کی فصیل کی پناہ میں تھا قلب کی حفاظت کے لئے آگے توپ خانہ لگایا تھا۔ اور توپیں گاڑی اور لکڑی کے گٹھوں کی آڑ میں ایک دوسرے کے ساتھ تسموں سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے لمبی لمبی "جزیل" یعنی توڑے دار اور زمین پر ٹکی ہوئی قرابینیں لئے تفنگچی کھڑے تھے۔ اپنے میسرے کے آگے بابر نے کچا دمدمہ تیار کرایا تھا۔ اور درخت کے ٹہنوں سے اس کی حفاظت کی تھی؛ اس کے کئی گھنٹے انھی تیاریوں میں صرف ہوئے اور جب صبح ہوتے ہی دوسرے دن سلطان ابراہیم نے بے صبری سے اپنی گڈ مڈ فوجوں کو دھاوے کا حکم دیا تو اُس کا جو کچھ نتیجہ ہونا تھا وہ ہم خود سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو جان کی بازی لگی ہوئی تھی اور جدید فن حرب کا ساز و سامان موجود تھا اور دوسری طرف قرون وسطیٰ کے لڑنے والوں کا ہجوم کہ اُن کے پاس وہی پرانے زمانے کے ہتھیار تھے اور نہ باقاعدہ کوئی ترتیب تھی نہ تقسیم، شور کرتا چلا آتا تھا؛

مغل سواروں کے تین رسالے تھے، اور دو کا کام یہ تھا کہ دشمن کے بڑھتے وقت اُس پر حملہ کریں۔ اور دو کی حفاظت تیسرے کے سپرد تھی۔ تیر اندازوں کا گروہ بھی ان میں موجود تھا جو دبے پاؤں غنیم کے سیدھے بازو پر آنکلا اور عقب سے تیر برسا برسا کے اُسے پریشان کرتا رہا۔ اُدھر سامنے کی صفوں میں مغلوں کی توپ و تفنگ نے تہلکہ ڈال دیا اور جس قدر ہندوستانی قریب آتے گئے اُسی قدر لشکر گاہ پر حملہ کرنے کی ہمت پست ہوتی گئی

اور ادھر تو بڑھنے میں پس وپیش ہوا اُدھر پیچھے کے ریلوں نے ہٹنے کی راہ بند کر دی کیونکہ صفوں پر صفیں پلی پڑی تھیں اور کثرت تعداد اُن کے لئے عذاب ہوگئی تھی۔ غرض ہر چند سلطان ابراہیم اور اُس کے چند جاں نثاروں نے فوجوں کو سنبھالنے کی کوشش کی کچھ فائدہ نہ ہوا اور ہر طرف ہلچل پیدا ہوگئی۔ سلطان کو ایک درباری نے نکل چلنے کی صلاح دی تھی کہ ابھی تک جان بچانے کا موقع ہے لیکن دشمن کے تیر انداز پشت پر اور سوار سر پر آ پہنچے تھے سلطان نے پیٹھ پھیرنے سے انکار کر دیا اور اپنے جانباز رفیقوں کو لے کے لڑائی کے گھمسان میں جا پڑا جس وقت لڑائی ختم ہوئی تو پانچ ہزار سے زیادہ نمک حلالوں کی لاشیں اپنے مقتول سلطان کے گرد انبار تھیں۔ بابر کے تخمینے کے مطابق ہندوستانی سپاہ کے صرف مقتولین کا شمار ۱۵ ہزار تھا اور انہی میں گوالیار کا ہندو راجہ بھی شامل ہے جو اپنے وطن پر سینہ سپر ہونے کو مسلمان سلطان سے آملا تھا۔ باقی ادھر اُدھر جو لوگ پکڑے یا مارے گئے ان کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ فتحمند دل کے ہراول دستے آگے بڑھ کر دلّی اور آگرے پر قابض ہو گئے لیکن گو ہندوستانی مسلمانوں کا مقابلہ ان سے ہوا جو صریحاً قوت وجنگجوئی میں اُن سے بدتر تھے۔ باایں ہمہ یہ وحشی اور خونخوار لوگ نہ تھے کہ بے وجہ مغلوب دشمن پر ظلم کرتے۔ ہندوستان نے ایک لڑائی پر اپنا پورا زور صرف کر دیا تھا، بس اس کے بعد کسی مزید کشت وخون کی نوبت نہیں آئی بلکہ صرف حکومت فتحمند فریق کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔

ظہیر الدین بابر بادشاہ

فتح کے بعد تیسرا جمعہ تھا کہ بابر شاہزادۂ ولی عہد ہمایوں مرزا کے عقب میں آگرے آیا۔ راجہ گوالیار کے اہل وعیال نے ہمایوں کی خدمت میں باریاب ہوکر بعض تحائف پیش کئے اور انہی میں وہ مشہور ہیرا بھی تھا جو "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہوا اور بہت سے خاندانوں کو تباہ کرنے کے بعد آجکل شاہان انگلستان کے قبضے میں ہے۔ خاندان گوالیار کے ساتھ بابر بہت لطف وکرم سے پیش آیا اور مرحوم سلطان ابراہیم لودھی کے پسماندوں کی بسر اوقات کا بھی اُس نے شاہانہ طریق پر انتظام کیا۔ لیکن ان مشقتوں سے جو ملک ہاتھ آیا تھا اُسے لے کر وہ یا اُس کے ساتھی

کچھ بہت خوش نہ ہوئے۔ اور یہ صاف گو سپاہی اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں رغبت و دل کشی کے بہت کم سامان ہیں" اور ایک جگہ اُس نے آگرے کی ہوش فرسا گرمی کا ذکر کیا ہے کہ اس موسم میں مغل سواروں کو کھانے کے لئے خوراک میسر آتی تھی نہ گھوڑوں کے لئے چارہ۔ کیونکہ خشکی کے زمانے میں فصلیں بوئی نہیں جاتیں اور لوگ یا تو بھاگ گئے تھے یا مغلوں کی حکومت سے منحرف تھے۔ غریب الوطن مغل سپاہی پہاڑی آب و ہوا کے پلے ہوئے تھے گرمی کی شدّت اور خوراک کی قلّت نے صدہا کو ہلاک کر دیا۔ سرداروں کی زبان پر حرف شکایت آنے لگے اور آپس میں مشورے ہونے لگے کہ اپنے اپنے رسالے کو واپس کابل لے چلو۔ لیکن اس ارادے پر عمل نہیں ہوا اور ان میں سے صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے حقیقت میں یہاں رہنا گوارا نہ کیا اور اُسے مال غنیمت کے ساتھ کابل بھیج دیا گیا۔

جنگ سیکری یا کنواہہ

ادھر میواڑ کے راجہ رانا سانگا نے بابر کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بہت بہادر اور طاقتور راجہ تھا اور "تاریخ راجستان" کے مشہور مصنف کرنل ٹاڈ نے اس راجہ کا بڑی محبت سے حال لکھا ہے کہ اس کے جسم پر شجاعت و شرافت کی کم سے کم اسّی مہریں ثبت تھیں یعنی نیزے اور کٹار کے اتنے زخموں کا نشان موجود تھا۔

سردیاں آتے ہی یہ تلوار کا دھنی آگرے پر بڑھا کہ ہندوستان کے نئے دعویداروں سے قوّت آزمائی کرے، اپنے پہاڑی علاقوں میں اس کے آباواجداد نے راجپوتی نام اور آزادی پر اب تک کوئی حرف نہ آنے دیا تھا لیکن اپنا موروثی دشمن اور سخت حریف وہ اُسی اُتر کے پہاڑی قبیلوں کو سمجھتے تھے کہ راجپوتوں سے ہندوستان کی حکومت چھیننے والے اگر ہیں تو یہی لوگ ہیں اور بچپن سے انھیں یہی تعلیم دی جاتی تھی۔ غرض جب تک آگرے اور دلّی پر پٹھانوں کا راج تھا اور بابر کابل ہی سے ہندوستان کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا اُس وقت تک رانا سانگا نے ہندوستان کو بچانے میں یہاں کے مسلمانوں کا بالکل ساتھ نہ دیا۔ لیکن بابر کا دہلی اور آگرے پر قبضہ ہوتے ہی اُس نے جنگ شروع کی اور تمام راجپوتانے کی ریاستوں سے فوج جمع کر کے لے چلا اور اس میں بہت سے لودھی امیر بھی

اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔

راجپوتوں سے اوّل اوّل معمولی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی اور اس حال میں بھی فریقین پیام وسلام سے ایک دوسرے کو بہلا رہے تھے اور غالباً لڑائی کو ٹالتے تھے کہ اپنی اپنی تیاریاں مکمل کرنے کا وقت مل جائے۔ آخر ماہ جمادی الاوّل میں دونوں فوجوں نے بیانہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ مقام آگرے سے ۵۰ میل جنوب مغرب میں واقع ہے اور ان دنوں یہاں ایک مستحکم قلعہ تھا جس کے سردار نے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی اس قلعے کو راجپوتوں کے حملے سے بچانے کے لئے وہ اُدھر بڑھا اور ایک روز جبکہ صبح کو ہراول کی فوج کسی نوجوان مغل سردار کے تحت میں تھی اُس کی راجپوت پہرہ داروں سے تلوار چل گئی۔ ساتھ ہی اُنھوں نے ۱۵ ہزار سواروں سے مغلوں پر حملہ کر دیا اور اسی ہنگامے میں ایک جھنڈا (تمغ) اور چند سپاہیوں کو پکڑ کے لے گئے۔ بابر نے یہ خبر سن کر فوراً کمک بھیجی، خود چند توپیں لے کر آیا اور اپنے ہراول کو جسے اس موقع پر بہت خفت اٹھانی پڑی، میدان سے ہٹا لایا۔

اب صلح کے پیام سلام ختم ہو گئے بابر پانی پت کی طرح مورچہ بندی کرا رہا تھا اور اُس نے اپنی گاڑیوں کی باڑ سامنے لگائی تھی۔ مگر سپاہیوں میں شکستہ دلی کے آثار نمایاں تھے حتیٰ کہ بعض ساتھ چھوڑ کے نکل گئے۔ بادشاہ نے دل بڑھانے کے لئے سب کے سامنے شرابخواری سے توبہ کی اور سرداروں نے حلف اُٹھائے کہ ماریں گے یا مر جائیں گے؛ با ایں ہمہ فوجیں چار ہفتے تک فتحپور سیکری کے قریب موقع کی تاک میں آمنے سامنے بیکار پڑی رہیں۔ آخر ۹ جمادی الثانی، جمعرات کے دن بابر کو راجپوت سپاہی غالباً قلت رسد کی وجہ سے پیچھے ہٹتے نظر آئے اور اُس نے اپنی فوج کو مورچوں سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ گھمسان کا رن دو دن کے بعد کنواہہ کے مقام پر پڑا جو بیانہ سے ایک منزل دور ہے۔ جب غنیم کا لشکر چار میل پر رہ گیا تو سب سے اوّل بابر چیدہ سواروں کا رسالہ لے کر راجپوتوں پر جا گرا۔ پیچھے پیچھے اُس کی توپیں پہنچیں اور لڑائی کا جو خوف اتنے دن سے دل پر چھایا ہوا تھا، چند ہی ساعت میں زائل ہو گیا۔ ہندوؤں کے پاس ان خوفناک کلوں کی آتشباری کا کوئی جواب نہ تھا۔ دوسرے بابر نے سواروں کو اس خوبی سے لڑایا کہ دشمن ہر طرف سے اُن کے نرغے میں آگیا اور

شام ہوتے ہوتے راجپوت پریشان ہوکر بھاگنے لگے اور "اسّی[1] زخم کا سور ما رانا سانگا اگر آگے آگے نہ تھا تو بھاگنے والوں کے ساتھ ساتھ ضرور تھا" شاید رات کی تاریکی نے فتحمندوں کو تعاقب سے باز رکھا پھر بھی لڑائی میں اتنے آدمی مارے گئے تھے کہ اُن کی کھوپریوں کا ایک "کلہ منار" (یعنی حرم یا مخروطی منار) تیّار ہوگیا۔ یہ چنگیزی سنّت تھی جو کنواہہ کے میدان میں بابر کے رفیقوں نے ادا کی (۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء)۔

تسخیر چندیری
۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء

اس لڑائی سے وہ علاقہ جو الور کہلانے لگا ہے بابر کے قبضے میں آگیا اور اب اُس نے چندیری کے راستے راجپوتانے پر پیشقدمی کی۔ یہ گوالیار کے جنوب میں نہایت آباد مقام تھا اور اس کا قلعہ محل وقوع اور سنگینی کے اعتبار سے مشہور تھا سلطنت دہلی کے قبضے سے نکل کے یہ پہلے مالوے کے مسلمان بادشاہوں کے علاقے میں داخل ہوا اور پھر رانا سانگا کے ہاتھ پڑا جس نے میدنی رائے (مندنی رائے) نامی سردار کو چار ہزار فوج دے کر اُس کی حفاظت پر مامور کیا تھا بابر نہایت دشوار گزار اور جنگلی علاقے سے درخت گراتا اور توپوں اور گاڑیوں کے لئے سڑکیں بناتا ہوا کئی مہینے میں چندیری پہنچا اور ہفتے بھر میں حملہ کرکے شہر چھین لیا؛ مگر محصورین قلعے کے اندر مقابلے پر اڑے ہوئے تھے اور اس کا سر ہونا دشوار تھا آخر بابر کی فوج کے کسی بیگ (یعنی سپہ سالار) نے شہر کی فصیل سے ملے ہوئے ایک دمدمے کا سراغ نکالا اور یہیں سے کمند ڈال کے اندر گھس گیا۔ قلعے کے دروازے سے پہاڑی کے دامن تک چھت پاٹ کے ایک چور راستہ بنا ہوا تھا، ادھر سے مغلوں کی دوسری جمعیت پہنچ گئی محصورین نے یہ دیکھ کر پہلے تو اُس مکان کو آگ لگادی جس میں اُن کے بال بچّے جمع تھے اور اس کے بعد صرف تلواریں ہاتھ میں لے لے دیوانہ وار دوڑے اور سب کے سب لڑ کر مارے گئے؛

اس خوفناک خوں ریزی کے دن، صبح ہی شرقی صوبے سے یہ خبر آئی تھی کہ مغل فوج کو لکھنؤ سے پسپا ہوکر قنوج میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن بابر نے اس خبر کو اپنے ہی تک رہنے دیا اور جب چندیری کا قلعہ سر ہوگیا تو پھر بیگ[2] جمع ہوئے اور بادشاہ نے

---

[1] کین جلد اوّل، صفحہ ۹۷؛
[2] فوج کے بڑے سرداروں کا لقب "بیگ" ہوتا تھا اور چھوٹے عہدہ دار "سر" کہلاتے تھے خود بابر جب تک محض قسمت آزمائی میں مصروف رہا اس وقت تک قدیم ترکی لقب "خاقان" سے یاد کیا جاتا تھا؛

اس وقت یہ حال کہہ کے اُن سے مشورہ لیا۔ ابھی بحث وگفتگو ہو رہی تھی کہ ایک ہرکارے نے رانا سانگا کے مرنے کی اطلاع پہنچائی جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ چندیری سے بلا تاخیر جانب مشرق کوچ کر دیا جائے قلعے میں ایک معقول جمعیت متعین کر دی گئی اور وہی مالوے کا مسلمان عامل جس سے رانا سانگا نے یہ قلعہ چھین لیا تھا قلعہ دار بنا دیا گیا۔

مشرقی فتوحات اور وفات

چندیری کا قلعہ جمعرات کے دن سر ہوا۔ اسی اتوار کو فوج نے پھر کوچ کیا اور جمنا اُتر کے جس قدر جلد ممکن تھا قنوج کی طرف روانہ ہوئی قنوج گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہندوستانی فوجیں افغان سرداروں کے ماتحت آمادۂ جنگ ملیں۔ ان کی تعداد بہت تھی لیکن محض دلیری سے دشمن کی آنکھوں میں خاک ڈال کے مغلوں نے کشتیوں کا پل باندھ لیا اور بغیر لڑے بھڑے باہر کی فوج گنگا کو عبور کر آئی۔ اب ہمایوں کو بہار پر قبضہ کرنے میں کوئی خطرہ نہ تھا اور تھوڑے دن بعد خود بادشاہ نے آگرے اور گوالیار کو مراجعت کی جہاں پچھلی کدوکاوش کا ایک پھل یہ ملا کہ رانا سانگا کے وارث نے اطاعت قبول کی اور رنتھنبور کے مشہور قلعے کی کنجیاں لا کے حوالے کر دیں۔

اگلے سال پھر ولی عہد ہمایوں مرزا کے پاس سے تشویش انگیز خبریں آنے لگیں۔ اُسی لودھی سردار نے جو پہلے سانگا سے مل گیا تھا اُسے بہار سے خارج کیا اور اب چنار کے قلعے میں گھیر لیا تھا یہ سنتے ہی بابر جو تکان ومشقت کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا بیٹے کی مدد کے لیے بعجلت اُدھر چلا اور محض اُس کی آمد کی خبر نے وہ کھلبلی ڈالی کہ چنار کا محاصرہ اُٹھ گیا اور بادشاہ یلغار کرتا ہوا غازی پور تک آ پہنچا۔ بہار کے مسلمانوں سے دو مقابلے ہوئے دونوں میں انھیں ہزیمت ہوئی اور یہ صوبہ بابر کے ترک عزیز محمد زماں مرزا کو تفویض ہوا اسی کے ساتھ بنگالے کے سلطان نصرت شاہ سے صلح کے عہد وپیمان ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے اوّل اوّل لودھیوں کی شورش میں اُن کا ساتھ دیا تھا لیکن بعد میں بابر کی فوجی قوت کے سامنے اُسے دبنا پڑا۔

آخر اس جانباز جہاں گرد کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو گئی یعنی اب وہ محض قزاقوں کے جرگوں کا سردار نہیں تھا بلکہ کابل و دہلی آگرہ وجونپور میں جیحوں سے گنگا تک تمام ممالک وبلاد کا

مطلق العنان فرماں روا بن گیا تھا۔ مشرقی فتوحات کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آگرے آیا اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس فرصت کو اُس نے کس لطف سے گزارا ہوگا لیکن چودہ برس کی عمر سے اُس کی زندگی مصائب و خطرات میں بسر ہوئی تھی اور اس تشویش و مشقت کا صحت پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ جوانی سے اُسے شراب خواری کی مہلک عادت رہی، پھر ہندوستان کی گرمی سردی کا سخت تغیّر اُس کی تندرستی کے حق میں مُضر ثابت ہوا۔ وہ بہت شاکی ہے کہ "یہاں رہنے کے لئے اچھے مکان نہیں۔ نہ کھانے کے لئے اچھے میوے میسّر آتے ہیں اور برف ایک طرف ٹھنڈا پانی تک نہیں ملتا۔" غرض ۹۳۷ھ یا ۱۵۳۰ء کے آتے جاڑے عمر کے پچاسویں برس قوّت جسمانی نے جواب دے دیا۔ اُس نے بڑے بیٹے کو بلا بھیجا اور مرتے وقت وصیّت کی کہ "اپنے بھائیوں کو ہلاک نہ کرنا۔ اگران کی طرف سے غافل بھی نہ ہو جانا" بابر بادشاہ نے آگرے میں انتقال کیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد نعش کابل لے گئے اور وہیں اُس کا مقبرہ موجود ہے۔

پچھلے دور کے مشہور واقعات و سنین

- سنہ ۱۲۰۶ء قطب الدین ایبک کی خود مختاری اور سلطنت دہلی کا قیام۔
- سنہ ۱۲۱۰ء شمس الدین التمش کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۲۱۵ء تاج الدین یلدوز کا خاتمہ۔
- سنہ ۱۲۱۷ء ناصر الدین قباچہ کی شکست۔
- سنہ ۱۲۲۱ء منگولوں کی آمد ہندوستان میں۔
- سنہ ۱۲۳۱ء گوالیار کی فتح۔
- سنہ ۱۲۴۶ء غیاث الدین بلبن کی وزارت۔
- سنہ ۱۲۶۶ء غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۲۷۹ء طغرل بیگ صوبہ دار بنگالہ کی سرکوبی۔
- سنہ ۱۲۸۷ء غیاث الدین بلبن کا انتقال۔
- سنہ ۱۲۹۰ء جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۲۹۴ء علاء الدین خلجی کا پہلا حملہ دکن پر۔
- سنہ ۱۲۹۵ء علاء الدین کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۳۰۱ء قلعۂ رنتھنبور کی تسخیر۔
- سنہ ۱۳۰۳ء قلعۂ چتوڑ کی تسخیر۔
- سنہ ۱۳۰۶ء تا سنہ ۱۳۱۲ء ملک کافور کے حملے دکن پر۔
- سنہ ۱۳۲۱ء غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۳۲۵ء سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۳۲۷ء دولت آباد کو پائے تخت بنانے کی کوشش۔
- سنہ ۱۳۴۷ء سلطنت بہمنی کی بنیاد۔
- سنہ ۱۳۵۱ء فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی۔
- سنہ ۱۳۹۸ء امیر تیمور کا حملہ۔
- سنہ ۱۴۱۴ء سادات کا دہلی پر قبضہ۔
- سنہ ۱۴۵۱ء لودھیوں کا تخت دہلی پر قبضہ۔

باب پنجم

ہندوستان کی عام حالت اور خود مختار ریاستیں

بابر نے اپنی دلچسپ تزک یا خود نوشتہ سوانح عمری میں ہندوستان کی بُرائیاں کی ہیں لیکن یہ صرف پنجاب و دہلی پر کسی حد تک صادق آسکتی ہیں ورنہ ہند کے اکثر حصے ایسے تھے جن پر بابر کی ہجو صادق نہیں آتی۔ دکن میں اگرچہ بہمنی سلطنت کا چراغ گُل ہو چکا تھا لیکن اب جو اسلامی ریاستیں ان کی جانشین ہوئیں اُن میں عرصۂ دراز تک علم و فن اپنے مراتب کمال پر رہے، انتہائے جنوب میں وجیانگر کی ہندو ریاست نے اپنی کوئی ایسی تاریخ نہیں چھوڑی ہے تاہم اُس کی راج دھانی کے (جسے اب ہامپی کہنے لگے ہیں) کھنڈر اس بات کے گواہ ہیں کہ قرون وسطیٰ کے مغربی سیاح سیزر فریڈرک نے اس کا بیان کرنے میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کیا ہے اور اس کا قول یہ ہے کہ "میں نے بہت سے پادشاہوں کے دربار دیکھے مگر وجیانگر کی سی بات کہیں نہ پائی" ملبے کے ڈھیر میں اب تک وہاں حمام اور حوض و تالاب کے آثار ملتے ہیں اور بابر کی زبان سے ہند کی زبوں حالی سُن کر جو رنج ہوتا ہے اُس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح گجرات و مالوہ، جونپور و بنگالہ کے مسلمان بادشاہوں نے ان مُلکوں کو بڑی ترقّی دی اور یہاں کی لاجواب عمارتوں اور قدیم صنعت و حرفت کی بہت سی یادگاریں اب تک موجود ہیں اور وہاں کی مقامی تاریخوں میں جابجا بڑے بڑے مدارس اور بلند پایہ

علما اور مصنّفین و شعرا کے حالات ملتے ہیں۔

دکن کی اسلامی ریاستیں

جس وقت شمالی ہند میں مسلمان آئے دن کی لڑائیوں کا شکار تھے ان کے دکنی بھائیوں کی عام ظاہری اور دُنیاوی حالت ایسی بُری نہ تھی بانیٔ سلطنت حسن گنگو ہندوؤں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے گیارہ سال حکومت کر کے ۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) میں وفات پائی اور اس کا بیٹا محمد شاہ جانشین ہوا۔ اُس نے تخت پر قدم رکھتے ہی خاص مسلمان فاتحین کا طرز اختیار کیا اور تلنگانے میں گولکنڈہ اور ورنگل کے ہمسایوں سے جنگ چھیڑ دی۔ بلکہ وجیانگر کی طاقتور ریاست کو بھی اُس نے زیر کیا اور صلح کی جو شرطیں پیش کیں وہ وہ راجہ کو مجبوراً قبول کرنی پڑیں، محمد شاہ کی وفات کے بعد مجاہد شاہ وارث تاج و تخت ہوا۔ اس بادشاہ نے وجیانگر پر دوبارہ فوج کشی کی۔ لیکن مہم کو ناکام واپس آنا پڑا اور راستے میں بادشاہ کو اس کے چچا داؤد خاں نے قتل کر دیا۔ (۷۷۹ھ ۱۳۷۸ء) قاتل کو سزائے موت ملی اور مجاہد کا بھائی محمود شاہ تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کے بست سالہ عہد حکومت میں امن و فراغت کا دور دورہ رہا لیکن جب اُس نے ۷۹۹ھ (۱۳۹۷ء) میں وفات پائی تو وراثت کے متعلّق ہنگامہ بپا ہوا اور اسی ہلچل میں کچھ عرصے بعد داؤد خاں کا بیٹا فیروز شاہ تخت گلبرگہ کا مالک بن گیا اور پچیس سال تک حکومت کی تخت نشینی کے ایک ہی سال بعد اس پر وجیانگر کے حاکم دیو راجہ نے فوجکشی کی تھی لیکن داؤں پٹ پڑا۔ راجہ کو شکست دے کے شاہی فوجوں نے خود اُس کے مُلک پر حملہ کیا اور اُسے بیٹے کی جان گنوا کے اپنے پائے تخت میں پناہ لینی پڑی۔ پھر ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں فیروز شاہ نے خاص راجہ کے پائے تخت کے سامنے اُسے امان مانگنے پر مجبور کیا اور اُس نے اپنی بیٹی بھی سلطان کو بیاہ دی۔ اس پیوند کے باوجود لڑائی کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور بہت جلد اُس کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔ انھیں لڑائیوں کے دوران میں سلطان فیروز نے وفات پائی اور سالہا سال کی خونریزی کے باوجود وجیانگر سے کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ اس کے بھائی احمد شاہ نے خود بادشاہ ہوتے ہی پھر وجیانگر پر حملہ کیا اور تلنگانے کی ریاست کا بالکل قلع قمع کر ڈالا۔ اس بادشاہ نے شہر بیدر کو جہاں پہلے صرف چھوٹا سا قلعہ تھا،

آباد کیا۔ ۸۳۸ھ (۱۴۳۵ء) میں اسی جگہ وفات پائی اس کا بیٹا علاء الدین باپ کا جانشین ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ بیدر کو اپنا مستقل پائے تخت بنالیا۔ وجیانگر سے پیشتینی جنگ کا سلسلہ چند سال کے لئے رُک گیا تھا اور باہم صلح ہوگئی تھی۔ مگر جب علاء الدین کے بعد اُس کا بیٹا ہمایوں چار سال تک بری طرح حکومت کرکے قتل ہوا (۸۶۳ھ ۱۴۵۹ء) اور بڑا بیٹا بھی بحالت نابالغی یک بیک فوت ہوگیا تو ملکہ اور اس کے وزیر محمود گاواں نے ہمایوں کے دوسرے بیٹے محمد شاہ ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اس کی عمر ابھی گیارہ برس کی تھی اور سلطنت کا تمام انتظام اس کی ماں اور محمود گاواں کرتے تھے۔ اس کے بڑے بھائی کی نابالغی کے زمانے میں محمود گاواں بحیثیت اتالیق، سلطنت کو اغیار کے حملوں سے جس طرح ممکن ہوا بچاتا رہا لیکن اب اُس نے خود ملک ستانی پر کمر باندھی اور ۸۷۴ھ (۱۴۶۹ء) میں وجیانگر کے راجہ کو شمالی ساحل سے بے دخل کردیا۔ پھر دو سال بعد اڑیسہ کے راجہ کو اُس کی رعایا سے بچانے کے لئے فوجکشی کی اور مچھلی پٹم سے کانچی (کانچی ورم) تک تمام ملک کلنگ کو فتح کرلیا۔ یہ بہمنی سلطنت کی انتہائی ترقی کا زمانہ ہے کہ مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک تمام دکن میں محمد شاہ کا سکہ جاری تھا لیکن سلطنت کی بدنصیبی کہ سلطان کو ایسے نامور وزیر کی طرف سے لوگوں نے بدگمان کردیا اور خود اُس کے کارناموں نے اس کے حق میں دشمنی کی یعنی انھی کی بدولت اُس پر طرح طرح کے شبہے کئے جانے لگے اور ۸۸۶ھ (۱۴۸۱ء) میں اُسے بادشاہ نے مروا ڈالا مگر سلطنت کی تباہی کا زمانہ بھی سر پر آگیا تھا محمد شاہ نے ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا محمود شاہ ثانی بادشاہ ہوا جس کے عہد میں سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے گئے۔ واضح رہے کہ سہولت کے واسطے یہ سلطنت چار حصّوں میں منقسم تھی اور جب اس میں ضعف آیا تو اُس کے قدرتی طور پر اتنے ہی ٹکڑے ٹوٹ کر الگ ہوگئے اور وجیانگر کے علاوہ، تمام دکن انھی اسلامی ریاستوں کے حصّے میں آگیا؛

بہمنی دربار میں قاسم برید نامی ایک غلام کا اقتدار سوخ بڑھا کہ اس نے بیدر میں بریدشاہی حکومت علیحدہ قائم کرلی۔ اور محمود گاواں کے ایک ترک پسر خواندہ نے بیجاپور میں سلطان یوسف عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ایلچ پور میں ایک نومسلم ہندو نے احمد شاہ کے نام سے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور خود

سلطان محمود شاہ ثانی کے وزیر نظام الملک نے شمال میں بڑھ کر دولت آباد کی ولایت پر قبضہ کیا اور احمد نگر کی اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی (سنہ ۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء) سب سے آخر میں تلنگانے کے صوبہ دار نے علم بادشاہی بلند کیا اور گولکنڈے میں قطب شاہی سلطنت قائم کی (سنہ ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء) ورنگل کا علاقہ یعنی دریائے کرشنا سے گوداوری کے شمال تک ملک کلنگ اسی کے قبضے میں تھا اور کچھ حصے پر اڑیسہ کے راجپوت راجاؤں کی حکومت تھی جو خاتمہ ہونے تک پچاس ساٹھ برس بنگالے کے مسلمان سلاطین سے اُلجھتے رہے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں اقطاع دکن کے باشندوں کی اندرونی حالت اتنی بھی معلوم نہیں جتنی ہندوستان والوں کی معلوم ہے لیکن یہاں (یعنی دکن کے ہندوؤں میں) مہادیو کی پوجا یا شو بھگتیوں کا زور تھا۔ اور ان قدیم دیوانی قوانین پر عمل ہوتا تھا جو متاکشرا کے نام سے مشہور ہیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ دکن کے ہر حصے میں ہندوؤں کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی کیونکہ شمالی دکن میں تو قدیم مسلمان باشندے اُن کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیتے تھے اور نو وارد ترکوں کا مزاج لااُبالی تھا اور جنوب میں اوّل تو بعض طاقتور ہندو ریاستیں موجود رہیں دوسرے ہندو مسلمانوں میں برابر شادی بیاہ ہوتا اور تیسرے رفتہ رفتہ یہ رواج بھی قائم ہوتا گیا کہ قلمدان وزارت کسی ہندو کے سپرد کیا جائے۔ سرکاری مالگزاری میں یہاں بالعموم زرعی پیداوار کا دسواں حصہ مقرر تھا۔ اور محصول راہداری اور بعض مقامی رسوم کے علاوہ خاص ہندوؤں سے ایک علیحدہ محصول بھی وصول کیا جاتا تھا۔

سلطنت بنگالہ

اسلامی دور کے ابتدائی زمانے میں ملک بنگال تین حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصے کا علاقہ وہاں کے صدر مقام کے نام سے موسوم تھا۔ چنانچہ جس علاقے کا مستقر شہر لکھنوتی تھا اُسے "لکھنوتی" کہتے ہیں۔ اور اُسے خلجی سپہ سالار محمد بن بختیار نے فتح کیا؛ گنگا کے دہانے کے گرد و پیش کا علاقہ "سات گاؤں" کہلاتا تھا اور اس کا مستقر سات گاؤں موجودہ شہر ہگلی کے قریب واقع تھا۔ اسی طرح سنار گاؤں کے نام پر جو موجودہ ڈھاکہ کے قریب تھا،

تمام مشرقی بنگال کو "سنارگاؤں" کہتے تھے۔ اوّل اوّل ان تینوں حصّوں پر اور بہار پر خلجیوں کی حکومت رہی لیکن تھوڑے دن بعد یہ سلطنت دہلی کے صوبے بنائے گئے اور جب بلبن کے زمانے میں یہاں کے صوبہ دار طغرل نے بغاوت کی اور آخر کار بھاگتے میں ڈوب کر ہلاک ہوا (۶۶۸ھ ۱۲۷۰ء) تو بلبن کا منجھلا بیٹا یہاں کا نائب الممالک یا صوبہ دار بنا دیا گیا جو عام طور پر بغرا خاں کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے نالائق اور بدنصیب بیٹے کیقباد کے ہندوستان میں تخت نشین ہونے کے وقت بھی وہ انھی شرقی صوبوں کا حاکم تھا اُس کے دو بیٹے رکن الدین اور شمس الدین اور تھے جو یکے بعد دیگرے بنگال میں باپ کے جانشین بنے اور پھر اسی طرح شمس الدین کے دو بیٹے نوبت بہ نوبت مسند بنگال کے وارث ہوئے۔ سلطان محمد تغلق کے آخری زمانے میں یہاں کے حاکم سلطان سے باغی ہو گئے تھے لیکن بہت دن تک خود وہاں کے مقامی سرداروں میں جھگڑا ہوتا رہا اور آخر ۷۴۱ھ ۱۳۴۰ء میں حاجی الیاس نامی ایک امیر سب پر غالب آیا اور دوسرے سرداروں نے بھی اس کو اپنا بادشاہ مان لیا اور اُس زمانے سے بابر کے وقت تک بنگالے کی آزاد سلطنت تمام ہندوستان سے بالکل جدا رہی اور یہاں کے معاملات میں بنگالے کا کہیں نام نہیں آتا۔

جونپور و گجرات

دکن اور بنگالے کے بعد جونپور اور گجرات کی اسلامی ریاستیں قابل ذکر ہیں کہ یہ دونوں بھی خاندان تغلق میں ضعف آنے کی وجہ سے خود مختار ہوئیں۔

(۱) آٹھویں صدی ہجری کے اخیر تک جونپور کوئی مشہور مقام نہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شہرت اُس وقت سے ہوئی جب دلی کا ایک خواجہ سرا جو پہلے وہاں وزیر تھا جونپور کا صوبہ دار بنا کے بھیجا گیا۔ سنہ ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۸۹ء میں جب مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور ہر طرف فتنہ و فساد پیدا ہوئے تو اُس نے خواجۂ جہاں کے لقب سے "سلطنت شرقی" قائم کی اور پھر اُس کا لے پالک مبارک شاہ جانشین ہوا۔ اور اسی کی اولاد سلاطین شرقی کے نام سے کوئی ایک صدی تک سلطنت دہلی کی پریشاں حالی کے زمانے میں اُسے اور بھی پریشان کرتی رہی حتیٰ کہ اس خاندان کے آخری فرمانروا حسین شاہ کو سلطان بہلول لودھی نے مغلوب کیا۔

جونپور کی بڑی مسجد جو ابھی تک موجود ہے۔ اسی شرقی تاجدار نے تعمیر کرائی تھی۔

(۲) گجرات کا ملک چھوٹے چھوٹے اضلاع میں بٹا ہوا تھا۔ اور ۶۹۷ھ (۱۲۹۷ء) میں جب تک سلطان علاء الدین نے گجرات کو فتح کیا، اُس کے وسطی علاقے پر انہلواڑے کے راجہ حکومت کرتے تھے۔ سلاطین تغلق کے آخری زمانے میں اس ملک کا صوبہ دار ظفر خاں ہوا اور اُس نے امیر تیمور کی یورش کے وقت موقع پاکر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کا خطاب مظفر شاہ تھا۔ یہی اُس کے خاندان کے بادشاہوں کا موروثی لقب ہوگیا۔ یہاں تک کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں یہ ملک پھر سلطنت ہندوستان میں شامل ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ شہر سورت اور کاٹھیاواڑ کا جزیرہ نما اکثر انھی بادشاہوں کے قبضے میں رہتا تھا اور اسی کی بدولت وہ پرتگیزوں کے روشناس ہوئے۔

مالوہ معلوم ہوتا ہے کہ مالوے کے مسلمان رئیسوں نے امیر ہوشنگ سے پہلے اپنا سکّہ جاری نہیں کیا تھا جو مشرقی ممالک میں خودمختاری کی خاص علامت ہے۔ حسام الدین ہوشنگ یہاں کا پہلا بادشاہ ہے جس نے نربدا کے دائیں کنارے پر مانڈو آباد کیا۔ گرد فصیل اور دمدمے تیار کرائے اور ایک عالی شان مسجد سے اُس کی زینت بڑھائی۔ مانڈو کی قابل دید عمارات میں ہوشنگ کا مقبرہ بھی داخل ہے اور یہ تمام سنگ مرمر کی عمارت ہے۔ ہوشنگ کے بعد اُس کا بیٹا محمد شاہ وارث تخت و تاج ہوا اور اُس کے زمانے میں یہ سلطنت گجرات سے بندھیل کھنڈ تک اور کوہ ست پڑا سے لے کے شمال میں راجپوتانے تک پھیل گئی تھی۔

ہندو ریاستیں میواڑ یا چتوڑ کی ریاست پر جسے اب اودے پور کہتے ہیں۔ گہلوٹ راجپوتوں کی حکومت تھی۔ اور وہ کئی اعتبار سے اس بات کی مستحق ہے کہ اُسے شمالی ہندوؤں کی سب سے ممتاز ریاست مانا جائے، کچھ تو اس خاندان کے راجہ ہی خاص طور پر مغرور و جنگجو تھے اور کچھ ریاست کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہ گجرات، مالوہ اور دہلی کے بادشاہوں کے ساتھ برابر شمشیر آزمائی میں مصروف رہے۔ اس میں انھوں نے اکثر نام پایا اور کبھی کبھی کامیابی حاصل کی۔

سنہ ۷۰۳ھ (۱۳۰۳ء) میں سلطان علاء الدین خلجی نے چتوڑ کا قلعہ تسخیر کرلیا تھا مگر اگلی پشت میں پھر وہاں کے راجہ اس پر قابض ہو گئے۔ سنہ ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) میں جو رانا گدی پر بیٹھا سکوں پر اس کا نام کمبھ کا کندہ ہے اور اس نے اپنے عہد میں بہت کچھ کامیابی پائی۔ سنگ رام سنگھ جو تاریخ میں رانا سانگا کے نام سے مشہور ہے، اسی راجہ کی تیسری پشت میں تھا۔ وہ سنہ ۹۱۵ھ مطابق سنہ ۱۵۰۹ء میں گدی پر بیٹھا اور بابر کے زمانے تک گہلوٹ راجپوت اسی کے ماتحت تھے۔

وجیا نگر

وجیا نگر کی ہندو سلطنت کے متعلق یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ اپنے مسلمان ہمسایوں کی باہمی کشمکش کی بدولت وہ عرصے تک گمنامی کی حالت میں صحیح سلامت رہی بابر کے ہندوستان کے حملے کے وقت وہاں ایک طاقتور راجہ کرشنا دیو رائے نامی حکومت کرتا تھا۔ مگر اس کے بعد اُس کے دیوان اور داماد رام رائے نے خاندان نرسنگھ کے اصلی ورثا کو محروم کردیا اور لڑ جھگڑ کے خود راجہ بن گیا اور عرصے تک وجیا نگر میں اسی کی حکومت رہی۔

باب ششم

نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ
اور
خاندان سور

تخت نشینی اور پہلی لڑائیاں

بابر کے چار بیٹے تھے مگر بڑا بیٹا ہمایوں اسے سب سے زیادہ عزیز اور سلطنت کا ولی عہد تھا۔ منجھلے بیٹے کامران مرزا کو قندھار و کابل کی حکومت سپرد تھی اور جب باپ کے انتقال کے بعد شہزادہ ہمایوں نے ہندوستان کے تخت پر جلوس کیا (۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء) تو شمالی پنجاب کا حصہ بھی اپنے اسی بھائی کو دے دیا۔ کامران سے چھوٹے ہندال مرزا اور عسکری مرزا دو بھائی اور تھے جنھیں بادشاہ نے ہندوستان ہی میں دو ولایتوں پر مامور کر دیا لیکن ہمایوں نے بھائیوں کے ساتھ جس قدر شفقت اور فیاضی کا برتاؤ کیا اسی قدر یہ سنگدل بھائی اُس کی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہے۔

تخت نشینی کے وقت مغل بادشاہ کے علانیہ دشمن پٹھان سردار تھے جو دلی کی سلطنت جانے کے بعد مشرقی صوبوں میں جابجا اپنی حکومت جمانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بابر بادشاہ نے ان فتنہ انگیزوں کو کئی شکستیں دی تھیں

اور آپس کے نفاق نے انھیں اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ بایں ہمہ مُلک میں اُن کی کافی آبادی موجود تھی اور سالہا سال سے اُن کا اقتدار قائم تھا۔ پس جب کبھی کوئی افغان امیر یا سردار آمادۂ فساد ہوتا تو اُس کو بہ آسانی بہت سے رفیق مل جاتے تھے؛ ہمایوں بادشاہ کی تخت نشینی کو زیادہ مدت نہ ہوئی تھی اور وہ بندیل کھنڈ میں قلعۂ کالنجر کا محاصرہ کر رہا تھا کہ جونپور میں پٹھانوں کی بغاوت کی خبر ملی بادشاہ نے فوراً ادھر کا رخ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر چنار کا قلعہ گھیر لیا جہاں شیر خاں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ اور قلعہ اُسی کو دے کر بادشاہ نے آگرے کو مراجعت کی؛ یہی وہ پٹھان سردار ہے جس کی قسمت میں آئندہ ہمایوں پر غلبہ پانا اور ہندوستان کی بادشاہی کرنا لکھا تھا؛

بہادر شاہ لیکن شروع میں بادشاہ کو سب سے زیادہ جس نے تنگ کیا وہ گجرات کا بادشاہ بہادر شاہ تھا۔ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ جب شاہان دہلی کی قوت میں ضعف آیا تو سلطنت کے کئی صوبے خود مختار ہو گئے۔ انھی میں گجرات کا ملک تھا اور اُس کو بہادر شاہ کے زمانے میں بہت فروغ حاصل ہوا کیونکہ اس بادشاہ نے نہ صرف مالوہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا بلکہ خاندیس برار اور احمد نگر کے بادشاہوں تک سے خراج وصول کیا اور اب دہلی و آگرے کے تخت نشینوں سے برابری کا دعوی کرتا تھا؛ ہمایوں کے بعض مفرور درباریوں کو اُس نے اپنے ہاں پناہ دی تھی اور جب مغل بادشاہ نے انھیں طلب کیا تو بہادر شاہ نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے بعد انھی میں سے ایک مفرور سردار کو فوج دے کر خود پائے تخت آگرے پر چڑھائی کرائی مغل سرداروں نے اس فوج کو شکست دی (سنہ ۹۳۹ھ مطابق ۱۵۳۲ء) لیکن بہادر شاہ کو سزا دینی ضروری تھی پس بادشاہ نے آگرے سے کوچ کیا اور مندسور کے قریب فوجوں نے ایک دوسرے کے قریب خیمے ڈال دئے۔ بہادر شاہ کو اپنے توپ خانے پر بہت ناز تھا۔ اور وہ چاہتا یہ تھا کہ مغل اس پر حملہ کریں تا کہ اس کی بھاری توپیں ان کا قلع قمع کر دیں مگر ہمایوں نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی اور حملہ کرنے کی بجائے دو تین ہزار آدمی صرف اس کام پر مقرر کر دئے کہ وہ گجراتیوں تک رسد نہ پہنچنے دیں؛ یہ تدبیر

کارگر ہوئی۔ قلت رسد کی وجہ سے دو ہی مہینے میں گجراتی سپاہی چھپ چھپ کے بھاگنے لگے؛ حتیٰ کہ بہادر شاہ کی ہمت پست ہوگئی اور وہ اپنی توپیں بیکار کر کے صرف چار پانچ رفیقوں کے ساتھ رات کو لشکر سے نکل گیا۔ مغلوں کو بغیر لڑے بھڑے کامل فتح حاصل ہوئی۔ بہادر شاہ اپنی جان بچا کے شہر بہ شہر بھٹکتا پھرا اور چمپانیر (جانپانیرا) کی تسخیر کے ساتھ گجرات کا تمام علاقہ اور کثیر مال و زر بادشاہِ دہلی کے ہاتھ آیا؛ لیکن اس قدر آسانی سے جو ملک فتح ہوا تھا وہ اسی قدر جلد اور آسانی سے نکل بھی گیا۔ کیونکہ بادشاہ کو یہاں سے جا کر پھر گجرات کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی اور دو ہی سال بعد بہادر شاہ نے مغل صوبہ داروں کو گجرات سے نکال دیا (۹۴۲ھ مطابق ۱۵۳۵ء) پھر اکبر بادشاہ کے دور تک اس ملک میں پہلے کی طرح آزاد و خود مختار سلطنت رہی؛

شیر خاں اور بنگالے کی لڑائیاں

ہمایوں بادشاہ نے گجرات سے واپس آکر بعض درباری سازشیں رفع دفع کیں اور پھر مشرقی صوبوں کا رخ کیا جہاں افغان سرداروں میں خانہ جنگی بپا تھی۔ ان سرداروں میں شیر خاں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ایک عالی خاندان اور نووارد افغان رئیس کا بیٹا تھا اور باپ کی جاگیر واقع سہسرام میں پیدا ہوا اس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ اور وہ لڑکپن میں باپ سے ناراض ہو کے جونپور چلا آیا تھا۔ وہیں اس نے تاریخ اور فارسی علم ادب کی تعلیم پائی۔ اور پھر سلطان سکندر لودھی کی ملازمت اختیار کی۔ لیکن باپ کے مرنے پر وہ اپنی جاگیر کا انتظام کرنے سہسرام چلا آیا تھا اور جب ابراہیم لودھی جنگ پانی پت میں کام آیا تو اس نے پہلے پٹھانوں کی اور پھر مغلوں کی رفاقت اختیار کی اور خاص بابر بادشاہ سے اپنی جاگیر کی سند حاصل کی (۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء)؛

ہمایوں بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت بہار کی آزاد افغان حکومت کا جلال خاں وارث ہوا۔ وہ نابالغ تھا اور تمام انتظام اس کی ماں کے ہاتھ میں تھے شیر خاں اور فرید خاں نے اس پٹھان شہزادی کے مزاج میں اس قدر دخل پایا کہ جب وہ مری تو سب نظم و نسق پر حاوی ہو گیا۔ اسی بنا پر اس کی جلال خاں سے

ان بن ہوئی اور آخر میں جلال خاں نے بنگالے کے بادشاہ سے مدد کی درخواست کی۔
جلال خاں لوحانی اور شیر خاں اسی جنگ میں مصروف تھے کہ افواج شاہی نے
آگرے سے کوچ کیا اور چنار کے قلعے کو گھیر لیا (۹۴۶ھ مطابق ۱۵۳۹ء) یہ مستحکم قلعہ
بندھیاچل کی ایک شاخ پر مرزاپور کے قریب دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے
اور یہ اور قلعۂ رہتاس شیر خاں کے خاص مامن تھے۔ مگر اس موقع پر جب تک بادشاہ
چنار کو فتح کرے شیر خاں نے بنگالے کے دار الحکومت گور کو مسخر کیا اور بنگالے کے
بادشاہ محمود شاہ کو شکست دے کر ملک سے نکال دیا۔ پھر بادشاہی فوجوں کو
آتے دیکھ کر اس نے گور کے خزانے اور تمام زر و مال رہتاس کے قلعے میں پہنچا دئے
اور سامنا کرنے کی بجائے جنوب و مغربی پہاڑوں میں ہٹ گیا بادشاہی فوجوں نے
بلا دقت گور کو فتح کر لیا، لیکن بارش کا موسم آپہنچا تھا اور شیر خاں کے تعاقب میں
آگے بڑھنا ممکن نہ تھا غرض تین چار مہینے تک وہ اسی شہر میں بیکار پڑے رہے
بُری آب و ہوا اور بیکاری نے بہت لوگوں کو بیمار ڈال دیا اور بعض گھبرا گھبرا کر
فرار ہونے لگے۔ مرزا ہندال نے اپنی فوجی جمعیت لے کے آگرے کی راہ لی اور
برسات ختم ہوتے ہی بادشاہ کو بھی واپس ہونا پڑا۔ گور میں اُس نے تھوڑی سی
فوج متعین کر دی تھی اور ہر چند جانتا تھا کہ یہ کسی طرح شیر خاں کا مقابلہ نہ کر سکے گی
لیکن مجبوری یہ تھی کہ اب شیر خاں نے پھر پہاڑوں سے نکل کر بہار و بنارس پر
قبضہ کر لیا تھا اور جونپور کا محاصرہ کر رہا تھا، گویا آگرے سے بنگالے آنے کے
راستے پر اس کا عمل دخل ہوتا جاتا تھا۔ بادشاہ کو کمک آنے کی کوئی امید نہ رہی تھی اور
ایسی حالت میں جب کہ سپاہی پہلے ہی بد دل ہو رہے تھے گور میں رہنا مخدوش تھا
مصلحت اسی میں نظر آئی کہ واپس آگرے کی جانب کوچ کیا جائے اور ممکن ہو تو راستے
میں شیر خاں سے لڑ کر اُس کی قوت توڑ دی جائے۔ جس وقت بادشاہ پٹنہ اور بنارس
کے درمیان قصبہ بکسر سے گزر کے چونسہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیر خاں جونپور کا محاصرہ
چھوڑ کر راستہ روکنے آگیا ہے اور ایسے با موقع مقام پر خیمہ زن ہے کہ اُس پر حملہ کرنا
خطرے سے خالی نہ تھا اور اس کے سامنے سے گزرنا اور بھی مخدوش تھا۔ اسی تردد
میں بادشاہ نے حکم دیا کہ کشتیوں کا پُل تیار کیا جائے تاکہ گنگا اُتر کے دوسرے کنارے

کوچ جاری رہ سکے۔ لیکن پُل تیار ہونے نہ پایا تھا کہ شیر خاں نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور اسی دھوکے میں رکھ کے ایک رات فوج شاہی پر شبخون مارا۔ مغل سپاہی پہلے سے دل برداشتہ تھے اس حملے سے پریشان ہو گئے اور ہزاروں گنگا میں ڈوب ڈوب کر مرے۔ خود بادشاہ نے جرأت دکھانے میں کمی نہ کی اور جب تک رفیقوں نے زبردستی گھوڑا نہ پھیرا وہ میدان سے نہ ہٹا۔ لیکن جس وقت گنگا میں ڈالا تو گھوڑے کا دم ٹوٹ گیا اور بادشاہ ڈوبنے کو تھا کہ ایک سقے نے مشک کی مدد سے اُسے دوسرے کنارے پر پہنچایا اور اس کارنمایاں کے صلے میں ڈھائی گھڑی کی بادشاہی پائی (۹۴۶ھ ۱۵۳۹ء)۔

ہمایوں کی مصیبتیں

لیکن یہ ان مصائب کی ابتدا تھی جن میں اس نیک دل اور شریف بادشاہ کے کئی سال گزرنے والے تھے۔ بنگالے ہی میں اُس کی پریشانیوں کو بھائیوں کی بیوفائی نے بڑھا دیا تھا کیونکہ ہندال دہلی پہنچ کر اپنی بادشاہی کی کوشش کر رہا تھا اور کامراں نے لاہور سے آگرے آکر مدد بھیجنے کی بجائے علانیہ مخالفت پر کمر باندھی تھی بادشاہ کے آگرے پہنچتے ہی یہ فتنے فرو ہو گئے۔ بھائیوں نے معافی مانگی اور بادشاہ نے عادت کے مطابق ان کا قصور معاف کر دیا۔ لیکن کامراں نے اب بھی فوجی مدد دینے میں لیت ولعل کی اور ٹل کر لاہور چلا گیا۔ اس کے صرف تین ہزار سپاہی رہ گئے تھے۔ انھیں اور دیگر افواج کو بلند ہمت بادشاہ نے پھر سمیٹا اور سال ختم ہونے سے پہلے دوبارہ شیر خاں کی سرکوبی کو چلا جس نے اب شیر شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

یہ دوسری لڑائی بھی دریائے گنگا کے کنارے قنوج کے قریب واقع ہوئی (۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء)۔ بارش نے بادشاہی لشکر گاہ میں رہنا دشوار کر دیا تھا ایک سردار نے وقت کے وقت دغا دی۔ انھی نامساعد حالات میں شیر شاہ نے حملہ کیا اور پھر اسی آسانی سے لشکر شاہی کو شکست فاش دی۔ اس مرتبہ بھی بادشاہ بمشکل دریا سے پار اترا اور افتاں و خیزاں آگرے پہنچا۔ لیکن اب افغان سپاہ تعاقب میں چلی آتی تھی۔ اور انھیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ناچار ہمایوں نے پائے تخت کو الوداع کہی۔ تھوڑے سے جاں نثار ساتھ لے کر وہ پہلے لاہور آیا مگر بھائی نے مدد دینے سے

پہلوتہی کی اور اپنی فوجیں لے کر کابل چل دیا۔ ہمایوں کو لاہور میں اس طرح بے سروسامان رہنا مصلحت کے خلاف نظر آیا۔ اور اس نے پہلے سندھ کا رخ کیا جہاں ارغون خاندان کے امیر مرزا حسین کی حکومت تھی۔ اس بیمروت نے مدد دینے سے انکار کیا اور آخر میں عداوت پر کمر باندھی ایک سال سے زیادہ عرصے تک بادشاہ ان علاقوں میں وقت گزارتا رہا اور جب کوئی شکل بہتری کی نظر نہ آئی بلکہ روپیہ بھی ختم ہونے لگا اور ساتھی کنارا کرنے لگے تو ناچار اس نے مارواڑ کے راجہ مالدیو کے ہاں جانے کا ارادہ کیا جس نے اوّل اوّل خود خط لکھ کر منت سے اُسے بلایا تھا مگر جس وقت بادشاہ ایسی حالت زار میں اُس کے علاقے تک پہنچا تو اُس نے کمال سنگدلی سے بادشاہ کو گرفتار کرنے کا قصد کیا۔ یہ خبر سن کر ان تھکے ہارے غریب الوطنوں کے دل ٹوٹ گئے اور وہ ناچار واپس سندھ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں جو کچھ تکلیفیں ہوئیں ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ جمادی الثّانی سنہ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء کے مہینے میں جب شکستہ حال قافلہ امرکوٹ پہنچا تو بادشاہ کے پاس سواری کو گھوڑا تک نہ تھا اور حاملہ بیوی اونٹ پر اُس کے ہمراہ تھی۔ چنانچہ امرکوٹ ہی میں اُس بیوی کے بطن سے محمد جلال الدین اکبر پیدا ہوا جس کے نصیب میں ہندوستان کا نہایت نامی گرامی بادشاہ ہونا لکھا تھا لیکن اس وقت تو مصیبت زدہ باپ کو اُس کا ساتھ رکھنا بھی مصیبت معلوم ہوا چنانچہ جب مرزا حسین سے عہد و پیمان کر کے وہ قندھار کے علاقے میں پہنچا اور یک بیک اپنے تعاقب میں مرزا عسکری کے آنے کی خبر ملی تو اُس نے شیر خوار بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور چند رفیقوں کو لے کر سیستان کی راہ لی جو اُن دنوں شاہ ایران کا صوبہ تھا؛ واضح ہو کہ مرزا عسکری ہمایوں کا سب سے چھوٹا بھائی اور ان دنوں کامراں کی جانب سے قندھار کا والی تھا جب بھائی ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اکبر اور اُس کی انّا کو اپنے ہمراہ لے آیا اور اس شہزادے نے کئی سال تک کابل میں پرورش پائی؛

خاندان سور

ہمایوں بادشاہ کے جاتے ہی شیر شاہ آگرے، دہلی اور پنجاب پر قابض ہو گیا تھا اور یہاں اُس نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جس کا نام بہار کے قلعے کے نام پر رہتاس رکھا۔ کیونکہ وہ قلعہ اُسے بہت عزیز تھا۔ اس کے بعد وہ آگرے آیا ہی تھا کہ بنگالے میں شورش برپا ہوئی۔ یہ مشرقی علاقے

شاہانِ دہلی سے ہمیشہ انحراف کرتے رہتے تھے اور اس زمانے میں فاصلے کی درازی اور سفر کی دقتیں وہاں کے سرکشوں کو گویا بغاوت پر آمادہ کرتی تھیں۔ شیر شاہ نے بغاوت کو خود جاکر فرو کیا اور مُلک کو کئی ضلعوں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ پھر کسی ایک ضلع کے حاکم کو سرکشی کی جرأت نہ ہو۔

آیندہ تین سال میں شیر شاہ نے مالوے کا زرخیز علاقہ اور مارواڑ کا دشوار گزار مُلک فتح کیا اور آخر میں کالنجر کے محاصرے میں مصروف تھا کہ آتشبازی کے ایک لٹو میں آگ لگی اور اسی آگ میں شیر شاہ نے جل کر وفات پائی (ربیع الاول ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۵ء) مرتے دم تک اُسے محاصرے کا خیال تھا اور برابر اپنے سرداروں کو احکام بھیج رہا تھا۔ حتیٰ کہ قلعہ سر ہونے کی خبر ملی اور الحمدُ للہ کے ساتھ اس اقبالمند بادشاہ کی زبان بند ہوگئی۔

شیر شاہ سوری نے پانچ سال کے قریب بادشاہی کی اور اس عرصے میں بھی برابر لڑائیوں میں مصروف رہا لیکن فتوحات اور جنگی قابلیت سے کہیں زیادہ قابلِ تعریف اُس کے مُلکی انتظامات ہیں کہ اس قلیل مدت میں سررشتۂ مالگزاری کی اصلاح کی اور مُلک میں ہر طرف امن و خوشحالی کا دور دورہ نظر آنے لگا۔ بنگالے سے پنجاب تک اُس نے ایک بڑی سڑک تیار کرائی اور اُس پر دو رویہ درخت نصب کرادئے۔ ہر کوس پر پختہ سرائے مسجد اور کنواں بنوایا اور سرائے میں ہر قوم و مذہب کے مسافروں کی مہمانی کا انتظام کیا کہ جو محتاج وہاں آتے انھیں بادشاہ کی طرف سے کھانا دیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کے بعد اُس کا چھوٹا بیٹا سلیم شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور نو سال تک مستعدی اور قابلیت کے ساتھ حکومت کی۔ اُس کے عہد میں رعایا خوشحال مُلک آباد و سرسبز اور خزانہ معمور تھا۔ اور بادشاہ کو رفاہِ عام کے کام کرنے کا موقع ملتا رہتا تھا چنانچہ بہت سی عمارتیں بنوائیں اور باپ کے زمانے کی سراؤں کی تکمیل و ترمیم کی۔ دلّی میں سلیم گڑھ نامی قلعہ اب تک اُس کے نام کی یادگار باقی ہے۔

سلیم شاہ کے انتقال پر سلطنت کا وارث اُس کا بیٹا فیروز ہوا لیکن وہ کم سن لڑکا تھا اور اُس کے ماموں نے بادشاہی کی خاطر اُسے بیگناہ مار ڈالا اور خود محمد شاہ عادل کے نام سے تخت پر جلوس کیا (سنہ ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء) یہ شخص بہت نادان اور جاہل تھا عوام اسے عادل کی بجائے عَدلی کہتے تھے اور ظریفوں نے اسے بگاڑ کر

"اندھلی" (یعنی اندھا اور بے شعور) کر دیا تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی وہ عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا پھر قدیم بادشاہوں کی داد و دہش کے افسانے سُن کر اُسے خود بھی ویسا بننے کا شوق چرّایا تو بے غل و غش خزانہ لٹانا شروع کیا اور چند ہی روز میں یہ نوبت پہنچی کہ دوسرے امرا کی جاگیریں نئے مصاحبوں کو ملنے لگیں ایک اور حرکت جس نے افغان امیروں کو اُس سے برگشتہ کیا' یہ کی کہ اپنا وزیر الممالک ہیمو کو بنایا اور تمام اختیارات اُس کو سونپ دئے۔ ہیمو ادنیٰ درجے کا آدمی تھا مگر اُس کی ہوشیاری اور قابلیت میں کچھ کلام نہیں کہ اوّل سرکش افغان امیروں کے ساتھ اُس نے نباہی اور اس کے بعد کئی کئی دشمنوں سے کلّہ بہ کلّہ جنگ کی؛ کیونکہ اُس کے آقا کی نادانی نے بہت جلد ہر طرف دشمن پیدا کر لئے تھے اور اس خانہ جنگی کی ابتدا بنگالے سے ہوئی تھی۔ پھر جب بادشاہ باغیوں کی سرکوبی کرنے ادھر گیا تو اُس کے ایک رشتہ دار ابراہیم سور نے دہلی اور آگرے پر قبضہ کر لیا اور عادل کو شکست کھا کے مشرقی صوبوں میں واپس ہٹنا پڑا مگر ابراہیم سور کو بہت جلد ایک تیسرے حریف نے شکست دے دی اور خود دہلی کا بادشاہ بن بیٹھا۔ یہ سکندر شاہ سوری پنجاب کا حاکم اور شیر شاہ سوری کا عمزاد بھائی تھا۔ اور اسی کی عارضی حکومت کے زمانے میں ہمایوں بادشاہ نے دوبارہ ہندوستان کا رخ کیا (سنہ ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۵ء) اور سکندر کو نکال کر خود دہلی اور آگرے پر قبضہ کر لیا جس کی تفصیل آگے آئے گی؛

اس اثنا میں محمد شاہ عادل اور اُس کا وزیر ہیمو چنار کے قلعے میں ایک بڑی فوج تیار کر رہے تھے کہ ایک مرتبہ پھر تخت دہلی کے لئے قسمت آزمائی کی جائے۔ مگر پہلے ابراہیم شاہ سے مقابلہ پیش آیا جو سکندر سور کے سامنے سے بھاگ کر ادھر آیا تھا۔ اسے شکست ہو گئی تو بنگالے کے باغیوں نے پیش قدمی کی اور ہیمو کو واپس جا کر اُن سے لڑنا پڑا۔ اس جنگ میں بھی وہ کامیاب ہوا اور اب مالوے کا خیال چھوڑ کر اُس نے دہلی کا رخ کیا جہاں ابھی دنوں ہمایوں بادشاہ نے دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد وفات پائی تھی اور اس کا نوجوان بیٹا ابھی تک پنجاب میں تھا؛ (ربیع الاوّل سنہ ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء)؛

بابِ ہفتم

ہمایوں بادشاہ کی مراجعت

اور

اکبر بادشاہ کا ابتدائی زمانہ

پچھلے باب میں ہمایوں بادشاہ کی خانماں بربادی اور سیستان پہنچنے کا حال ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ وہاں کے ایرانی صوبہ دار نے عزت کے ساتھ اس غریب الوطن بادشاہ کو مہمان رکھا اور وہاں سے ہرات و مشہد ہوتا ہوا وہ قزوین پہنچا اور اپنے وفادار سردار بیرم خاں کو شاہ ایران کی خدمت میں اُس نے بطریق سفارت روانہ کیا۔ ایران میں اُس وقت شاہ طہماسپ صفوی کی حکومت تھی اور یہ سلطنت ایشیا کی نہایت قوی اور مقتدر سلطنت مانی جاتی تھی۔ شاہ طہماسپ نے کچھ دن بعد ہمایوں سے ملاقات کی اور بہت عزت و تکریم سے پیش آیا لیکن بعض موقعوں پر اُس نے مذہبی تعصب کے جوش میں بے اعتنائی بھی کی۔

العزض کئی ماہ شاہ ایران کا مہمان رہنے کے بعد ۱۵۴۵ء کے آخیر میں ہمایوں بادشاہ نے مراجعت کی اور سیستان میں چودہ ہزار ایرانی سپاہی مدد کے لئے اُس سے آملے۔ پھر قندھار کا محاصرہ کیا تو بہت سے قدیم رفیق مرزا کامراں کا ساتھ

چھوڑ چھوڑ کر اُس کی طرف آ گئے۔

پھر ۶ ، ۷ برس تک ہمایوں کو کابل و بدخشاں کے واسطے جنگ کرنی پڑی اور اور یہ بھائی جب مغلوب ہو کر معافی مانگتے تو عالی ظرف بادشاہ انھیں معاف کر دیتا تھا حتیٰ کہ ۱۵۵۱ء میں کامران آخری مرتبہ گرفتار ہوا اور پھر بادشاہ نے اُس کا قصور معاف کر دیا۔ مغل امرا اس بات کو کسی طرح پسند نہ کرتے تھے اور انھی کی عرض معروض اور خود کامران کی درخواست پر اُسے مکۂ معظمہ جانے کی اجازت دے دی گئی اور وہیں اُس نے وفات پائی۔

ہمایوں کو شیر شاہ اور سلیم شاہ سوری کے جیتے جی ہندوستان پر حملہ کرنے کی نہ ہمت ہوئی نہ فرصت ملی۔ لیکن جب کابل پر پورا تسلط ہو گیا اور ادھر سلیم شاہ کے بعد ہندوستان میں خانہ جنگی برپا ہوئی تو حملے کا خدا داد موقع ملا اور ۱۵۵۴ء میں بادشاہ نے پندرہ ہزار چیدہ سوار لے کر پنجاب پر یلغار کی۔ لاہور کا حاکم شکست کھا کے بھاگا اور سرہند پر خود سکندر سور کو سخت شکست ہوئی۔ دہلی اور آگرے پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور سکندر کی سرکوبی کے واسطے جو دوبارہ مقابلے کا سامان کر رہا تھا، بیرم خاں اور شہزادۂ اکبر پنجاب کی طرف بھیجے گئے۔ خود بادشاہ دہلی میں مصروف انتظام تھا کہ ایک روز بالاخانے سے اُترتے میں اس کا عصا پھسل گیا، وہ نیچے گر پڑا اور چند روز بیہوش رہ کر اسی صدمے سے وفات پائی۔ (۱۲ ربیع الاوّل ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۶ء)۔ اسی مقام پر چند سال کے بعد اُس کا وہ عالی شان مقبرہ تعمیر ہوا جو خوبصورتی اور سنگینی کے لحاظ سے قدیم ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

ہمایوں بادشاہ چھبیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور چھبیس سال بعد وفات پائی۔ مگر گردش روزگار نے اُسے طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا رکھا اور وہ چند سال بھی اطمینان سے بیٹھ کر حکومت کرنے نہ پایا ورنہ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے وہ نہایت بہادر، فیاض اور شائستہ فرماں روا تھا۔ ریاضی میں اسے مہارت حاصل تھی اور ہمیشہ صاحبان علم و فضل کی صحبت کا جویا رہتا تھا اور پاکیزہ ذوق کی شہادت میں اُس کی بہت سی غزلیں اب تک موجود ہیں۔

اکبر کی تخت نشینی اور ہند کی حالت

باپ کے انتقال کے وقت شہزادہ جلال الدین محمد اکبر کی عمر تیرہ سال نو مہینے کی تھی اور وہ بیرم خاں کے ہمراہ کلانور (پنجاب) میں مقیم تھا۔ وہیں مغل امرا نے تاج سر پر رکھا اور بیرم خاں نے اتالیق و سپہ سالار کی حیثیت سے عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لیکن وہ ملک جس کی فرماں روائی کے لئے تقدیر نے اس اقبالمند شہزادے کو منتخب کیا، مدت سے کمال انتشار کی حالت میں تھا۔ دریائے نربدا سے نیچے دکن کا وسیع علاقہ صدیوں سے آزاد ہو چکا تھا اور وہاں پانچ اسلامی اور ایک ہندو سلطنت قائم تھی لیکن دسویں صدی ہجری میں بریدشاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اکبر کی تخت نشینی کے چند سال بعد مسلمان بادشاہوں نے مل کر وجیانگر کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی (جنگ تالی کوٹ ۹۷۲ھ مطابق ۱۵۶۵ء) مگر ان مسلمان بادشاہوں کا یہ اتحاد بالکل عارضی تھا اور باہمی حسد کی وجہ سے وہ اکثر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی رقابت کی بدولت وجیانگر کا مفتوحہ علاقہ بھی اُن میں بخوبی تقسیم نہ ہو سکا اور وہاں بہت سے زمیندار اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار ہو گئے۔

دکن کے شمال میں خاندیس، مالوہ اور گجرات کے ملک آزاد ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے قوی سلطنت گجرات کی تھی جس کے بادشاہ کی ہمایوں سے لڑائیوں کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ راجپوتانے میں بہت سی راجپوت ریاستیں موجود تھیں جنھیں موقع ملتا تو آزاد ہو جاتیں ان میں سب سے بڑی اور مشہور اودے پور میواڑ، بوندی، جیسلمیر (جودھپور) ماڑواڑ اور (جے پور) امیر کی ریاستیں تھیں شمالی مالوے اور بندھیل کھنڈ کی ریاستیں بالعموم مسلمان بادشاہوں کی باجگزار تھیں مگر اڑیسہ کے غیر آباد ملک پر مسلمانوں کا پورا تسلط نہ ہوا تھا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

لیکن اکبر کا سب سے قریبی اور قوی دشمن وہ تھا جو چنار کے قلعے سے فوج لے کے پائے تخت دہلی کی جانب بڑھا اور اس سے قبل کہ دہلی کے مغل سردار کو کمک پہنچے اُس نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ مغل سردار تردی بیگ نے بھاگ کر تو شہرے میں پناہ لی اور ہمایوں بادشاہ کے مامور کردہ عہدہ داروں کو بھی میرٹھ آگرہ و دہلی کے علاقوں سے ہٹنا پڑا۔

ہندوستان خاص کا صرف یہی ٹکڑا دوبارہ مغلوں کے قبضے میں آیا تھا اور اس کے پھر نکل جانے سے اکبر کے رفیق نہایت ہراساں ہوئے۔ لیکن بیرم خاں نے پہلے تو تردی بیگ کو شکست کھانے کی خطا پر قتل کروایا اور اس کے بعد ہیمو کے مقابلے کے لئے پنجاب سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ ہیمو دہلی کی فتح پر پھولا نہ سماتا تھا اور اب پنجاب کو دشمنوں سے صاف کرنے کے لئے پیش قدمی کر رہا تھا۔ چنانچہ یہی پانی پت کے تاریخی میدان میں فریقین کا مقابلہ ہوا اور ۲ محرم ۹۶۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء کے دن وہ خوں ریز جنگ واقع ہوئی جس نے دوبارہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ہیمو نے بہادری دکھانے میں کمی نہ کی تھی لیکن وہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا اور افغان سپاہی پریشان ہو کے بھاگے۔ مغل فوجیں بڑھ کر دہلی میں داخل ہو گئیں۔

بیرم خاں کا عروج و زوال

ہیمو کے مارے جانے کے بعد سکندر شاہ سور نے پھر پنجاب میں شورش بپا کی اور کئی مہینے محصور رہ کے اس شرط پر ہتھیار رکھے کہ اُسے بلا گزند بنگالے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اور سچ پوچھئے تو اس فتنے کے رفع ہونے کے بعد ہی اکبر کی بادشاہی شروع ہوتی ہے۔ لیکن ابھی تک حکومت کی اصلی باگ اُس کے نامور اتالیق محمد بیرم خاں ترکمان کے ہاتھوں میں تھی جس کی ہمایوں بادشاہ کے ساتھ رفاقت کا حال ہم اوپر پڑھ چکے ہیں۔ اکبر کی تخت نشینی سے تین چار سال تک وہ سلطنت کے جزو و کُل پر حاوی رہا اور اس میں شک نہیں کہ جب تک بیرونی دشمنوں سے مُلک صاف نہ ہوا تھا اُس وقت تک اس کی رہنمائی اور سپہ سالاری کے بغیر نوجوان اکبر کی کامیابی دشوار تھی۔ ایسے نازک وقت میں معاملات کا انصرام کرنے کے لئے بیرم خاں سے زیادہ موزوں کوئی سردار نہ تھا کیونکہ جنگی قابلیت اور موقع شناسی کے علاوہ وہ نہایت مستقل مزاج تجربہ کار اور سخت گیر شخص تھا۔ اور ابتدا میں یہ سخت گیری عین مفید مطلب ثابت ہوئی، مگر جب اغیار سے یہ حصۂ مُلک پاک ہو گیا اور خطرات سے یک گونہ نجات ملی تو پھر اہل دربار کو بیرم خاں کی سخت گیری ناگوار گزرنے لگی۔ دو تین سرداروں کو اُس نے اپنے حکم سے قتل کرا دیا اور بادشاہ کے اُستاد ملا پیر محمد کو حج کے بہانے جبراً مُلک سے نکلوا دیا۔ ان باتوں سے بادشاہ ناراض ہو کر آگرے سے دہلی چلا آیا اور اتالیق کے معتوب ہونے کی خبر

سنتے ہی بہت سے درباریوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کے دہلی کا راستہ لیا بیرم خاں ایک عرصے تک تذبذب میں رہا اور جب بادشاہ سے مصالحت کی امید نہ رہی تو پہلے اُس نے حج کا ارادہ کیا اور پھر اُس کے دل میں بغاوت کا وسوسہ پیدا ہوا پنجاب میں اُس نے علانیہ سرکشی کی لیکن خاطر خواہ مدد نہ مل سکی اور وہ بہت جلد ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس حالت میں جب اُسے بادشاہ کے حضور میں لائے تو وہ قدموں پر گر کے بے اختیار رونے لگا۔ اکبر نے متاثر ہو کے گلے سے لگا لیا اور اُسے بحال کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن بیرم خاں نے اب ہندوستان میں رہنا پسند نہ کیا اور حج کی اجازت لے کر گجرات گیا کہ وہاں کسی بندرگاہ سے جہاز میں روانہ ہو جائے وہ ابھی ساحل تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک شخص نے جس کا باپ لڑائی میں بیرم خاں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا ملاقات کے بہانے آکر اس کو قتل کر ڈالا۔

"شہید شد محمد بیرام" سے اس واقعے کی تاریخ نکلتی ہے۔

بادشاہ کی مشکلات بیرم خاں کے جانے کے بعد نوجوان بادشاہ کو سلطنت کا تمام انتظام خود کرنا پڑا اور اسے بہت جلد اپنی دشواریوں کا احساس ہونے لگا۔ کیونکہ اوّل تو مغل امرا کو ہمایوں بادشاہ کی نرمی اور اکبر کی کم عمری نے فرماں برداری سے بے پروا کر دیا تھا۔ دوسرے شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقے ابھی تک بادشاہ کے قبضے سے باہر تھے اور جو ٹکڑا فتح ہو گیا تھا وہاں بھی مدت سے اندرونی امن و انتظام مفقود تھا۔ ان خرابیوں کو دور کرنا اور تخت گاہ دہلی کی پوری میراث کو حریفوں سے واپس لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بیرم خاں کی اتالیقی کے زمانے میں صرف پنجاب اور جنوب میں اجمیر و گوالیار تک مغلوں کا قبضہ ہوا تھا اس کی معزولی کے بعد ہی جونپور تک مشرقی علاقہ بھی پٹھانوں سے صاف کر لیا گیا۔ لیکن مالوے میں پٹھان حاکم باز بہادر نے ابھی اطاعت قبول نہ کی تھی اور گجرات و بہار کے صوبے بالکل آزاد تھے مشکل یہ تھی کہ جو مغل سردار فوج لے کر باہر جاتا وہی کامیابی پا کر نوجوان بادشاہ کے احکام ماننے سے بے پروائی کرنے لگتا تھا۔ اور خود اکبر کو اس علاقے میں پہنچنا پڑتا۔ اس کی اسی مستعدی نے

کئی مرتبہ مغل امیروں کی سرکشی کا انسداد کیا۔ چنانچہ مالوے ہی میں اوّل ادھم خاں نے فتح پاکر مال غنیمت بادشاہ کے پاس بھیجنے میں سستی کی اور جب اکبر یکایک خود وہاں جا پہنچا تو پشیمان ہوکر قصور کی معافی مانگی پھر باز بہادر نے دوبارہ سر اٹھایا اور مالوے پر قابض ہوگیا تو اس کی سرکوبی پر عبداللہ خاں ازبک مامور ہوا۔ اس نے بھی یہ صوبہ فتح کرنے کے بعد سرکشی کی اور بادشاہ کو دوبارہ فوج لے کر ادھر جانا پڑا اور عبداللہ خاں نے بھاگ کر گجرات میں پناہ لی۔ اس واقعے نے دوسرے ازبکوں میں ناراضی پیدا کردی اور خان زماں اور آصف خاں جیسے نامی امیران کے حامی و مددگار بن گئے۔ ان امیروں کی بغاوت رفع کرنے میں بادشاہ کے دو سال صرف ہوئے اور ابھی اس کا پوری طرح تدارک نہ ہوا تھا کہ اس کے بھائی محمد حکیم مرزا نے کابل سے بڑھ کر پنجاب پر حملہ کردیا۔ یہ شہزادہ اکبر کا سوتیلا بھائی اور ہمایوں کے زمانے سے کابل کی حکومت پر مامور تھا۔ کم عمری کی وجہ سے حکومت کی اصلی باگ اس کی ماں کے ہاتھ میں تھی اور وہ انھی دنوں بعض امیروں کی سازش سے قتل کردی گئی اس وقت مرزا سلیمان والی بدخشاں نے مدد کے بہانے کابل پر قبضہ کرلیا اور حکیم مرزا کو وہاں سے نکلنا پڑا اُسے اپنی پریشانی میں اکبر بادشاہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ امداد ملتی رہی تھی لیکن اب بھائی کو اپنے امیروں کی بغاوت میں مصروف دیکھ کر اُس نے دشمنی کا موقع پایا اور لاہور کا محاصرہ کرلیا۔ ناچار بادشاہ کو اس تازہ فتنے کو فرو کرنا پڑا اور باغی امیروں کو چھوڑ کر اُس نے پہلے بھائی کو بزورِ ملک سے نکالا (سنہ ۱۵۶۶ء) کابل میں اتّفاق سے پھر میدان خالی تھا حکیم مرزا کو دوبارہ اپنی ولایت پر قابض ہونے میں دشواری پیش نہ آئی اور آیندہ ایک عرصے تک وہ اطمینان سے وہاں حکومت کرتا رہا؛

"مبارک فتح اکبر"
سنہ ۹۷۴ھ
۱۵۶۷ء

خان زماں خاں جس کا اصلی نام علی قلی خاں سیستانی ہے۔ ہمایوں بادشاہ کا رفیق تھا اور اپنی قابلیت اور جنگی کارناموں کی بدولت سب سے نامی امیروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے سرکشی کی تو بہت سے اور سردار بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اور کئی سال تک بادشاہی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ محمد حکیم مرزا کے پنجاب پر

حملہ کرنے سے کچھ پہلے انھوں نے صلح کا عہد کر لیا تھا۔ لیکن بادشاہ کا لاہور جانا سنتے ہی پھر منحرف ہو گئے اور قنوج اور اودھ پر قبضہ کر لیا۔ مگر اکبر جس تیزی سے لاہور پر بڑھا تھا اُسی سرعت کے ساتھ واپس آگرے آیا اور فوج کثیر آراستہ کر کے دوبارہ باغیوں پر چڑھائی کی حقیقت میں بادشاہ کی یہ دلیری اور مستعدی اس کے دشمنوں کو بے حواس کئے دیتی تھی اور محض اس کی وجہ سے کہ وہ ہر مہم میں کامیاب ہوتا تھا۔ ورنہ مخالفوں کی کثرت اور جابجا فتنوں کا برپا ہونا مستقل مزاج سے مستقل مزاج شخص کو پریشان کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس موقع پر باغیوں کا کڑہ مانک پور کے قریب مقام تھا اور برسات کے باوجود اکبر نے وہیں ان پر فوج کشی کی دریائے گنگا کے دوسرے طرف خان زماں مصروف عیش ونشاط تھا اور اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ بادشاہ گنگا کو عبور کر کے اس پر حملہ کرے گا۔ لیکن نوجوان اکبر کی ہمت عالی کوہ و دریا کو خاطر میں نہ لاتی تھی جب کشتی نہ مل سکی تو اُس نے رات ہی کو اپنا ہاتھی دریا میں ڈال دیا۔ امیر وزیر منع کرتے رہ گئے اور وہ تھوڑی دیر میں دوسرے کنارے پر جا پہنچا اور ابھی آفتاب بلند نہ ہونے پایا تھا کہ مٹھی بھر فوج سے اُس نے باغیوں پر دھاوے کا حکم دیا۔ بادشاہی نقارے کی چوب نے خان زماں اور اس کے رفیقوں کے ہوش پراگندہ کر دیے ورنہ ان کی فوج کہیں زیادہ تھی۔ سپاہیوں میں اس اچانک حملے سے وہ بے ترتیبی پھیلی کہ تعداد کی کثرت خود ان کے حق میں وبال ہو گئی اور جب خان زماں مارا گیا تو لڑائی کا فیصلہ ہونے میں دیر نہ لگی۔ دشمنوں کے بعض سردار گرفتار ہوئے اور باقی جدھر منہ اٹھا بھاگ گئے۔ اکبر کو کامل فتح حاصل ہوئی۔ اور قاسم ارسلان نے قطعۂ تاریخ لکھا جس کا مادۂ تاریخ اس فقرے کا عنوان ہے ؏

چتوڑ کی تسخیر

اپنے امیروں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد اقبالمند بادشاہ نے راجپوتانے کے مشہور قلعے چتور گڑھ پر چڑھائی کی ان دنوں رانا سانگا کا بیٹا اودے سنگھ ریاست اودے پور میواڑ کا راجہ تھا۔ مگر بادشاہی آمد کی خبر سن کر وہ پہاڑوں میں چلا گیا اور قلعے کی حفاظت اس کے رشتہ دار جے مل نے اپنے ذمے لی۔ یہ نہایت بہادر اور ہوشیار سردار تھا اور آٹھ ہزار منچلے راجپوت اس کے ماتحت

قلعے میں موجود تھے۔ اس قلعے کی سنگینی اور مضبوطی ہندوستان میں آج تک ضرب المثل ہے اور ان دنوں بھی راجپوتوں میں بہت محترم سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہی فوجوں نے اُسے گھیر کر ساباط بنائے کہ ان کی آڑ میں نقب کھودی جا سکے یہ دو دیواریں ہوتی تھیں جنھیں فصیل کے قریب تیار کرتے تھے اور ان کے بیچ میں سے آڑلے کے سرنگ لگاتے تھے۔ پہلی دفعہ مغلوں نے جو سرنگیں تیار کیں ان میں سے ایک نے شہر پناہ میں رخنہ کر دیا تھا۔ لیکن راجپوتوں نے ان کا حملہ روک لیا اور اسی جنگ میں یکایک دوسری سرنگ نے اُڑ کر دوست دشمن جو قریب تھا سب کو ہلاک کر دیا۔ ناچار بادشاہ نے دوسری مرتبہ ساباط بنانے کا حکم دیا اور اس تیاری کے زمانے میں ایک رات وہ خود دیوار کی آڑ میں بیٹھا تھا کہ سامنے مشعل کی روشنی میں جے مل راجپوت نظر آیا جو اپنی فصیل کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا! اکبر نے دیکھتے ہی تفنگ اُٹھا کے اس پر فیر کیا اور گولی ٹھیک اس کی پیشانی پر لگی۔ جے مل کے مرتے ہی راجپوتوں نے عورتوں بچوں کو جلا دیا اور مغل فوجیں بلا مزاحمت قلعے کے اندر داخل ہو گئیں۔ اور قلعے میں خود کوئی نقصان اُٹھائے بغیر راجپوتوں کو گھیر گھیر کر قتل کیا۔ ۱۵۶۸ء۔

فتح گجرات

اب سلطنت مغلیہ کی سرحد ملک گجرات سے مل گئی تھی بعض باغی مغل سرداروں نے بھی اس علاقے میں پناہ لے رکھی تھی۔ اور جب موقع ملتا اپنے مامن سے نکل کر مالوے اور راجپوتانے پر یورش کرتے رہتے تھے۔ گجرات میں ان دنوں مظفر شاہ ثالث کی حکومت تھی اور وہ بہادر شاہ کا پوتا تھا۔ لیکن اصلی اختیارات ایک نو مسلم غلام اعتماد خاں کے قبضے میں تھے اور اسی نے مظفر شاہ کو جس کا نسب مشتبہ تھا تخت پر بٹھایا تھا۔ چتوڑ جس زمانے میں فتح ہوا اس وقت گجرات کا ملک اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا اور یہ جھگڑے تین چار سال تک ہوتے رہے حتّٰی کہ خود اعتماد خاں نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ وہ گجرات کو اپنی قلمرو میں داخل کر لے۔ اسی درخواست پر ۱۵۷۲ء میں بادشاہ نے اس علاقے کی طرف کوچ کیا اور شہر پٹن گجرات سے کچھ آگے بڑھ کر مظفر شاہ سے ملاقات کی جس نے اپنا تاج و تخت حضور میں نذر کیا اور یہ ملک سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

گجرات کے مفسد سرداروں کی سرکوبی میں زیادہ دیر نہ لگی۔ لیکن باغی مغل

بچ کر نکل گئے اور انھی کے تعاقب میں ایک موقع پر بادشاہ کی جان بال بال بچی پھر اسے پائے تخت آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ دوبارہ ایک باغی سردار حسین مرزا کے گجرات پہنچنے کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ بعض گجراتی رئیسوں کو ملا کر اس نے شاہی فوجوں کو پریشان و عاجز کر دیا ہے۔ اس اطلاع کے وقت برسات شروع ہو گئی تھی اور کسی بڑی فوج کا اتنا دور جانا دشوار تھا۔ لیکن منچلے بادشاہ سے برسات گزرنے کا انتظار نہ ہو سکا۔ اور دو ہزار سوار آگے بھیج کے اس نے تین سو رفیقوں کو اپنے ساتھ لیا اور اونٹوں پر سوار ہو کر اتنی سرعت سے پیش چلا کہ نو دن میں پانچ سو میل کے قریب مسافت طے کر لی اور بلائے بے درماں کی طرح حسین مرزا کی فوج پر ٹوٹ کے گرا جو شہر کا محاصرہ کر رہی تھی۔ چند ہزار آدمیوں کا اتنے بڑے لشکر پر حملہ کرنا نہایت جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن یہ اس قیامت کی یلغار تھی کہ بادشاہ کی صورت دیکھ کر باغی حیران و ششدر رہ گئے اور جب ہوش آیا تو سب کو بھاگنے کی پڑ گئی۔ اسی ہل چل میں حسین مرزا مارا گیا۔ گجرات نے فتنہ و فساد سے نجات پائی۔

فتح بنگالہ

گجرات کا الحاق بادشاہ کی بہت بڑی کامیابی تھی لیکن ہندوستان کا سب سے مشرقی اور وسیع صوبہ ابھی تک سلطنت مغلیہ کی حدود سے باہر تھا اور گو یہاں کے افغان بادشاہ داؤد خاں نے پہلے خراج ادا کرنے کا اقرار کر لیا تھا لیکن اس مُلک کے باقاعدہ فتح ہونے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اور داؤد خاں کو بھی جب اپنے خانگی مفسدوں سے فرصت مل گئی تو خراج بھیجنے سے پھر گیا۔ اور بادشاہ نے ۱۵۷۵ء میں اس مُلک پر فوج کشی کی۔ برسات کا موسم تھا اور گنگا جمنا چڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن انھی کے راستے بادشاہ نے کشتیوں میں کچھ فوج اور تمام ساز و سامان روانہ کیا اور بلا دقت بہار تک بڑھ آیا جس کا مشرقی حصہ بنگالے کے قلمرو میں داخل کیا۔ مگر داؤد خاں عیش دوست آدمی تھا اس نے بادشاہی لشکر کا اوّل اوّل مقابلہ نہ کیا اور بنگال خاص کے علاقوں میں ہٹ گیا۔ اکبر نے بھی اپنے بعض سرداروں کو یہاں چھوڑ کر پائے تخت کو مراجعت کی۔

مغل سرداروں نے رفتہ رفتہ تمام بنگالہ فتح کیا اور داؤد خاں کو اڑیسہ میں پناہ لینی پڑی۔ اس نے دو تین مرتبہ اس پناہ سے نکل کر مغلوں پر حملے بھی کئے۔ لیکن آخر میں بادشاہی فوجوں کو کامیابی ہوئی اور بظاہر بنگالے میں کوئی قوی حریف نہ رہا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ پانی پت کی پہلی لڑائی کے بعد سے اکثر پٹھان سرداروں کے خاندان اُٹھ اُٹھ کر بہار و بنگالے میں آ بسے تھے اور یہاں ان کا مدت سے اقتدار چلا آتا تھا۔ ملک میں جابجا ان کی جاگیریں اور بستیاں تھیں اور اب تک اُنھی کے ہم قوم یہاں بادشاہی کرتے رہے تھے۔ لہذا یہاں بہت دن تک شورشیں ہوتی رہیں اور اڑیسہ کے افغانی حاکم تو جہانگیر کے زمانے تک مغلوں کے قابو میں نہیں آئے۔

پنجاب و گجرات کے فساد

جس وقت مشرق کے بعید علاقوں میں امرائے شاہی سلطنت مغلیہ کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے۔ بادشاہ کو پنجاب و گجرات کے مفسدوں پر توجہ کرنی پڑی یعنی ۱۵۸۱ء کے شروع میں مرزا حکیم نے دوبارہ کابل سے بڑھ کر لاہور پر چڑھائی کی اور خود بادشاہ کو اس کی گوشمالی کے لئے جانا پڑا۔ حکیم کابل کی طرف پسپا ہوا لیکن اس مرتبہ اکبر نے اسے اپنی قلمرو سے نکال دینے پر قناعت نہ کی بلکہ کابل تک پیچھا کیا اور حکیم کو پہاڑوں میں بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے امان مانگی اور اکبر نے کمال فیاضی سے دوبارہ اسے ولایت کابل پر بحال کر دیا۔

اسی سال مظفر شاہ ثالث بھاگ کر اپنے وطن پہنچا اور بعض قدیم گجراتی امیروں کے اغوا سے بغاوت کی۔ واضح ہو کہ اپنا ملک اکبر بادشاہ کے سپرد کرنے کے بعد وہ اسی کے ہمرکاب آگرے آگیا تھا اور ہندوستان خاص میں اُسے رہنے کے لئے جاگیر عطا ہوئی تھی۔ یہاں وہ سات آٹھ برس رہا اور اب کسی کو اس کی نسبت شورش بپا کرنے کا گمان بھی نہ تھا۔ مگر بعض قدیم گجراتی امیروں نے خط بھیج بھیج کر اسے دوبارہ اپنی سلطنت لینے پر آمادہ کیا۔ اور اس کے گجرات پہنچتے ہی وہاں لڑائی کے شعلے بھڑکنے لگے۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بیرم خاں کے فرزند مرزا عبدالرحیم خاں کو مامور کیا گیا تھا۔ اور اس نے

مظفر شاہ کو شکست دے کر گجرات کے ساحلی علاقوں میں بھگا دیا بایں ہمہ اسے جب موقع ملتا وہ اپنی جائے پناہ سے نکل کر اندرونی حصے پر تاخت کرتا اور اس قسم کی قزاقانہ جنگ رُک رُک کر کئی سال تک ہوتی رہی آخر ۱۵۹۲ء میں مظفر شاہ گرفتار ہو کے آگرے روانہ کیا گیا اور اس نے راستے میں خود گلا کاٹ کے اپنا کام تمام کر لیا۔

باب ہشتم

اکبر بادشاہ کی آخری فتوحات

اور

ملکی انتظام

کشمیر کی فتح۔ افغانی قبائل کی شورہ پشتی

اکبر نے اس وقت تک جتنے ملک فتح کئے وہ اس کے پیش رو سلاطین بارہا فتح کر چکے تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ابھی دکن کے وسیع قطعات جن پر خلجی اور تغلق بادشاہ فرماں روائی کرتے رہے۔ سلطنت مغلیہ کی حدود میں نہ آئے تھے۔ ان جنوبی علاقوں کی تسخیر کا بادشاہ کو خیال ضرور تھا لیکن دکن پر کسی بڑی مہم کے بھیجنے سے پہلے اُسے کابل جانے کی ضرورت پیش آگئی اور اسی سفر میں فتح کشمیر کا ارادہ پورا ہوا۔ کشمیر میں ان دنوں مسلمان بادشاہ فرماں روائی کرتے تھے اور اگرچہ قدرت نے اس خوبصورت ملک کی حفاظت کے واسطے ہر طرف پہاڑوں کی مہیب فصیلیں بنا دی ہیں مگر باہمی نفاق وہ بلا ہے کہ حقیر سے حقیر دشمن کے مقابلے میں بادشاہوں یا قوموں کو مغلوب و سرنگوں کرا دیتا ہے۔ کشمیر کے شاہی خاندان میں بھی سخت نزاع برپا تھی کہ اکبر کو حملے کا موقع ملا۔ شاہرخ مرزا اور راجہ بھگوان داس

مہم کے سردار تھے لیکن پہلی دفعہ راہ کی دشواری اور آسمان کی برف باری نے ان سرداروں کے حوصلے پست کر دیے اور وہ شاہان کشمیر سے محض اطاعت کا وعدہ لے کر واپس چلے آئے۔ بادشاہ نے یہ قرارداد پسند نہ کی اور دوبارہ فوج بھیج کر اس ملک کو فتح کیا۔ وہاں کا بادشاہ امرائے دربار میں داخل کر لیا گیا اور یہ بےنظیر صوبہ سلطنت مغلیہ کا جزو بن گیا لیکن اسی سلسلے میں مغلوں کی افغانی قبائل سے جنگ چھڑ گئی جس میں کئی مرتبہ بادشاہی فوج کو زک ہوئی اور سخت نقصان اُٹھانے پڑے، یہ آزاد جنگجو کوہ ہندوکش کی اُن بلندیوں پر آباد تھے۔ جو قدرتی مناظر میں کشمیر سے کم خوبصورت نہیں کشمیر کی طرح وہاں میوہ دار درختوں کی افراط ہے اور کشمیر سے اگر کسی بات میں نمایاں فرق ہے تو اس میں کہ ان پہاڑوں کے بسنے والے اہل کشمیر سے کہیں زیادہ قوی اور دلیر ہوتے ہیں۔

اکبر کے زمانے میں یوسف زئی قبیلے کے لوگ پہاڑی جرگوں کے حاکم تھے اور یہ صرف کثرت مال و زر بلکہ تہذیب اور قابلیت میں بھی وہاں کے سب باشندوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ چند ہی سال پہلے ان میں بایزید نامی ایک شخص نے مُلہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اس کے پیرو روشنائی کہلاتے تھے اس فرقے نے خیبر اور سلیمان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور کئی بار کابل کا علاقہ تاخت و تاراج کر گئے تھے۔ محمد حکیم مرزا کی وفات کے بعد کابل کی حکومت راجہ مان سنگھ کے سپرد کی گئی تھی لیکن بیدار مغز و دلیر ہونے کے باوجود بھی وہ ان سرکش پٹھانوں کو قابو میں نہ لا سکا اور بادشاہ نے فتح کشمیر کے زمانے میں دریائے سندھ کے کنارے زیادہ عرصے تک اسی وجہ سے قیام کیا کہ ان سے ان قبائل کی پوری سرکوبی منظور تھی، اس غرض کے لئے جو فوج بھیجی گئی زین خاں اور بیربل اس کے سپہ سالار تھے۔ راجہ بیربل بادشاہ کا نہایت عزیز مصاحب تھا لیکن میدان جنگ میں اُس کی جلدبازی نے بادشاہی سپاہ کو سخت نقصان پہنچایا وہ زین خاں کے خلاف منشا اور بلا اطلاع پہاڑوں میں گھسا چلا گیا لیکن جب اُس کے سپاہی ایک تنگ درے کے اندر پہنچے تو یک بیک پٹھانوں نے ان پر حملہ کیا اور ہر طرف سے اتنے پتھر اور تیر برسائے کہ تمام فوج میں ہلچل مچ گئی۔ ادھر دشمن کی ٹکڑیاں تلوار ہاتھ میں لئے بلائے بے درماں کی طرح ان پر حملہ آور ہوئیں مقام کی ناہمواری اور پیچ و خم کی وجہ سے پہلے ہی لشکر کی ترتیب درست نہ تھی اس اچانک حملے نے اور بھی انتشار پیدا کر دیا۔ بے حواس سپاہی

اپنی مدافعت بھی نہ کر سکے۔ اور غالباً سب کے سب انھی پہاڑی گھاٹیوں میں کام آئے۔ زین خاں کی فوج کسی قدر اچھے اور کھلے مقام پر تھی اور وہ بچ کر نکل آئی۔ لیکن راجہ بیربل کی موت کا بادشاہ کو اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ بہت دن تک اُس نے سوگ رکھا اور زین خاں کی صورت نہ دیکھی۔

پٹھانوں کی لڑائی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا اور اگرچہ یوسف زئی قبائل کو مجبور ہو کے صلح کرنی پڑی لیکن اس امن و امان کے اصلی دشمن روشنائی فرقے کے لوگ تھے اور بایزید کا بیٹا جلالہ ان کا سرغنہ ہوا تھا جس نے کئی سال تک حکومت کابل کو سخت پریشان رکھا۔ مگر رفتہ رفتہ ان مفسدوں کی قوت کم ہو گئی اور پچاس ساٹھ برس کے عرصے میں اس فرقے کے پیرو معدوم ہو گئے۔

سنہ ۱۰۰۱ھ (سنہ ۱۵۹۲ء) تاریخ ہندوستان میں یادگار ہے کیونکہ اسی سال قندھار و سندھ کے علاقے فتح ہوئے۔ اڑیسہ پر شہنشاہ کا کامل تسلط جم گیا اور مظفر شاہ کی گرفتاری نے گجرات کو فتنہ و فساد سے پاک کر دیا۔ راجپوتانے کے سب رئیس راجہ بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور گوادوے پور کا رانا ابھی تک خودسری سے باز نہ آیا تھا لیکن اس کی حیثیت محض ایک مغرور سردار کی تھی جو پہاڑوں اور جنگلوں میں منہ چھپاتا پھرتا ہو، خلاصہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا سنہ میں دریائے نربدا تک ہندوستان و کابل کا وسیع خطہ اقبالمند اکبر کے زیر حکم آگیا اور یہ حکومت جس قدر باقاعدہ اور مستحکم تھی اس سے پہلے شاید کبھی ہندوستان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

احمد نگر کا محاصرہ

لیکن باہمت بادشاہوں کی نظر میں نربدا ندی ایسی روک نہ تھی جسے عبور کرنا محال ہو۔ دوسرے دکن کی شاداب و زرخیز زمین میں کشش کے بہت سے اسباب موجود تھے۔ پھر یہ کہ چند سال پہلے احمد نگر کے حاکم مرتضیٰ نظام شاہ کا ایک بھائی برہان شاہ مغل شہنشاہ کی حمایت میں آگیا تھا اور اسے تخت پر بٹھانے کی غرض سے ایک مہم بھی روانہ کی گئی تھی۔ یہ مہم ناکام واپس آئی اور چند سال کے بعد برہان شاہ کو بغیر کسی مدد کے اپنا ورثہ مل گیا۔ لیکن برہان کی وفات کے قریب احمد نگر میں خانہ جنگی بپا ہو گئی اور ایک فریق نے مغلوں سے امداد کی درخواست کی چنانچہ شہزادہ مراد گجرات سے اور خان خاناں مالوے سے فوج لے کے بڑھے اور خاص احمد نگر کے سامنے ایک دوسرے سے مل گئے۔ انھیں امید تھی کہ شہر بلامزاحمت ان کے

قبضے میں آجائے گا مگر اس چند ماہ کے عرصے میں برہان شاہ کی وفات کے بعد احمد نگر کی عنان حکومت چاند بی بی کے ہاتھ میں آگئی تھی اور اسی نے اپنے شیر خوار بھتیجے بہادر نظام شاہ کی طرف سے مغلوں کا مقابلہ کیا وہ سلاطین بیجاپور کے خاندان سے تھی اور سب سے پہلے اس نے وہیں کے بادشاہ کو آمادہ کیا کہ قدیم خصومت چھوڑ کر اس نازک وقت میں احمد نگر کا ساتھ دے اسی طرح خود ریاست احمد نگر کے جو امرا باہم دست و گریباں تھے انھیں سمجھایا اور مغلوں کے مقابلے میں متحد کر لیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ چاند بی بی کی یہ فراست اور قابلیت اسی قدر قابل تعریف ہے جس قدر کہ اس کی ذاتی شجاعت جس کی بہت سی کہانیاں اب تک دکن اور ہندوستان میں مشہور ہیں۔ کیونکہ جب مغلوں کو صاف جواب مل گیا اور چاند بی بی کی جنگی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے احمد نگر کا محاصرہ شروع کر دیا اور جس قدر جلد ممکن ہوا اسے تسخیر کرنے کے درپے ہوئے۔ اسی کوشش میں ایک مرتبہ انھوں نے فصیل کا ایک حصہ سرنگ سے اُڑا دیا اور اس کی آواز نے محصورین کو اتنا بے حواس کیا کہ سپاہی جگہ چھوڑ چھوڑ کے بھاگنے لگے اور مغل سپاہیوں نے یورش کر کے چاہا کہ اندر داخل ہو جائیں۔ بظاہر قلعے کے فتح ہونے میں اب کچھ دیر نہ تھی کہ یک بیک چاند بی بی منھ پر نقاب ہاتھ میں ننگی تلوار زرہ بکتر پہنے دوڑتی ہوئی آئی چلا چلا کے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا انعام کے وعدوں سے اُن کے دل بڑھائے۔ ساتھ ہی اس کے حکم سے یکبارگی اتنے گولے اور پتھر برسے کہ مغلوں کی فوج آگے نہ بڑھ سکی اور جو فصیل تک پہنچ گئی تھی وہ اندر داخل نہ ہو سکی حملہ دوسرے دن پر ملتوی کرنا پڑا اور اس فرصت میں تمام رات کھڑے رہ کر اس مستقل مزاج شہزادی نے گری ہوئی فصیل پھر تین گز اونچی تیار کرا دی۔ اس یادگار مدافعت اور بہادری کے باوجود چاند بی بی کو بیرونی مدد ملنے کا اطمینان نہ تھا اور اندرونی مخالفت سے ہر وقت اندیشہ تھی ادھر محاصرین کو بیجاپور کی فوجیں قریب آنے کی وجہ سے رسد رسانی میں دقت ہو رہی تھی لہذا دونوں فریق مصالحت پر آمادہ ہو گئے شہزادہ مراد نے محاصرے سے ہاتھ اٹھا لیا اور چاند بی بی نے برار پر شہنشاہ کا قبضہ تسلیم کر لیا (۱۵۹۵ء)۔

تسخیر احمد نگر اور خاندیس کا الحاق

برار پر قبضہ ہونے کی وجہ سے مغلوں کی ریاست بیجاپور سے بھی جنگ چھڑ گئی اور آیندہ ناندیڑ کے قریب بہت بڑی لڑائی ہوئی جس میں بیجاپور احمد نگر اور گولکنڈہ کی فوجیں ایک طرف تھیں اور خاندیس کے

باجگزار بادشاہ نے مغلوں کا ساتھ دیا تھا مگر اس خوں ریزی کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور کچھ روز بعد شہزادۂ مراد نے دکن میں وفات پائی تو اکبر نے اپنے دوسرے بیٹے شہزادۂ دانیال کو مہمات دکن کا اختیار دے کر بھیجا اور بعد ۱۵۹۹ء میں اسی ہزار فوج لے کے خود بھی دکن کا رخ کیا۔ اکبر کے اس طرف آنے میں دو مصلحتیں تھیں ایک تو یہ کہ احمد نگر سے قریب رہے جس کی تسخیر کے واسطے شہزادۂ دانیال اور خان خاناں نامزد کئے گئے تھے اور دوسرے ملک خاندیس کو سلطنت مغلیہ میں داخل کر لیا جائے تاکہ دکن کے راستے میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ واضح رہے کہ خاندیس کے شاہان فاروقیہ مدت سے شہنشاہ ہندوستان کے باجگزار ہو گئے تھے اور ناندیڑ کی لڑائی میں ہم وہاں کے بادشاہ راجے علی خاں کو مغلوں کی طرف سے شریک جنگ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن جب وہ اسی جنگ میں کام آیا اور اس کا بیٹا بہادر دل خاں خاندیس کا حاکم ہوا تو اس نے ایسی خیر خواہی نہ دکھائی۔ پس اکبر نے خود اُس کے صدر مقام آسیر گڑھ کا محاصرہ کیا جس کی سنگینی مشہور تھی۔ اس محاصرے نے قلعۂ احمد نگر کے دوسرے محاصرے سے بھی زیادہ طول کھینچا اور اکبر کو تسخیر احمد نگر کی خبر اسی جگہ ملی (۱۶۰۰ء) لیکن اسیر گڑھ میں بیماری پیدا ہو گئی تھی اور بہادر دل کو مختلف اوہام نے اور زیادہ پست ہمت کر دیا تھا ناچار ہتھیار رکھ دیے اور اسیر گڑھ کا مشہور قلعہ جس میں بے شمار زر و جواہر جمع تھے بادشاہ کے قبضے میں آگیا اور خاندیس سلطنت مغلیہ کا ایک علیحدہ صوبہ بنا لیا گیا (۱۰۰۹ھ مطابق ۱۶۰۰ء)۔

شہزادۂ سلیم کی سرکشی

خاندیس سے آتے وقت اکبر نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ سلیم کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تھا لیکن اس نے بد اندیش مصاحبوں کی صلاح سے مخالفت پر کمر باندھی اور جب اکبر آباد کے قلعہ دار نے وہاں کا قلعہ حوالے کرنے سے انکار کیا تو وہ اپنے صوبۂ الٰہ آباد میں آگیا اور علانیہ باپ سے سرکشی کی۔ یہ خبریں گوش زد ہوئیں تو اکبر نے دکن کا انتظام شہزادۂ دانیال و خان خاناں و ابوالفضل کے سپرد کیا اور خود آگرے کو مراجعت کی اس نے اپنے منحرف بیٹے کو محبت آمیز خط لکھے اور آخر شہزادۂ سلیم نے بہت عجز کے ساتھ معذرت کی اور باپ بیٹے میں مصالحت ہو گئی۔ اسی زمانے میں ابوالفضل کے دکن سے واپس آنے کی اطلاع ملی اور سلیم کو خوف ہوا کہ وہ بادشاہ کو دوبارہ مجھ سے ناراض کر دے گا۔ کیونکہ چند سال سے

شہزادۂ ولی عہد اور اس وزیر میں سخت مخالفت ہوگئی تھی پس باپ سے مصالحت کے باوجود سلیم نے بندھیل کھنڈ کے ایک رئیس کو اشارہ کردیا کہ راستے میں ابوالفضل کو قتل کرڈالے؛ اس نامی گرامی وزیر کو مارنا اکبر کو سخت صدمہ پہنچانا تھا۔ چنانچہ یہ خبر سن کر شہنشاہ کو اتنا رنج ہوا کہ اس نے قاتل راجہ رام کے تمام علاقے کو تباہ و تاراج کرادیا؛ (۱۶۰۲ء)۔

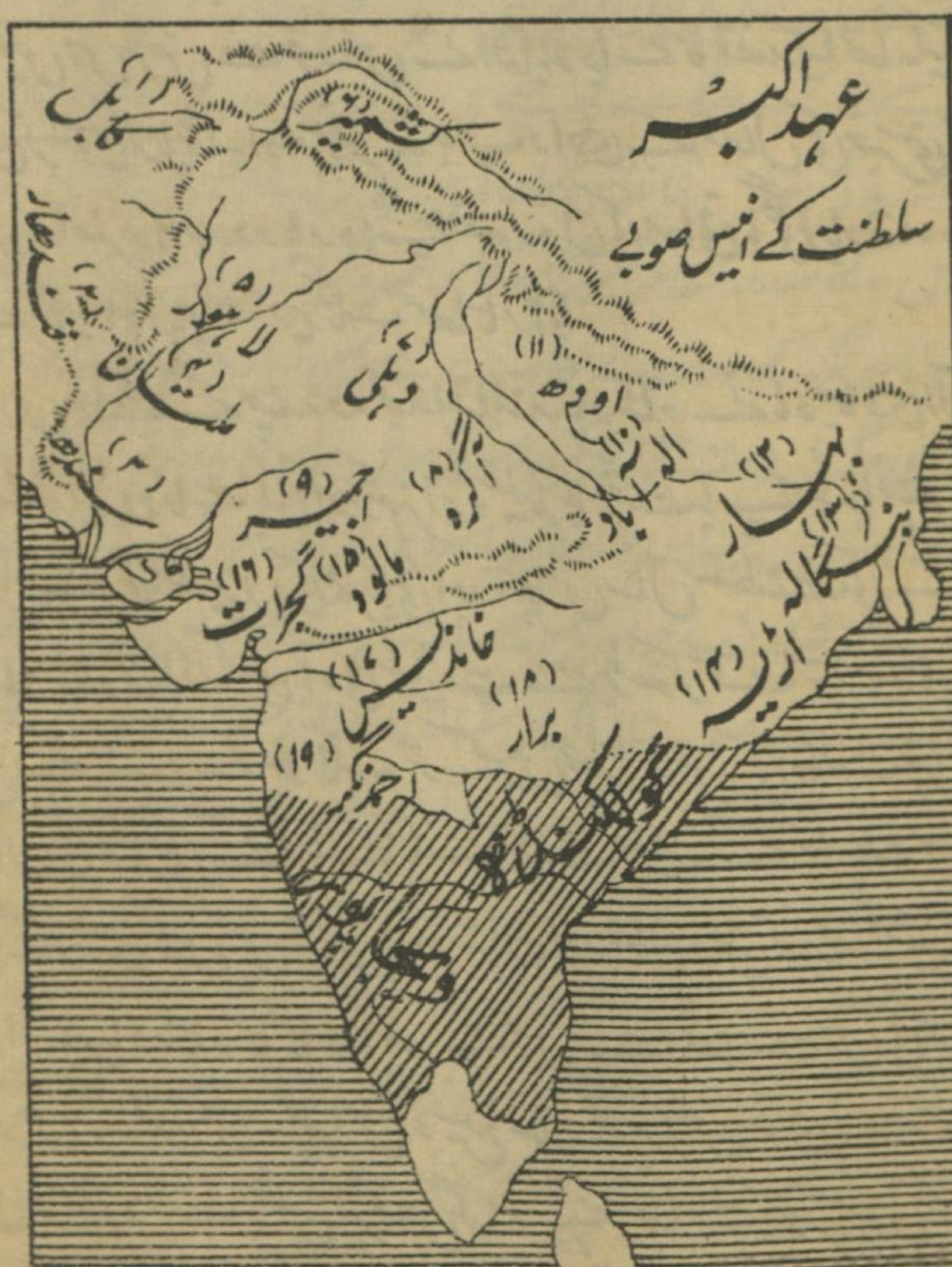
اکبر کی وفات اور اوصاف

اکبر کے آخری چند سال اُلٹی خاندانی پریشانیوں میں بسر ہوئے۔ ۱۶۰۰ء میں اس کا دوسرا بیٹا شہزادۂ دانیال دکن میں فوت ہوگیا تھا اور اسی لئے اب غم زدہ باپ کی تمنّا یہ تھی کہ بڑا بیٹا سلیم راہ راست پر چلے اور ان بے اعتدالیوں سے باز آئے جن کی خبریں پیہم آگرے پہنچتی رہتی تھیں اس غرض سے خود اس نے الٰہ آباد جانے کا قصد کیا تھا۔ لیکن ماں کی سخت علالت سن کر ملتوی کرنا پڑا۔ ادھر سلیم نے جب دادی کے انتقال کی خبر سنی تو خود باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوبارہ اپنے قصوروں کی معافی مانگی بادشاہ نے آبدیدہ ہوکر بیٹے کو گلے سے لگایا اور بہت دیر تک سمجھاتا رہا؛

اس واقعے کے چند روز بعد اقبالمند بادشاہ نے ماہ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ (اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں وفات پائی اور شہزادۂ سلیم بلا دقّت باپ کا جانشین ہوگیا؛

اکبر نے تریسٹھ برس کی عمر پائی اور انچاس سال سلطنت کی۔ بے شبہ وہ موروثی بادشاہ تھا اور کسی ادنیٰ حیثیت سے بڑھ کر تخت شاہی تک نہ پہنچا تھا لیکن اس کے باپ نے جو ملک ترکے میں چھوڑا اس کی حالت نہایت مخدوش تھی اور بیرم خاں کی اتالیقی کے زمانے تک سلطنت مغلیہ کے حدود دوآب اور مالوہ سے آگے نہ بڑھی تھیں پس تمام ہندوستان اور شمالی دکن کو بزور شمشیر فتح کرنا حقیقت میں اسی اولوالعزم بادشاہ کا کارنامہ ہے جس نے اٹھارہ برس کی عمر سے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ پھر اس وسیع علاقے پر اس خوبی سے حکومت کرنا کہ حسن انتظام کا دوست دشمن ہر شخص گواہ ہے، نہایت غیر معمولی قابلیت کا ثبوت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اکبر نہایت معاملہ فہم اور زیرک بادشاہ تھا؛ بے دھڑک لڑائی کی آگ میں کود پڑنا ذاتی شجاعت اور سپہ سالاری اور اسی طرح حلم، درگزر، مروّت و فیّاضی کی صفات

اُسے ورثے میں ملی تھیں لیکن موقع شناسی نے اس کی بہادری اور فیاضی کو اس قدر مفید بنا دیا تھا کہ بابر و ہمایوں جس ملک پر چین سے کبھی حکومت نہ کر سکے اس سے کئی گنا ملک اکبر کی جاگیر بن گیا وہاں کی رعایا اس کا کلمہ پڑھنے لگی اور تمام کشور ہندوستان میں کوئی ایسا گردن کش باقی نہ رہا جسے مغل بادشاہ سے ہمسری کا دعویٰ یا مقابلے کی جرأت ہوتی؛



ذاتی عادات کے اعتبار سے اکبر نہایت اعتدال پسند بادشاہ تھا عیش و عشرت اور امیروں کے بیہودہ مشاغل کی طرف اسے بالکل رغبت نہ تھی اور ان کے بجائے سیر و شکار مردانہ فنون اور جنگی جانوروں کی لڑائی دیکھنے کا شایق تھا اور علما کے مباحثے اور تاریخی افسانے سننے سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کا طاقتور جسم جفاکشی اور اعتدال کی بدولت آخر تک سڈول اور مضبوط بنا رہا۔ اور آئے دن کی بیماریوں سے کبھی اس کی زندگی بے مزہ نہ ہوئی وہ دن رات میں تین چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتا تھا اور اپنے فرائض شاہی مستعدی اور پابندی کے ساتھ انجام دیتا تھا۔

تزک و احتشام اور شان مطلق العنانی

مذکورۂ بالا خوبیوں کے بیان میں اہل تصنیف نے ورق کے ورق بھر دیئے ہیں۔ لیکن بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ خردہ گیروں نے اکبر کے مزاج میں بھی خود نمائی کا نقص نکالا۔ گو اس میں کلام نہیں کہ یہی عیب مطلق العنان بادشاہوں کا زیور ہے اور اس کے بغیر کیانی اور ساسانی یا سلجوقی اور مغلیہ درباروں میں وہ بات ہی نہ پیدا ہوتی جس کی بدولت مشرقی بادشاہوں کا جاہ و جلال ضرب المثل ہو گیا ہے۔ دوسرے اتنے عرصے تک اقبال مندی اور کامرانی کے ساتھ فرماں روائی کرنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ اکبر کے دربار میں شاہانہ ساز و سامان اور تکلفات کی افزائش ہو چنانچہ خزانۂ عامرہ کا بہت سارو پیہ انھی لوازم بادشاہی میں صرف ہونے لگا تھا۔ آئین اکبری میں ایسے بیسیوں کارخانوں کے حالات اور مصارف کی تفصیل درج ہے جو بادشاہ کی ذات سے مخصوص تھے اور اس شاہانہ تزک و احتشام کی تصویر دیکھنی ہو تو آدمی سالگرہ اور جشن نوروز کے حالات پڑھے جن میں کروروں روپیہ خرچ ہوتا تھا اور کئی کئی دن تک عیش و نشاط کی مجلسیں گرم رہتی تھیں۔ انھی موقعوں پر "تلاوان" کی رسم ادا ہوتی تھی اور محتاجوں کو بے شمار زر و مال خیرات میں دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی شان و شوکت سے رعایا کے دلوں پر جو اثر پڑتا ہے وہ ہر شخص خود سمجھ لے گا۔ ہندوستان کے لوگوں میں پہلے ہی بادشاہ کا ادب پرستش کی حد تک کیا جاتا ہے اور گدّی کے مالک کو وہ "ظل اللہ" سے بھی بڑھ کر "ان داتا" یا دیوتا مانتے ہیں۔ لیکن یہی اسباب ہیں جو بادشاہوں کو خود پسند بنا دیتے ہیں اور باضابطہ و فہیم ہونے کے باوجود شہنشاہ اکبر بھی اس اثر سے محفوظ نہ تھا۔ نیک اور دیگر امرا سے اس کی جنگ و جدال

اور فتح مندی کا مختصر حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ظاہر میں تو اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند باغیوں کا استیصال ہوگیا۔ مگر حقیقت میں ان فتوحات نے بادشاہ کی مطلق العنانی کو بڑی تقویت پہنچائی اور آیندہ بڑے سے بڑے امیر کی حیثیت اس کی نظر میں معمولی ملازموں کی سی رہ گئی۔ لیکن اس خرابی کا تمام الزام اکبر کو دینا بیجا ہے اس نے یہ فرق مراتب قصداً پیدا نہیں کیا بلکہ درحقیقت اس طرز حکومت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کامیاب اور لایق فرماں روا سب پر حاوی ہو جائے اور اپنی ذات کو معمولی انسانوں سے بلند و بالاتر سمجھنے لگے۔

آغاز حکومت کے چند سال بعد سے بادشاہ کا میلانِ خاطر ہندو رئیسوں کی طرف ظاہر ہونے لگا تھا۔ پھر اس نے اپنی اور اپنے بیٹوں کی راجپوت خاندانوں میں شادیاں کیں تو ان خاندانوں کے راجہ اور راج کمار بھی اس کی سرکار میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ لیکن ہندوؤں کو مناصب جلیلہ عطا کرنے کی بھی ایک وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کو قدیم امرا سے ان کے برابر اطاعت کی امید نہ تھی اور وہ مسلمان سرداروں کو سرکش و متمرد جانتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مطلق العنان سلطنتوں میں انتظام اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ بادشاہ کے ہر اشارے کے بے چون وچرا تعمیل کی جائے اور اگر بادشاہ ایسا رعایا پرور اور منتظم ہو جیسا کہ اکبر تھا تو اس کی مطلق العنانی ملک کے حق میں ضرور مفید ہوگی۔ بااین ہمہ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں موروثی بادشاہی کا آئین ہے وہاں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ ایسی مطلق العنانی آگے چل کے قانون عدل و اخلاق کی حدود سے باہر نہ ہو جائے گی؛ دوسرے خود اکبر نے کچھ عرصے بعد "زمین بوسی" کا طریقہ جاری کیا تھا۔ جس طرح ہندوؤں میں "پالاگن" کا دستور ہے۔ اسی طرح قدیم ایرانیوں میں "نماز" یا "زمین بوسی" کی رسم تھی یعنے بادشاہ کے سامنے گر کر زمین چومتے تھے۔

اکبر کے مذہبی خیالات

اکبر کے عقائد میں تغیر ہونے کے بہت سے اسباب تھے۔ واضح رہے کہ بچپن میں اس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہوا اور کتابی علم سے وہ قریب قریب بے بہرہ تھا۔ لہٰذا اوائل عمر میں اس کے جو کچھ عقائد تھے وہ محض تقلیدی اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہوں گے اور جوانی میں ہم اسے نہایت خوش اعتقاد مسلمان پاتے ہیں۔ جو کبھی خواجہ معین الدین کے مزار کی زیارت کے واسطے

پیادہ پا اجمیر کے سفر کرتا ہے۔ کبھی اولاد کے لیے دعا کرانے شیخ سلیمؒ[1] چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اپنے بیٹے کو بھی انھی کے نام پر شاہزادہ محمد سلیم موسوم کرتا ہے، لیکن آغاز حکومت سے بیس بائیس برس بعد ہم اسے بالکل دوسرے رنگ میں رنگا ہوا پاتے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اس کے مزاج میں فیضی اور ابوالفضل کو پورا دخل ہوگیا تھا۔ یہ دونوں بھائی شیخ مبارک ناگوری کے بیٹے تھے۔ فیضی جس طرح عمر میں بڑا تھا۔ اسی طرح علم و فضل میں اسے فضیلت حاصل تھی۔ وہ سنسکرت زبان کا عالم اور مختلف مذہبوں کی تعلیم سے خوب واقف تھا اور فارسی کا نہایت بلند پایہ شاعر مانا جاتا ہے۔ ابوالفضل انتظامی قابلیت اور دربار داری کے فن میں طاق تھا اکبری عہد کے واقعات اور آئین و قوانین پر اس نے جو لاجواب کتابیں لکھی ہیں وہ اس کی ذہانت و لیاقت کی یادگار ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور کتاب آئین اکبری ہے اور دوسری اکبر نامہ جسے مولف اپنی زندگی میں ختم نہ کرسکا۔ یہ دونوں آزاد خیال اور فلسفیانہ مزاج کے تھے ان کی صحبت کا اکبر پر اثر پڑا اور انھی نے بادشاہ کو بھی رفتہ رفتہ اپنا ہم خیال بنا لیا۔

ملکی اور جنگی انتظام اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے کہ اکبر کے وضع کردہ قوانین پر عمل کس حد تک ہوتا تھا۔ لیکن اس بات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ عہد اکبری میں ملک کا نظم و نسق بہت کچھ ترقی کرگیا تھا اور سلطنت کی کل نہایت عمدہ طریقے سے چلنے لگی تھی۔ انتظام کی غرض سے تمام علاقے کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا تھا اور ہر صوبے میں کئی کئی سرکاریں اور سرکار میں کئی کئی پرگنے یا محال ہوتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں صوبہ کا اعلیٰ حاکم سپہ سالار کہلاتا تھا اور وہاں کے تمام ملکی اور جنگی اختیارات اس کو تفویض کردیے جاتے تھے۔ اسی اصول پر سپہ سالار کے ماتحت ہر سرکار میں یا ضلع میں فوجدار اپنے اپنے علاقے میں امن و انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنا میر عدل اور قاضی کا فرض تھا اور اگر فریقین ہندو ہوں تو ایک پنڈت یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ شہروں یا

[1] یہ اور خواجہ باقی باللہؒ اس زمانے کے بڑے عالی مقام درویش تھے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بھی یہی زمانہ ہے جن کے علم و فضل کی تمام دنیائے اسلام میں شہرت ہوئی۔ ۱۲

بڑے بڑے قصبوں میں جرائم کی تفتیش و سراغ رسانی کے لیے کوتوال تھے اور دیہات میں یہ کام مالگزاروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ محکمۂ فوج میں بھی اکبر نے بہت سی مفید اصلاحیں کیں اور منصب داری کا طریقہ جاری کیا منصب دار کم سے کم دس سپاہیوں کا سردار ہوتا تھا اور اس سے اوپر یک صدی، یک ہزاری وغیرہ کئی درجے کے منصب ہوتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں سب سے بڑا منصب پنج ہزاری تھا اور شہزادوں کے سوا کسی کو اس سے زیادہ کا منصب نہیں ملا۔ یہ منصب دار افواج شاہی کے لیے نصف پیادہ اور نصف سوار سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد فراہم کرتے تھے اور انھیں بادشاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ کہ ایسے سرداروں کو جمعیت کی تنخواہ کے لیے جاگیریں عطا کر دی جائیں اکبر نے بالکل ترک کر دیا تھا، کیونکہ اس میں بہت سی خرابیاں تھیں۔

بندوبست مالگزاری لیکن اکبر کا سب سے بڑا کارنامہ سررشتۂ مالگزاری کا انتظام تھا جس کے اکثر قاعدے آج کے دن تک جاری ہیں۔ واضح رہے کہ اکبری بندوبست کے اصول نئے نہ تھے بلکہ اس میں بہت سے وہ طریقے اختیار کر لیے گئے تھے جنھیں شیر شاہ سوری نے رواج دیا تھا۔ اسی طرح بعض اور اصول پر بھی پہلے سے کہیں کہیں عمل ہوتا تھا۔ مگر ان باتوں سے اکبری بندوبست کی وقعت کم نہیں ہوتی کیونکہ تحصیل مالگزاری کا نہ تو ایسا مکمل نظام کبھی پہلے تیار ہوا نہ اس خوبی سے اتنے بڑے علاقے میں کبھی نافذ رہا جیسا کہ اکبر کے عہد میں ہوا اور اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ مغلوں کے آنے سے پہلے مرکزی حکومت کبھی اتنی قوی اور با اختیار نہ تھی کہ اس کے احکام پر تمام صوبوں میں یکساں عمل ہوتا۔

اکبری بندوبست کے تفصیلی حالات لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ سب سے پہلے تمام زمینوں کی یکساں پیمانے سے پیمائش کرائی گئی تھی اس کے بعد ہر کھیت کی حیثیت دیکھی جاتی تھی کہ اس کی زمین کیسی ہے۔ آب پاشی کا کیا انتظام ہے کس مالیت کی جنس اور بالاوسط کتنی مقدار فی بیگہ پیداوار ہوتی ہے ان سب باتوں کو دیکھ کر سرکاری مالگزاری تشخیص کی جاتی تھی جو بالعموم پیداوار کا آٹھواں ساتواں یا چوتھائی حصہ ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کی زیادہ سے زیادہ شرح ایک تہائی مقرر کی گئی تھی تو ان اصول پر اول اول سالانہ

جمعبندی ہوتی تھی لیکن تھوڑے عرصے میں یہ بندوبست ''دہ سالہ'' کردیا گیا تھا۔ مالگزاری کے لیے اجازت تھی کہ کاشتکار سرکاری لگان جنس کی صورت میں دے یا اس قیمت کا زرنقد ادا کردے اور سرکاری محصّلوں کو تاکید کردی جاتی تھی کہ وہ کسان کی آسانی کا خیال رکھیں اور براہ راست اسی کے ساتھ معاملہ کریں چنانچہ گو جمعبندی کے تمام کاغذات پٹیل پٹواری کے پاس رہتے تھے۔ لیکن وہ کسان پر کوئی ناجائز دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے جسے ادائے مالگزاری کے لیے غالباً ہمیشہ ان کے بالادست عہدہ دار سے سابقہ پڑتا تھا۔

اس بندوبست کے اصول وضوابط کو سب سے اول خواجہ عبدالمجید آصف خاں نے مرتب کیا تھا لیکن بعد میں **مظفر خاں** اور اس کے نائب ٹوڈرمل کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی اور چونکہ آخر میں راجہ ٹوڈرمل کئی سال تک وزیر مال رہا اس لیے لوگوں نے اس بندوبست کو اسی کے نام سے منسوب کردیا۔

باب نہم

عہد جہانگیر

خسرو کی بغاوت اور گرفتاری

جس وقت شہزادۂ سلیم نے محمد نورالدین جہانگیر کے لقب سے تخت ہندوستان پر جلوس کیا تو دریائے تاپتی کے تمام شمالی ممالک میں امن و آسودگی کا دور دورہ تھا بنگالے کے بعض گوشوں میں قدیم بغاوت کی دبی ہوئی چنگاریاں کبھی کبھی بھڑک اٹھتی تھیں۔ اور اسی طرح اودے پور کا رانا بھی ابھی تک مقابلے کئے جاتا تھا لیکن اس قسم کی مقامی شورشیں ملک کے امن و امان میں کوئی خلل نہ ڈال سکتی تھیں۔ البتہ جب شہزادۂ خسرو نے آگرے سے بھاگ کر پنجاب کی راہ لی تو جہانگیر کو اس کی بغاوت پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہوا اور اس نے فوراً شیخ فرید بخاری کو تعاقب میں روانہ کیا اور پھر خود بھی پوری فوج کے ساتھ لاہور کی جانب کوچ کیا۔ شیخ فرید اصل میں خاندان سادات سے ہیں اور جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی ان کو اپنا میر بخشی یا وزیر جنگ مقرر کر دیا تھا۔

شہزادۂ خسرو جہانگیر کا بڑا بیٹا اور اکبر کی زندگی میں تخت کا مدعی تھا۔ دربار کے بعض بڑے بڑے امیر بھی اس کے حامی ہو گئے تھے لیکن جب خود اکبر نے

اپنی آیندہ وراثت کا معاملہ صاف کر دیا تو خسرو کی کچھ پیش نہ گئی اور اس کے مددگار ٹوٹ کر جہانگیر کے ساتھی ہو گئے بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے عام اہل ملک سے اپنی رفاقت کی امید باقی تھی اور اس بات کا ٹھیک اندازہ نہ کر سکا تھا کہ اب تخت نشین بادشاہ کی قوت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی ہے اور اکبر کے عمدہ انتظام نے اس بات کی بہت کم گنجائش چھوڑی ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی بغاوت بہ آسانی سرسبز ہو جائے چنانچہ لاہور کے قریب اسے شکست ہوئی تو وہ چند ہزار آدمی بھی منتشر ہو گئے جنھیں اس نے غارت گری کے لالچ اور بڑے بڑے انعاموں کی امید دلا کر اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا تھا۔ اور یہ واقعہ خاص طور پر لکھنے کے لائق ہے کہ جب شکست خوردہ خسرو کابل کی جانب فرار ہوا تو دریائے چناب پر ملاحوں نے اسے کشتی نہ دی پھر اس کے ساتھیوں نے ایک کشتی پکڑ لی اور زبردستی ملاحوں کو لے چلے تو انھوں نے دریا کے بیچ میں کشتی ٹاپو پر چڑھا دی اور خود کود کر بھاگ گئے۔ چنانچہ اسی مقام پر خسرو گرفتار ہوا۔ اور اپنے رفیقوں سمیت لاہور بھیجا گیا۔ کابل کے سفر میں اس کی زنجیریں تڑوا دی گئی تھیں۔ شاید اور زیادہ آزادی مل جاتی لیکن اسی اثنا میں خسرو کو قید سے چھڑانے اور جہانگیر کو قتل کرنے کی ایک تازہ سازش کا حال کھلا۔ سازشی گرفتار ہو کے مارے گئے اور خسرو کی سختی سے نگرانی کی جانے لگی۔

دکن کی لڑائیاں

اگرچہ اکبر کے زمانے میں شہر احمد نگر فتح ہو گیا تھا لیکن یہاں کی نظام شاہی حکومت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور اس کے بادشاہوں یا امیروں سے برابر چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ جہانگیر نے تخت نشیں ہوتے ہی ادھر خان خاناں کو مہم دے کے روانہ کیا مگر وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکا اور جب نظام شاہی حکومت کی باگ ملک عنبر حبشی کے ہاتھ میں آئی تو معاملات کی صورت بالکل بدل گئی۔ ملک عنبر نہایت عقلمند جفاکش اور منتظم سپہ سالار تھا اور شہر کھڑکی (اورنگ آباد) کو اپنا پائے تخت بنا کے اس نے مغلوں پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ اس طریق جنگ کے لیے دکن کے گریزپا سپاہی خاص طور پر موزوں تھے۔ دوسرے میدان میں مغلوں کی آراستہ اور طاقتور فوج سے جم کر مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ بس

ملک عنبر نے وہ قزاقانہ جنگ شروع کی جو آخر میں مرہٹہ سپاہیوں کا خاص فن بن گئی تھی۔

جب ایسا مستعد سردار ملا تو سپاہیوں کے دل میں بھی تازہ جوش پیدا ہوگیا اور اُنھوں نے مغلوں کو اس قدر پریشان کیا کہ خان خاناں ہٹ کر برہان پور میں پناہ گزیں ہوا اور احمد نگر پر دوبارہ نظام شاہیوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ (۱۶۰۹ئ) جہانگیر کو یہ اطلاع پہنچی تو اس نے بڑے پیمانے پر فتح دکن کا سامان کیا اور اس مہم کی سرداری پر شہزادۂ پرویز اور خانجہاں مامور ہوئے، برار سے راجہ مان سنگھ کمک لے کر چلا اور گجرات سے عبداللہ خاں ازبک نے پیش قدمی کی لیکن یہ سردار اس قدر تیز بڑھا تھا کہ دوسری فوجوں سے ملنے کی نوبت ہی نہ آئی اور ملک عنبر نے آگے بڑھ کے اپنی قزاقانہ جنگ سے اسے عاجز کردیا۔ اور اسے بہت نقصان اٹھاکے گجرات کی جانب پسپا ہونا پڑا۔ اس حالت میں شہزادۂ پرویز نے بھی برہان پور سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی اور کئی سال تک ملک عنبر کو فرصت مل گئی کہ اپنے وہ ملکی اور مالی آئین جاری کرے جن کی بدولت اسے دکن کے سب سے رعایا پرور مدبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

شہزادہ خرّم کی جنگی مہمات

ادھر اودے پور کے رانا سے بھی جنگ کا سلسلہ منقطع نہ ہوا تھا اس مہم پر اول پرویز اور پھر مہابت خاں روانہ کئے گئے تھے۔ اور گو مہابت خاں نے میدان میں رانا کو شکست دی لیکن وہ حسب معمول بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپا اور بادشاہی فوجیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ آخر ۱۶۱۳ئ میں شہزادہ خرّم کو بیس ہزار سپاہ دے کر اس طرف بھیجا گیا اور جب رانا حسب معمول پہاڑوں میں جاکر چھپا تو شہزادہ خرّم نے بڑھ کر اودے پور میں چھاؤنی ڈال دی اور پہاڑ کے ایک ایک راستے کی ناکہ بندی کردی کہ رانا کے ساتھی رسد نہ لیجا سکیں۔ ساتھ ہی فوج کے چند دستے اس کام کے لیے خاص کردیے کہ جہاں رانا کی کوئی جمعیت ملے اس پر حملہ کریں۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ بہت دن تک جاری رہا۔ رانا کے راجپوت سپاہیوں نے بہادری دکھانے میں کوتاہی نہ کی اور بار بار شب خوں مارے لیکن شہزادہ خرّم کی

مستعدی اور استقلال نے انھیں رفتہ رفتہ اتنا کمزور کر دیا کہ رانائے اودے پور کو اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا اور صلح کے پیام کے بعد خود شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو گیا (سنہ ۱۶۱۴ء)۔

اس نمایاں کامیابی پر شہزادہ خرّم اور جہانگیر کو نہایت خوشی ہوئی کیونکہ اودے پور کے مغرور رانا کا سر پشتہا پشت سے کسی کے سامنے نہ جھکا تھا اور چتوڑ چھن جانے کے بعد بھی وہاں کے راجہ اودے پور میں خود سری کا دم بھرتے تھے؛ مگر فاتح نے مغلوب رانا سے سلوک بھی ایسا ہی کیا جو ایک بہادر دشمن کے ساتھ کرنا شایاں تھا اور جب اس کا بڑا بیٹا رانا کرن جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو وہاں بھی اس کی بڑی عزت و توقیر ہوئی اور کچھ دن بعد وہ منصب پنج ہزاری سے مشرف ہوا۔

سال آیندہ شہزادہ خرّم کو "شاہ" کا خطاب عنایت ہوا۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے بیٹے کی کمر سے تلوار باندھی اور بہت کچھ ساز و سامان کے ساتھ دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ پھر کچھ روز بعد خود بھی مالوے کی طرف کوچ کیا تاکہ مقام جنگ سے قریب رہے۔ راستے میں اودے پور کے رانا نے حاضر ہو کر اطاعت گزاری کی تصدیق کی اور مورد عنایت ہوا۔ خود "شاہ خرم" کو مہم سر کرنے میں زیادہ زحمت اٹھانی نہ پڑی۔ کیونکہ وہی نفاق جس نے نظام شاہیوں سے احمد نگر چھڑایا اب اورنگ آباد میں ان کی بیخ کنی کر رہا تھا۔ شہزادے کے دکن پہنچنے سے پہلے چند دکنی سردار خان خاناں سے جا ملے تھے اور اسی مغل سپہ سالار کے بیٹے شہنواز خاں نے ملک عنبر کو سخت شکست دی تھی۔ لہٰذا شہزادۂ خرّم کی فوج دکن میں داخل ہوئی تو کوئی مزاحمت کرنے والا سامنے نہ آیا اور ملک عنبر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ احمد نگر اور دیگر مقامات مغلوں کو دیکر صلح کرے سنہ ۱۶۱۶ء[1]۔

---

[1] اسی سال پنجاب میں وبائے طاعون کا ظہور ہوا اور ہزاروں آدمی ضائع ہوئے۔ یہ وہی مرض تھا جو آج کل ہندوستان خاص کر احاطۂ بمبئی میں ہر سال زور کرتا رہتا ہے۔ مگر جہاں تک تحریری شہادت سے معلوم ہوتا ہے پہلی مرتبہ وہ اسی سال (یعنی سنہ ۱۰۲۵ھ مطابق سنہ ۱۶۱۶ء) ہندوستان میں ظاہر ہوا۔ ۱۲

لیکن یہ مصالحت تین چار سال سے زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوئی۔ جہاں پناہ کشمیر کی سیر و سیاحت میں مصروف تھے کہ ملک عنبر کے دوبارہ برسرِ جنگ ہونے کی اطلاع ملی اور چند ہی روز میں معلوم ہوا کہ اس مرتبہ دکنیوں نے دریائے نربدا کے پار تک یورش کی اور مالوے کے جنوبی علاقے کو تاراج کر گئے۔ غرض پھر شہزادۂ خرّم مہم لے جانے پر مامور ہوا اور اس نے دکنی فوج کو پہلے نربدا کے پار دھکیل دیا اور پھر اورنگ آباد پر پیش قدمی کی۔ ملک عنبر نے وہی قزاقانہ جنگ شروع کر دی تھی لیکن ہندوستان کا آیندہ بادشاہ توقع سے بڑھ کر ہوشیار نکلا اور اس کی جنگی تدبیروں نے خود چھاپہ مارنے والوں کو تھکا دیا۔ حتیٰ کہ ملک عنبر نے دوبارہ عاجزانہ صلح کی درخواست کی اور پہلے سے زیادہ ملک اور سالانہ خراج دینے کا پختہ عہد کیا؛ ان مسلسل خونریزیوں نے دکن کے شاداب ملک کو تباہ و تاراج کر ڈالا تھا اور سامان رسد فراہم کرنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی نظر بریں شہزادۂ خرّم نے اطاعت کا عہد لے کر صلح کر لی اور فتح کا تہنیت نامہ باپ کی خدمت میں روانہ کیا؛ (۱۶۲۱ء)۔

شہزادہ خرم سے نورجہاں بیگم کی مخالفت

ان فتوحات نے، جن کی پائے تخت میں بڑی دھوم دھام سے خوشیاں منائی گئیں، بظاہر شہزادۂ خرّم کی آیندہ تخت نشینی کا مسئلہ صاف کر دیا تھا کیونکہ اس کے بڑے بھائی خسرو نے انھی دنوں نظر بندی میں وفات پائی اور ایک روایت یہ ہے کہ اسے زہر دیدیا گیا۔ پرویز میں یہ لیاقت نہ تھی کہ خرّم کے مقابلے میں ترجیح دی جائے، اور سب سے چھوٹا بھائی شہریار بالکل نوجوان اور ناتجربہ کار تھا لیکن اسی سال نورجہاں بیگم کی بیٹی جو پہلے شوہر شیر افگن خاں سے تھی۔ اس شہزادے کو بیاہی گئی اور یہی وہ واقعہ ہے جس نے معاملات کا رنگ بدل دیا کیونکہ اب نورجہاں بیگم اپنے داماد کی آیندہ بادشاہی کے لیے کوشاں تھی۔ اتفاق سے اس کے باپ اعتماد الدولہ نے بھی انھی دنوں وفات پائی اور کاروبار حکومت میں بیگم کا پہلے سے بھی زیادہ دخل بڑھ گیا۔

نورجہاں بیگم

اس نامور خاتون کے واقعات زندگی اتنے دلچسپ ہیں کہ ہندوستان میں کہانیوں کی طرح مائیں بچوں کو سناتی ہیں۔ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کا باپ مرزا غیاث بیگ اپنا ایرانی وطن چھوڑ کر اہل و عیال سمیت ہندوستان کے راستے میں تھا اور فلاکت نے یہ نوبت پہنچائی تھی کہ اس نے بیٹی کو قافلے میں ڈال دیا کہ شاید کوئی ترس کھا کے اسے پال لے۔ تاریخ میں اس بیکس بچی کے طفیل قافلہ سالار ملک مسعود سوداگر کا نام باقی رہنا لکھا تھا کہ یہ خدمت اس نے انجام دی اور جب انّا کی تلاش ہوئی تو قافلے میں صرف ایک ہی عورت نکلی جو دودھ پلا سکتی تھی۔ یعنی خود بچی کی ماں جس کی وساطت سے غیاث بیگ کا سوداگر سے تعارف ہوگیا۔ ملک مسعود اکبر کے حضور میں اکثر حاضر ہوتا تھا اور جب اس مرتبہ بادشاہ نے شکایت کی کہ کوئی تحفہ ہمارے لایق نہ لائے تو اس نے ادب سے عرض کی کہ اور تو کوئی چیز حضور کے لائق نہیں لیکن اس مرتبہ سفر میں یہ خادم دو جواہر ایسے بے بہا لایا ہے کہ اگر سرکار کی توجہ شامل حال ہو تو ان کا ثانی کہیں نہ ملے۔ پھر مرزا غیاث اور اس کے بیٹے ابوالحسن کو حضور میں پیش کیا اور وہ بادشاہ کی سلک ملازمت میں منسلک ہو گئے۔

چند سال کے بعد مرزا غیاث کی بیٹی (مہرالنساء) پر شہزادہ سلیم کا مائل ہونا شیر افگن خاں سے اس کی شادی اور جہانگیر کے عہد میں شیر افگن خاں کا مارا جانا اور اسکی بیوہ کا ایک مدت تک انکار کے بعد جہانگیر سے شادی کرنا، مشہور واقعات ہیں جن کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اس جگہ یہ وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نورجہاں بیگم نے جہانگیر کے دل پر قبضہ پالیا تو اس کی وجہ محض اس کی خوبصورتی اور بادشاہ کی شیفتگی نہ تھی۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ خانہ داری کے سلیقے کے ساتھ اسے ان علوم فنون سے بھی خوب واقفیت تھی جو ان دنوں امیرزادوں کی تعلیم میں داخل تھے۔ اور اگر ان خوبیوں نے بادشاہ کو اس قدر گرویدہ بنالیا کہ بغیر اس کے مشورے کے کوئی کام نہ کرتا تھا تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ حتیٰ کہ اکثر شاہی کاغذات پر اسی کے دستخط ہوتے تھے اور سکے پر بھی یہ شعر کندہ کر دیا گیا تھا:۔

بہ حکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور   بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

ملکی معاملات میں اوّل اوّل بیگم شہزادہ خرم کی طرف دار تھی کیونکہ اس کے بھائی آصف خاں کی بیٹی (جس نے بعد میں ممتاز محل کے نام سے اپنے بے نظیر مقبرے کی بدولت شہرت جاوداں پائی) اسی شہزادے سے منسوب تھی۔ لیکن جب سلطنت میں نورجہاں کا دخل بڑھا اور حکمرانی کا چسکا پڑا تو قدرتی بات تھی کہ وہ ایسے شخص کی تخت نشینی کی خواہاں ہو جو جہانگیر کے بعد بھی اس کے اشاروں پر کام کرے اور خرم جیسے فہیم و خود دار شہزادے سے یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ وہ بادشاہ بن کر امور سلطنت میں اپنی سوتیلی ماں کی مداخلت گوارا کرے گا پس نورجہان بیگم نے آئندہ بادشاہی کا ایک اور امیدوار منتخب کیا اور اسی سے (یعنی شہزادۂ شہریار سے) اپنی بیٹی کی شادی کر کے در پردہ شہزادۂ خرم کی مخالفت شروع کی ؂

شہزادہ خرم کی سرکشی جہانگیر کو اپنے لائق بیٹے سے بدظن کرا دینے میں بھی کچھ دیر نہ لگی اتفاقاً اسی سال ایرانیوں نے قندھار چھین لیا تھا اور اس کے واپس لینے کے لیے مہم بھیجنے کی تیاری تھی۔ بادشاہ کو خیال آیا کہ دکن کے فاتح سے بہتر یہ خدمت کوئی انجام نہ دے سکے گا۔ امیروں نے بھی اس رائے کی تائید کی اور "شاہجہاں" کے نام قندھار جانے کے احکام بھیج دیے گیے لیکن حکم کی تعمیل میں مالوے تک چلے آنے کے بعد شاہجہاں کو شبہ ہو گیا کہ اس نئی مہم کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اسے ان علاقوں سے دور بھیج دیا جائے جن میں اس کا اثر قائم ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ عذر کیے اور بعض شرائط پیش کیں اور یہی موقع دیکھ کر بیگم اور اس کے ہوا خواہوں نے جہانگیر کو اس سے ناراض کر دیا۔ قندھار کی مہم شہریار کے تفویض کرا دی گئی اور جب شاہجہاں نے کئی خط لکھے اور صفائی کی غرض سے خود حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو جواب میں اسے حکم دیا گیا کہ دکن کو واپس جائے۔ اسی کے ساتھ شمالی ہندوستان میں اس کی جاگیریں شہریار کے نام پر منتقل کر دی گئیں اور کہہ دیا گیا کہ ان کی بجائے وہ گجرات و دکن میں کچھ علاقے لے لے۔ شاہجہاں کو یہ بدسلوکی نہایت ناگوار گزری اس نے مانڈو سے آگرے کی جانب کوچ کیا اور گو ابھی تک باپ کی اطاعت کا دم بھرتا تھا

لیکن احکام شاہی کے خلاف فوج سمیت اس کا پائے تخت کو آنا علانیہ سرکشی کی علامت تھی۔

نورجہاں بیگم ان باتوں کو پہلے ہی سوچ چکی تھی، اس نے کابل سے سپہ سالار مہابت خاں کو خاص شاہجہاں کے مقابلے کے لیے طلب کر لیا تھا اور جب شاہجہان باپ کی آمد سنکر دلی کے قریب سے دکن کو واپس ہو گیا تو یہی سردار شہزادہ پرویز کے ساتھ اس کے تعاقب پر مامور ہوا (۱۶۲۲ء) لیکن بات کو اتنا بڑھا کر خود شاہجہاں کا پیچھے ہٹ جانا ایسی غلطی تھی جس کی پھر کوئی تلافی نہ ہو سکی اور اس کی حیثیت ایک باغی کی سی رہ گئی جسے مدد دینے سے لوگ پہلو تہی کرنے لگے۔ تین سال تک وہ دکن، بنگال اور مالوے میں سرگرداں پھرا اور جہاں بادشاہی فوج سے مقابلے کی نوبت آئی وہاں اسی کو شکست ملی۔ حتیٰ کہ عاجز آ کر اس نے باپ سے اپنے قصور کی معافی چاہی اور بہار و مالوے کے دو مستحکم قلعے جو ابھی تک اس کے قبضے میں تھے جہانگیر کے حوالے کر دیئے۔ اور اپنے دو بیٹے بطور یرغمال حضور میں بھجوا دیئے کہ اس کی جانب سے آیندہ اطاعت گزاری کی ضمانت ہوں (۱۶۲۵ء)

مہابت خاں کی بغاوت۔

لیکن یہ قضیہ ابھی پوری طرح فیصل نہ ہوا تھا کہ ایک تازہ فساد پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ جب مہابت خاں بنگال و دکن میں شاہجہاں پر غالب آیا تو رفتہ رفتہ امرائے سلطنت میں اس کا اقتدار سب سے زیادہ بڑھ گیا اور اس کی شہزادہ پرویز کے ساتھ موافقت کا حال سنکر نورجہان بیگم بھی بدگمان ہو گئی ادھر بنگالے میں اس نے لوگوں پر ظلم کیئے اور اس پر غبن کے الزام بھی قائم ہوئے اور حساب دینے کے لیے وہ حضور میں طلب کیا گیا! مہابت خاں تندخو اور سرکش سپاہی تھا۔ جب لیت و لعل سے کام نہ چلا تو پانچہزار منچلے راجپوت ساتھ لے کر بادشاہ کے لشکر میں حاضر ہو گیا کہ اگر اس پر کوئی آنچ آئے تو چند ایسے جانباز موجود رہیں جو اسکی ذات سے وابستہ اور حکم کے تابع تھے لشکر شاہی میں بھی اسے سلام کے لیے باریاب ہونے کی اجازت نہ ملی اور وہ سمجھ گیا کہ ذلت و خواری کے سوا اب کسی نیک سلوک کی توقع رکھنی عبث ہے۔

مہابت خاں جس وقت آیا ہے اس وقت لشکر شاہی کابل کے راستے میں

دریائے جہلم کے کنارے مقیم تھے اور دریا پر پل باندھ کر عبور کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں پھر چند روز میں پل تیار ہو گیا تو پہلے بھیر اور فوج کے سپاہی اور امرا پار ہو گئے تاکہ بادشاہ کے آنے سے پہلے دوسری طرف قیام کا انتظام کرلیں اور صرف سرہنگان شاہی یا سواران خاصہ کی قلیل جماعت حرم سرا کی حفاظت کے لیے بادشاہ کے پاس رہ گئی؛ یہ موقع پاکر مہابت خاں نے عجیب جسارت کی کہ دفعتہً دو ہزار سوار بھیج کر پل کا راستہ روک لیا کہ دوسرے کنارے سے ادھر کوئی نہ آنے پائے اور بادشاہی فوج آنا چاہے تو پل کو آگ لگا دی جائے۔ پھر باقی جمعیت سے اس نے شاہی خیمے کا محاصرہ کرلیا۔ چند آدمی جو حفاظت کے واسطے اس طرف رہ گئے تھے مہابت خاں کے راجپوتوں کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے اور کسی نے انھیں ٹوکا تو وہ مارا گیا دوسرے یہ حرکت ایسی تھی کہ پہلے سے کسی کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ غرض بلادقت بادشاہ کو حراست میں لے لیا گیا اور کئی مہینے تک وہ مہابت خاں کی قید میں رہا اور گو رسمی آداب میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور مہابت خاں اسی ادب قاعدے کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں دست بستہ حاضر رہتا تھا لیکن جہاں پناہ اس کی منشاء کے بغیر کوئی کام نہ کرسکتے تھے اور چند راجپوت سپاہی تلوار لیے ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے (۱۶۲۶ء)۔

جہانگیر کے اس طرح قید ہو جانے سے امرائے شاہی بے بس ہو گئے نورجہاں بیگم کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی لیکن واضح رہے کہ ایسی انوکھی حراست کا اخیر تک قائم رہنا غیر ممکن تھا۔ مہابت خاں جوش میں آکے یہ حرکت تو کر گزرا مگر اب حیران تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بادشاہ کو گزند پہنچانا یا قتل کرنا خود اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا اور وہ حقیقت میں ایسا کرنا بھی نہ چاہتا تھا ادھر چند ہی روز کے تجربے نے بتادیا کہ اس طرح حراست میں رکھنا بھی خود قید ہو جانے سے بدتر ہے کیونکہ ہر وقت بادشاہ کے قابو سے نکل جانے کا خطرہ رہتا تھا اور اس کی حفاظت قید کرنے والوں کے واسطے عذاب جان ہو گئی تھی۔ بہرحال اسی حالت میں کابل کا سفر جاری رہا اور وہیں کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ بادشاہی سواروں کی جو احدی کہلاتے تھے کسی معمولی بات پر راجپوتوں سے تلوار چل گئی۔ احدیوں کی تعداد کم تھی لیکن اور لوگ مدد کو پہنچ گئے، راجپوتوں کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور اسی ہنگامے میں مہابت خاں کے

پہرہ والوں کو مار کر ہوا خواہوں نے بادشاہ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ مہابت خاں اور اس کے باقی ماندہ سپاہی بھاگ کر پہاڑوں میں چھپے اور آخر کار جہانگیر کو اس قید سے نجات مل گئی (۱۶۲۶ء)۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مہابت خاں کی خطا معاف کر کے اسے پھر شاہجہاں کے تعاقب پر مامور کیا گیا کیونکہ نور جہاں بیگم اپنے اصلی حریف کو ابھی تک نہ بھولی تھی اور مہابت خاں کو اس نے محض اسی شرط پر معافی دلوائی تھی کہ وہ شاہجہاں کو گرفتار کر لائے جو ان دنوں بے سروسامانی کی حالت میں ایران کا عازم تھا۔ اسی ارادے سے وہ سندھ تک پہنچ گیا تھا کہ راستے میں علیل ہوا اور ادھر یہ اطلاع ملی کہ برہان پور میں شہزادہ پرویز نے انتقال کیا دوسرے خود مہابت خاں کی نور جہاں بیگم سے دوبارہ ان بن ہو گئی اور تعاقب کرنے کی بجائے اب وہ شاہجہاں کی رفاقت پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ شاہجہاں نے گجرات کے راستے دکن کو مراجعت کی اور وہیں مہابت خاں اس سے آملا۔ ادھر دکن میں ملک عنبر حبشی نے وفات پائی اور یاقوت حبشی نے اس کا جانشین بن کر پھر مغلوں سے لڑائی چھیڑ دی تھی اس مہم کے لیے جہانگیر نے دوبارہ تازہ دم فوج بھیجی مگر خود اپنی "جنت" یعنی کشمیر کو روانہ ہو گیا اور وہیں اس پر مرض (ضیق النفس) کا سخت دورہ پڑا۔ اسے کشمیر سے پھر لاہور لاتے تھے لیکن راستے میں (منزل راجور پر) حالت خراب ہو گئی اور ماہ صفر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں اس نے منزل آخرت کی راہ لی۔

عہد جہانگیری پر ایک نظر۔

جہانگیر کی نسبت بعض مصنفوں نے بے انصافی سے کام لیا ہے اور اس کا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو ایک ایسی برائیاں تھیں جو آدمی کو بہت جلد بدنام کر دیتی ہیں۔ جوانی سے وہ شراب و افیون کا عادی ہو گیا تھا اور مرتے دم تک شراب خانہ خراب کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوا یہی وہ بلائیں تھیں جنھوں نے اس کی صحت کا ناس کیا اور اخلاق پر برا اثر ڈالا۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اس کی چند حرکتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بعض اوقات اپنے جذبات پر قابو نہ رہتا تھا۔ بایں ہمہ یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ جہانگیر فرائض حکمرانی سے بے خبر ہر وقت شراب کے نشہ میں مست رہتا تھا۔ اس نے سولہ سال تک بڑے عیش اور اطمینان سے حکومت کی اور اس زمانے میں ہندوستان کی صنعت و حرفت تجارت و زراعت کو بہت کچھ

ترقی ہوئی اور امن و آسودگی کا دور دورہ رہا اور اس کی وجہ محض یہ نہ تھی کہ اس کا باپ نظم و نسق کے عمدہ آئین قایم کر گیا تھا کیونکہ گو ایسے آئین انتظام میں سہولت پیدا کر دیتے ہیں لیکن انتظام کرنے والے کے بغیر خالی آئین انتظام اور ضابطوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ خاص کر جہاں معاملات کا سارا دارو مدار ایک مطلق العنان بادشاہ کی ذات پر ہو وہاں اس کی غفلت اور نالائقی چند ہی مہینے میں ابتری ڈال دیتی ہے۔ دوسرے اس بات کو سب مورخ لکھتے ہیں کہ تخت نشین ہو کر جہانگیر نے دن کے وقت شراب پینی ترک کر دی تھی اور بکمال متانت و مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ زیردستوں کی فریاد رسی اور دادخواہی کا اسے خاص طور پر خیال تھا۔ اور عدل گستری کے معاملے میں نور جہاں بیگم کو بھی دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ قلعہ اکبر آباد کے بڑے برج سے دریا کے کنارے تک ایک سونے کی زنجیر اسی غرض سے لٹکتی رہتی تھی اور اس میں گھنٹے لگے ہوئے تھے کہ اگر کوئی فریادی اندر نہ آسکے تو باہر ہی سے دن یا رات کسی وقت بھی زنجیر ہلا کر بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اور اس عہد کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض رسمی اور دکھاوے کی باتیں نہ تھیں بلکہ واقعی جب کبھی کسی امیر یا اعلیٰ عہدہ دار نے ظلم و جبر سے کام لیا تو وہ اپنی سزا کو پہنچے بغیر نہ رہا۔

جہانگیر کو سپہگری کے جوہر دکھانے کے موقعے نہیں ملے۔ غالباً وہ اس میدان کا مرد نہ تھا۔ لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے عہد میں اودے پور، دکن یا شاہجہاں کے خلاف جو مہمات پیش آئیں ان میں کامیابی نے ہمیشہ بادشاہ کا ساتھ دیا۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جہانگیر کی فرمانروائی محض حسن نصیب کے طفیل نہ تھی بلکہ تدبیر و سعی کی قابلیت بھی اسے عطا ہوئی تھی اور ضرورت کے وقت وہ جنگی مہمات کا پورا انتظام و اہتمام کر سکتا تھا۔

ذہانت و طباعی میں وہ اپنے اقبال مند باپ سے کم نہیں اور علمی قابلیت کے لحاظ سے نمایاں فوقیت رکھتا ہے۔ ترکی اور فارسی علم ادب سے خوب واقف تھا اور کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ لیکن اس کی ادبی قابلیت کی بڑی یادگار "توزک جہانگیری" ہے جس میں اس نے اپنے واقعاتِ زندگی خود جمع کئے ہیں بعض خامیوں کے باوجود یہ کتاب اہل تاریخ کے لیے بڑی کام کی چیز ہے اور اسے پڑھ کر بعض اوقات جہانگیر کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے کہ کبھی وہ اپنے امیروں میں بیٹھا فرامین و احکام لکھوانے میں

معروف ہے۔ کبھی دادخواہوں کی عرضیاں اس کے سامنے پیش ہو رہی ہیں اور کبھی بزم عیش وطرب کا رنگ جما ہوا ہے۔

مگر اس عہد کی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بادشاہ کی مطلق العنانی میں اور ترقی ہوئی۔ تاکیدی احکام جاری کئے گئے کہ کوئی امیر یا صوبہ دار آیندہ بادشاہ کی طرح جھروکے میں نہ بیٹھے، اپنے ماتحتوں کو خطاب نہ دے۔ سرنامے پر اپنی مہر ثبت نہ کرے قربانی یا بعض اور اسلامی شعائر کے متعلق اکبر نے جو امتناعی قانون بنائے تھے انھیں جہانگیر نے تخت نشیں ہوتے ہی منسوخ کر دیا تھا۔ بایں ہمہ زمیں بوسی کا طریقہ اسی طرح جاری رہا۔ بلکہ بادشاہ نے اشرفی پر اپنی تصویر کندہ کرا کے بعض درباریوں کو عطا کی کہ سر یا سینے پر لگائیں جو گویا ان کے مقرب درگاہ ہونے کا امتیازی نشان تھا۔

اس عہد کے بعض حالات مغربی سیاحوں کی تحریر کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ کیونکہ سولھویں اور سترھویں صدی میں اہل یورپ کی ہندوستان میں آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ پرتگیز، ولندیز اور انگریز قوم کے سوداگر سواحل ہند پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قایم کرتے جاتے تھے۔ جیمس اول بادشاہ انگلستان کا سفیر سر طامس رو بھی جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا (۱۶۱۵ء) اور قریب قریب تین سال تک لشکر شاہی کے ہمراہ رہا۔ مشرقی درباروں میں سفیروں کا یوں بھی اعزاز و اکرام کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طامس رو نے اپنی سفارت کے متعلق جو تحریریں لکھی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بادشاہ کی خاص عنایت تھی اور وہ اسے اپنی خلوت کے جلسوں میں بھی شرکت کا شرف دیتے تھے۔ لیکن طامس رو کو شکایت ہے کہ اس کے آنے کی جو اصلی غرض تھی اس پر عرصہ تک کوئی توجہ نہیں ہوئی اور بہت دن کی درباداری کے بعد یہ شاہی فرمان حاصل ہو سکا کہ انگریزی مال پر آیندہ محصول برآمد نہ لیا جائے۔ قرینہ کہتا ہے کہ اس تاخیر اور بے التفاتی کا سبب یہ تھا کہ مغل بادشاہوں کے دربار میں تجارتی سفارتوں کو کوئی خاص وقعت نہ دی جاتی تھی اور یہ تو اس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ دو صدی کے اندر تو وارد سوداگر کشور ہند کے مالک بن جائیں گے۔

طامس رو یا مغربی سیاحوں نے اس زمانے کے جو حالات لکھے ہیں انھیں بہت غور و احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اگرچہ ان میں کام کی باتیں نکل آتی ہیں لیکن

یہ لکھنے والے عام طور پر ہندوستان کی زبان اور معاشرت سے بیگانہ تھے ان کے لیے روایات کی تحقیق اور تصدیق نہایت دشوار امر تھا اور اتنی دردسری کرنے کی انھیں کچھ ضرورت بھی نہ معلوم ہوتی تھی اس لیے کہ اپنی تحریر کی تکذیب و تنقید کا انھیں اندیشہ نہ تھا اور وہ بالعموم اس قومی تعصب سے پاک بھی نہ تھے جو یورپ والوں کو قدیم سے ایشیائیوں کے ساتھ چلا آتا ہے۔

ٹ دربار کی زبان فارسی تھی مگر عہد جہانگیر میں عام طور پر بول چال ہندوستانی یا اردو زبان میں ہونے لگی تھی۔ الفنسٹن (بحوالۂ ہاکنس صفحہ ۵۴۸)

باب دہم

دورِ شاہجہانی

شاہجہاں کی تخت نشینی

شہزادہ خرم کو ایک تیز پا ہرکارے نے دکن میں باپ کے انتقال کی خبر پہنچائی اور وہ احمد آباد گجرات کے راستے بسرعت آگرے روانہ ہوا۔ ادھر پنجاب کے صوبہ دار آصف خاں نے نور جہاں بیگم کو نظر بند کرلیا اور شہزادہ شہریار کو لاہور کے قریب شکست دی اور وہ اور دانیال کے بیٹے گرفتار ہو کر قتل کرا دیے گئے کہ سلطنت کے اصلی وارث کو کسی قسم کا خرخشہ نہ رہے ہیں اثنا میں شہزادہ خرم اکبر آباد آ پہنچا اور محمد شہاب الدین شاہجہاں کے نام سے تخت نشین ہوگیا (جمادی الآخر ۱۰۳۷ء مطابق ۱۶۲۸ء)

اس اقبال مند بادشاہ نے اپنی عمارات اور درباری تزک وشان کی بدولت جو ناموری پائی وہ دنیا کے بہت کم بادشاہوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس عہد کے صرف اہم واقعات اور نئی فتوحات کا ترتیب زمانی کے ساتھ ذکر کر دیا جائے۔

خان جہاں لودھی کی بغاوت

اب بہت دن سے زبدانڈی کشور ہند کی جنوبی سرحد نہ رہی تھی مغل سواروں کے گھوڑے گوداوری کا پانی پیتے تھے۔ برار پر ان کا قبضہ تھا۔ احمد نگر میں ان کی چھاؤنی تھی نظام شاہیوں کا باقی ماندہ علاقہ تین طرف سے ان میں گھرا ہوا تھا اور ملک عنبر کے بعد اس چھوٹے سے ٹکڑے کی بھی خیر نظر نہ آتی تھی۔ جہانگیر نے اپنی وفات سے کچھ پہلے اس مہم پر خان جہاں لودھی

کو مامور کیا تھا لیکن اس نے احمد نگر کا تمام مغربی علاقہ جو صوبۂ بالاگھاٹ کہلاتا تھا نظام شاہی حکومت کے حوالے کر کے ان سے صلح کر لی تھی اور شاہجہاں نے آگرے کی جانب کوچ کیا تو اس وقت بھی نئے بادشاہ کی رفاقت سے انحراف کیا بلکہ مالوے کے علاقے کو تاراج کر دیا تھا۔ مگر جس وقت شاہجہاں کی بادشاہی میں کوئی شبہ نہ رہا اور خانجہاں کے بعض سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ کر بادشاہی ملازمت اختیار کر لی تو اس نے بھی اپنے قصور کی معافی مانگی اور شاہجہاں کا وفادار خادم بن گیا۔ بادشاہ نے اس کی خطا معاف کر دی اور اسے دکن کی بجائے مالوے کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاں بندیل کھنڈ کی ایک شورش میں اس نے بادشاہ کی جانب سے لڑ کر سرخروئی حاصل کی اور پائے تخت میں طلب کیا گیا۔ دربار میں بھی جہاں پناہ اس پر بہت نوازش فرماتے تھے لیکن خان جہاں کے دل میں چور تھا اور جس قدر اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی گئی اسی قدر وہ اور خوف زدہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک رات اپنے دو ہزار خاص جاں نثار ساتھ لے کے آگرے سے نکل کھڑا ہوا اور جنوب کی راہ اختیار کی چنبل کے کنارے پر اسے بادشاہی سرداروں نے جا لیا تھا مگر لڑائی میں شکست اور زخم کھانے کے باوجود وہ ندی کو عبور کر گیا اور گونڈوانے کے دشوار گزار جنگلوں میں پناہ لی جہاں اسے اپنے نظام شاہی دوستوں سے دستگیری کی امید تھی۔

خان جہاں اب علانیہ باغی تھا اور دکن کے بادشاہوں کو مغلوں کے خلاف اُبھار رہا تھا۔ چنانچہ مرتضیٰ نظام شاہ نے اس کا ساتھ دیا اور دکن کی جنگ پھر تازہ ہو گئی۔ نظر بریں خود شاہجہاں نے جنوب کا رُخ کیا اور برہان پور سے تین فوجیں احمد نگر کے علاقے پر بڑھائیں۔ مہم کا سردار خواجہ ابوالحسن کو بنایا گیا تھا اور گجرات کے صوبہ دار اعظم خاں کو حکم پہنچ گیا تھا کہ احمد نگر کے مغربی علاقوں میں گھس جائے۔ اس زبردست لشکر کے سامنے مرتضیٰ نظام شاہ کو میدان میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی اور خان جہاں لودھی نے پناہ کے لیے بیجاپور کا رُخ کیا اور جب وہاں بھی مدد نہ ملی تو وسط ہند کی طرف چلا کہ بندیل کھنڈ سے گزر کر کسی طرح کوہستان سلیمان اور ہندوکش کے افغانی قبایل میں پہنچ جائے جہاں ان دنوں سخت شورش برپا تھی۔ مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور آخر بندیل کھنڈ میں وہ کالنجر کے قریب لڑ کر مارا گیا (۱۶۳۰ء)

فارسی تاریخوں میں اس بغاوت کے تفصیلی حالات محفوظ ہیں اور آج بھی انہیں

پڑھ کر دل پر مغل بادشاہوں کی سطوت و قابلیت کا رعب بیٹھ جاتا ہے کہ اس زمانے میں جب نہ ریل تھی نہ تار ہندوستان کی وسیع مملکت پر ان کا ایسا تسلط تھا کہ ان کے مجرم کو کہیں پناہ نہ مل سکتی تھی اور خانجہاں جیسا دلیر و نامور باغی بھی ان سے بچ کے نہ بھاگ سکا حالانکہ وہ اس کے رفیق شیروں کی طرح لڑتے تھے اور بیسیوں شکستیں کھانے اور تعداد گھٹ جانے کے باوجود ہمت نہ ہارتے تھے۔

نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ

خانجہاں کی دستگیری کرنے والے بھی مواخذے سے نہ بچ سکے اعظم خاں نے مرتضیٰ نظام شاہ کو جابجا شکست دی اور اسی سال قحط ایسا پڑا کہ اس علاقے کے لاکھوں مویشی اور انسان خوراک نہ ملنے سے ہلاک ہو گئے اور جو بھاگ سکے وہ وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ اس پریشانی میں امید کی ایک جھلک یہ پیدا ہوئی تھی کہ **محمد عادل شاہ** نے مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اپنی ہمسایہ ریاست کی مدد کے واسطے فوج روانہ کی مگر یہاں ملک عنبر کے بیٹے فتح خاں نے اپنے محسن مرتضیٰ نظام شاہ کو قتل کر دیا اور خود مغلوں سے صلح کر لی پس بادشاہی فوجیں یہ علاقہ چھوڑ کر بیجاپور کی ریاست میں گھس گئیں اور **آصف خاں** نے خاص شہر بیجاپور کو گھیر لیا لیکن محاصرہ میں دیر ہوئی اور وبا اور قحط نے محاصرین کو سخت پریشان کیا اور آخر کار وہ محاصرہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

اسی زمانے میں شاہجہاں نے مراجعت کی اور دکن کا تمام انتظام خان خاناں **مہابت خاں** کے سپرد کر دیا کہ وہ فتح خاں کی سرکوبی کرے جو موقع ملتے ہی مغلوں سے ٹکرا اہل بیجاپور کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ ان دونوں دکن کی ریاستوں میں یہ عہد شکنی مدافعت کی معمولی تدبیر سمجھی جاتی تھی اور اس کی کئی مثالیں آیندہ بھی ہماری نظر سے گزریں گی لیکن یہ تدبیر اسی وقت تک کارگر ہوتی رہی جب تک کہ مغل بادشاہوں کا تسلط نربدا کے پار بخوبی قایم نہ ہوا یا ان کی توجہ دوسری طرف ہٹی رہی ورنہ برہان پور میں مستقر بن جانے کے بعد جب خاندیس و برار ان کے قبضہ میں آگئے تو صاف نظر آنے لگا کہ اب نظام شاہی و عادل شاہی کا خاتمہ قریب ہے اور ان میں سے کوئی ریاست بھی اتنی قوت نہیں رکھتی کہ اس سیلاب کو جو جمنا کے کناروں سے امنڈ رہا تھا گوداوری پر بڑھ کے روک لے غرض فتح خاں کی نہ جاں بازی چلی نہ دغابازی اور نظام شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

قلعۂ دولت آباد کی تسخیر اور فتح خاں کی اطاعت (سنہ ۱۶۳۱ء) نے احمد نگر کی رہی سہی

قوت کا خاتمہ کر دیا۔لیکن یہاں کے ایک مرہٹہ سردار ساہو جی بھونسلہ کی ریشہ دوانی جاری تھی اور بیجاپور کی مدد سے وہ رفتہ رفتہ اتنا طاقتور ہو گیا کہ احمد نگر کے کئی مغربی اضلاع اس کے تصرف میں آگئے اور خود شاہجہاں نے ایک مرتبہ پھر دکن کا رخ کیا کیونکہ خان خاناں مہابت خاں کا انتقال ہو گیا تھا اور شہزادہ شجاع اور اس کے ساتھ جو سردار دکن بھیجے گئے وہ ان مفسدوں کا کوئی قابل اطمینان تدارک نہ کر سکے تھے۔

۱۶۳۶ئ میں جہاں پناہ دولت آباد گئے اور اسی مقام کو جنگی مستقر بنایا گویا جس طرح مانڈو اکبر و جہانگیر کے عہد میں اور برہان پور جہانگیر و شاہجہاں کے عہد میں دکن کی مہمات کے جنگی مستقر رہے اسی طرح اب دولت آباد و اورنگ آباد شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں یہی خدمت انجام دیں گے اور سلطنت کی حدیں جنوب میں اور آگے بڑھتی رہیں گی۔

دولت آباد پہنچنے سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈے کے بادشاہوں کے پاس ایلچی روانہ کر دیے گئے تھے۔ محمد عادل شاہ سے تو یہ مطالبہ تھا کہ وہ ساہو اور دوسرے نظام شاہی سرداروں کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دے اور ان کی شورش میں کسی قسم کی مدد نہ دے اور نظام شاہی علاقے کے جن قلعوں پر اس کی فوج نے توپیں لگا رکھی ہیں وہ ہٹالی جائیں اور اس کے صلے میں شاہجہاں کی جانب سے ریاست احمد نگر کے بعض ساحلی اضلاع عنایت ہونے کی امید دلائی گئی تھی۔ اور گولکنڈے کے بادشاہ کو یہ ہدایت بھیجی گئی تھی کہ وہ حسب قرارداد پیشکش سالانہ کی مقررہ رقم ادا کرے۔ شاہ ایران کی بجائے خطبے میں بادشاہ ہندوستان کا نام داخل کرائے اور اس کے ملک میں خلفائے راشدینؓ کی شان میں جو بد زبانی اور تبرّی ہوتا تھا اسے بالکل روک دے۔ چنانچہ یہ سفارت کامیاب ہو گئی اور گولکنڈے سے سالانہ پیشکش بھیجا جانے لگا۔ اس کے برخلاف محمد عادل شاہ نے مذکورۂ بالا مطالبہ ماننے میں لیت و لعل کی اور اپنا شاداب ملک تاراج کرایا۔

یعنے بیجاپور کے خلاف دولت آباد سے تین فوجیں روانہ کی گئیں۔

(۱) مہابت خاں کے بیٹے خان زماں خاں کو بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ احمد نگر کی جانب بھیجا گیا کہ ساہو کی جاگیر اور وطن کو پامال کرتا ہوا دکن کے علاقے میں پہنچ جائے جنوبی ملک کی تسخیر پر شائستہ خاں والہ وردی خاں مامور ہوئے اور تیسری فوج خان دوراں خاں کی ماتحتی میں ناندیڑ و قندھار کے درمیان بڑھی کہ او دگیر فتح کرنے کے بعد ضرورت ہو تو بیجاپور کی

سرحد میں گھس جائے۔ اس لشکر کے مقابلے میں ساہوجی کی اتنی بساط نہ تھی کہ چند روز بھی مدافعت کرتا خود شاہ بیجاپور کو بہت جلد اپنے تمرد پر پشیمان ہونا پڑا کیونکہ احمد نگر کا علاقہ مفسدوں سے پاک کرنے کے بعد ہر طرف سے مغل فوجیں بیجاپور کی ریاست میں گھس گئیں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسے تباہ و تاراج کر ڈالا محمد عادل کو بیجاپور میں قلعہ بند ہونا پڑا اور حملے سے بچنے کے لیے خود پانی کے تالاب تڑوا کے اس نے دور تک کھیتی اُجاڑ دی کہ مغلیہ لشکر وہاں قیام نہ کر سکے مگر سپہ سالار خان دوراں کو قیام کی نہ ضرورت تھی نہ ہدایت کی گئی تھی اسے شاہ بیجاپور کو نقصان پہنچانا منظور تھا اور یہ کام بغیر محاصرہ کئے بھی خوب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس تباہی نے آخر کار محمد عادل کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور اس نے کئی لاکھ روپیہ سالانہ بطریق خراج دینے کا عہد کر لیا۔ ادھر شاہ جہاں نے کمال فیاضی سے نظام شاہی ریاست کے چند ضلعے اسے عنایت کر دیے اور ساہوجی بھونسلہ کو بھی ریاست بیجاپور میں ملازمت کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ صلح نامہ گویا نظام شاہی ریاست کے قطعی خاتمہ اور بیجاپور و گولکنڈے کی آیندہ فتح کی تمہید تھی جس کی تحریر کے بعد شہنشاہ نے دکن کی صوبہ داری پر شہزادہ اورنگ زیب کو مامور کیا اور خود پائے تخت کو مراجعت فرمائی۔ (۱۶۳۷ء)

متفرق واقعات اور بلخ و بدخشاں کی لڑائیاں۔

دکن کے مہمات کے زمانے میں دوسری طرف بھی بعض قابلِ ذکر لڑائیاں پیش آتی رہیں۔ ہگلی کو پرتگیزوں نے تجارتی کوٹھی کی بجائے رفتہ رفتہ مورچا بند کر لیا تھا اور غریب رعایا کو طرح طرح کے آزار پہنچاتے تھے صوبہ دار بنگال نے انھیں روکا لیکن اپنے جنگی استحکامات اور توپوں کے زعم پر انھوں نے کچھ پروا نہ کی لہذا بادشاہ کے حکم سے یہ قلعہ جبراً ان سے چھین لیا گیا ایک شورش بندیل کھنڈ میں پیدا ہوئی اور جب تک اس کا سرغنہ (راجہ جھجار) نہ مارا گیا فرو نہ ہوئی کشمیر میں تبت خُرد کے علاقے پر ۱۶۳۶ء میں مغلوں نے حملہ کیا اور فتح پائی لیکن سری نگر کی تسخیر کے لیے جو مہم گئی تھی وہ ناکام رہی اسی طرح بنگالے کی ریاست کوچ بہار پر بھی قبضہ نہ ہو سکا اور آب و ہوا کی خرابی کے باعث بادشاہی فوج واپس چلی آئی۔ ۱۶۳۷ء

اسی سال ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ پیش آیا کہ قندھار کے ایرانی والی علی مردان خاں نے شاہ ایران کی بدظنی اور عداوت سے ڈر کر شاہ جہاں کی پناہ لی اور یہ شہر مغلوں کے حوالے

کر دیا۔ قندھار پر مغل بادشاہوں کو ابھی تک وراثت کا دعویٰ تھا اور اس کا بغیر کسی جنگ کے قبضہ میں آجانا بڑی خوشی کا سبب ہوا لیکن حق یہ ہے کہ خود علی مردان خاں جیسے عالی نژاد و شایستہ امیر کا ہندی امیروں میں شامل ہو جانا بھی کچھ کم قابل مسرت بات نہ تھی شاہی محلوں کی تزئین و آرایش، باغوں کی درستی و آبپاشی کے وسایل مہیا کرنے میں جو سلیقہ اس نے دکھایا وہ تاریخ میں یادگار ہے اور دلّی کی نہر جس کا بڑا حصہ اب پاٹ دیا گیا ہے آخر تک اسی کے نام سے موسوم رہی۔ دوسرے چند سال کے بعد بلخ و بدخشاں کی لڑائیوں میں اس سے بڑی مدد ملی۔ ان شمالی علاقوں میں ان دنوں خانہ جنگی بپا ہو گئی تھی۔ امیر تیمور صاحبقران کا یہ ترکہ حاصل کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ ہو سکتا تھا پس ۱۶۴۵ء میں علی مردان خاں کو فوج دے کر بھیجا گیا اور اس نے بدخشاں کو پامال کر ڈالا لیکن جاڑوں میں برف باری نے ہندوستان کے راستے مسدود کر دیئے اور علی مردان خاں کو کوئی مستقل فائدہ حاصل کیے بغیر واپس ہونا پڑا۔ آیندہ سال بادشاہ کا سب سے چھوٹا بیٹا شہزادہ مراد بخش اور علی مردان خاں مہم کے سردار مقرر ہوئے مگر یہ نوجوان شہزادہ جس قدر بہادر تھا اسی قدر بدمزاج تھا۔ اس کی علی مردان خاں سے بہت جلد اَن بَن ہو گئی اور پھر اس نے بادشاہ کی پند و نصایح کو سنا نہ عتاب کی پروا کی بلکہ بلخ چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا اور کچھ عرصہ بعد شہزادۂ اورنگ زیب اور وزیر سعد اللہ خاں اس مہم پر مامور ہوئے۔

اس شہزادہ نے ایک بڑی لڑائی میں نمایاں فتح پائی لیکن معلوم ہوتا ہے ہندوستان والوں کی تقدیر میں اہل شمال سے مغلوب ہونا لکھا تھا ہندوکش کے پار حکومت کرنا ان کے نصیب میں نہ تھا جس کا سب سے بڑا قدرتی سبب موسم کا اختلاف ہے جو سردی ان ولایتوں کے لیے خوشگوار و صحت بخش ہے ہندی اس کی تاب نہیں لاتے۔ غرض چند سال تک بہت سا روپیہ اور جانیں ضایع ہونے کے بعد شاہجہاں کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ بلخ کو وہیں کے ایک دعویدار کے حوالے کر دیا اور عزت کے ساتھ صلح کر کے ہندی فوجوں کو واپس بلا لیا۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے اور بلخ کو چھوڑے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایرانیوں نے قندھار بھی چھین لیا اور شہزادۂ اورنگ زیب کی دو مرتبہ فوج کشی کے باوجود اسے لینے میں کامیابی نہ ہوئی۔ شاہجہاں کا سب سے عزیز اور بڑا بیٹا دارا شکوہ تھا اور اسے بھی اپنے دوسرے بھائیوں کی مثل سپہ سالاری کے جوہر دکھانے کا شوق ہوا چنانچہ اس نے باپ سے

اجازت لی اور بڑے لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ قندھار گیا کہ جو کام بھائی نہ کرسکا تھا وہ خود کر دکھائے۔ لیکن چند حملوں کی ناکامی نے اسے بھی اس قلعہ کی تسخیر سے مایوس کر دیا اور واپسی میں حسب معمول ایرانیوں اور افغانیوں کے ہاتھ سے نقصان اٹھاتا ہوا وہ بہ دقت کابل آگیا۔ قندھار کو لینے کی یہ آخری کوشش تھی اور اس کے بعد خاندان تیموریہ کو کبھی اس پر قبضہ کرنے کا موقع نہ ملا۔

شاہجہاں بادشاہ کے عہد حکومت کا آخری حصّہ جنگی واقعات کے ذکر سے پاک ہے بلخ و قندھار کی لڑائیاں بھی سچ پوچھئے تو بیرونی لڑائیاں تھیں اور نہ خاص ہندوستان کی وسیع سلطنت میں برابر امن رہا۔ دکن کے مفتوحہ صوبوں میں از سرِ نو انتظام اور مرشد قلی خاں دیوان کا قابل یادگار دستور العمل جاری ہوا۔ سعد اللہ خاں وزیر کی مفید اصلاحوں نے مالگزاری کے بند و بست میں سہولت اور باقاعدگی پیدا کر دی سلطنت کے بعید اور بڑے بڑے صوبوں پر شاہجہاں کے بیٹے حکمراں تھے اور خود جہاں پناہ اپنے نئے پایۂ تخت کی تزئین و آرائش میں مصروف تھے خلاصہ یہ کہ ہر طرف عیش و آسودگی کا سماں چھایا ہوا تھا اور آنے والے طوفان کا اگر کسی کو خدشہ تھا بھی تو وہ حال کی بےفکری کو مستقبل کے فکر سے بدلنا نہ چاہتا تھا۔

خانہ جنگی اور شاہجہاں کا نظر بند ہونا

دوسرے خانہ جنگی کا سبب ایسا پیش آیا جو پہلے سے کسی کے ذہن میں نہ آسکتا تھا یعنی ۱۰۶۷ھ (مطابق ۱۶۵۷ء) میں بادشاہ کو ایسا سخت مرض لاحق ہوا کہ وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے اور نظم و نسق کی باگ دارا شکوہ کے ہاتھ میں آگئی جو پہلے سے باپ کا منظور نظر تھا۔ اس نے بھائیوں کو باپ کی خطرناک بیماریوں سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی اور ناکہ بندی کرا دی کہ ان تک پایۂ تخت سے کوئی قاصد بھی نہ پہنچنے پائے۔ مگر اس چھپانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شجاع اور مراد کو بادشاہ کے انتقال کا یقین ہوگیا اور انھوں نے اپنے اپنے مقام پر خود مختاری کا اعلان کر دیا بلکہ شجاع نے کہنا شروع کیا کہ دارا شکوہ نے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا اور بدلہ لینے کے بہانے فوج لیکر پایۂ تخت کا رُخ کیا۔

اورنگ زیب نے اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ چھوٹے بھائی کو سمجھایا کہ "بادشاہ سلامت زندہ ہیں اور تمھاری خودسری بالکل نازیبا ہے تمھیں اپنے مقام پر ابھی خاموش رہنا چاہیے تھا"۔ لیکن مراد نے کئی بار لکھا کہ دارا شکوہ ہماری بیخ کنی کے سامان کر رہا ہے اور

اسی نے راجہ جسونت سنگھ کو فوج دیکر بھیجا ہے کہ ایک ایک کرکے ہم دونوں کا قلع قمع کردے اوپر کی دونوں باتیں صحیح تھیں واقعی دارا شکوہ اپنی بادشاہی اور بھائیوں کی بیخ کنی کا سامان کر رہا تھا شاہجہاں کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی اور وہ بھی کم سے کم تخت دہلی کا وارث اسی کو بنانا چاہتا تھا۔

شاہجہاں کو چند ہفتے میں اپنے مرض سے افاقہ ہوگیا تھا (ربیع الاول ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۸ء) بیٹوں کی خود مختاری کی خبریں اس کی ناخوشی کا موجب ہوئیں دارا شکوہ کی آیندہ وراثت اور بھی یقینی نظر آنے لگی لیکن اس شہزادے کی تند مزاجی نے ملک میں لڑائی کی آگ بھڑکائی اور خود اسے تباہ کرا دیا۔ شاہجہاں نے اپنے سرکش بیٹوں کے نام دستخط خاص سے احکام بھیجے تھے کہ فوراً اپنے اپنے مقام پر واپس چلے جائیں لیکن دارا شکوہ کے نزدیک ان کے جرم کی کچھ اور سزا ملنی ضروری تھی چنانچہ اس نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو فوج دیکر شجاع کے مقابلے کے واسطے بھیجا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا جسونت سنگھ اور قاسم خاں چھوٹے بھائیوں کا قلع قمع کرنے پر مامور کر دیے گئے۔

اس خانہ جنگی کی پہلی لڑائی بنارس کے قریب واقع ہوئی اور شجاع جس نے باپ کے خطوں کو جعلی سمجھا تھا شکست کھا کے بنگالے میں پسپا ہوا لیکن دارا کا اصلی حریف برہان پور سے بڑھ رہا تھا اور شہزادۂ مراد (جس کی تحریک سے اورنگ زیب نے کوچ کیا) اپنی فوج لے کر اس سے مالوے میں آملا تھا نربدا اترنے کے بعد اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو پیام دیا کہ "میں صرف بادشاہ سے ملنے جاتا ہوں جنگ مقصود نہیں ہے۔ تم یا تو میرے ہمرکاب چلو یا راستے سے ہٹ جاؤ کہ خونریزی کی نوبت نہ آئے۔" جسونت سنگھ نے درشتی سے انکار کیا اور ماہ رجب (۱۰۶۸ھ ۱۶۵۸ء) کی آخری تاریخوں میں اجین کے قریب سخت جنگ ہوئی جسونت سنگھ نے شکست کھائی اور ہزاروں راجپوت کٹوا کے اپنے وطن میں منہ چھپایا اور فتح مند فوجیں گوالیار کے راستے شمال کی جانب بڑھیں۔

جسونت سنگھ کی کامل شکست کی خبر نے آگرے میں کھلبلی ڈال دی جہاں پناہ دہلی جاتے جاتے واپس ہوئے اور خود جا کر بیٹوں کو روکنے پر آمادہ تھے۔ مصالحت کی اب ایک یہی تدبیر باقی رہ گئی تھی لیکن دارا شکوہ کو مصالحت کے نام سے غصہ آتا تھا۔ وہ اس ذلت کا بدلہ لینے کے لیے بیتاب تھا اور اپنے کثیر لشکر کے زعم پر یقین رکھتا تھا کہ ایک ہی

حملے میں بھائیوں کو پیس ڈالے گا کیونکہ تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے واقعی اس کی قوت مراد و اورنگ زیب سے تین چار گنی زیادہ تھی اور بظاہر گجرات و دکن کے سپاہی اتنا بڑا سفر طے کرنے کے بعد کسی قدر مضمحل بھی ہو گئے تھے لیکن لڑائی کا فیصلہ اس قسم کی ماندگی یا فوجوں کی کمی بیشی پر نہیں بلکہ زیادہ تر سپہ سالاروں کی قابلیت پر منحصر ہے اور دارا شکوہ نہ حریف کے برابر ضابطہ و منتظم تھا نہ تجربہ کار۔ دوسرے اس کی فوج کے بعض دستے بے دلی سے لڑنے چلے آئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک طرف تو جان کی بازی لگی ہوئی تھی اور مراد و اورنگ زیب کو شکست کی صورت میں کامل تباہی اور ہلاکت سامنے نظر آتی تھی اور دوسری طرف دارا شکوہ اپنی کامیابی کا یقین رکھتا تھا اور اسے اگر کوئی فکر تھی تو یہ کہ اس کے بھائی بچ کر زندہ نہ نکل جائیں۔

الغرض ماہ رمضان کی چھٹی تاریخ (۲۹ مئی ۱۶۵۸ء) کو فریقین آگرے سے ۲۵، ۲۰ میل جنوب مشرق میں باہم دوچار ہوئے اور دوسرے دن اسی سموگڑھ کے میدان میں تلوار نے ہندوستان کی شہنشاہی کا فیصلہ کر دیا۔ دارا شکوہ قریب قریب ایک لاکھ سوار میدان میں لایا تھا گجرات اور دکن کی فوجیں ملکر غالباً ۲۵ ہزار سے بھی کم تھیں مگر ان کے میسرے پر شہزادۂ مراد جیسا بے جگر جنگ جو تھا اور قلب میں اورنگ زیب جیسا سپہ سالار اس طرح جما ہوا تھا کہ ثبات و استقلال کے سامنے پہاڑ کی بھی کچھ حقیقت نہ تھی۔ لڑائی حسب معمول توپوں کی شررفشانی سے شروع ہوئی اور ہراول کے ہٹتے ہی رستم خاں نے اورنگ زیب کے قلب سپاہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد خود دارا شکوہ نے اپنا ہاتھی بڑھایا اور اسی مقام پر پیہم اتنے حملے کیے کہ فوج دکن میں ہراس و انتشار پیدا ہونے لگا۔ قریب قریب یہی حالت میسرے کی تھی جہاں تین ہزار ازبکوں نے تیر مار مار کر مراد کی صفوں میں تلاطم ڈال دیا تھا اور یہ بارش کم نہ ہوئی تھی کہ راجپوت سواروں کا ایک ٹڈی دل اس پر آ گرا تھا۔ فوج کے اس بازو کا غنیم سے دبنا اسی امر سے ظاہر ہے کہ شہزادۂ مراد بخش نے حکم دیا کہ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر جکڑ دیا جائے کہ اپنی جائے سے نہ ہلے حالانکہ اس کا ہودج تیروں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ اسی طرح اورنگ زیب دشمن کے نرغے میں بلا ورنگ ڈٹا ہوا فوج کا دل بڑھا رہا تھا اور یہی وہ شجاعت اور پامردی تھی جس کی بدولت ان شہزادوں نے تنگی فوج کا ریلا روک لیا۔ اسی اثنا میں راجہ رام سنگھ جس نے ٹوک کر مراد بخش پر وار کیا تھا، شہزادے کے تیر سے چھد کر گرا اور راجپوتوں میں بے ترتیبی

پیدا ہوگئی۔ اودھر دارا شکوہ کے ہاتھی پر آتش باری کا ایک لٹو اس زور سے آگے پھٹا کہ وہ مضطربانہ اتر کے گھوڑے پر سوار ہولیا۔ اس کا ہاتھی سے اترنا تھا کہ سپاہیوں کے دل چھوٹ گئے جس نے موقع پایا وہ فرار ہونے لگا اور خود شہزادہ دارا شکوہ نے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔

شکست خوردہ شہزادہ چند ہزار رفیقوں کے ساتھ آگرے پہنچا تو شرم سے اپنے باپ کے پاس نہ گیا بلکہ کچھ جواہرات اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کے دلی کی طرف نکل گیا اور اس کے تین دن بعد فتحمندوں نے آگرے کی شہرپناہ کے سامنے اپنے خیمے نصب کیے۔ ان کے یہاں پہنچتے پہنچتے بڑے بڑے اُمرا فتح کی مبارکباد دینے اور اپنی رفاقت کا اظہار کرنے لشکر میں پہنچ چکے تھے اور خود جہاں پناہ نے شہزادۂ اورنگ زیب کو شمشیر مرصع بھیجی تھی جس پر لفظ "عالم گیر" کا خطاب کندہ تھا۔ بااین ہمہ اورنگ زیب کو ابھی تک مصالحت کی جوامیدیں تھیں وہ بہت جلد باطل ہوگئیں اور ثابت ہوا کہ باپ کی بدگمانی بلکہ درپردہ عداوت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور وہ اسی طرح دارا شکوہ کا طرفدار ہے۔ اس حالت میں اورنگ زیب کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ واپس دکن چلا جائے اور اپنے باپ کو آزاد و خود مختار رہنے دے یا اپنی کامیابی سے فایدہ اٹھائے اور باپ کو بے اختیار کر کے اصلی حریف دارا کا قلع قمع کر دے تاکہ نہ صرف اس کی جان اور دکن کی صوبہ داری خطرے سے نکل جائے بلکہ خود کشور ہند پر اس کا تسلط ہو جائے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور سچ یہ ہے کہ بات اس حد تک بڑھ جانے کے بعد کوئی شخص بھی جو اس کی جگہ پر ہوتا اپنی سلامتی اور حفاظت کی خاطر یہی کرتا۔

عہد شاہجہانی کا خاتمہ شہاب الدین شاہجہاں کو آگرے میں نظر بند کر لیا گیا۔ اس کی ذاتی راحت و آسایش کے تمام سامان اسی طرح موجود رہے اور شاہانہ طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ بااختیار بیٹا اگرچہ باپ کے سامنے نہیں گیا تاہم شاہی اختیارات لے لینے کے سوا اس نے کوئی ایسی بات نہ کی جو شاہجہاں کے مرتبے کے خلاف ہوتی۔ اسی نظربندی کی حالت میں بوڑھے بادشاہ نے اپنی زندگی کے باقی سات سال گذارے لیکن دور شاہجہانی کا یہیں خاتمہ ہے اور آیندہ تاریخ میں ہم شاہجہاں کا نام نہیں سنیں گے لہذا مناسب ہے کہ اس معزول تاجدار سے رخصت ہوتے وقت بالاجمال اس کے اوصاف اور اس کے عہد کی بعض خصوصیات کا ذکر کر دیا جائے۔

مورخ محمد ہاشم خافی خاں لکھتا ہے کہ اگرچہ ملک گیری کے اعتبار سے سلاطین تیموریہ

میں اکبر کے برابر کوئی بادشاہ اقبال مند نہیں گزرا" امّا در بندوبست و نسق فراہم آوردن خزانہ و آبادکاری ملک و قدردانی سپاہ و رفاہِ لشکر بہ از شاہ جہاں بادشاہ در عرصۂ پُروسعت ہندوستان فرماں فرمائے نہ گردیدہ" اور اتنے سلیقے اور انتظامی قابلیت کے ساتھ قدرت نے جو ذوقِ سلیم اور بلند نظری شاہجہان کو عطا کی تھی اس کی یادگاریں آج بھی سیاحانِ عالم کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ روضۂ ممتاز محل میں پہنچ کر یقین نہیں آتا کہ یہ نور کی عمارت اسی کرۂ خاکی کی بنی ہوئی ہے۔ صناعی کے انہی بے نظیر نمونوں میں غور کرنے والے کو بنانے والے کی ثروت و جاہ فیاضی اور بلند ہمتی کا جلوہ نظر آجائے گا۔ دربارِ شاہجہانی کے تزک و احتشام اور زیب و زینت کا حال پڑھنے سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ جس سلطنت کو شہنشاہِ اکبر نے دلھن بنانا چاہا تھا اس کی آرائش اسی عہد میں تکمیل کو پہنچی کیونکہ اقبالمند پوتے نے بزرگوں کی محنت اور اپنے سلیقے سے اتنی دولت جمع کی جس کا عشر عشیر بھی دادا کے حصہ میں نہ آیا تھا چنانچہ اس داد و دہش کے باوجود کہ ایک ایک مرہم کا نسخہ دینے والے کو اس کے ہم وزن سونا مل جاتا تھا[1] اور کروروں روپیہ کے صرف سے شاہجہاں آباد دہلی اور متعدد عمارات کو تعمیر کرایا گیا تھا شاہجہاں کے خزانے سے ۴۲ کرور روپیہ[2] نقد اور ۱۵،۱۶ کروڑ روپیہ کا سونا چاندی اور جواہرات برآمد ہوئے۔ تخت طاؤس اور وہ بیش قیمت ساز و سامان جو کروڑوں روپیہ میں تیار ہوا تھا اس دولت کے علاوہ ہے اور جس طرح اس کثرتِ مال کا سبب بخل نہ تھا اسی طرح جور و تعدی بھی اس کی وجہ نہ تھی بلکہ درحقیقت امن و انتظام اور عدل و انصاف کی بدولت ملک میں دولت کی فراوانی اور ہر طرف فراغت و آسودگی پھیلی ہوئی تھی ہندوستان میں مختلف صنعتوں کو اور خاص کر پارچہ بافی کو اسی زمانے میں وہ فروغ حاصل ہوا کہ لاکھوں روپے کے مصنوعات یورپ کی منڈیوں میں دساور جانے لگیں۔ مگر ملکی آسودگی اور

---

[1] شہزادی جہاں آرا بیگم کے کپڑوں میں شمع سے آگ لگ گئی تھی اور وہ بہت دن سخت بیمار رہی اس بیماری اور پھر صحت یابی میں کروروں روپیہ خیرات ہوا اور جس شخص کے مرہم سے پہلی مرتبہ فائدہ ہوا تھا اسے تول کر اسی کے ہم وزن سونا انعام میں ملا - ۱۲

[2] اس عہد کا روپیہ ہمارے پونے دو (انگریزی) اور کوئی دو روپے حالی کے ہم قیمت تھا پس وہ ۴۲ کروڑ روپیہ قریب قریب ۷۴ کروڑ انگریزی اور ۸۴،۸۴ کرور سکہ حالی کے معادل ہوا۔ ۱۲

حسن انتظام کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ عہد شاہجہانی میں (کابل و قندھار چھوڑ کے) ہندوستان کے ۱۸ صوبوں سے آٹھ ارب اٹھاون کروڑ دام صرف مالگزاری کی جمع وصول ہوتی تھی جس کے اس زمانہ کے حساب ۲۱ کروڑ اور ہمارے زمانہ کے انگریزی ۲۷ ½ کروڑ روپیہ ہوئے اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ آج بھی سرکار انگریزی کو خالص مالگزاری سے وصول نہیں ہوتی۔ حالانکہ انگریزوں کے قبضہ میں جو ملک ہے اس کا رقبہ سلطنت مغلیہ سے زیادہ ہے اور مالگزاروں پر یا زراعت پیشہ رعایا پر ایسی سختی کی جاتی ہے جو شاید اسلامی بادشاہوں کے زمانے میں کبھی نہیں ہوئی خاص کر شاہجہاں کے زمانے میں رعایا نہایت خوش دل تھی اور ایک انگریز سیاح کے الفاظ میں شہنشاہ ان پر ایسا مہربان تھا جیسے کوئی باپ اپنے بچوں پر" ایک نیک دل مطلق العنان کی سچی تصویر ہے اور گو مغل بادشاہوں کو تخت و تاج کے لیے اپنے بھائیوں تک کا خون بہانا پڑتا تھا لیکن مسکین رعایا پر وہ سب کے سب ایسی ہی شفقت رکھتے تھے اور اس کی راحت رسانی اور دادرسی کو اپنا سب سے بڑا فرض جانتے تھے۔

بلحاظ عقاید شاہجہاں سچا مسلمان تھا اس نے "زمین بوسی" یا بعض اکبری رسوم جو شعائر اسلامی کے خلاف تھیں موقوف کردیں اور دربار شاہی میں علمائے دین کا پھر اعزاز و وقار قایم کیا۔ جوانی میں توبہ کرنے کے بعد اس نے پھر کبھی شراب کو منہ نہ لگایا اور اسی طرح تمام کبیرہ گناہوں سے اس کا دامن پاک ہے لیکن جہانگیر کا جانشین ان تکلفات میں گھرے رہ کر زاہد کامل نہ بن سکتا تھا، اور بابر کی اولاد میں یہ شرف صرف عالمگیر کے نصیب میں آیا تھا لہذا رقص و سماع یا شاہانہ اسباب راحت سے لطف اٹھانے میں شاہجہاں دریغ نہ کرتا تھا اور غالباً اسی وجہ سے بڑھاپے میں آرام طلب ہوگیا تھا۔ مگر اس میں بادشاہ کی کچھ خصوصیت نہیں درحقیقت تمام آسودہ حال مسلمانوں کی یہی حالت ہوتی جاتی تھی۔ دولت اور تکلفات انھیں عیش پسند بنا رہے تھے سادہ معاشرت کے ساتھ جفاکشی اور سپاہیانہ مستعدی رخصت ہورہی تھی فنون سپاہ گری کا تھے۔ بلکہ ان کی قدر بڑھ گئی تھی اور جاں بازوں کی بھی قوم میں کمی نہ تھی لیکن طبقۂ اعلیٰ میں ایسے سردار تھوڑے تھے جو نہ راحت و آرام کی پروا کریں نہ گرمی سردی کی اور جنھیں سخت سے سخت مہم پر جانے کے لیے صرف "ایک گھوڑا پانچ ہتھیار" درکار ہوں۔

مگر لوگوں کے اخلاق و اذکار پر سب سے بڑا اثر اس مطلق العنان بادشاہی کا پڑا جو اب ایک خاندان (تیموری) سے مخصوص معلوم ہونے لگی تھی اولادِ بابر کے سوا تخت ہندوستان کو حاصل کرنے کی کسی متنفس کے دل میں جرأت نہ ہوسکتی تھی۔ عوام الناس کا تو ذکر ہی کیا ہے اس موروثی امتیاز کی وجہ سے طبقۂ امرا کو بھی معاملات سلطنت سے چنداں سروکار نہ رہا بلکہ صرف مغل بادشاہ کی خوشنودی پر ان کی فلاح کا انحصار رہ گیا تھا اور جب ملک میں امن و امان ہوا، جنگی مہات کا سلسلہ رکا اور بادشاہوں کا زیادہ وقت سیر و تفریح کے مشغلوں میں گزرنے لگا تو ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی جاں بازی اور سپہ گری لازمی چیز نہ رہی۔ بے شبہ مغلیہ دربار میں ابھی تک انتظامی قابلیت اور تہذیب و شائستگی کی قدر تھی اور غلامانہ خوشامد یا ادنیٰ چاپلوسی کا ناپاک قدم آنے نہیں پایا تھا تاہم امیروں میں نہ آزادیٔ رائے باقی رہی تھی نہ جاں نثاری کا وہ شوق و ولولہ تھا جو صاحب ہوش افراد میں صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ آزادی سے سوچ سمجھ کر کسی شخص کے ساتھی ہوئے ہوں۔ غالباً یہی سبب تھا کہ شاہ جہاں جیسے ہردل عزیز اور فیض رساں بادشاہ کی نظربندی پر کسی امیر نے دم نہ مارا اور فاتح کی خدمت میں آ آ کے نذریں دکھانے لگے۔

باب یازدہم

محمد محی الدین اورنگزیب عالمگیر

بھائیوں کا حشر باپ کو نظر بند کرنے کے بعد اورنگ زیب دارا کے تعاقب میں شمال کی جانب روانہ ہوا چھوٹا بھائی مراد بخش اب خوشامدی مصاحبوں کی شہ سے منحرف ہوتا جاتا تھا اور پہلے عہد و پیماں کے خلاف[1] اپنی بادشاہی کے منصوبے باندھنے لگا تھا اور ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کو یہ گوارا نہ ہوسکتا تھا کہ ہندوستان کی بادشاہی کا تاج باپ سے چھین کر اپنے سادہ لوح بھائی کے سر پر رکھدے اور خود الگ ہوجائے ادھر اس کے برے تیور دیکھکر اسے آزاد رہنے دینا بھی دوراندیشی کے خلاف تھا۔ غرض اسی سفر میں ایک رات جبکہ یہ شہزادہ کثرت شراب سے بدمست ہو رہا تھا اسے ہاتھی پر ڈال کے سلیم گڑھ (دہلی) لے آئے اور کچھ عرصے بعد گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا جو اس زمانے کا بادشاہی زنداں تھا خود اورنگ زیب نے پائے تخت دہلی کے قریب پہنچ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کرادیا (غرۂ ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ = جولائی ۱۶۵۸ء)

[1] عہد یہ تھا کہ تمام ہندوستان فتح ہونے کی صورت میں مراد بخش کو ایک تہائی مال غنیمت اور پنجاب و کابل کا علاقہ دیا جائے گا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے سموگڑھ کی لڑائی میں جو غنیمت ملی اس کا ایک ثلث نقد روپے کی صورت میں بھیج دیا اور لکھ دیا کہ دارا شکوہ کے دفع ہونے کے بعد معاہدے کی دوسری شرط پر عمل کیا جائے گا۔ ۱۲

نئے بادشاہ نے جشن تاجپوشی تو ایک طرف پائے تخت میں داخل ہونا بھی پسند نہ کیا کیونکہ داراشکوہ لاہور میں از سر نو جنگ کا ساز و سامان کر رہا تھا اور اورنگ زیب اس قسم کا بادشاہ نہ تھا کہ ذاتی آرام یا شاہانہ نمائش کو کام پر مقدم سمجھے خاص کر اس وقت، جبکہ داراشکوہ اور شجاع جیسے قوی حریف زندہ سلامت موجود تھے، وہ پائے تخت میں چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے دہلی سے یلغار کی اور اس کی آمد آمد سن کر دارا کا تازہ لشکر متفرق ہونے لگا۔ اس برگشتہ بخت شہزادے نے مجبوراً لاہور کو خیرباد کہکر ملتان کی راہ لی، جہاں وہ باپ کے عہد حکومت میں صوبہ دار تھا۔ لیکن اورنگ زیب راستے ہی سے ملتان کی جانب مڑ گیا اور لمبے لمبے کوچ کرتا ہوا چلا کہ بھائی کو اطمینان سے فوج جمع کرنے کی مہلت نہ ملے۔ چنانچہ دارا اس شہر میں بھی نہ ٹھیر سکا اور چند ہزار رفیقوں کو لئے ہوئے ملک سندھ میں گھس گیا کہ لشکر شاہی کے تعاقب سے نجات پا جائے۔ اورنگ زیب کو یہ اطلاع ہوئی تو چند سرداروں کو تعاقب میں روانہ کر دیا اور خود اسی تیزی سے لاہور ہوتا ہوا دہلی پہنچ گیا کہ شجاع کے مقابلے کا سامان کرے جو بنگالے سے بڑھ کر بنارس آگیا تھا؛

اوائل ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۹ء) میں افواج شاہی نے کوچ کیا اور اٹاوے سے آگے کھجواہہ کے مقام پر فریقین کا سامنا ہوا۔ جنگ شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ نے دغا کی اور لشکر شاہی کے ایک حصے کو لوٹتا ہوا نکل کر الگ ہو گیا۔ واضح رہے کہ اجین میں شکست کھا کے وہ اپنے وطن چلا گیا تھا اور وہاں اس کی رانی نے اسے طعنے دے دے کے بہت رسوا کیا تھا۔ اورنگ زیب کی بادشاہی کا اعلان ہوا تو جسونت سنگھ نے حاضر ہو کر قصور کی معافی مانگی اور گو اس کے تمام خطابات واپس نہیں ملے تاہم اس کا قصور معاف کر دیا گیا اور اس مہم میں وہ بادشاہ کے ہمرکاب تھا لیکن جنگ سے چند ساعت پہلے اس نے شہزادۂ شجاع سے ساز باز کر لیا اور پچھلی رات کو اچانک بادشاہی فوج کے بعض خیمے لوٹتا ہوا ساتھ چھوڑ کے الگ ہو گیا۔ اس کے راجپوت سپاہیوں کی لوٹ مار نے تمام فوج میں پریشانی پیدا کر دی تھی لیکن مستقل مزاج اورنگ زیب کی تیوری پر بل نہ آیا۔ اور اس نے جسونت کے بجائے دوسرے سردار بھیج کے صف جنگ آراستہ کرنے کا حکم دیا؛

کھجواہے کی جنگ میں شجاع کو اپنے توپ خانے اور سادات بارہہ کی جان نثاریوں پر بہت ناز تھا، جن کے ساتھ تین جنگی ہاتھی تھے کہ عین گھمسان میں دو دو تین تین من کی

آہنی زنجیریں ہلاتے ہوئے جدھر جاتے تھے فوج کو پامال کر ڈالتے تھے۔ لشکر شاہی میں اس بلائے سیاہ نے تہلکہ ڈال دیا تھا، اور خود جہاں پناہ سپاہیوں کو غیرت دلا دلا کر لڑا رہے تھے۔ اتنے میں ان خوفناک ہاتھیوں نے اپنے فیل بانوں کے اشارے سے خاص شاہی ہاتھی کا رخ کیا، اور سواران خاصہ کی صفیں درہم برہم کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کی ہیبت انگیز صورت دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کا زہرہ آب ہوا جاتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب تیرہ برس کی عمر میں تنہا فیل مست کے سامنے ڈٹ گیا تھا، اس وقت کیا ڈرتا۔ اس نے حکم دیا کہ فیل سواری کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی جائیں اور تفنگچیوں کو اشارہ کیا کہ دشمن کے فیل بان کو گولی مار دیں، چنانچہ اس کے گرتے ہی دشمن کے ہاتھی نے رخ پھیر دیا اور دوسروں کو بھی اِدھر آنے کی ہمت نہ ہوئی ؛

ایسے لڑنے والے کے سامنے سادات ہوں یا مغلیہ کسی کے بھی قدم نہ جم سکتے تھے، خود شجاع نے ہمت ہار دی اور بہت سا جنگی ساز و سامان چھوڑ کے فرار ہو گیا، اس کے تعاقب پر میر جملہ اور شہزادہ محمد سلطان مامور ہوئے اور انھوں نے اسے شکستیں دے دیکے بنگالے سے ملک اراکان و آسام کی جانب بھگا دیا اور کچھ عرصے بعد وہ وہیں کے راجہ سے لڑ کر بھاگا اور پہاڑوں میں چھپ کے مفقود الخبر ہو گیا ؛

لیکن یہ کچھ عرصے بعد واقعات ہیں کھجوا ہے کی لڑائی سے فرصت ملتے ہی اورنگ زیب کو پھر داراشکوہ کی فکر پیدا ہو گئی تھی جو سندھ سے گجرات آیا اور احمد آباد کے صوبہ دار سے مل کر جسونت سنگھ کو اپنی جانب ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کھجوا ہے کے میدان سے ہٹنے کے بعد پہلے یکایک آگرے پہنچ گیا تھا اور چاہتا تو اس وقت شاہجہاں کو پھر آزاد کر سکتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ انتقام اورنگ زیبی کے خوف سے یہ حوصلہ نہ ہوا اور اس نے پھر اپنے وطن کی پناہ لی۔ وہیں داراشکوہ کے ایلچی پہنچے اور جسونت سنگھ اس کی رفاقت پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن جے پور کے راجہ جے سنگھ نے شاہی معافی کی امید اور داراشکوہ سے مل جانے میں انجام کا خوف دلایا، تو وہ پھر اس بدنصیب شہزادے سے برگشتہ ہو گیا اور داراشکوہ کو جو دھپور کے بالکل قریب پہنچ کر مایوس و مجبور اجمیر کی طرف پھرنا پڑا، جہاں مدافعانہ جنگ کے بہت

اچھے موقعے تھے ؛

دارا کے پاس بیس ہزار سپاہی جمع ہو گئے تھے اور اورنگ زیب کو اس کے مضبوط مورچے فتح کرنے میں کئی دن سخت جنگ پیش آئی۔ لیکن آخر میں احمد آباد کا صوبہ دار شاہ نواز جس نے اپنے محسن اور داماد (یعنی اورنگ زیب) سے بے وفائی کی تھی مارا گیا تو دارا کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وہ بے حواس ہو کر اجمیر سے فرار ہوا اور سخت مصیبتیں اٹھاتا ہوا گجرات و کچھ کے راستے سندھ پہنچا کہ قندھار کی جانب نکل جائے۔ مگر سندھ کے ایک رئیس ملک جیون نے چند روز مہمانداری کے بعد اسے اور اسکے بیٹے سپہر شکوہ کو بے خبری میں حملہ کرا کے گرفتار کر لیا ؛

اجمیر کی فتح کے بعد پائے تخت پہنچکر اورنگ زیب نے اطمینان سے تاج پوشی کی رسم ادا کی اور بڑی دھوم دھام کا جشن منعقد کیا۔ (رمضان المبارک ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء) اس جشن میں خاندان شاہی کے افراد اور امرا کو بڑے بڑے خطاب اور گرانبہا خلعت عطا ہوئے محتاجوں کو اتنی خیرات ملی کہ غنی ہو گئے اور دو ڈھائی مہینے تک خوشی اور شادمانی کے جلسے ہوتے رہے ؛ داراشکوہ کے قید ہونے کی اطلاع نے اس مسرت کو چار چند بڑھا دیا تھا لیکن عوام الناس ملک جیون کو گالیاں دیتے تھے اور جب داراشکوہ کی دہلی کے بازاروں میں تشہیر کی گئی تو لوگ زار و قطار روئے۔ پھر ملک جیون شہر میں داخل ہوا تو اس پر اینٹ پتھر کی بوچھاڑ کی گئی اور اگر کوتوال وقت پر نہ پہنچ جائے تو اسکا بلوائیوں کے ہاتھ سے زندہ بچنا دشوار تھا بلوے کا سرغنہ ہیبت نامی ایک سوار تھا' اسے علما کے فتوے کے مطابق قتل کرا دیا گیا اور دوسرے دن داراشکوہ کے قتل پر بھی فقہا نے مہریں ثبت کر دیں کہ "از دائرہ شرع پا بیروں گزاشتہ تصوف را بدنام ساختہ' کار بالحاد و کفر رسانده بود" اور اس کی لاش شہر میں پھرانے کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں دفن کرا دی گئی ؛

شمالی فتوحات

آیندہ چند سال میں چند قابل ذکر فتوحات حاصل ہوئیں جو اس زمانے میں بادشاہوں کی اقبال مندی کا ثبوت مانی جاتی تھیں اور آج کل خود مختار قوموں کی ترقی کی دلیل سمجھی جاتی ہیں' اس سلسلے میں پہلی اور نمایاں فتوحات سپہ سالار میر جملہ کو حاصل ہوئیں' جس نے کوچ بہار کا علاقہ فتح کیا جو عہد شاہجہانی میں آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے فتح نہ ہو سکا تھا۔ پھر اس کی ماتحتی میں اسلامی فوجوں نے اول مرتبہ دریائے برہم پتر کو عبور کیا اور تمام آسام پر قابض

ہوگئیں فتحمند سپہ سالار اس راستے ملک چین میں گھس جانے کا بڑا ارمان تھا لیکن آسام کی دھواں دھار بارش نے ہمت پست کر دی، وہ راجہ سے خراج گزاری کا عہد اور اور مغربی علاقہ لے کر واپس ڈھاکے چلا آیا اور کچھ عرصے بعد نہیں وفات پائی (رمضان ۱۰۷۳ھ؛ ۱۶۶۳ع) دو سال کے بعد صوبہ دار بنگالہ نے خلیج بنگال کے مشرقی سواحل پر جہاں بحری قزاقوں نے مامن بنا رکھے تھے پھر فوج کشی کی اور چاٹ گام تک یہ سیراب علاقہ سلطنت مغلیہ میں داخل ہو گیا؛ دوسری طرف کشمیر کے صوبہ دار نے انھی دنوں تبت پر چڑھائی کی۔ اور اس شمالی علاقے کا بھی ممالک محروسہ میں الحاق کر لیا گیا؛

دکن میں افواج شاہی پے در پے فتوحات حاصل کر رہی تھیں اور سیواجی نے مغلوب و مجبور ہو کر بادشاہی سپہ سالاروں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ لیکن ان لڑائیوں کے حالات ہم آگے چلکر ایک جا بیان کریں گے یہاں صرف شمالی ہندوستان کے واقعات لکھنے مقصود ہیں اور ان میں دو تین باتیں قابل ذکر نظر آتی ہیں ورنہ عالمگیر کے تمام عہد حکومت میں ہندوستان خاص میں کامل امن و انتظام رہا اور ہر قسم کے علوم و فنون اور صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کو ترقی ہوئی۔

۱۔ شمال کے پہاڑی علاقوں میں افغانی قبائل کیساتھ جنگ چھڑ گئی تھی ۱۶۷۶ع میں خود جہاں پناہ نے ان کی سرکوبی کے واسطے حسن ابدال کا سفر کیا کیونکہ جسطرح اکبر کے عہد میں روشنائی افغانوں نے بادشاہی افواج کو سخت نقصان پہنچایے تھے، اسی طرح اب عالمگیری عمال کو پریشان کر رکھا تھا، مگر بادشاہ کے اسطرف پہنچتے ہی لڑائی کا رنگ بدل گیا اور آغر خاں نے افغانوں کو جا بجا اتنی شکستیں دیں کہ انھیں چھپنے کو جگہ نہ ملتی تھی؛ یہ پٹھان سردار غضب کا جنگجو اور اپنے زمانے کا مشہور سورما گزرا ہے۔ بنگال و دکن میں اس کی تیغ زنی کا سکہ بیٹھ گیا تھا اور اسکے حیرت انگیز کارناموں کے بیان میں آغر نامہ نامی مثنوی لکھی گئی تھی۔ کہتے ہیں اس نے افغانوں کے دل میں ایسی ہیبت بٹھادی تھی کہ مائیں بچوں کو اس کا نام لیکر ڈراتی تھیں؛ ان کارناموں کے صلے میں بادشاہ کی جانب سے بہت کچھ اعزاز و انعام عطا ہوئے اور اور وہ منصب چار ہزاری پر سرفراز کیا گیا؛

۲۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ ستنامی فقیروں کا فساد (۱۶۷۲ع) جو قصبہ نارنول

کی نواح میں آباد ہو گئے تھے۔ فساد کی ابتدا ایک کوتوالی کے جوان اور کسی ستنامی کاشتکار کے معمولی جھگڑے سے ہوئی ایک طرف سے کوتوالی کے پیادے پہنچ گئے دوسری طرف سے ان ہندو فقیروں کا ایک گروہ اپنے آدمی کی حمایت میں جمع ہو گیا' اس زمانے میں ادنیٰ سے ادنیٰ کاشتکار کے پاس ہتھیار رہتے تھے' ہر شخص تھوڑا بہت ان سے کام لینا بھی جانتا تھا۔ دوسرے اہل ہند کامل امن و انتظام کے باوجود غالباً پہلے کبھی اتنے بزدل نہ تھے جتنے آجکل نظر آتے ہیں۔ غرض فقیروں نے حملہ کرکے کوتوالی کی جمعیت کو بھگا دیا' نارنول پر قابض ہو گئے اور دو تین مرتبہ بادشاہی فوج کے دستے بھی ان کے مقابلے میں شکست کھا کر واپس آئے' نارنول دہلی سے کوئی ساٹھ میل جنوب مغرب میں واقع ہے' اور چونکہ آس پاس کوئی بڑی آبادی نہ تھی لہذا پایۂ تخت سے ۲۴'۲۵ میل فاصلے کے دیہات تک ستنامیوں کے قبضے میں آ گئے اور عوام الناس میں یہ خبریں پھیل گئیں کہ ان فقیروں پر تیغ و تفنگ کا اثر نہیں ہوتا اور وہ جادو کے زور سے پیادہ و سوار کو بیکار کر دیتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے سپاہی مقابلے میں جانے سے ڈرنے لگے اور اس فساد کے اثر سے آگرے اور راجپوتانے کے ملے ہوئے علاقوں میں بھی شورش کے آثار پیدا ہو گئے۔ آخر بادشاہ نے دفع سحر و بلا کے تعویذ لکھ کر ستنامیوں کے مقابلے میں راجہ بشن سنگھ اور حامد خاں کو روانہ کیا جنھوں نے مفسدوں کی قرار واقعی سرکوبی کی اور یہ ہنگامہ فرو ہو گیا؛

غالباً اسی شورش کے چند روز بعد تحصیل جزیہ کی تجدید عمل میں آئی شرع اسلامی کی رو سے یہ محصول ان غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے جن کی حفاظت جان و مال مسلمانوں کے ذمے ہے اور جو جنگی خدمت سے مستثنیٰ ہوتے ہیں' لیکن کوئی محصول کسی وجہ سے بھی لیا جائے' دینے والوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ بالخصوص جزیہ کا جسے اکبر نے منسوخ کر دیا تھا' ایک صدی بعد دوبارہ اجرا ہونا ہندوؤں کو بہت شاق گزرا۔ لیکن عالمگیر ان اسلامی قوانین کی ترویج کا جو عہد اکبری سے نسیاً منسیاً ہونے لگے تھے' پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس نے تخت نشینی کے کچھ مدت بعد سے پانداری (یعنی ہوس ٹیکس) راہداری' مسکرات جاترا وغیرہ تمام غیر شرعی محصول یک قلم مسترد کر دئے تھے دربار میں زمین بوسی' رقص و سرود شعر گوئی اور جھروکے سے درشن دینے کی رسم موقوف ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ سرکار کی طرف سے اجناس کے نرخ مقرر کرنے کے طریقے پر علماء نے اعتراض کیا تو اسے بھی ترک کر دیا تھا۔

پابندی اُصول کے آگے اسے لومۃ لائم اور کسی مخالفت کی پروانہ تھی ۱۰۸۲ھ ۱۶۷۲ء میں جزیہ[۱] جاری کر دیا گیا اور چند سال میں لوگ بھی اس کے عادی ہو گئے۔

اندرونی اصلاحات

چند سال تک ہندوستان کو کوئی بڑی لڑائی پیش نہ آئی برہان پور میں محرم کے شدّے نکالنے پر دو گروہوں میں زدوکوب اور کشت و خون کی نوبت پہنچی تھی مگر یہ مقامی اور ہنگامی فساد چند روز میں رفع دفع ہو گیا اور آیندہ ایسے جلوس نکالنے کی ہر جگہ ممانعت کر دی گئی۔

اس واقعے سے قطع نظر کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ہر گوشے میں کامل امن و فراغ تھا۔ راجہ جے سنگھ صوبہ دار اور دلیر خاں سپہ سالار کے سامنے مرہٹوں میں ابھی دوبارہ جنگ کرنے کی قوت نہ آئی تھی۔ راجہ جسونت سنگھ اور شہزادہ معظم سلطان ولایت کابل میں مامور تھے کہ اگر ایرانیوں کی جانب سے کوئی پیش قدمی ہو جسکا ان دنوں خطرہ پیدا ہو گیا تھا تو اسی وقت انسداد کر دیا جائے۔ سرحد کے ان مشہور عہدہ داروں کے علاوہ خود اندرون ملک میں ہر عامل و فوجدار اپنے فرائض منصبی کمال مستعدی سے انجام دیرہا تھا کیونکہ ان سب کی باگ ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جسکی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی خطا بھی بہ مشکل مخفی رہ سکتی تھی اور جو سلطنت کے تمام جزئیات سے غضب کی واقفیت رکھتا تھا؛ اس خبرداری اور بیدار مغزی کی دوست دشمن ہر مورخ نے تصدیق کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فریضہ شناسی جفاکشی اور زاہدانہ زندگی کا طفیل تھا کہ اس بادشاہ کو اسقدر کام کرنے کی مہلت مل جاتی تھی ورنہ اتنی وسیع سلطنت کے ہر شعبۂ انتظام پر نظر رکھنا شخص واحد سے ممکن نہیں ہے۔

ایسی واقفیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایک لائق و ذہین فرماں روا مروجہ آئین میں بھی اصلاح کرے چنانچہ عالمگیر نے قریب قریب ہر محکمے کے ضوابط میں ردو بدل کیا۔

ع[۱]۔ مغلوں سے پہلے اسلامی بادشاہ غیر مسلم مردوں سے ۱۰ تا ۴۰ سکہ سالانہ جزیہ لیتے تھے عالمگیر کے عہد میں ۳½ تا ۱۳ روپیہ سالانہ تک حسب حیثیت وصول کیا جاتا تھا جو تقریباً ۶ روپے اور ۲ روپے (سکہ انگریزی رائج الوقت) کے مساوی ہوا۔ دیکھو "اورنگ زیب" صفحہ ۸۰۔ ۱۱ مصنفہ لین پول۔ بحوالۂ منو کی۔

مالگزاری کے اکبری آئین میں بہت کچھ ترمیم کی اور اس اصلاح کا یہ فائدہ ظاہر ہوا کہ چند سال میں ہندوستان کی جمع مالگزاری ساٹھ کروڑ روپیہ (بحساب سکہ رائج الوقت انگریزی) سے اوپر پہنچی؛ دیگر محصولات کے متعلق ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جو غیر شرعی تھے وہ سب ایک قلم منسوخ کردیے گئے اور ان کی تعداد ستر سے بھی زیادہ تھی؛ اسی ضمن میں سالانہ دربار جشن سالگرہ کے موقعوں پر جو بیش قرار نذریں امرا کی جانب سے گزرانی جاتی تھیں، موقوف کردی گئیں اور اس کا خاص مدعا یہ تھا کہ ان امرا کو اپنے اپنے مقام پر ماتحتوں سے نذرانے وصول کرنے کی جسارت نہ ہوسکے کیونکہ اکثر اوقات یہ رسم رشوت لینے کا محض ایک مہذب پیرایہ بن جاتی ہے۔ اس قسم کے اصلاحات کے باوجود یہ کہنا دشوار ہے کہ تمام سلطنت میں رشوت اور زیادہ ستانی کا سدباب ہوگیا تاہم اتنا بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایسے حاکم کے زمانے میں جسے اپنی رعایا کی دادرسی کا ہر وقت خیال ہو جس کے دربار تک ہر شخص کی رسائی ہوسکتی ہو اور جو ہر مقام کی اطلاعیں خود سنتا اور ان پر احکام و ہدایات جاری کرتا ہو، یہ خرابیاں بہت کم ہوگئیں تھیں۔ اس عہد کے دیوانی عہدہ داروں ہی کے حالات دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دربار عالمگیری میں مرزا عبدالرحیم خاں خاناں اور نواب اعتماد الدولہ جیسے باذاق امیروں کے شاہانہ جاہ و جلال اسقدر مقبول نہ تھے جس قدر امانت خاں دیوان کی درویشانہ زندگی اور مرزا یار علی کے انکسار و بے غرضی کی قدر تھی کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جن کی دیانت و امانت، انصاف و غربا پروری اور اسی کے ساتھ انتظامی قابلیت مسلم تھی؛ خافی خاں کی تاریخ منتخب اللباب میں ایسے بہت فرشتہ سیرت اور قابل منتظم افراد کا ذکر ہے جن سے مصنف کو خود ملنے یا انکے حالات معلوم کرنے کا موقع ملا اور جو عالمگیر بادشاہ کے نہایت عزیز عہدہ دار تھے۔

راجپوتانے کی شورش ستنامیوں کے فساد کے سات آٹھ برس بعد راجہ جسونت سنگھ نے کابل میں وفات پائی۔ یہ راجہ تین چار دفعہ عالمگیر سے بے وفائی اور دشمنی کرچکا تھا۔ لیکن مجبور ہو کر جب کبھی اس نے معافی مانگی عالمگیر نے خطا بخش دی اور آخر میں اسے اپنے بیٹے کیساتھ کابل کی مہم پر مامور کیا۔ جب وہ اسکے ہمراہی راجپوت، صوبہ دار کابل کی اجازت لئے بغیر راجہ کے اہل و عیال کو لیکے

ہندوستان روانہ ہوگئے اور دریائے سندھ پر میر بحر نے روکنا چاہا تو لڑکر جبراً دریا کو عبور کرگئے، انکے دہلی پہنچتے پہنچتے بادشاہ کو ان حرکتوں کی اطلاع ہوگئی تھی لہذا حکم دیا کہ انھیں شہر کے باہر ٹھیرایا جائے اور تاحکم ثانی جسونت سنگھ کے اہل وعیال اپنے وطن کو نہ جانے پائیں۔ لیکن چند راجپوت سواروں نے اپنے جانے کی اجازت حاصل کرلی اور راجہ کے ایک بچے کو لیکر فرار ہوگئے اور اودے پور کے رانا کی پناہ لی۔ یہ رانا جزیے کا روپیہ ادا کرنے میں لیت ولعل کر رہا تھا اور اب اس نے جودھپور کے نافرمان راجپوتوں کی بھی حمایت کی۔ پس بادشاہ نے اجمیر کی جانب کوچ کیا اور ایک تعزیری فوج ریاست جودھپور کی طرف بھیجکر رانا کو لکھا کہ جزیہ دینے اور جودھپور کے سرکشوں کی مدد سے دست بردار ہونے میں دیر کی تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ لشکرِ عالمگیری اسقدر تیز بڑھا تھا کہ رانا مقابلے کی تیاری بھی نہ کرسکا۔ اس نے معتبر وکیل بھیجکر قصور کی معافی مانگی۔ جزیہ کے عوض میں اپنے دو پرگنے پیش کیے اور عہد کیا کہ جسونت سنگھ کے بچوں سے کوئی غرض نہ رکھونگا عالمگیر نے خان جہاں بہادر کو ان پرگنوں کے بندوبست اور تحصیل مال کیلیے راجپوتانے میں چھوڑا اور خود پایۂ تخت کو مراجعت کی۔ (۱۶۷۸ء)

اس سفر میں سات آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں لگے۔ لیکن دہلی پہنچے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اطلاع ملی کہ رانا اپنے قول سے پھر گیا اور جودھپور والوں سے مل کر علانیہ بغاوت پر آمادہ ہے؛ لہذا عالمگیر نے جو سفر کی زحمت، موسم کی تکالیف یا خطرات جنگ کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا، پھر فوج کشی کی اور چند ہفتوں میں اجمیر پہنچ گیا۔ رانا کی تادیب پر اس مرتبہ شہزادہ اکبر نامزد ہوا اور تہور خاں وغیرہ بعض تجربہ کار سردار اس نوجوان شہزادے کے ہمراہ بھیجے گئے اسی کے ساتھ شہزادہ محمد معظم کو دکن میں اور محمد امین صوبیدار کو احمد آباد میں فرمان بھیج دے گئے کہ اپنے اپنے مقام سے بڑھکر اودے پور کو گھیر لیں تاکہ رانا کسی طرف بچکر نہ جاسکے۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوا کہ رانا صدر مقام چھوڑکے پہاڑوں میں جا چھپا جودھپور و اودے پور کی متحدہ فوجیں اگرچہ تعداد میں کم وبیش پچیس ہزار تھیں اور بار بار دلیری سے مقابلہ کرتی رہیں، لیکن لشکرِ شاہی کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ مغلوں نے اودے پور کا تمام زرخیز علاقہ پامال کرڈالا کہ راجپوتوں کو اپنے کوہستانی دامنوں میں رسد ہی نہ پہنچ سکے اور وہ مجبور ہوکے ہتھیار ڈال دیں۔

جب نیزہ و تلوار سے مدافعت نہو سکی تو راجپوتوں نے مغل شہزادوں سے سازباز شروع کیا۔ محمد معظم نے ان کی استمالت پر کوئی توجہ نہ کی۔ البتہ محمد اکبر بادشاہی کے لالچ میں آگیا اور جودھپور کے باغی سردار درگاداس نے اسے وہ سبز باغ دکھائے کہ اس نے باپ سے بغاوت کی اور لشکر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس نوجوان شہزادے سے عالمگیر کو دغا کا احتمال نہ تھا اور اس نے اپنی قریب قریب تمام فوج دے کے اسے اودے پور بھیجا تھا۔ جب اس کے دشمن سے مل جانے کی خبر اجمیر آئی تو بادشاہ کے باقی ماندہ سپاہیوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کیونکہ اب اکبر اپنا لشکر اور کئی ہزار راجپوتوں کو لئے ہوئے باپ کے خلاف پیش قدمی کر رہا تھا۔

بااین ہمہ عالمگیر کی جبین استقلال پر شکن نہ آئی وہ اپنی فراست سے یہ بات سمجھ گیا تھا کہ لشکر شاہی کے بہت سے سردار اور سپاہی محض مجبوری سے باغی شہزادے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چنانچہ جب شہاب الدین جس کا بھائی شہزادۂ اکبر کے لشکر میں تھا اپنے بھائی کے پاس گیا تو وہ موقع پاتے ہی شہاب الدین کے ساتھ نکل آیا اور دونوں بھائی عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس واقعہ نے ادھر تو عالمگیر کی ہمت مضبوط کی اور ادھر باغیوں کے لشکر میں انتشار ڈالدیا۔ فوج کے اور سردار بھی اکبر کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کے عالمگیر کے حضور میں پہنچنے لگے حتیٰ کہ تہور خاں تک نے باغی شہزادے کی رفاقت ترک کی اور یہ حال دیکھ کر ان راجپوتوں کو بھی ساتھ دینے کی ہمت نہ رہی جن کے اغوا سے اکبر نے باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا غرض یہ کہ چند ہی روز میں یہ باغی شہزادہ بے یار و مددگار رہ گیا۔ اس نے مرہٹوں کے علاقے میں بھاگ کر جان بچائی (۱۶۸۱ء) اور وہاں بھی اطمینان نہ ملا تو جہاز میں بیٹھ کر بہ ہزار دشواری ایران چلا گیا اور پھر کبھی اسے وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

اس تمام فساد کا اصلی بانی درگاداس اور غالباً وہ بھی شہزادہ اکبر کے ساتھ ہی راجپوتانے سے نکل گیا اور باقی راجپوت سرداروں نے رفتہ رفتہ اطاعت قبول کر لی۔

رانائے اودے پور کو پہاڑوں میں بھی پناہ نہ مل سکی وہ ہر طرف سے اسطرح

گھر گیا تھا کہ مجبور ہو کر اس نے شہزادہ محمد اعظم سے شفاعت کرائی۔ عالمگیر نے شاہانہ درگزر سے کام لیا۔ رانا کی خطا معاف ہوئی اور جزیے کے عوض دو پرگنے لیکر اسے دربار کے پنج ہزاری امیروں میں شامل کر لیا گیا۔ (۱۶۸۰ء) چند ماہ کے بعد اس رانا نے وفات پائی تو اس کے بیٹے جے سنگھ کو خلعت و خطاب راجگی عطا ہوا۔ اس کے تین بھائی[۱] دکن کی لڑائیوں میں آخر تک عالمگیر کے ہمرکاب رہے اور انھوں نے اپنی جانبازی اور جنگی کارگزاریوں کے صلے میں سہ ہزاری و پنج ہزاری منصب پر ترقی کی۔

---

[۱] یعنی راجہ بھیم سنگھ، اندر سنگھ اور بہادر سنگھ۔ ۱۲

باب دوازدہم

مرہٹے اور دکن میں عالمگیر کی فتوحات

راجپوتانے کی شورش رفع دفع ہوئے تھوڑی مدت گزری تھی کہ سیواجی کے جانشین سنبھاجی نے برہان پور پر چھاپہ مارا اور شہر پناہ کے باہر جو محلے آباد تھے انھیں لوٹ کر آگ لگادی، اس کے باپ نے اپنے عروج کے زمانے میں بیسیوں شہر اور پرگنے تاراج کئے لیکن اورنگ آباد و برہان پور پر کبھی ہاتھ نہ ڈالا تھا اور کسی نے یہ صلاح بھی دی تو اس نے ہمیشہ انکار کیا، اور یہی کہا کہ اگر ان شہروں پر ہم نے حملہ کیا تو بات بہت بڑھ جائے گی اور عجب نہیں کہ خود بادشاہ ہم پر فوج کشی کرے اور نہ معلوم اس کا انجام کیا ہو۔[1] دور اندیش سیوا کا قیاس غلط نہ تھا۔ سنبھاجی کی تاخت کے بعد جب علما و شرفائے برہان پور کی عرضداشت عالمگیر کے پاس پہنچی کہ اب اس مقام میں مسلمانوں کو امن و اطمینان سے بسنا دشوار ہو گیا ہے تو دکن کے صوبہ دار خانجہاں بہادر پر سخت عتاب نازل ہوا اور جنوبی فتنوں کا قرار واقعی سدباب کرنے کی غرض سے جن کا مدت سے خیال تھا، خود عالمگیر نے دکن کی تیاری کی۔ ۱۶۸۱ء

قوم مرہٹہ اور سیواجی مگر بادشاہ کے دکن پہنچنے سے قبل ضروری ہے کہ مرہٹوں کی

[1] منتخب اللباب۔ جلد دوم صفحہ ۲۷۲۔

نوخیز قوم اور ان کے نامی سورما سیواجی کے حالات بیان کر دیے جائیں جس کا داداد امالوجی بھونسلا دولت آباد کے قریب ایلورہ گاؤں میں آبسا تھا اور ملک عنبر کی فوج میں ترقی کرکے ایک معزز عہدہ پر سرفراز ہوا؛ یہی زمانہ ہے (اوائل گیارھویں صدی ہجری) جس کی تاریخوں میں پہلی مرتبہ مرہٹہ سپاہیوں کا بار بار نام آتا ہے اور ہم انھیں نظام شاہیوں کی طرف سے مغلوں کے ساتھ لڑتے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ نسل کے اعتبار سے دراوڑی ہیں لیکن ان میں اور جنوب کی دراوڑی قوموں میں بڑا فرق زبان کا ہے کیونکہ مرہٹے آریائی زبان بولتے ہیں اور دکن کے باقی سب قدیم باشندوں کی زبانیں "دراوڑی" ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آریا لوگ یہاں تک نہیں آئے تو کم سے کم انکا تمدن ضرور یہاں پہنچ گیا تھا؛ بہرحال یہی خصوصیت (یعنی مرہٹی زبان) مرہٹوں کی وجہ امتیاز ہے اور جہاں تک مرہٹی بولی جاتی تھی اس تمام علاقہ کو مہاراشٹر یعنی مرہٹوں کا وطن کہا جاسکتا ہے۔ سرسری طور پر اس علاقے کے حدود اربعہ شمال میں کوہ ست پڑا مغرب میں بحیرہ عرب اور مشرق میں بان گنگا کو قرار دیسکتے ہیں اور یہ ندی جس مقام پر وردھا سے ملی ہے اگر وہاں سے ایک ترچھا خط جنوب مغرب کی طرف کھینچیے جو بیدر بیجاپور سے گذر کر گوا کے اوپر ساحل سے مل جائے تو یہ گویا مہاراشٹر کی جنوب مشرقی سرحد بن جائے گی؛

مرہٹوں کے اس کوہستانی وطن کا شمالی حصہ ریاست احمد نگر میں تھا اور جنوبی ٹکڑا بیجاپور ریں۔ اکبر و جہانگیر کے عہد میں ان دولتمند ریاستوں کو بڑی بڑی فوجیں مہیا کرنی پڑیں۔ کیونکہ گو ان میں آئے دن باہم لڑائی رہتی تھی لیکن شمال کے جن دشمنوں سے اب سابقہ پڑا وہ کہیں زیادہ قوی تھے اور انھیں روکنے کے لئے بہت زیادہ سعی و سامان کی ضرورت تھی۔ محل وقوع کے لحاظ سے اول ریاست احمد نگر مغل ترکتازوں کی زد میں آئی اور وہیں کے نامور سپہ سالار ملک عنبر نے مدافعت کے لئے جرار فوج مرتب کی اور اسے "قزاقانہ جنگ" کے گر سکھائے۔ کیونکہ مغل سپاہیوں کے سامنے جم کر لڑنا دشوار تھا اور دکن کے ہلکے پھلکے جوانوں کی جیت اسی میں تھی کہ اچانک غنیم کے لشکر پر آپڑتے تھے اور لڑ بھڑ کے اسطرح منتشر ہو جاتے تھے کہ یہاں کی پہاڑی علاقوں میں ان کا تعاقب نہ ہوسکتا تھا اور وہ تھوڑی دیر میں پھر اکھٹے ہو کر چھاپہ مار جاتے۔

ایسے گریز پا دشمن کے مقابلے میں مغلوں کو ہمیشہ پریشانی اور کبھی کبھی سخت زکیں نصیب ہوئیں۔

اسی ضمن میں، محاربات دکن کا مطالعہ کرنے والوں کو چند باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

(۱) مہم لانے کے لئے مغل بادشاہوں کو شمالی ہندوستان کے باشندوں کو بھرتی کرنا پڑتا تھا اور ان کے وطن سے دکن صدہا میل دور کئی مہینے کا سفر تھا۔

(۲) یہ طولانی راستہ ایسے دشوار گزار و غیر آباد خطوں سے گزرا ہے کہ ایک بڑے لشکر کے دہلی اور آگرے سے کابل یا بنگالے پہنچنے میں اتنی دشواری نہ تھی جس قدر کہ دکن آنے میں پیش آتی تھی؛

(۳) دکن کی اسلامی ریاستیں مستقل سلطنتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دولت اور ساز و سامان کی ان میں کمی نہ تھی۔ رعایا میں سے ہر شخص جسے ڈھال تلوار دیدی جائے سپاہی کا کام دے سکتا تھا' لہذا مغل بادشاہوں کو ان سے لڑنے کے لئے شمالی ہندوستان سے بہت بڑی فوج لانی پڑتی تھی؛

(۴) اتنی بڑی فوج زیادہ عرصے تک اپنے وطن سے دور دکن میں رہ نہیں سکتی تھی اور اگر وہیں کے باشندوں کی فوج مرتب کی جائے تو اس کی سپہ سالاری پر کسی سردار یا شہزادے کو مقرر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا اور خود بادشاہ اپنا شمالی علاقہ چھوڑ کر زیادہ عرصے تک دکن میں نہ رہ سکتے تھے؛

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ تھا کہ دو دو چار چار سال کے بعد مغل فوجیں حملہ کرتی تھیں، دشمنوں کو بڑے بڑے مقامات سے نکالنے اور شکستیں دینے کے بعد جا بجا مغل قلعہ دار مقرر کر دئے جاتے تھے اور ان کے پاس تھوڑی سی جمعیت چھوڑ دی جاتی تھی کہ امن عام اور وصول مالگزاری کا انتظام رکھے لیکن خود بادشاہ اور انکی فوج کا بڑا حصہ واپس چلا جاتا تھا اور شکست خوردہ دشمن کو موقع مل جاتا تھا کہ وہ جمع ہو کر مغل قلعہ داروں کو نکال دیں اور ملک پر پھر قابض ہو جائیں۔

شاہجہاں کے زمانے تک معاملات کی یہی صورت رہی اور نظام شاہیوں کا زور ٹوٹ گیا تو بیجاپور و گولکنڈے سے جنگ چھڑ گئی۔ مگر مغلوں کی یہ مہم فوج کشی کا

سب سے اہم نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ شمالی دکن کا بچہ بچہ سپہگری کے فن سے آشنا ہو گیا، دولت آباد اور کھڑکی یا اورنگ آباد پر مغلوں نے قبضہ کر لیا۔ نظام شاہی خاندان کا آخری وارث گوالیار کے شاہی زندان میں بھیجدیا گیا، ملک عنبر کی ساختہ پرداختہ فوجیں منتشر کردی گئیں ملک میں امن و امان کی منادی ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن جن مرہٹہ کسانوں کو لڑائی اور لوٹ مار کی چاٹ پڑگئی تھی، انھیں اب پاؤں توڑ کے اپنے جھپروں کے نیچے بیٹھنے یا خاموشی سے ہل چلانے میں لطف نہ آتا تھا اور بہت سے نچلے جنھیں بیجاپوری یا مغلیہ افواج میں نوکری نہ ملی آس تکتے تھے کہ جب موقع ملے درانتی پھینک کر برچھی اور تلوار ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ نظام شاہی سلطنت کے خاتمے پر جب انھی کے ایک ہموطن سردار نے اس وقت کی عام بدامنی سے فائدہ اٹھایا اور ایک بچے کو نظام شاہی خاندان کا وارث بنا کر ملک عنبر کی طرح اپنی حکومت جمانی چاہی تو اس کی بے سروسامانی کے باوجود ہزاروں بے سرے سپاہی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور احمد نگر کے غیر آباد مغربی اضلاع پر اس کا عمل دخل ہو گیا۔

ساہوجی بھونسلا یہ سردار جس نے نظام شاہی کے مردہ قالب میں پھر جان ڈالنے کی کوشش کی، مالوجی کا بیٹا ساہو یا شاہ جی بھونسلا تھا اور دولت آباد کے دیسکھ جادو رائے کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس رشتے نے ساہوجی کا اثر بڑھا دیا کیونکہ ان دنوں دیسکھ بڑے بارسوخ جاگیردار ہوتے تھے اور سرکاری مالیہ وصول کرنے کی خدمت وہی انجام دیتے تھے جس کے صلے میں انھیں مالگزاری کا دسواں یا کچھ زیادہ حصہ مل جاتا تھا؛ اس کے علاوہ جادو رائے ملک عنبر کی فوج میں معزز عہدہ رکھتا تھا اور اس لئے جب وہ مغلوں سے آملا تو اس کی اور اس کے بعد اس کے داماد ساہوجی کی مغلوں نے بہت قدر کی اور تھوڑے ہی دن بعد جنگی کارگزاری کے صلے میں شاہجہاں نے ساہوجی کو پنجہزاری منصب اور کئی پرگنے بطور جاگیر عطا کئے جو دراصل ملک عنبر مرحوم کی جاگیر میں داخل تھے لیکن جب سال آیندہ عنبر کے بیٹے فتح خاں نے نظام شاہیوں کی رفاقت ترک کی اور شاہجہاں کے دربار میں آیا تو وہ پرگنے ساہو سے لیکر فتح خاں کے نام لکھدئے گئے اور یہ بات ساہو کو نہایت شاق گزری اور اس نے ریاست بیجاپور کی مدد سے مغلوں کے خلاف

علم سرکشی بلند کیا۔ ۱۶۴۵ء

اہل بیجاپور کا نظام شاہیوں کو مدد دینا اور ان سے شاہجہاں کی لڑائیوں کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں اور اسی مقام پر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جب شاہجہان نے دولت آباد پہنچ کر بیجاپور پر لشکر کشی کی تو ایک حصہ فوج ساہو کی سرکوبی پر مامور ہوا اور آخر میں محمد عادل شاہ بیجاپور نے خراج دیکر صلح کی تو ساہو کو بھی معافی کا پروانہ مل گیا ۱۶۳۶ء چنانچہ وہ آیندہ سے عادل شاہی سرکار کا ملازم ہو گیا اور دربار بیجاپور سے اسے پونا اور سوپا کے پرگنے جاگیریں عطا ہوئے۔ پھر شاہ بیجاپور کیطرف سے جنوب میں لڑنے گیا تو وہاں کے مفتوحہ علاقے (کرناٹک) میں بھی بعض مقامات انعام میں ملے اور یہ گویا اس کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا جس کے بعد نوجوان بیٹے کے سامنے خود اس کی شہرت ماند ہو گئی۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ گو ساہوجی کو احمد نگر میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی کیونکہ کمزور نظام شاہی کی بجائے وہاں اسی وقت طاقتور مغلوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ تاہم سب سے پہلے مرہٹہ سلطنت کا نقشہ اسی نے تیار کیا اور اسی کا منصوبہ تھا جسے سیواجی نے پورا کر دیا۔

سیواجی سارے ہندوستان کی اس مختصر تاریخ میں ساہوجی کے نامور بیٹے کے ابتدائی حالات لکھنا بے محل ہوں گے کیونکہ اول اول صرف ریاست بیجاپور کے ساتھ اس کا سابقہ رہا۔ تاہم مختصر طور پر یہ بتانا مناسب ہے کہ سیواجی ساہو کا چھوٹا بیٹا تھا ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا اور پونا میں پرورش پائی۔ طبعاً وہ سیر و شکار اور فنون سپہگری کا شایق تھا پہاڑوں کے بھیل اور کولی اس کے یار غار تھے اور سولہ سترہ برس ہی کی عمر میں قریب کے جنگل اور پہاڑ چھانتا پھرتا تھا۔ ایسے من چلے نوجوان پر اس کے بوڑھے استاد کی نگرانی کیا چل سکتی تھی۔ سیواجی نے بہت جلد رفیقوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر لی اور آس پاس کے قلعوں پر ہاتھ مارنے لگا واضح رہے کہ یہ چھوٹے قلعے ایسے غیر آباد و غیر معروف علاقے میں تھے کہ ریاست بیجاپور کے حکام ادھر زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔ سیواجی کو اپنی قوت بڑھانے کا موقع ملا۔ اور اس نے زیادہ دور دور کے قصبوں اور دیہات پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ ان مقامات کے حاکموں کی فریاد پر بیجاپور میں کوئی التفات نہ کرتا تھا اور ادھر سیواجی کی

عرضی پہنچتی کہ اس پرگنے کا انتظام خراب ہے اسے میرے سپرد کیا جائے تو سرکاری مالگزاری میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، ساتھ ہی سرکاری عہدہ داروں کو اس کی طرف سے رشوتیں اور نذرانے پہنچ جاتے اور پرگنے کی سند مل جاتی تھی:

نظام شاہیوں کے ہاتھ سے برار نکلنے کے بعد دکن میں سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت بیجاپور کی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی انتظامی حالت سب ریاستوں سے بدتر تھی، اور سالہا سال تک وہ سیواجی کی دست برد کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ کوکن کے علاقے میں بارش کی کثرت، خراب آب و ہوا، ناہموار راستے اور گھنے جنگلوں کی وجہ سے انتظام رکھنا آسان نہ تھا اور پناہ کے یہی قدرتی مواقع تھے جن میں سیواجی نے مضبوط قلعے اور ایک زبردست جمعیت تیار کی تھی۔ دوسرے اوّل اوّل بیجاپور میں سب یہی سمجھتے رہے کہ یہ دست درازیاں ساہوجی کے ایما سے ہو رہی ہیں چنانچہ اسے ایک مرتبہ قید کر کے ایک حجرے میں بند کر دیا تھا اور اگر سیواجی مغل بادشاہ سے فریاد نہ کرے تو عجب نہیں کہ اسکے باپ کا اسی زنداں میں خاتمہ ہو جاتا، یہی پہلا موقع تھا جب کہ سیواجی کو مغلوں سے سابقہ پڑا اور اسکی درخواست پر شاہجہاں نے سیواجی کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور پنجہزاری منصب بھی عنایت کیا۔ یہ اسی قسم کی سیاسی مصلحت تھی جس کی بنا پر بیس سال پہلے اسی بادشاہ نے سیوا کے نانا جادو رائے اور پھر ساہوجی کو پنجہزاری منصب دیا تھا تاکہ وہ نظام شاہیوں سے برگشتہ ہو کر مغلوں کے ساتھ ہو جائیں۔ نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد عادل شاہی کی باری تھی اور سیواجی کو پناہ دینا حقیقت میں ریاست بیجاپور کی قوت کو توڑنا تھا۔ عطائے منصب کے ساتھ شاہجہاں نے بیجاپور لکھ کر ساہوجی کو بھی قید سے نجات دلوائی گو وہاں ابھی تک اس پر نگرانی رکھی جاتی تھی اور اسی کے قید یا قتل کر دئے جانے کا خوف تھا کہ کئی سال تک سیواجی نے کوئی تازہ ہنگامہ بپا نہیں کیا بلکہ اپنی مقبوضہ جاگیر ہی میں فوج اور قوت بڑھاتا رہا:

۱۶۵۵ء میں محمد عادل شاہ نے وفات پائی۔ درباریوں نے سکندر علی عادل نام ایک لڑکے کو تخت پر بٹھایا۔ اس کا نسب کسی قدر مشتبہ تھا اور یوں بھی امرائے بیجاپور میں مل کر حکومت چلانے کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ غرض تمام کاروبار میں سخت ابتری پیدا

ہوگئی۔ ادھر مغلوں نے خراج طلب کیا اور شاہ جہاں کے حکم سے شہزادہ اورنگ زیب نے لشکر کشی کی۔ اس نازک وقت میں وہاں کوئی ملک عنبر جیسا باتدبیر سردار نہ تھا کہ عادل شاہیوں کی ڈوبتی ناؤ کو چند روز اور ترا لیتا۔ مغلوں کی کوئی مزاحمت نہ ہو سکی اور انھوں نے خاص پائے تخت کو آکے گھیر لیا۔ لیکن اسی زمانے میں شاہجہاں بیمار ہوا سلطنت کی باگ دارا شکوہ نے ہاتھ میں لی اور چونکہ منجھلے بھائی سے شدید حسد رکھتا تھا، حکم دیا کہ افواج شاہی بیجاپور کا محاصرہ چھوڑ کے ہٹ آئیں چنانچہ سپہ سالار مہابت جنگ اور راجہ ستر سال اورنگ زیب کی بغیر اجازت بادشاہی سپاہ کو لے کے واپس روانہ ہوگئے اور شہزادہ کو مجبوراً صلح کر کے محاصرے سے دست بردار ہونا پڑا (۱۶۵۶ء)

اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنی دکنی فوج کو ساتھ لے کر شمال کی طرف کوچ کیا اور تخت ہند کے لئے بھائیوں میں وہ لڑائیاں شروع ہوگئیں جن کا ذکر ہم پہلے پڑھ آئے ہیں سیواجی کو اپنی قوت بڑھانے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا کہ ایک طرف سلطنت مغلیہ میں خانہ جنگی بپا تھی اور ادھر بیجاپور کی ریاست کا انتظام درہم برہم ہو رہا تھا چنانچہ اس نے دور دور چھاپے مارے، نئے قلعے تیار کرائے اور کئی پرگنوں پر قابض ہوگیا۔ آخر دربار بیجاپور کو ہوش آیا اور ۱۶۵۷ء میں سپہ سالار افضل خاں سیواجی کے استیصال پر مامور ہوا۔ واضح رہے کہ ابھی تک سیواجی اور اس کے رفیق کھلے میدان کے مرد نہ تھے انھیں بے خبری میں چھاپہ مارنا یا نہتے دشمن کو لوٹ لینا آتا تھا لیکن سامنے نکل کر مقابلہ کرنے سے ان کا پہلا استاد ملک عنبر تک جی چراتا تھا۔ سیواجی کو سوا اس کے کچھ نہ بن آئی کہ دھوکے سے افضل خاں کو مار ڈالا اور جب دو سال بعد خود سکندر علی عادل شاہ نے اس پر فوج کشی کی تو بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ گیا مگر اس کی تقدیر کی خوبی سے انھی دنوں بیجاپور کے سپہ سالار شیدی جوہر نے بغاوت کی۔ سکندر شاہ کو پوری قوت سے ادھر متوجہ ہونا پڑا۔ سیواجی کو پھر اپنے علاقے میں آنے اور طاقت بہم پہنچانے کی فرصت مل گئی۔

مغلوں سے لڑائی

الفنسٹن کے قول کے بموجب اب ۱۶۶۱ء میں پونا کے شمال سے میٹرچ کے جنوب تک تمام علاقہ سیواجی کے قبضے میں آگیا جس کا طول ڈیڑھ سو میل سے زیادہ اور (بڑے سے بڑا) عرض سو میل کے قریب تھا۔

اور فوج کی تعداد بڑھ کر سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ ہو گئی تھی[1]۔

لیکن ابھی تک یہ فوج کوئی باقاعدہ تنخواہ دار سپاہیوں کی جماعت نہ تھی اور نہ ملکی مدافعت یا قیام امن اس کا مقصود تھا۔ اور یہ بھی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اتنا چھوٹا علاقہ اتنی بڑی سپاہ کے مصارف برداشت نہ کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیواجی کے جھنڈے کے نیچے ہزاروں ایسے آدمی جنھیں کہیں نوکری نہ ملتی تھی یا جو لوٹ مار پر گزارہ کرتے تھے؛ جمع ہو گئے تھے اور یا مرہٹہ کسانوں کا گروہ تھا جو چھ مہینے کھیتی باڑی کرتے اور باقی وقت سیواجی کی ترکتازوں میں اس کے ساتھ ہو جاتے۔ لوٹ میں جو کچھ ہاتھ آئے وہی ان کی تنخواہ تھی اور اول اول ہمسایہ علاقوں کی دست برد ہی ان کی وجہ معاش رہی۔

القصہ جب ساہوجی کی کوشش سے ریاست بیجاپور کے ساتھ سیواجی کی صلح صفائی ہو گئی تو اب فوج کے گزارے کے واسطے ضروری ہوا کہ مغلوں کے علاقے لوٹے جائیں چنانچہ مرہٹوں نے ۱۶۶۳ء میں صوبہ اورنگ آباد کے کئی پرگنے لوٹ لیے اور عالمگیر کے صوبہ دار امیر الامرا شائستہ خاں کو یہ فتنہ فرو کرنے کی غرض سے خود فوج کشی کرنی پڑی۔ اسی موقع پر مورخ خافی خاں کا باپ امیر الامرا کے ہمراہ تھا اور مہم کے متعلق اس عینی شاہد کا بیان بجنسہ موجود ہے۔ جیسا کہ خیال تھا، سیواجی سے کسی میدانی جنگ کی نوبت نہ آئی اور شائستہ خاں نے چند ہفتے میں مرہٹوں کے لوٹ مار کرنے والے دستوں کو جابجا گھیر کر ہتھیار رکھوا لیے۔ کوکن کے تمام بڑے قلعے (سوپہ، سیوا پور، چاکنا) افواج بادشاہی کے قبضے میں آ گئے، امیر الامرا نے پونہ کو فتح کر کے خاص ساہوجی کی حویلی میں قیام کیا۔ سیواجی کو اب کہیں نجات کی امید نہ رہی تھی۔ لہٰذا ایک اندھیری رات کو چھپ کر شہر میں آ گیا اور کھڑکی توڑ کر اس کے ساتھی حویلی کے اندر گھس گئے کہ سوتے میں امیر الامرا کا کام تمام کر ڈالیں۔ ان کی مراد پوری نہ ہوئی امیر الامرا شائستہ خاں بچ گیا۔ لیکن اس واقعے کی خبر بادشاہ کو پہنچی تو امیر الامرا کو بنگالے بھیج دیا گیا اور صوبۂ دکن پر شہزادہ محمد معظم نامزد ہوا۔

اس عزل و نصب سے بادشاہی انتظامات میں خلل پیدا ہو گیا۔ امیر الامرا کی

[1] "تاریخ ہندوستان" مولفہ الفنسٹن (بحوالہ گرانٹ ڈف) صفحہ ۶۰۸ - ۱۲

متعینہ فوجیں اورنگ آباد ہٹ آئیں اور سیواجی کو پھر اس قدر آزادی مل گئی کہ اس کا باپ فوت ہوا تو اس نے راج گڑھ میں مسند نشینی کا جلسہ کیا اور اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا جو خود مختاری کی سب سے نمایاں علامت مانا جاتا تھا۔ پھر اسی خود مختاری کی شان دکھانے کی غرض سے اس نے اچانک سورت پر حملہ کیا اور سوداگروں کی دکانیں، حاجیوں کے جہاز غرض جس پر ہاتھ پڑ سکا، لوٹ کر لے گیا۔ عالمگیر کو اطلاع ہوئی تو حکم ہوا کہ راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کی سرداری میں دکن پر فوج کشی کی جائے۔

دکن کی پہلی مہم

یہ پہلی مہم ہے جو عالمگیر کے زمانے میں دکن روانہ ہوئی۔ درحقیقت پہلے سیواجی کی حیثیت محض ایک سرکش جاگیردار کی تھی اور اب اسے مستقل راجہ ہونے کا دعویٰ ہو گیا تھا۔ دوسرے اب اس نے ساحل پر تاختیں شروع کر دی تھیں اور نہ صرف بحری آمد و رفت مخدوش ہو گئی تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ سورت بھی جو ان دنوں "باب مکہ" کے نام سے مشہور تھا، مرہٹوں کی دست درازی سے محفوظ نہیں رہا۔ یہاں یہ صراحت کر دینی چاہیئے کہ سیواجی نے محض روپے کی لالچ سے حاجیوں کے جہاز لوٹے ورنہ اسے مسلمانوں سے کسی قسم کی مذہبی عداوت نہ تھی اور وہ قرآن مجید اور مسجدوں کا خاص احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ بہر حال عالمگیر اس قسم کا بادشاہ نہ تھا کہ اپنے ملک میں ایسی لوٹ مار کو گوارا کر لیتا دوسرے اسے اہل بیجاپور کی بھی تنبیہ مقصود تھی جو مقررہ خراج کے ادا کرنے میں ہمیشہ لیت و لعل کرتے رہتے تھے۔

عالمگیر کو بہت اچھے فوجی سردار ملے تھے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ خود بے مثل سپہ سالار اور اچھے سپاہی کا قدرشناس تھا۔ غرض اب جو مہم دکن روانہ ہوئی اس کی سپہ سالاری پر ایسے ہی منتخب سردار مقرر ہوئے جن کی شجاعت و قابلیت مسلم تھی۔ اور گو سیواجی کی قوت اس وقت انتہائے عروج پر پہنچ گئی تھی لیکن وہ اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ۱۶۶۵ء میں راجہ جے سنگھ پونا میں داخل ہو گیا۔ دلیر خاں نے چند ہزار فوج سے مرہٹوں کی نئی ریاست کو پامال کر ڈالا۔ پانچ مہینے کے اندر اندر صرف دو قلعے سیواجی کے پاس رہ گئے جن میں سے ایک (یعنی راج گڑھ) میں وہ خود محصور تھا اور دوسرے میں اس کے خاندان کے آدمی گھر گئے تھے۔ محاصرین جس شد و مد سے

برج توڑنے اور فصیلیں گرانے میں مصروف تھے اسے دیکھ کر ان قلعوں کی تسخیر میں بھی چند روز کی دیر نظر آتی تھی۔ سیواجی نے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور تنہا جے سنگھ کے پاس حاضر ہو گیا۔

سیواجی کا امان مانگنا

اول اول راجہ جے سنگھ نے سیواجی کی منت سماجت پر کوئی توجہ نہ کی تھی بلکہ جب وہ امان مانگنے تنہا لشکر شاہی میں آیا تو مسلح راجپوت مقرر کر دیے کہ اس سے خبردار رہیں پھر استقبال کے لئے صرف اپنے منشی کو بھیجا اور یہ پیام دیا کہ اگر بلا شرط اطاعت منظور ہو تو یہاں آئے ورنہ اجازت ہے کہ وہیں سے واپس چلا جائے۔ سیواجی نے جواب دیا کہ اطاعت و عبودیت کے سوا مجھے امان کی اور کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ تب راجہ نے بعض او معززین کو بھیج کر آبرو کے ساتھ اپنے پاس بلایا اور اس کی بہت کچھ خاطر و دلدہی کی۔ پھر دربار شاہی سے فرمان جاں بخشی صادر ہوا تو ان شرائط پر سیواجی کو امان دی گئی کہ ۳۵ قلعوں میں سے ۲۳ قلعے اور اپنا سب سے اچھا علاقہ بادشاہ کے حوالے کر دے اور جس وقت سرکاری کام کے لئے طلب کریں حضور میں حاضر ہو جائے۔ باقی ۱۲ چھوٹے قلعے اسی کے ماتحت چھوڑ دیے گئے۔ دربار مغلیہ کے دستور کے مطابق اس کے ہشت سالہ بیٹے سنبھاجی کو مناسب جمعیت کے ساتھ لشکرِ شاہی میں رکھ لیا گیا اور جے سنگھ کی سفارش پر پنجہزاری منصب عطا ہوا۔[1]

اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد بادشاہی افواج نے بیجاپور کا رخ کیا اور وہاں کی لڑائیوں میں سیواجی سے بہت مدد ملی۔ اسے بادشاہ کی طرف سے خوشنودی کا پروانہ حاصل ہوا۔ پھر جشن سالانہ میں شرکت کی غرض سے ۱۶۶۶ء میں وہ اور سنبھاجی آگرے روانہ ہوئے قریب پہنچے تو جے سنگھ کے بیٹے رام سنگھ کو جو دربار میں اپنے باپ کا قائم مقام تھا استقبال کی غرض سے بھیجا گیا۔ پھر نذر قبول کرنے کے بعد امرائے پنجہزاری میں جگہ دی کیونکہ اب تک سیواجی کو کوئی منصب عطا نہیں ہوا تھا اور راجہ جے سنگھ بھی اپنے خطوں میں اس قسم کی کوئی تصریح نہ کی تھی دوسرے

---

[1] یہ تمام بیان خافی خاں کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۵۔ ۱۲

پنجہزاری صرف اول درجے کے امرا کا منصب مانا جاتا تھا اور وزیر اعظم فاضل خاں یا سپہ سالار دلیر خاں جیسے نامور درباری بھی اس سے بڑھ کر مرتبہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن سیواجی کو اس سے زیادہ اعزاز کی امید تھی اور غالباً[1] اپنے بیٹے کے پنجہزاری ہو جانے کی وجہ سے یقین رکھتا تھا کہ مجھے اس سے بڑا منصب ملیگا، حالانکہ شروع میں کسی باشاہی سردار کو اس سے بڑا منصب نہیں دیا جاتا تھا اور مآثر[2] عالمگیری کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اس اعزاز کا پورا خیال تھا اور وہ جب دربار سے بلا خلعت ملے رخصت ہوا تو اس وقت بھی عالمگیر نے رام سنگھ کو اس کی مہانداری کرنے کا حکم دیا اور اسی وقت راجہ جے سنگھ کو یہ کیفیت لکھواکر مشورہ طلب کیا۔ پھر یہ کہ گو دکن سے جواب آنے تک سیواجی دربار میں حاضر نہ ہو سکتا تھا بلکہ اس کی نگرانی رکھی جاتی تھی، تاہم اس کے بیٹے کو باریابی کی اجازت تھی۔

سیواجی کی فراری

باایں ہمہ سیواجی کی آزاد مزاجی ایسی پابندیاں گوارا نہ کرسکتی تھی۔ وہ جل دے کے آگرے سے نکل گیا اور غیر معروف راستوں سے چھپ چھپ کے نو مہینے میں پھر دکن آپہنچا۔

حیدرآباد میں ان دنوں ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا تھا اور اسی کی فوج اور جنگی ساز و سامان کی مدد لے کے سیواجی نے پھر بیجاپور و دکن کے کئی قلعے فتح کر لئے اور مغلوں کے ساتھ یہ پہلی دشمنی تھی جو تاناشاہ کی طرف سے ظہور میں آئی؛ بادشاہی فوجیں بیجاپور کے محاصرے میں مصروف تھیں اور اسی وجہ سے نہ یہ ریاست سیواجی کی روک تھام کر سکی نہ راجہ جے سنگھ وہاں سے فوجیں ہٹا سکا کہ پچھلے معاہدے کے

---

[1] "غالباً اس لئے لکھا کہ سیواجی کو کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوگا کہ اس کے نانا جادو رائے کو پہلی مرتبہ شاہجہاں نے پنجہزاری منصب عطا کیا تو اسی کے ساتھ سیواجی کے باپ کو بھی یہی منصب ملا، حالانکہ سن و سال یا رسوخ و اقتدار کے لحاظ سے ساہوجی کا مرتبہ اپنے خسر کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ ۱۲

[2] وہ عبارت یہ ہے "به اشارۂ والا بر بساطِ قرب و منزلت باریافت و در مقامِ مناسب که جائے مقربانِ پیشگاهِ دولت بود با امرائے نامدار و خوینانِ رفیع مقدار دوش بدوش ایستاد۔"

مطابق جو علاقے اور قلعے مغلوں کے قبضے میں آگئے تھے، ان کی حفاظت ہو جاتی۔ غرض ہر طرف میدان خالی پا کر دوبارہ سیواجی نے قریب قریب اسی قدر علاقہ حاصل کر لیا جس قدر کہ جے سنگھ کی مہم سے پہلے اس کے پاس تھا۔ (۱۶۶۹ء)

سیواجی کا آخری زمانہ

اسی زمانے میں راجہ جے سنگھ نے وفات پائی اور دکن کا ملکی اور جنگی انتظام شہزادہ معظم اور راجہ جسونت سنگھ کے سپرد ہوا۔ سیواجی نے انھی سرداروں سے پھر صلح کرنی چاہی اور پھر اپنے بیٹے سنبھاجی کو شہزادے کی خدمت میں اورنگ آباد بھیجا اور اب کے اُسے پنجہزاری منصب کے ساتھ صوبۂ برار میں جاگیر بھی عنایت ہوئی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ سیواجی کی پچھلی کارگزاریوں کے صلے میں جو کچھ خطا اس نے کی تھی معاف کر دی گئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس طرزِ عمل کے بعض اور اسباب بھی تھے۔ (۱) معظم کو سیواجی کے ساتھ نہ کوئی پرخاش تھی نہ اس کی کسی بدعہدی کا تجربہ ہوا تھا۔ دوسرے جسونت سنگھ سیواجی کا بڑا حامی اور سفارشی بن گیا تھا اور اس میں شبہ ہے کہ آیا یہ حمایت محض ملکی مصلحت پر مبنی تھی یا اس کی تہ میں رشوت ستانی اور بادشاہ کی بدخواہی بھی کچھ دخل تھا (۲) سیواجی کو افواجِ مغلیہ کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا تجربہ ہو چکا تھا۔ آگرے سے آنے کے بعد اس میں پہلا سا دم خم بھی ابھی نہ آیا تھا بس اس کو معاف کر دینے میں کچھ ہرج نہ نظر آتا تھا (۳) بادشاہی فوجیں کوکن و بیجاپور کے معرکوں میں لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں تازہ کمک ملے بغیر سیواجی پر دوبارہ لشکر کشی بہت دشوار تھی، خود بادشاہ سلامت افغانوں کی تنبیہ و تادیب میں معروف ہو گئے تھے۔ غالباً انھیں یہ پسند بھی نہ تھا کہ جسونت سنگھ جیسے ناقابلِ اعتبار سپہ سالار کے ماتحت کوئی تازہ مہم دکن پر بھیجی جائے، نہ شہزادہ معظم نے اس پر اصرار کیا۔ دوسرے معلوم ہوتا ہے بادشاہ کے نزدیک حاجیوں کو لوٹنے کی کافی سزا سیواجی کو مل گئی تھی اور وہ مغلوں کی طرف سے بیجاپوریوں کے خلاف شریکِ جنگ ہو کر اپنی اطاعت گزاری کا بھی ثبوت دے چکا تھا۔ اسی لئے جب دوبارہ اس نے صلح کی درخواست کی تو رعایت و رواداری کا مقتضیٰ تھا کہ اسے قبول کر لیا جائے اور تا امکان اپنی طرف سے فساد و خونریزی کی ابتدا نہ کی جائے۔

ادھر سے اطمینان حاصل ہوا تو سیواجی نے پھر اپنی اندرونی قوت بڑھانی شروع کی۔

ریاست کے ملکی اور دیوانی محکمے قائم کئے اور فوج کو نہایت خوبی سے از سرِ نو مرتب کیا۔ وہ بہت زیرک اور منتظم شخص تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے ساتھ اتنے دن رہ کر اسے عمدہ نظم و نسق اور آئین و ضوابط کی خوب واقفیت اور قدر ہوگئی تھی۔ اور اب وہ اپنی حکومت کو باقاعدہ بنانے پر آمادہ تھا۔ چنانچہ اس کی زندگی کا یہی آخری زمانہ ہے جس میں کوکن کے علاقے نے ایک منتظم ریاست کی شان حاصل کی اور مرہٹہ فوجیں بیجاپور و گولکنڈہ پر باقاعدہ حملوں کی مشق کرنے لگیں سیواجی نے جنگی کشتیوں کا بیڑا بھی تیار کیا تھا اور فرنگیوں اور حبشیوں سے اس کے بارہا بحری مقابلے ہوئے۔ جب چند سال میں دوبارہ اس کی قوت بحال ہوگئی تو اس نے پھر مغلوں کے علاقے تاخت و تاراج کرنے شروع کئے اور انھی لڑائیوں میں کبھی فتح کبھی شکست پاکر ۱۶۸۰ء میں وفات پائی اور مرہٹوں کی ایک قومی ریاست تیار کر گیا۔

عالمگیر کا ورود دکن میں

سیواجی کے بعد اس کا بڑا بیٹا سنبھاجی باپ کا جانشین ہوا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کا دشمن تھا بلکہ ہندو بھی اس کی سفاکی سے نالاں تھے۔ ایک مرتبہ بدچلنی کی وجہ سے اس کے باپ نے اسے قید کر دیا تھا اور اس نے بھاگ کر مغلوں کے لشکر میں پناہ لی تھی۔ راج کا مالک بنے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس نے نواحِ برہانپور کو لوٹ لیا اور وہاں کے شرفا نے بادشاہ سے فریاد کی جس کا اس باب کے شروع میں ذکر آچکا ہے۔ اس وقت راجپوت سرکشوں کا قلع قمع ہوچکا تھا۔ شہزادۂ اکبر نے بھاگ کر مرہٹوں کی پناہ لی تھی شمالی ہندوستان کی طرف سے اطمینان حاصل تھا۔ لہٰذا خود عالمگیر نے دکن کا رخ کیا۔ اور برہانپور ہوتا ہوا اورنگ آباد پہنچ گیا۔

راستے ہی میں شہزادہ معظم کو ایک فوج دے کے دکن کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا اور اس شہزادے نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنبھاجی کا تمام علاقہ پامال کر ڈالا۔ مرہٹوں کو کسی مقام پر مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ قزاقانہ طریق پر رسد لوٹنے کے سوا انھیں کوئی صورت مغلوں کو روکنے کی نظر نہ آتی تھی لیکن برسات کے زمانے میں لشکرِ شاہی میں وبا پھیل گئی اور ہزاروں آدمی اور گھوڑے ہلاک ہوگئے۔ رسد رسانی میں سخت دشواریاں پیش آنے لگیں۔ شہزادے کو احمد نگر واپس آنا پڑا (۱۶۸۴ء)

تسخیرِ بیجاپور

اس اثنا میں دربار بیجاپور و گولکنڈہ سے بھی مراسلت جاری تھی کیونکہ یہ دونوں ریاستیں خراج گزار ہونے کے باوجود مرہٹوں کو برابر مدد پہنچا رہی تھیں اور نہ اپنے عہد و پیمان کی پروا کرتی تھیں نہ شاہی تہدید و عتاب کی۔ آخر تنگ آکر عالمگیر نے شہزادہ محمد اعظم کو روانہ کیا کہ اہل بیجاپور کی تنبیہ کرے۔ اس شہزادے کی فوج تعداد میں کم تھی اور محاصرہ کرنے کی بجائے بیجاپور سے سترہ اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر خود محصور ہوگئی بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کو مدد کے لئے بھیجا گیا اور اسی نامور سپہ سالار کی شجاعت کی بدولت اندی کی جنگ میں لشکر بادشاہی کو فتح کامل حاصل ہوئی اور شہر بیجاپور کو گھیر لیا گیا۔ (۱۶۸۴ء)۔

لیکن اس وسیع قلعے کے اندر سامان خور و نوش اور فوج کی کمی نہ تھی محاصرے نے طول کھینچا، شہزادے کے رفیقوں میں نااتفاقی ہوگئی۔ عالمگیر کو خود جانا اور مغل سرداروں کو غیرت دلانا ضروری معلوم ہوا۔ بڑی دقت یہ تھی کہ شہزادہ معظم بھائی کی رقابت میں محصورین سے خفیہ ساز باز رکھتا تھا اور اس کے بعض ہمراز محصورین کی اعانت کر رہے تھے۔ بایں ہمہ عالمگیری انتظام کے سامنے محصورین کی پامردی چل سکی نہ بدخواہوں کی سازش۔ چند مہینے میں قلعہ فتح ہوگیا سکندر نے اطاعت قبول کرلی اور ماہ ذیقعدہ ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء میں ریاست بیجاپور سلطنت مغلیہ کا صوبہ بن گئی۔ بیجاپور کے مغلوب فرماں روا کا شاہانہ اعزاز و اکرام کیا گیا اور اس کے درباری بھی حسب مراتب مناصب و جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

ریاست گولکنڈہ سے معرکہ آرائی

لیکن مغلوں کی دشمنی میں گولکنڈے والے بیجاپوریوں سے بھی زیادہ سرگرم تھے۔ ابوالحسن تاناشاہ سیواجی کے زمانے سے مرہٹوں کا مددگار تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے ملکی معاملات میں کسی بات پر توجہ تھی تو وہ اسی پر کہ کسی طرح مرہٹوں کو ابھار کر مغلوں کا ملک تاراج کرایا جائے۔ ورنہ اس کا تمام وقت عیش و عشرت میں گزرتا تھا اور حکومت کی باگ مادنا پنڈت کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ شاہجہاں کے زمانے سے قطب شاہی سلطنت مغلوں کی خراج گزاری تھی اور عالمگیر کے سفیر ابوالحسن کو برابر اس کی حرکتوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔

لیکن ابوالحسن کی قسمت میں ذلت و رسوائی لکھی تھی۔ وہ کسی طرح مغلوں کی دشمنی سے باز نہ آیا اور بیجاپور کے محاصرے کے زمانے میں بھی اس نے سنبھاجی کے ساتھ سازش کر کے چالیس ہزار فوج تیار کی کہ ایک طرف سے وہ حملہ کرے اور دوسری طرف سے مرہٹے مغلوں پر حملہ آور ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے سنبھاجی نہ اتنا ہی وقوف تھا نہ اتنا دلاور کہ عالمگیر پر حملہ کرنے کی جرأت کرتا! البتہ بادشاہ کی عداوت میں مرہٹوں سے جو کچھ ممکن تھا اس میں انھوں نے کوتاہی نہ کی۔ سنبھاجی اپنی "فوج" سمیت گجرات پہنچ گیا اور وہاں کے غیر محفوظ شہر و دیہات کو لوٹ کر، تدارک ہونے سے پہلے اپنے علاقے میں بھاگ آیا۔ اُدھر گولکنڈے کے تیغ زن شاید پیش قدمی کرنے بھی نہ پائے تھے کہ خود افواج شاہی کے بڑھنے کی اطلاع ملی اور شہزادہ محمد معظم کو ابوالحسن کی تادیب پر مامور کر دیا گیا (۱۰۹۶ھ ۱۶۸۵ء)[1]۔

اس موقع پر یہ بات لکھنی فائدے سے خالی نہ ہوگی کہ گولکنڈے کے قطب شاہی سلاطین مذہباً شیعہ تھے اور دربار مغلیہ کے اکثر بڑے بڑے امرا ایرانی اور اسی فرقے کے پیرو تھے۔ بعض شیعہ مورخین کے بقول، خود شہزادۂ ولی عہد (یعنی محمد معظم) اس فرقے کا طرف دار تھا اور اسی لئے وہ اور بادشاہی امرا دل میں ابوالحسن کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور کوئی بھی اس کی ذلت کا خواہاں نہ تھا۔ لیکن ابوالحسن کی نالائقی اور عداوت چھپی ہوئی نہ تھی اور بار بار سمجھانے کے باوجود وہ مغلوں کی مخالفت سے باز نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ جب محمد معظم نے جنگ سے تا مقدور بچنا چاہا اور پیام دیا کہ (۱) مادنا کو معزول و مقید کر دیا جائے۔ (۲) سیڑم و رائے گیر کے بادشاہی پرگنوں سے جو قطب شاہی عہدہ داروں نے بلاحق دبا لئے تھے، دست برداری کر لی جائے۔ اور (۳) مقررہ پیشکش یا خراج کی باقیات ادا کر دی جائیں تو ابوالحسن اور اس کے سرداروں نے سخت جواب دیئے اور مقابلے کے لئے فوج روانہ کی۔ مختصر یہ کہ ابوالحسن کے ایرانی ہمدردوں کو بھی کوئی گنجائش ہمدردی کرنے کی باقی نہ رہی اور ناچار لڑنا پڑا۔ اس لڑائی کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا اور گو دکن کے سپاہی جان توڑ کے لڑے نیز شہزادہ معظم جنگ میں بھی

[1] خافی خان نے یہ اور اگلے واقعات ۱۰۹۴ھ و ۱۰۹۵ھ میں لکھے ہیں۔ ۱۲

ان کی اس قدر رعایت کرتا رہا کہ عالمگیر اس سے ناخوش ہو گیا۔ بایں ہمہ فتح وظفر نے لشکر عالمگیری کا ساتھ دیا اور آخر کار مغل فوجیں شہر حیدرآباد میں داخل ہو گئیں۔ ابوالحسن اور اس کے رفیقوں نے قلعۂ گولکنڈہ میں پناہ لی اور مجبور ہو کر پہلی شرائط پر امان طلب کی۔ مادنا پنڈت کو وزارت سے ہٹانا یا قید کرنا ابوالحسن کو شاق تھا سو اس مایۂ فساد کو تنگ آ کے خود اس کے دکنی امیروں اور خدمتگاروں نے مار ڈالا۔ غرض محمد معظم نے پھر رعایت سے کام لیا اور خراج سالانہ میں کچھ اضافہ اور انھی شرائط پر صلح کر کے حیدرآباد خالی کر دیا۔ سچ پوچھئے تو اتنی خونریزی اور لڑائیوں کے بعد اس قدر نرم شرطوں پر صلح کر لینا سلطنت کے ساتھ دشمنی کرنا نہ تھا بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ ابوالحسن کو سامان جنگ کرنے کی دوبارہ فرصت مل جائے تاہم عالمگیر نے بیٹے کی بات رد نہ کی اور سعادت خاں کو حیدرآباد بھیج دیا کہ حسب قرارداد خراج کا روپیہ وصول کر لائے۔

تسخیر گولکنڈہ

ابوالحسن خراج کا روپیہ ادا کرنے میں لیت ولعل کر رہا تھا اور بادشاہ کے نزدیک جب تک روپیہ ادا نہ ہو جائے معاہدۂ صلح مکمل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سعادت خاں کو عالمگیر برابر پیام بھیج رہا تھا کہ روپیہ وصول کرنے میں کوئی رعایت نہ کی جائے۔ اور اگر ابوالحسن دیر لگائے تو اس سے جس طرح ممکن ہو جواب صاف لے لیا جائے۔ مگر خافی خاں کی روایت کے بموجب ڈیڑھ دو سال تک سعادت خاں کو نہ روپیہ ملا نہ صاف جواب۔ یہاں تک کہ تسخیر بیجاپور کے بعد خود جہاں پناہ نے حیدرآباد کا رخ کیا اور ادھر سے بھی روپیہ ادا کرنے کی بجائے ابوالحسن نے چالیس پچاس ہزار فوج مقابلے کے لئے روانہ کی (۱۶۸۶ء)۔ یہ لکھنا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ گولکنڈہ کا آخری تاجدار اپنے سپہ سالاروں کو تاکید کر دیتا تھا کہ بادشاہ (یعنی عالمگیر) کو حتی المقدور زندہ گرفتار کر لانا اور یہ سردار جوش میں آ کے کہتے تھے کہ ہمارے دل میں اس کی جانب سے آگ بھری ہوئی ہے۔ ہم سے یہ رعایت کسی طرح نہ بن پڑیگی۔

لیکن یہ سب شیخی کی باتیں تھیں۔ میدان جنگ میں جم کر لڑنے کا ایک مرتبہ بھی انھیں حوصلہ نہ ہوا اور افواج شاہی منزل بہ منزل بڑھ کر حیدرآباد میں داخل ہو گئیں۔ قلعہ گولکنڈہ محصور کر لیا گیا۔ مضبوطی کے اعتبار سے اس قلعے کی تسخیر بیجاپور سے بھی زیادہ دشوار تھی۔

روپے پیسے اور لڑنے والوں کی بھی ابوالحسن کے پاس کچھ کمی نہ تھی اور جنگ کا ساز و سامان کرنے کی اسے کافی مہلت مل چکی تھی۔ دوسرے عالمگیر کے ایرانی امیر جنگ کے علانیہ مخالف تھے اور خود شہزادۂ ولی عہد سے ابوالحسن کے خفیہ نامہ و پیام جاری ہو گئے تھے۔ بارش کی کثرت اور رسد رسانی کی دقتیں محاصرین کی ہمت پست کئے دیتی تھیں کیونکہ گرد و نواح کے علاقوں میں پچھلی لڑائیوں کی وجہ سے زراعت ہی کم ہوئی تھی اور جو کچھ پیدا وار ہوئی بھی اسے محصورین یا بعد میں لٹیروں نے تلف کر دیا تھا۔ قلعہ گیری کی اس زمانے میں صرف دو تدبیریں تھیں۔ ایک تو یہ کہ سرنگ لگا کے فصیل اڑا دی جائے اور دوسری یہ کہ موقع پا کے کسی مقام پر کچھ لوگ اوپر چڑھ جائیں اور پھر تمام فوج اسی طرف سے یورش کر کے قلعے میں داخل ہو جائے۔ لیکن گولکنڈے کے برج و حصار کی مضبوطی اور وہاں کی توپوں کی آتش فشانی کے علاوہ بارش نے سرنگوں کے لگانے میں سخت ہرج ڈالا اور ادھر جب کبھی قلعے پر یورش کا منصوبہ کیا گیا تو اس کی اطلاع غداروں نے اہل قلعہ کو پہنچا دی اور وہ ہوشیار ہو گئے۔

لیکن حقیقت میں فتح و شکست کا فیصلہ فریقین کی اخلاقی قوت سے ہوتا ہے اور عالمگیر کو خطرات و مشکلات گویا اور کوشش کی تحریک دلاتی تھیں وہ ان دقتوں کو ماننے والا نہ تھا اور اگر ایک طرف سپہ سالار فیروز جنگ بہادر کو تسخیر قلعہ کے متعلق پیہم تدابیر و ہدایات پہنچ رہی تھیں تو دوسری طرف قطب شاہی علاقے کے انتظام کی درستی اور خرابیوں کی اصلاح کا کام بھی جاری تھا شہزادۂ معظم کو جس کی دشمن کے ساتھ سازش کرنے کی متواتر اطلاعیں ملیں، اس نے مجبور ہو کر حراست میں لے لیا اور بعض اہل سازش کو بھی سخت سزائیں دیں۔

آخر عالمگیری استقلال کے سامنے قطب شاہی اقبال نے حوصلہ ہار دیا۔ ابوالحسن کے امرا عاجز آ کر مغلوں کی اطاعت کرنے لگے تو وہ ان کا کوئی تدارک نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ عام روایت کے بموجب قلعے ایک نگہبان سردار نے خود دروازہ کھول کے محاصرین کو اندر لے لیا اور آٹھ مہینے دس دن کے محاصرے کے بعد گولکنڈہ مسخر ہو گیا (۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء) اور ابوالحسن کو شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ دولت آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ لوٹ مار میں ضائع ہونے کے باوجود ابوالحسن کا مال و املاک جو ضبطی میں آیا اس میں چھ کروڑ اسی لاکھ

سے زیادہ نقد اور کروڑوں روپے کے جواہرات اور طلائی ظروف تھے اور اسی واقعے سے ثابت ہے کہ خراج ادا کرنے میں تہی دستی اور بے زری کے جو عذر ابوالحسن پیش کرتا رہا وہ سب مصنوعی تھے اور عالمگیر نے صلح نامہ کی یہ شرط پوری نہ ہونے کو بنائے مخاصمت قرار دیا اور فوج کشی کی تو یہ نری زبردستی یا مظلوم کو بے وجہ ستانا نہ تھا بلکہ عہد شکنی کی سزا تھی جو نا عاقبت اندیش ابوالحسن کو بھگتنی پڑی۔

سنبھاجی کا حشر

گو عالمگیر کو اس عرصے میں مرہٹوں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوکن کی پہلی مہم اور بادشاہ کا دکن میں قیام ان کے سرداروں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا اور سنبھاجی کو اپنی دلچسپی کے لئے گھر ہی میں عیاشی کے بہت سے مشغلے مل جاتے تھے۔ حتیٰ کہ بیجاپور کے وہ جنوبی اضلاع جنھیں سیواجی نے وراثت کے دعوے سے باپ کی جاگیر کے ساتھ اپنے ملک میں داخل کر لیا تھا مرہٹوں سے چھن گئے اور سپہ سالار فیروز جنگ نے خاص راج گڑھ کی طرف پیش قدمی کی (۱۶۸۹ء)۔ نیز **مقرب خاں** (حیدرآبادی) نام ایک دلیر سردار کو خاص سنبھاجی کی تنبیہ کے لئے مامور کیا گیا۔ مقرب خاں ادھر آیا تو ان دنوں سنبھاجی سنگ میشور کے گھاٹ پر نہانے اور سیر کرنے آیا ہوا تھا اور یہی اطلاع پا کر مقرب خاں نے یلغار کی اور نہایت دشوار گزار پہاڑی راستے طے کر کے یک بہ یک اس طرح سنگ میشور پہنچ گیا کہ سنبھاجی کو بھاگنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اگرچہ بادشاہی سپاہ کی تعداد بہت کم تھی لیکن اس اچانک حملے نے مرہٹوں کو بدحواس کر دیا۔ وہ شکست کھا کے منتشر ہو گئے۔ سنبھاجی نے کسی مندر میں پناہ لی تھی اور نکل جانے کے ارادے سے ڈاڑھی منڈا کے بھیس بدل چکا تھا کہ اس کا پتہ چل گیا اور اسے دست و پا بستہ اپنے ہاتھی پر بٹھا کے مقرب خاں نے لشکر بادشاہی کی راہ لی۔ اس کی گرفتاری کی خبر بہت جلد ملک میں پھیل گئی اور خافی خاں جو ان دنوں دکن میں موجود تھا بیان کرتا ہے کہ جس گاؤں سے سنبھاجی گزرتا تھا وہاں کی عورتیں اور بچے تک باہر نکل کر اس کی گرفتاری پر خوشیاں مناتے تھے کیونکہ اس کے وحشیانہ افعال سے ہندو مسلمان ہزاروں آدمی نالاں تھے۔ دربار عالمگیری میں اوّل اوّل یہ رائے قرار پائی تھی کہ سنبھاجی کو قید کر دیا جائے لیکن سنبھا اور اس کے محبوب وزیر کب کلس (یا کالو شاہ) نے شاید ایسی عمر قید گوارا نہ کی اور مسلمانوں کو اتنی شدید گالیاں

دیں کہ عالمگیر نے انہیں سخت اذیت کے ساتھ جان سے مروا ڈالا۔ مقرب خاں کو اس کارنمایاں کے صلے میں خان زماں فتح جنگ کا خطاب اور بہت کچھ انعام و اعزاز عطا ہوئے۔ سنبھاجی کے بیٹے ساہو کو امرائے دربار میں داخل کر لیا گیا۔ اور عالمگیر نے اس لڑکے کی جس محبت و عنایت سے پرورش کی تھی اسے ساہو عمر بھر نہ بھولا۔

مرہٹہ حکومت کا استیصال

اس واقعے نے مرہٹہ ریاست کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا اور گو سنبھاجی کا بھائی رام راجا اس کی جگہ پر گدی کا وارث ہو گیا، تاہم سیواجی کی ریاست یا مرہٹوں کی فوج کو سنبھالنے کی اس میں قوت نہ تھی اور یہ کثیر سپاہ جس کے مصارف کا بڑا حصہ لوٹ مار کے مال سے پورا ہوتا تھا۔ اب دو تین گروہوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ چونکہ جنوبی دکن کے علاقوں میں ابھی تک امن و انتظام قائم نہ ہوا تھا اور یہاں کے زمینداروں کو بیجاپور اور گولکنڈے کی بد انتظامی نے مدت سے نہایت سرکش بنا رکھا تھا۔ لہٰذا عالمگیری عمال کے خلاف مرہٹوں کو ہر قسم کی مدد مل جاتی تھی اور ان کی فوج کے مذکورۂ بالا گروہ جہاں تہاں چھاپہ مارتے پھرتے تھے۔ پناہ کے لئے کوکن کے پہاڑ اور قلعے ان کے قریب تھے اور جنگی ساز و سامان اور سپاہ کی انہیں کچھ کمی نہ تھی غرض معلوم ہوتا تھا کہ بیجاپور کے بعد سلطنت مغلیہ کو ایک ساہوجی بھونسلا کی بجائے اس جیسے کئی باغیوں سے سابقہ ہے جن کے سپاہی قزاقانہ جنگ میں پہلے سے کہیں زیادہ مشاق و بے باک ہو گئے ہیں لیکن عالمگیر نے سب سے اول رام راجا کی خبر لی جو کرناٹک کے مشہور قلعۂ جنجی میں پناہ گزیں ہوا تھا، اور سردار ذوالفقار خاں نے ۱۶۹۸ء میں یہ مستحکم قلعہ سر کر لیا۔ رام راجہ بھاگ کر برار میں چلا آیا اور چار سال تک اِدھر اُدھر پریشان پھرنے کے بعد فوت ہو گیا۔

مرہٹہ فوج کے باقی دو گروہ بھی کچھ آپس کی نااتفاقی اور کچھ بادشاہی انتظام کی قوت سے رفتہ رفتہ منتشر ہو گئے، کیونکہ جانبازی کے باوجود اب انہیں اس قدر لوٹ مار کا موقع نہ ملتا تھا کہ اس پر اطمینان سے اوقات بسر ہو جائے پھر بھی انہوں نے اپنے پہاڑی قلعوں کو بچا رکھا تھا اور جب کبھی موقع ملتا نکل کر بادشاہی علاقوں پر ہاتھ مار جاتے تھے۔ عالمگیر کی عمر اب اسی سال سے تجاوز ہو چکی تھی لیکن اس کی فتوحاتِ دکن کا تکملہ ہونا ابھی باقی تھا کہ اس مہم کو خود اس نے اپنے ذمے لیا اور بسنت گڑھ کی فتح سے کوکن کی

تسخیر کا آغاز ہو گیا (۱۶۹۸ء) عالمگیر کی اس آخری مہم کے حالات عزم و استقلال شجاعت و انتظام کی حیرت انگیز داستان ہیں۔ کیونکہ اس میں صرف مرہٹوں کی مایوسانہ جدوجہد سے مقابلہ درپیش نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ بادوباراں کے طوفان، دشوار گزار کوہستان مہیب جنگل اور خطرناک سیلابوں سے لڑائی تھی جسے جیتنے میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور پانچ سال تک بوڑھے بادشاہ نے ہر قسم کے آرام و آسائش کو ذہن سے بھلا دیا۔ اس فولادی ارادے کے سامنے مرہٹوں کے بلند و سنگین قلعے زیادہ عرصے تک نہ ٹھہر سکتے تھے۔ ستارا، کھیلنا، پرنالا، تورنا وغیرہ ایک ایک کر کے سب مسخر ہو گئے۔ رام راجہ کی بیوہ تارا بائی اور اس کے چند رفیق اگر ابھی تک سیواجی کی وراثت کے دعویدار تھے تو یہ ان کی قابل تعریف وضعداری نظر آتی تھی ورنہ تمام دکن میں چند مربع میل کا قطعہ بھی ایسا نہ رہا تھا جہاں مرہٹوں کی خود مختار حکومت باقی ہو۔ (۱۷۰۵ء)[1]

---

[1] معلوم نہیں الفنسٹن صاحب نے عالمگیر کے آخری عہد میں مرہٹوں کے بادشاہی فوج پر دلیرانہ حملہ کرنے کے واقعات کہاں سے جمع کئے ہیں۔ ان کا خاص ماخذ اور اس زمانے کی مستقل تاریخ خافی خاں کی کتاب ہے۔ اور اس مولف نے مرہٹوں کی شوکت نمائی اور بادشاہ کی دقتیں بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بایں ہمہ کوکن کی مہم کے بعد عالمگیر کی حکومت کے آخری دو سال میں حملہ ایک طرف مرہٹوں کی کسی معمولی قزاقی کا بھی ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔ ۱۲

باب سیزدہم

عالمگیر کی وفات اور جانشین

مرہٹوں کا قلع قمع کرنے کے بعد، مراجعت میں بادشاہ نے واکن کھیڑ کو فتح کیا جہاں ایک بیڈ ر قوم کے زمیندار نے بہت سر اٹھا رکھا تھا اور ہر دفعہ اطاعت قبول کر کے باغی ہو جاتا تھا (۱۱۱۶ھ ۱۷۰۵ء) پھر ماہ شوال ۱۱۱۷ھ ۱۷۰۶ء میں احمد نگر پہنچ گئے اور ایک سال بعد اسی جگہ وفات پائی۔ (۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء)

اگر کسی بادشاہ کے اوصافِ حسنہ کے ثبوت میں، حکومت اور عمر کی درازی کو خدائی فیصلہ تسلیم کیا جائے تو ہندوستان کے تمام فرمانرواؤں کا مرتبہ عالمگیر سے نیچا ہے۔ اشوک نے ۳۱، ۳۲ برس حکومت کی بکرماجیت و چندر گپت ۳۰، اور راجہ ہرش کا ۴۰، ۴۲ سال تک راج رہا۔ فیروز شاہ تغلق نے ۳۸ سال سے زیادہ بادشاہی نہ کی اور اکبر (اگرچہ بیرم خاں کی آتالیقی کا زمانہ بھی شامل کر لیا جائے تو) تختِ ہند پر (قمری حساب سے) ۵۱ سال دو ماہ جلوہ گستر رہا اور ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ہمارے زمانے میں ملکۂ وکٹوریہ تقریباً ۶۳ سال ہندوستان کی قیصرہ رہیں۔ لیکن عالمگیر نے ان سب سے زیادہ یعنی ۵۲ سال ۲½ مہینے (قمری) فرماں روائی کی اور نوے سال سے بھی کچھ زیادہ عمر پائی۔ جو گویا اس کے اعتدال اور پرہیزگاری کا نمایاں صلہ تھی۔

عہدِ عالمگیر

لیکن اس مقابلے سے قطع نظر، تاریخ پر نظر ڈالو تو جس قدر وسیع سلطنت عالمگیر کو خدا نے دی تھی اتنی ہندوستان کے کسی بادشاہ کو پہلے نصیب نہیں ہوئی۔ حسنِ انتظام اور ملک کی خوش حالی کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوگا کہ گو علاقہ اس نسبت سے نہیں بڑھا لیکن سرکاری مالیہ اکبر کے وقت سے ڈھائی گنا اور عہد شاہجہانی کی نسبت ڈیڑھ گنے سے زیادہ ہوگیا حالانکہ عالمگیر کی عدل و رعایا پروری میں مخالف سے مخالف مصنف کو بھی کلام نہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ اس نے بہت سے محصول معاف کر دیے تھے۔ سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ بات ہے کہ پٹھان یا مغل بادشاہوں میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس کے عہد میں خود اسی کے درباری امرا یا قریبی رشتہ داروں نے بغاوت نہ کی ہو۔ تاریخ میں صرف عالمگیر ایسا فرماں روا ہے کہ نوّے سال کی عمر میں بھی بڑے سے بڑے سردار اور طاقتور بیٹے اس کے نام سے لرزتے تھے اور اگر کبھی انھوں نے منحرف ہونے کا ارادہ بھی کیا تو فساد و خونریزی کی نوبت آنے سے پہلے اقبالِ عالمگیری کے شکنجے میں کھنچ کر سیدھے ہو گئے۔ واضح رہے کہ راجپوتانے یا دکن کی لڑائیاں بیرونی یا برابر کی سلطنتوں کی جنگ تھی کیونکہ گو راجپوت راجہ مغلیہ درباروں میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوتے رہتے تاہم ان کی اندرونی خودمختاری میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ خاص کر اودے پور کا رانا ہر مغل بادشاہ کے عہد میں سرکشی کرتا اور لڑتا رہا تھا۔ مگر جب راجپوتوں نے عالمگیر سے لڑائی مول لی تو اس نے راجپوتانے کے بیابانوں میں گھس کر انھیں زیر کیا اور جزیہ وصول کر کے پہلی مرتبہ یہ بات منوا دی کہ راجپوتانہ مغلوں کی عملداری میں داخل ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی فوج سمیت چوبیس پچیس برس دکن میں مصروفِ جنگ و جدال رہا۔ بایں ہمہ کسی راجپوت راجہ کو سلطنت کے خلاف سر اٹھانے کی جسارت نہ ہوئی۔ اور بعض ریاستوں کے راج کمار تا آخر تک افواجِ عالمگیری میں جنگی خدمات انجام دیتے رہے۔ باقی دکن کی ریاستوں پر جو کچھ گزری وہ ابھی ہم پڑھ چکے ہیں۔

عالمگیر کی بدنامی

بایں ہمہ اوصاف و اقبال مندی ہندوستان کا کوئی بادشاہ اس قدر بدنام نہیں ہوا جس قدر کہ آج کل عالمگیر مورد الزام ہے لطف یہ ہے کہ اس کی غیر معمولی شجاعت و جفاکشی، انتظامی قابلیت، دماغی اور علمی استعداد عدل و انصاف، درویشانہ سادگی، حلم و فروتنی، رحم دلی اور نرمی کا ہر مصنف نے کسی نہ کسی پیرائے میں ذکر کیا ہے لیکن اس کے ساتھ سب انگریز مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ سخت متعصب ظالم اور مکار بادشاہ تھا جس نے اپنی نالائقی سے

مغلیہ سلطنت کو تباہ کرا دیا۔ ان غلط الزامات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ ان پر بحث کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب علٰحدہ چاہئے لیکن یہ لکھے بغیر چارہ نہیں معلوم ہوتا کہ دین اسلام سے اکثر یورپی مصنفوں کو ایسی مخالفت ہے کہ اس کی خوبیاں بھی انھیں برائیاں سوجھتی ہیں۔ کوئی مسلمان بادشاہ جو شعائر اسلامی کا پابند ہو، ان کی نظر میں درجۂ قبولیت نہیں پا سکتا۔ اور یہی وہ تعصب ہے جس کی عینک لگا کر وہ عہد عالمگیری کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے تمام اتہامات کی تفصیل اور تردید لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ تاہم دو باتیں بیان کرنی ضروری ہیں۔

(۱) یہ الزام کہ عالمگیر محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہندوؤں کے بت خانے اور مندر تڑوا دینا تھا بداہتہً غلط ہے۔ ایسا ہوتا تو کم سے کم اکبر آباد و دہلی کی نواح خاص کر متھرا کے قدیم مندر، نیز دولت آباد و اورنگ آباد کی نواح میں ایلورہ وغیرہ مقامات کے وسیع بتکدے آج کے دن سلامت نہ ہوتے کیونکہ ان مقامات میں عالمگیر کا برسوں قیام رہا ہے۔ بےشبہہ اس نے بعض مندر حکماً تڑوا دئے اور دکن میں ہندوؤں کے خلاف بعض شدید قوانین بھی جاری کئے۔ لیکن یہ سختیاں ملکی مصالح پر مبنی تھیں اور ان سے یہاں کی فتنہ انگیزی اور باغیانہ سازشوں کا روکنا مقصود تھا۔

(۲) عالمگیر کو سلطنت مغلیہ کے زوال کا بانی قرار دینا بالکل بے سر و پا لئے ہے۔ سلطان بلبن کے وارث کیقباد نے تین سال میں سلطنت کھو دی علاء الدین کے بیٹے نے چار سال کے اندر خلجیوں کو بے نام و نشان کروا دیا لیکن کوئی شخص ان کی نالائقی کا ان کے اقبال مند باپ دادا کو ذمہ دار نہیں گردان سکتا ممالک ایشیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ ایک شخص نے محض اپنی ذاتی تدبیر و لیاقت سے بہت بڑی سلطنت قائم کر دی اور معمولی درجے سے ترقی کر کے تخت شہنشاہی تک پہنچ گیا۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جو عمارت ایک شخص کی زندگی میں تیار ہو سکتی ہے وہ چند سال بلکہ چند ہی مہینوں کے اندر ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ کیونکہ بنانے میں توڑنے کی نسبت زیادہ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں کی ناکامی یا کامیابی کے متعلق ہم جو رائے قائم کریں وہ ان ہی کے عہد کے واقعات یا ذاتی اوصاف کی بنا پر ہونی چاہئے۔ اور عالمگیر کے حال میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اس کی

وفات کے قریب تک سلطنتِ مغلیہ کی حدود برابر وسیع ہو رہی تھیں جو حکومت کے زور و استحکام کی دلیل ہے نہ کہ زوال و ادبار کی ؎

خانہ جنگی

بہرحال، اس درویش صفت اور باسطوت بادشاہ کے انتقال کے بعد حسب دستور اس کے بیٹوں میں سلطنت کے لئے خانہ جنگی برپا ہوئی۔ بڑے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو عالمگیر نے شاہ عالم کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ اسے اپنی اولاد سے بہت محبت تھی لیکن امور ملک داری یا اصولِ عدل و انصاف کے سامنے وہ کسی کی رعایت نہ کرتا تھا چنانچہ شاہ عالم بھی ابوالحسن کے ساتھ سازش کرنے کے جرم میں کئی سال قید رہا۔ پھر بادشاہ نے بہادر شاہ کے خطاب اور بہت کچھ اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے شمالی ہندوستان میں اپنا نائب بنا کے اکبرآباد بھیج دیا تھا کہ منجھلے بھائی محمد اعظم شاہ کے حسد سے محفوظ رہے جو نہایت جری اور تند خو شہزادہ تھا[1]۔ حتیٰ کہ باپ کے انتقال کے بعد بھی شاہ عالم، اس سے لڑائی مول لیتے ہچکچاتا تھا اور جب اعظم اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے شمال کی طرف بڑھا تو بڑے بھائی نے خط لکھا کہ خلد مکان (عالمگیر) کی وصیت کے مطابق مالوہ، گجرات اور شمالی دکن کے صوبے تمھاری میراث ہیں اگر اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے تو جنگ سے بچنے کے لئے کچھ علاقے میں اپنی طرف سے نذر کر دوں گا؛ مگر بقول خافی خاں، شہزادہ اعظم نے یہ سن کر کہا کہ شاید اس ہوش باختہ نے گلستان بھی نہیں پڑھی جس میں حضرت سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ "دس فقیر ایک کمل میں پڑے رہتے ہیں۔ دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں سماتے" ؎

غرض اتنے شاہ عالم پشاور سے دلی اور اکبرآباد آئے اتنے محمد اعظم کی فوج غالباً گوالیار سے کوچ کر چکی تھی۔ ادھر سے شاہ عالم کا لشکر بڑھا اور آگرے کے ۱۵، ۲۰ میل جنوب میں سرائے جاجو پر نہایت خون ریز جنگ ہوئی اعظم شاہ اور اس کے رفیق دگنی تگنی[2] فوج کے مقابلے میں شیروں کی طرح لڑے اور گرد و پیش لاشوں کے انبار لگا دیے۔

---

[1] اسی کی نسبت لکھا ہے کہ باں ہمہ جرأت و سرکشی جب کبھی عالمگیر کا رقعہ اس کے پاس آتا تھا تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ ۱۲۔

[2] اعظم شاہ بہادری کے جوش میں اور فتح کے یقین پر صرف ۲۵، ۳۰ ہزار سپاہی اپنے ساتھ لایا تھا شاہ عالم

اس کا صغیر سن بیٹا عالی تبار بھی جو لڑائی میں باپ کے ساتھ تھا عماری سے نکلا جاتا تھا کہ تیموری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ لیکن آخر میں قضا کے ایک تیر نے اعظم کی پیشانی چھید دی اور اس کے گرتے ہی لڑائی کا خاتمہ ہو گیا (ربیع الاول ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء)۔

بہادر شاہ اول ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء

تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے وقت شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ بہت فیاض اور بے پروا بادشاہ تھا۔ مگر تن آسانی کے باوجود اس میں حکمرانی کی قابلیت اور اتنی مستعدی ضرور تھی کہ جب راجپوتوں نے عالمگیر کا زبردست ہاتھ اٹھتے ہی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اودے پور و جودھ پور کے راجاؤں نے سرکشی اختیار کی تو بہادر شاہ نے خود فوج کشی کی اور اجمیر و چتوڑ کے درمیان لشکر آتار کے شہزادہ عظیم الشان اور خان خاناں منعم خاں کو باغیوں کی سرکوبی پر بھیجا۔ ان سرداروں کے مقابلے میں راجپوتی فوج کے قدم نہ تھم سکے اور تھوڑے ہی عرصے میں راجہ اجیت سنگھ اور اس کے مددگاروں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ خان خاناں کی سفارش سے بادشاہ نے ان کی جاں بخشی کی اور خان زمان خاں اور قاضی القضاۃ جودھ پور بھیجے گئے کہ ازسرنو جزیہ کا تعین اور وصول کا انتظام کریں۔[1]

پائے تخت پہنچ کر بادشاہ نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی شہزادہ کام بخش کو مراسلہ لکھا کہ والد مرحوم نے بیجاپور و حیدرآباد کے علاقے تمہیں عطا فرمائے تھے۔ مجھے اس وصیت کے تسلیم کرنے میں کوئی حجت نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ دکن کے قدیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ کی فوج کا شمار اسی ہزار بتایا گیا ہے اور آگرے کے خزانے سے باپ کے زمانے کا اندوختہ ۱۳ کروڑ روپیہ نقد اس کو مل گیا تھا (منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۵۷۸) بایں ہمہ الفنسٹن صاحب نے عالمگیر کے ذکر میں لکھا ہے کہ آخر میں بدانتظامی کی وجہ سے شہنشاہ کو روپیہ وصول نہ ہوتا تھا اور اس کی آمدنی فوجی مصارف ہی کے واسطے کافی نہ ہوتی تھی ۱۲

[1] منتخب۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۶۔ ۱۲

فرمانرواؤں کے مثل خطبہ و سکہ میرے نام کا جاری کیا جائے اور سالانہ پیشکش میں بھی کوئی کمی نہ کی جائے۔

کام بخش عالمگیر کا بہت چاہتا بیٹا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے اس کے مزاج میں سودا کا غلبہ تھا۔ ایک مرتبہ اپنے کوکا کو عدالت کے حوالے نہ کرنے پر جب وہ اپنی ضد سے کسی طرح باز نہ آیا تو عادل بادشاہ نے حکم دیدیا تھا کہ اسے بھی جبراً مجرم کے ساتھ عدالت میں پیش کر دیا جائے غرض بڑے بھائی کے جواب میں اس نے خصومت انگیز کلمات تحریر کرائے اور بہادر شاہ کو مجبوراً دکن پر فوج کشی کرنی پڑی۔ کام بخش کی حرکتوں سے اس کے امیر دل برداشتہ ہو رہے تھے خزانے میں روپیہ نہ تھا سپاہیوں کو تنخواہ نہ ملتی تھی بہادر بادشاہ کے آنے کی خبر سنی تو ایک ایک کر کے سب نے ساتھ چھوڑ دیا اور خافی خاں کی عینی شہادت کے مطابق بھائی کی اسّی ہزار افواج کے مقابلے میں کام بخش کے پاس کل تین چار سو سے زیادہ لڑنے والے نہ تھے۔

غرض حیدر آباد کے قریب چند لمحے کی زدوکوب نے اس جمعیت کو پراگندہ کر دیا۔ کام بخش زخمی ہو کر بھائی کے لشکر میں لایا گیا اور تھوڑی دیر بعد مر گیا (ذی قعدہ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۸ء)

مرہٹے راجپوت اور سکھ

(۱) دکن کی اس فوج کشی میں بعض مرہٹہ رئیس بھی بادشاہ کے ہمرکاب تھے اور ان میں سندھیا خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے ذوالفقار خاں کی سفارش سے اول درجے کے امرا میں داخل کر لیا گیا اور کئی پرگنے جاگیر میں ملے اس قسم کی داد و دہش میں بہادر شاہ بہت بے باک تھا اور بیان کرتے ہیں کہ اس نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ "کسی سائل کا سوال رد نہ کروں گا"، چنانچہ اسی زمانے میں جب تارا بائی اور اس کے مقابلے میں ساہو کی درخواستیں ہوئیں کہ ہمیں دکن میں "سر دیس مکھی" کا حق دیا جائے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ دونوں کی درخواستیں منظور کر لی جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کی بھی درخواست منظور نہ ہو سکی۔

اس جگہ یہ وضاحت کر دینی چاہیے کہ عالمگیر کے انتقال تک راجہ ساہو شاہی لشکر میں رہا اور جب محمد اعظم شاہ نے باپ کی لشکر گاہ میں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور شمال میں پیش قدمی کی تو ذوالفقار خاں کی رائے سے نوجوان ساہو کو اپنے وطن جانے کی اجازت دے دی کہ مغلوں کے ایک ماتحت راجہ کی حیثیت سے دکن میں حکومت

کرے چنانچہ اس وقت بھی اس کی حیثیت اسی قسم کی تھی اور سر دیس مکھی ہے، جس کے لئے وہ اور اس کی حریف یعنی تارا بائی (بیوہ راجا رام) اب کوشاں تھے یہی مراد تھی کہ وہ مغلوں کے ماتحت سرکاری مالگزاری وصول کریں گے اور اس مالگزاری کا ایک جزو سرکار لبطور اجرت انھیں دے دیا کرے گی یہ ہی وہ صورت ہے جو بطور اجرت پنجاب میں مالگزاری کا زمین داری (یا نمبرداری) طریقہ کہلاتی ہے اور دکن میں قدیم سے رائج تھی۔ تارا بائی نے اپنے بچوں کی طرف سے اس خدمت کا معاوضہ ۹ فی صدی مانگا تھا اور ساہو نے پچیس فی صدی یا چوتھ، کیونکہ وصول مالگزاری کے علاوہ وہ یہ بھی وعدہ کرتا تھا کہ ویران علاقوں کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کریگا[1]؛

(۴) الغرض دکن میں ذوالفقار خاں صوبہ دار کا نائب (داؤد خاں پنی کو) مقرر کر کے ۱۷۱۰ء میں بادشاہ نے پائے تخت کو مراجعت کی اور برہان پور میں کچھ عرصے سیر و شکار سے دل بہلانا چاہتے تھے کہ راجپوتانے میں دوبارہ شورش و فساد کی اطلاع پہنچی۔ اس مرتبہ بغاوت کا بیج ہندوستان کے میر بحر سیف خاں نے بویا تھا جو کام بخش کی جنگ کے زمانے میں راجپوتانے بھاگ آیا تھا۔ اس نے تمام راجپوت سرداروں کو جو بہادر شاہ کے ہاتھوں چند ہی روز پہلے شکست کھا چکے تھے، کام بخش کی رفاقت پر ابھارا اور ان سے وعدہ لے لیا کہ یہ شہزادہ اگر برار کے راستے راجپوتانے تک پہنچ جائے تو پچاس ہزار سوار سے ہم اسے بادشاہ بنانے میں مدد دیں گے۔ یہ آگ بھڑکا کے سیف خاں کام بخش کے پاس حیدرآباد آیا کہ اس کار نمایاں کا صلہ ملے اور اس منصوبے پر بلا تاخیر عمل کیا جائے کیونکہ بہادر شاہ کی فوجیں دکن میں داخل ہو چکی تھیں؛ لیکن کام بخش نے اس کی باتوں کو جھوٹ سمجھ کر کوئی اعتنا نہ کی اور وہ تجویز یوں ہی رہ گئی

---

[1] انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے گویا مرہٹے مغلوں سے کوئی خراج مانگتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح کمزوری میں معمولی بیماری ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے اسی طرح سلطنت مغلیہ کی بدانتظامی اور کمزوری کے زمانے میں یہی سر دیس مکھی مرہٹوں کی دست درازی کا حیلہ بن گئی تھی اور کوئی ان کو روکنے والا نہ تھا۔ لیکن ابتدا میں ان کی اس درخواست کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی؛ ۱۲

بایں ہمہ راجپوتوں میں بادشاہ کی مخالفت کا جوش تازہ ہوگیا اور ان کی اس شورش کو دبانے کی کوشش میں اجمیر کا قلعہ دار بھی ان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ پس ان کی تادیب کے لئے بہادر شاہ نے دوبارہ راجپوتانے کا رخ کیا اور اجین سے بڑھ کر اجمیر پہنچ گیا۔ حسب دستور اودے پور جودھ پور کا علاقہ پامال کرنے کی غرض سے علٰحدہ علٰحدہ دو فوجیں تیار کی گئی تھیں مگر ان کی آمد آمد سن کر وہاں کے راجاؤں نے پھر قصور کی معافی مانگی اور رومال سے ہاتھ باندھ کر حضور میں جاں بخشی کی التجا کی (منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۶۶۲) بادشاہ کے نزدیک ان عہد شکن سرکشوں کو سزا دینی ضرور تھی لیکن خان خاناں منعظم خاں نے ان کی شفاعت کی دوسرے پنجاب سے سکھوں کے فساد کی خبریں ملیں۔ لہٰذا بادشاہ نے اس قبولِ اطاعت پر اکتفا کی اور سال کے آخری ایام میں پائے تخت پہنچ گیا؛

(۳) سکھوں کی یہ شورش، جس نے بادشاہ کو راجپوتانے سے جلد واپس آنے پر مجبور کیا ۱۷۱۰ء میں پیدا ہوئی اور مشرقی پنجاب کے کئی اضلاع میں پھیل گئی تھی؛ ایک صدی پہلے سکھوں کا فرقہ لاہور کے قرب وجوار میں آباد تھا لیکن مذہبی فتنہ فساد کی وجہ سے یہ لوگ جبراً یہاں سے نکال دیئے گئے اور شمال کے پہاڑی علاقوں میں جا بسے۔ انہی دور دست اقطاع میں گرو ہرگوبند صاحب نے ان میں جنگی جوش پیدا کیا اور بابا نانک صاحب کے درویش مزاج پیرو رفتہ رفتہ ایک فوجی جمعیت بن گئے۔ چنانچہ بہادر شاہ کے عہد میں گرو ہرگوبند صاحب ایک فوجی سردار کی حیثیت سے بادشاہی لشکر کے ہمراہ دکن آئے اور یہیں کسی خونی کے ہاتھ سے مارے گئے؛ اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد بندا نامی ایک شخص نے پنجاب میں گرو ہرگوبند ہونے کا دعویٰ کیا اور سرہند کے قریب بادشاہی علاقوں میں تاخت وتاراج شروع کی۔ ستنامیوں کے فساد کے ذکر میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ان دنوں ایک مسلح جماعت تیار کر کے دیہات کو لوٹ لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ سکھوں کے پاس بھی چند مہینے میں ۳۰، ۴۰ ہزار آدمی جمع ہوگئے اور سرہند کے قلعہ دار کو اپنی جمعیت لے کے ان کے مقابلے میں آنا پڑا۔ اس باقاعدہ سپاہ سے شورش کرنے والے شکست کھانے کو تھے کہ قلعہ دار کے ایک گولی لگی اور اس کے گرتے ہی سرکاری جمعیت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ سکھوں نے فتح پائی اور سرہند پر قابض ہوگئے؛ اس کامیابی نے جنوب میں، سہارنپور اور شمال میں سلطان پور تک ان کے واسطے گویا میدان صاف کر دیا۔ کیونکہ

قریب میں اور کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جہاں بادشاہی سپاہ کافی تعداد میں موجود ہوتی۔ غرض سرہند کو مستقر بنا کے سکھوں نے قرب و جوار کے دیہات میں تہلکہ ڈال دیا اور وہ وحشیانہ ظلم کیے جن کا بیان پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں؛ لیکن سہارنپور یا سلطان پور کے قریب جہاں باقاعدہ جنگ کی نوبت آئی وہاں یہ بے رحم جنگجو میدان میں نہ ٹھہر سکے اور دونوں دفعہ بھاگ کر سرہند کی طرف ہٹ آئے، تیسری مرتبہ انھوں نے لاہور پر یورش کی تھی اور گو شہر پر زور نہ چل سکا، تاہم انھوں نے قرب و جوار کے بڑے بڑے قصبے اور دیہات لوٹ کر ہزارہا ہندو مسلمانوں کو مار ڈالا۔ پھر جنوب میں ستلج اتر کے کئی پرگنے تاراج کر دیے، ان کی قتل و غارت گری کا سلسلہ یہیں تک پہنچنے پایا تھا کہ بادشاہ نے دہلی سے آگے بڑھ کر ساڈھورہ کے قریب قیام کیا اور شہزادہ رفیع الشان ان کی تادیب پر مامور ہوا۔ سکھوں نے اپنی جمعیت ستر اسی ہزار تک بڑھائی تھی لیکن بادشاہی فوجوں کے سامنے ان کا مذہبی جنون کچھ کام نہ دے سکا انھیں پے در پے شکست ہوئی اور آخر لوہ گڑھ کے قلعے میں محصور کر لیے گئے۔ کچھ عرصے میں اجناس خوردنی کی کمی ہوئی تو بندا بھیس بدل کے خود لڑتا بھڑتا نکل گیا اور ایک چیلے نے اس کا بہروپ بھر کر اپنے تئیں گرفتار کرا دیا۔

بہادر شاہ کی وفات

اس شورش کو رفع کر کے بہادر شاہ لاہور آ گیا تھا اور چند ماہ بعد اس کا اسی شہر میں انتقال ہوا (محرم ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء) شاہ عالم بہادر شاہ بامروت بادشاہ تھا مروت کی وجہ سے وہ اپنے امرا کی باہمی رقابت کا سدباب نہ کر سکتا تھا۔ اور نظم و نسق میں خرابی واقع ہوتی تھی۔

اس کے عہد میں مرہٹوں کو دم لینے کی فرصت ملی۔ عالمگیر کی وفات، بادشاہی افواج کے واپس ہندوستان چلے جانے سے کہنا چاہیے کہ وہ بھاری سلیں جو مرہٹوں کے سینے پر رکھی تھیں، ہٹ گئیں۔ دوسرے ذوالفقار خاں کی جانب سے داؤد خاں پنی نام ایک افغان دکن کا نائب صوبہ دار تھا اور اسے مرہٹوں کی خاص رعایت مدنظر تھی۔ باایں ہمہ ابھی تک ان میں دوبارہ سر اٹھانے کی طاقت نہ آئی تھی اور جب تک خود دربار دہلی کے خود غرض امیروں نے انھیں ابھارا اس وقت تک انھیں ہندوستان کے معاملات میں کوئی حصہ لینے کی جسارت نہیں ہوئی۔

جہاندار شاہ

شاہ عالم بہادر شاہ کے چار بیٹوں میں سب سے لائق اور تجربہ کار شہزادہ

عظیم الشان تھا وہ دادا اور باپ دونوں کا چہیتا تھا اور عالمگیر کی آغوش تربیت میں اس نے فن ملک داری کی واقفیت حاصل کی تھی عام طور پر سب کو یقین تھا کہ وہی بہادر شاہ کا جانشین ہوگا لیکن سلطنت کی بد قسمتی تھی کہ تقدیر نے بڑے بھائی کا ساتھ دیا یعنی لڑائی میں ایک گولی نے عظیم الشان کا کام تمام کر دیا اور باقی دونوں بھائی بھی تھوڑی سی کشمکش کے بعد مغلوب ہوگئے شہزادہ معز الدین جہاندار شاہ کے لقب سے تخت ہند پر متمکن ہوا اور بھائی یا بھائیوں کی اولاد میں جو شہزادہ اس کے ہاتھ پڑا، ان سب کو اس نے قتل یا محبوس کرا دیا۔

بھتیجے سے لڑائی

مگر عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر ان دنوں پٹنہ عظیم آباد میں مقیم تھا وہیں اسے بہادر شاہ کے انتقال کی اطلاع ملی اور اس سے پہلے کہ مرحوم کے بیٹوں میں وراثت کا کوئی فیصلہ ہو، فرخ سیر نے پٹنے میں اپنے باپ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ پٹنے کا صوبہ دار سید حسین علی اس وقت اپنے مستقر سے باہر گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی تک خبر آگئی تھی کہ عظیم الشان مارا گیا اور جہاندار شاہ تخت نشین ہوگیا۔ لہٰذا اب ادھر تو وہ مذبذب تھا کہ فرخ سیر کے ساتھ کیا سلوک کرے اور ادھر فرخ سیر پریشان تھا کہ ایسے بے رحم چچا کی حکومت میں جانبری کی کیا صورت ہو۔ آخر منت و سماجت سے اس نے سید حسین اور اس کے بھائی سید عبد اللہ صوبہ دار الہ آباد کو اپنی رفاقت پر رضامند کر لیا اور مقتول باپ کا بدلہ اور اس کی جگہ تخت شاہی لینے کے لئے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ پہلی مرتبہ جہاندار شاہ کی فوج سے کھجوے کے قریب سامنا ہوا جہاں ستر برس پہلے بھی سادات بارہہ ایک دعوے دار سلطنت کی طرف سے مردانگی کے جوہر دکھا چکے تھے لیکن اس مرتبہ مقابلے میں عالمگیر نہ تھا کہ شمشیر آزمائی کا لطف آتا جو فوجیں فرخ سیر کو روکنے آئی تھیں ان کے سرداروں میں سخت ناچاقی تھی اور وہ بے لڑے بھڑے متفرق ہوگئیں۔ فرخ سیر اور اس کے مددگاروں کو دور تک کوئی روکنے والا نہ رہا۔ البتہ جب آگرے کے نزدیک جہاندار شاہ نے ستر ہزار فوج سے مقابلہ کیا تو نہایت خوں ریز جنگ واقع ہوئی۔ اور اگر جہاندار شاہ تھوڑی دیر اور میدان میں ٹھہرا رہے تو سیدوں کی ہزیمت میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ لیکن جہاندار شاہ کو عشرت پسندی نے کہیں کا نہ رکھا تھا میدان جنگ میں بھی کئی سو ڈوم ڈھاڑی ساتھ تھے اور اتفاق سے سید عبد اللہ کے ایک عقبی حملے کی زد میں سب سے پہلے یہی لوگ آئے۔ ان میں چند تیروں نے

کھلبلی ڈال دی اور انھیں بھاگتے دیکھکر جہاندار شاہ کے بھی ہوش بجا نہ رہے۔ تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد میدان سے فرار ہو گیا اور فرخ سیر کی بادشاہی میں پھر کوئی خاص دشواری نہ پیش آئی۔

فرخ سیر

۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء کے آغاز میں فرخ سیر کی بادشاہی کا اعلان ہوا جہاندار شاہ اور اس کے خاص خاص رفیق سخت اذیتوں سے قتل کرا دئے گئے اور شہر دہلی میں چند روز نہایت ہراس اور پریشانی پھیلی رہی۔ پائے تخت کے انتظام کے لئے بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو "قطب الملک یار وفادار" کا خطاب اور وزارت کا عہدہ دے کر بھیج دیا تھا۔ اور اس کا بھائی سید حسین علی خاں منصب میر بخشی اور خطاب امیر الامرا سے منتخب ہوا تھا۔ قاضی عبداللہ کو "میر جملہ خان خاناں" کا خطاب دیا گیا اور یہ وہ شخص ہے کہ جب فرخ سیر کی سیدوں سے بگڑی تو بادشاہ کا سب سے زیادہ معتمد علیہ درباری وہی تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بگاڑ کا بھی سبب ایک حد تک وہی ہوا کیونکہ سیدوں کی نخوت و چیرہ دستی پر اسی نے فرخ سیر کو غیرت دلائی تھی۔

اسی عطائے منصب و خطاب کے زمانہ میں چین قلیچ خاں بہادر کو خطاب نظام الملک فتح جنگ اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ اس عالی خاندان سردار نے عالمگیر کے محبوب سپہ سالار فیروز جنگ بہادر فاتح بیجا پور و گولکنڈہ کے فرزند ہونے ہی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ ذاتی اوصاف کی بدولت اپنے زمانے میں بڑی قوت و ناموری حاصل کی اور ضرور اتھی شریف اجداد کی نیکیوں کا پھل ہے کہ آج بھی جب کہ سلطنت مغلیہ کو صفحۂ روزگار سے مٹے ہوئے برسوں گزر چکے، چین قلیچ خاں کی اولاد ملک دکن پر فرماں روا ہے۔ خلداللہ ملکہم و اقبالہم۔

سیدوں سے ناچاقی بعض جنگی مہمات

مگر دربار میں اصلی قوت انھی دونوں بھائیوں کو حاصل تھی جو فرخ سیر کی منت و سماجت پر بہار و الہ آباد سے فوج لے کے آئے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ فرخ سیر کو محض ہماری قوت بازو نے تخت شاہی تک پہنچایا ہے، اسی بنا پر اب وہ چاہتے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر انجام نہ پائے، اور یہ بات بادشاہ کو بہت ناگوار تھی۔ دوسرے سید عبداللہ کی نخوت و بے پروائی نے عام طور پر اہل دربار کو ان

بھائیوں سے ناراض کر دیا تھا خاص کر میر جملہ کو جب کبھی موقع ملتا وہ بادشاہ سے ان کی برائیاں کرتا تھا۔ بایں ہمہ ابھی یہ غبار دلوں ہی میں تھے کہ راجپوتانے کی مہم پیش آئی۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے بیان میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جودھپور کے راجہ نے جب دوبارہ سر اٹھایا تو بادشاہ موصوف کو ان کی پوری تادیب کا وقت نہ مل سکا تھا اور گو راجپوتانے کے سرکشوں نے معافی مانگ لی لیکن میدان میں انھیں کوئی زک نہ پہنچی تھی۔ پھر بہادر شاہ کے بعد ایک سال تک جہاندار شاہ اور بھائی بھتیجوں میں جنگ ہوتی رہی تو راجہ جودھپور اپنے تئیں بالکل خود مختار سمجھنے لگا۔ یہ خبریں سن کر بادشاہ نے امیر الامرا سید حسین علی کو اس کی تنبیہ پر مامور کیا اور بادشاہی فوج اس کے تمام علاقے پر مسلط ہو گئی راجہ پہاڑوں میں جا کر چھپا اور پھر قصور کی معافی مانگ رہا تھا کہ اس عرصے میں سید حسین علی کو بڑے بھائی کے خط ملے جن میں اشارہ تھا کہ "بادشاہ سے مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، جس قدر جلد ممکن ہو تو واپس چلے آؤ"۔ غرض اسی عجلت میں راجہ سے پیشکش (یا خراج) لے کر اور اس شرط پر کہ اس کا بیٹا اور کچھ فوج شاہی خدمت کے لئے امیر الامرا کے لشکر میں بھیج دی جائے گی، صلح ہو گئی اور حسین علی خاں دہلی چلا آیا۔ پھر چند روز کی کشیدگی کے بعد فرخ سیر سے بھی ان بھائیوں کی اس شرط پر صلح ہو گئی کہ میر جملہ کو صوبہ دار بنا کے بہار بھیج دیا جائے اور امیر الامرا دکن کی صوبہ داری پر اورنگ آباد چلا جائے۔ اس شرط پر عمل ہوا لیکن دلوں کا غبار صاف نہ ہوا تھا۔ اندر ہی اندر گجرات کے صوبہ دار داؤد خاں پنی کو بادشاہی پیام پہنچ گئے تھے کہ اگر امیر الامرا سید حسین علی خاں کا استیصال کر دو تو دکن کی صوبہ داری تمھاری ہے، چنانچہ وہ تین چار ہزار آدمی لے کے برہانپور پہنچ گیا تھا کہ سید حسین کو آگے نہ جانے دے لیکن جب لڑائی کی نوبت پہنچی تو داؤد خاں مارا گیا اور امیر الامرا اورنگ آباد پہنچ کر دکن کا گویا مالک بن بیٹھا اور یہاں کے اہم معاملات میں بادشاہ کے احکام کی بھی کچھ پروا نہ کرتا تھا۔

اسی اثنا میں سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور مساجد و مقابر کی بے حرمتی کرنے کے علاوہ، جہاں ان کا ہاتھ پڑا سرکار رعایا کو لوٹ لیا، مکانوں میں آگ لگا دی اور ہزاروں ہندو اور مسلمانوں کو مار ڈالا۔ ان کی سفاکی کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر ڈالتے تھے۔ (منتخب اللباب جلد دوم) آخر فرخ سیر کے حکم سے لاہور کا صوبہ دار

عبد الصمد خاں ان کی سرکوبی پر مامور ہوا اور اس نے انھیں پے در پے شکستیں دے کے ایک قلعے میں گھیر لیا جہاں فاقہ کشی کی نوبت پہنچنے پر انھوں نے ہتھیار ڈال دئے (۱۷۱۶ء) عبد الصمد خاں نے دو تین ہزار کو تو وہیں مروا دیا اور باقی (۷) سو (۸) سو قیدی ان کے سرگروہ بندا کے ساتھ پایۂ تخت بھیجے گئے اور یہاں بازاروں میں تشہیر کے بعد انھیں قتل کرا دیا گیا [1]

سیدوں کا غلبہ اور بادشاہ گردی

سید حسین کا دکن جانا ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اورنگ آباد پہنچ کر اس نے جا بجا اپنے عزیزوں اور رفیقوں کو بڑی بڑی خدمات پر مامور کیا اور خلافِ دستور، بادشاہی منظوری بھی حاصل نہ کی بلکہ جہاں پناہ اگر دلی سے کسی کو نامزد کر کے بھیجتے تھے تو سید حسین اسے دخل پانے نہ دیتا تھا اور فرخ سیر کو خفیہ سازشوں کے سوائے اور کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی تھی؛ ان سازشوں میں بہت سے نامور درباری فرخ سیر کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے کیونکہ سیدوں کی نخوت، خاص کر سید عبد اللہ اور اس کے دیوان رتن چند کی رشوت ستانی اور ناجائز حرکات نے قدیم امرا کو سیدوں کا نہایت مخالف بنا دیا تھا۔ عوام الناس ان بھائیوں کو علانیہ نمک حرام کہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ سید حسین دکن پر خاطر خواہ تسلط نہ حاصل کر سکا؛ بایں ہمہ خود فرخ سیر ایسا متلون مزاج اور بزدل تھا کہ اس کا کوئی منصوبہ پورا نہ ہوتا تھا اور اس کے رفیق ناچار ہو کر سیدوں سے مصالحت کر لیتے تھے مگر اس عہد کے پیچیدہ اور تاسف انگیز واقعات میں طالب علم کے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کا حق

[1] ۔ ہمارے زمانے کی بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ انھیں زندہ چنوا دیا گیا اور بڑے بڑے ظلم ہوئے۔ لیکن یہ سب لغو افسانے ہیں اور الفنسٹن کو کسی معتبر تاریخ میں ایسی کوئی روایت نہیں ملی جسے وہ آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکتا بڑی بات یہ ہے کہ مورخ خافی خاں اس وقت دہلی میں موجود تھا اور اس نے ان کی تشہیر اور قتل ہونا بچشم خود دیکھا اور بے کم و کاست بیان کیا ہے بے شبہہ بندا کے ساتھ زیادہ سختی کی گئی تھی کہ اس کا لڑکا اس کے سامنے بلکہ شاید خود اس کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ اور یہ وہ اذیت تھی جو بندا بے بس رعایا کو بارہا دے چکا تھا مگر اس کے سوا کسی خاص زیادتی کا ذکر ہمیں نہیں ملا؛

(دیکھو منتخب جلد دوم صفحہ ۷۶۶)

فرماں روائی کس قدر مسلم ہو گیا تھا کہ اتنے اختیارات اور غلبے کے باوجود سیدوں کو یہ حوصلہ نہ ہوا کہ مغلوں کو ہٹا کر تاج شاہی کے خود مالک بن جاتے۔ اس کے برخلاف، گو فرخ سیر کے پاس فوج تھی نہ خزانہ پھر بھی سید عبداللہ ہر وقت اس سے خوف زدہ رہتا تھا اور آخر اپنے بھائی کو دکن سے طلب کرنے کے سوا اور کوئی صورت اسے اپنی حفاظت کی نظر نہ آئی چنانچہ امیرالامرا سید حسین علی نے راجہ ساہو سے صلح کا عہد و پیمان کیا یعنی دس لاکھ روپئے سالانہ خراج اور پندرہ ہزار سوار کے معاوضے میں اسے دکن کی چوتھ اور سردیس مکھی دینی قبول کی اور قرار پایا کہ اب اگر ان علاقوں میں قزاقی سے کوئی نقصان جان و مال ہوا تو اس کا تاوان مرہٹوں کو دینا پڑے گا۔ پھر اپنی فوج اور مرہٹوں کی امدادی جمعیت ساتھ لے کے وہ ۱۷۱۹ء کے اوائل میں دہلی پہنچ گیا اور بادشاہ نے خوف زدہ ہو کر یہ شرط بھی مان لی کہ قلعہ پر سید عبداللہ کے سپاہیوں کا پہرہ قائم کر دیا جائے۔

اس وقت بھی اگر فرخ سیر ہمت کرتا تو سیدوں سے مقابلہ کرنے کے لئے غالباً اسے کافی آدمی مل جاتے بلکہ جس دن سید حسین علی کے مرہٹہ سپاہی شہر میں داخل ہوئے تو بعض امرا خود ہی اپنی جمعیت لے کے قلعے کے قریب پہنچ گئے کہ بادشاہ کا اشارہ ہوتے ہی سید حسین علی کی فوج پر جا پڑیں۔ لیکن ایسی لڑائی کی نوبت نہ آئی کیونکہ فرخ سیر سیدوں کے پنجے میں پھنس چکا تھا دوسرے خافی خاں کے بقول خاندان تیموری میں ایک وہی ایسا بادشاہ ہوا ہے جسے قدرت نے حمیت و شجاعت کے وصف سے محروم رکھا تھا۔ بایں ہمہ اتفاق سے خان دوران کے تیر اندازوں نے مرہٹوں کو دیکھ کر چند تیر ان کی طرف پھینک دیئے جس سے ان میں انتشار پیدا ہو گیا ساتھ ہی دہلی کے بازاریوں نے یورش کر کے انھیں لوٹنا اور مارنا شروع کیا خافی خاں یہ ہنگامہ سن کر تماشہ دیکھنے بازار میں نکل آیا تھا اور بیان کرتا ہے (صفحہ ۸۱۰) کہ تعداد میں دس گیارہ ہزار ہونے کے باوجود مرہٹوں کے ایسے حواس گم ہوئے کہ سیکڑوں آدمی عوام الناس کے ہاتھ سے مارے گئے اور اپنے اسلحہ گھوڑے اور جھنڈے پھینک پھینک کر بھاگے حتیٰ کہ شہر کے خاکروبوں تک نے انھیں پیٹا اور بعضوں کے کپڑے اتروائے۔

مگر بازاریوں کے ان بلووں سے فرخ سیر کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا دوسرے ہی دن سیدوں نے اسے معزول و محبوس کر دیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک پوتے

رفیع الدرجات کو قید سے نکال کر تخت دہلی پر بٹھا دیا (۹ ربیع الاوّل ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء) چند روز بعد فرخ سیر کو نہایت ذلّت و عقوبت سے قتل کرا دیا گیا تھا لیکن رفیع الدرجات بھی جو بچپن سے قید میں رہا دق کے مرض میں مبتلا تھا، زیادہ نہ جیا اور تین چار مہینے میں مر گیا تب سیّدوں نے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا (رجب ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء) وہ رفیع الدرجات سے بھی زیادہ کمزور و بیمار تھا اور دو مہینے کے اندر تمام ہو گیا۔

سیدوں کو کسی اور تیموری شہزادے کی تلاش ہوئی جو ان سے زیادہ تندرست ہو۔

باب چہاردہم

سلطنت مغلیہ کا زوال

ان واقعات کا جو پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزرے لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں سخت انتشار پیدا ہو جائے، سلطنت کے انتظام میں تو اسی وقت سے خرابی نظر آنے لگی تھی جب سے فرخ سیر اور سیدوں کی مخالفت بڑھی لیکن بادشاہ کے قتل کی خبر سنی تو لوگوں کو سید عبداللہ، سید حسین اور ان کے رفیقوں کے نام سے نفرت ہوگئی دہلی کے بازاری انھیں علانیہ گالیاں دیتے تھے بلکہ بارہہ کے سیدوں کا گلی کوچوں میں نکلنا دشوار کر دیا تھا اور اسی طرح جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ کا ناک میں دم تھا جس نے فرخ سیر کو بیٹی بیاہ دی تھی اور پھر سیدوں کا ساتھی بن گیا تھا؛ رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے وقت اسی راجہ نے دیوان رتن چند کے ساتھ مل کر جزیہ معاف کرایا اور سیدوں نے اس کی امداد کے معاوضے میں بہت کچھ روپیہ پیسا دے کر اسے گجرات روانہ کیا تھا کہ یہ صوبہ بھی سیدوں کے قبضے میں رہے کیونکہ جب تک خاص ان کا آدمی مقرر نہ ہو یہ اطمینان نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی امیر ان بادشاہ کش سیدوں کا وفادار رہے گا چنانچہ بعض صوبہ داران سے منحرف ہو گئے تھے اور آگرے میں چند مفسدوں نے عالمگیر کے پوتے نیکو سیر کو قید سے چھڑا کر تخت پر بٹھایا تو جے پور کا راجہ جے سنگھ اور کئی امیر اس شہزادے کے حامی ہو گئے کہ کسی طرح سیدوں کا

زور توڑ دیں۔

روشن اختر محمد شاہ

اسی قسم کی پریشانیاں تھیں جب سیدوں نے رفیع الدولہ کو ساتھ لے کر آگرے پر پیش قدمی کی اور اسی شہر کے نواح میں شاہ موصوف کو مرض الموت لاحق ہوا تو انھوں نے جلد سے جلد جہاں شاہ پسر بہادر شاہ کے نوجوان بیٹے روشن اختر کو دہلی سے بلوایا اور فتحپور سیکری میں ابوالمظفر ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا ؛ (۱۵۔ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء) اسی زمانے میں آگرے اور الٰہ آباد کے فساد بھی رفع دفع ہو گئے۔ نیکو سیر قید کر لیا گیا جے سنگھ کو دب کر مصالحت کرنی پڑی، سیّدوں کی حکومت پہلے سے زیادہ مستحکم نظر آنے لگی۔ مگر سیّدوں کو خوب معلوم تھا کہ ان کا اصل حریف اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ نواب نظام الملک فتح جنگ ہیں جنھیں دربار مغلیہ کے قدیم امیر اپنا بزرگ جانتے تھے۔ یہ نامور سردار اپنی دور اندیشی اور پختہ کاری کی بدولت پچھلے انقلاب اور سازشوں میں شریک نہیں ہوئے تھے کہ سیدوں کو مخالفت کرنے کا کوئی حیلہ ملتا۔ لیکن خود نواب نظام الملک کی موجودگی ان غاصبانِ حکومت کو کھٹکتی تھی۔ لہٰذا رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے وقت نواب نظام الملک کو مالوے کا صوبہ دار بنا کے شہر سے رخصت کر دیا کہ اگر مرکزی حکومت پوری طرح قبضے میں آ گئی۔ تو پھر نواب نظام الملک کی قوت کو توڑ دینا آسان ہو گا۔ کیونکہ جنوب میں بھی سید حسین علی کا متبنیٰ بھتیجا سید عالم علی دکن کا نائب صوبہ دار تھا اور دونوں طرف سے ان قوی دشمنوں میں گھر کر نواب نظام الملک کو بظاہر سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکتی تھی۔

سیدوں کا خاتمہ

الغرض جب شمالی ہندوستان کی طرف سے ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا تو سیّدوں نے نواب نظام الملک کی طرف توجہ مبذول کی اور بجا و بیجا اعتراض کرنے لگے ادھر نوجوان شہنشاہ اور اس کی باتدبیر ماں قدسیہ بیگم کے خط پہنچے کہ "خاندان تیموری کی عزت و سلطنت کو سادات بارہہ سے بچانے ہیں اب سوائے خدا کے کسی پر نظر پڑتی ہے تو وہ تم ہو۔ ورنہ بادشاہ ان سیدوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن گیا ہے کہ سیر و شکار کے لئے بغیر ان کی مرضی کے جنبش نہیں کر سکتا۔ دوسرے ان غاصبوں نے اب خود تمھارے استیصال کا تہیہ کر لیا ہے۔ لہٰذا تمھیں جو کچھ کرنا ہے، کر گزرو۔"

نواب نظام الملک نے بڑی دانائی سے کام لیا۔ یعنی دہلی کا ارادہ کرنے کی بجائے پہلے دکن کی راہ لی۔ اور مالوے سے آٹھ دس ہزار آدمی سمیٹ کر یکایک نربدا کو عبور کیا کہ

برہانپور اور اسیر گڑھ کے مستحکم قلعے بلا دقت ہاتھ آ گئے۔ سیدوں نے پہلے منصوبے کے مطابق اپنے حریف کے استیصال کی غرض سے سید دلاور علیخاں کو پندرہ سولہ ہزار فوج دے کے راجپوتانے کے جنوب میں لگا رکھا تھا۔ اب اس کو حکم دیا کہ نواب نظام الملک کو دکن جانے سے روکے، یا عالم علی خاں کی فوج کے ساتھ مل کر جو اورنگ آباد سے بڑھ رہا تھا، دشمن کو پامال کردے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان دو کثیر التعداد فوجوں سے عہدہ برآ ہونا محال معلوم ہوتا تھا جن میں مرہٹے، راجپوت اور بارہہ کے بہت سے نامور جنگجو شریک تھے۔ مگر نواب نظام الملک نے پلٹ کر پہلے دلاور علیخاں کو شکست دی اور پھر عالم علیخاں پر حملہ کیا جو بالاپور (برار) کے قریب خیمہ زن تھا۔ یہ دونوں لڑائیاں سنہ ۱۷۲۰ء میں واقع ہوئیں سادات بارہہ شیروں کی طرح لڑے اور ان کے نامی سرداروں میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ پھرا۔ مگر دونوں میدانوں میں نواب نظام الملک نے کامل فتح پائی اور ملک دکن سیدوں کے قبضے سے نکل گیا۔

سید حسین علی اور سید عبداللہ اس وقت آگرے میں تھے کہ پہلے دلاور کی شکست اور پھر عالم علی کی ہزیمت کی اطلاع ملی۔ دیوان رتن چند کے تو حواس بجا نہ تھے اور وہ بار بار کہتا تھا کہ نواب نظام الملک سے جس طرح ممکن ہو صلح کر لی جائے۔ لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ حسین علی نوجوان بادشاہ کو ساتھ لے کے دکن پر فوج کشی کرے اور سید عبداللہ دہلی جا کر سلطنت کا انتظام رکھے۔ چنانچہ لشکر بادشاہی نے جنوب کی طرف کوچ کیا اور سید عبداللہ پائے تخت کو روانہ ہوا۔ ابھی وہ دہلی پہنچنے نہ پایا تھا کہ ہنڈون بیانہ کے قریب حسین علی کے مارے جانے کی خبر پہنچی اور معلوم ہوا کہ اب افواج شاہی خود اس کی سرکوبی کے لئے دہلی کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

سید عبداللہ کے لئے یہ بہت نازک موقع تھا۔ قدیم امرا پہلے ہی سیدوں کے درپردہ مخالف تھے۔ اب علانیہ دشمن ہو گئے۔ اصلی رفیق بارہہ کے سید تھے، سو دکن کی شکستوں نے اور سید حسین علی کے قتل[1] نے اس جماعت کے نامی ارکان کو بھی فنا کر دیا تھا۔ بایں ہمہ سید عبداللہ نے جس مستعدی سے مقابلے کی تیاری کی وہ انتظامی قابلیت اور دلیری کی حیرت انگیز مثال ہے۔ چنانچہ محمد شاہ کے آگرے سے گزرتے گزرتے وہ اسی نوے ہزار سپاہی بھرتی کر چکا تھا اور ایک تیموری شہزادے کی بادشاہی کا اعلان کر کے پھر دہلی سے بڑھ رہا تھا کہ پائے تخت پہنچنے سے پہلے اپنے مخالفوں کو پامال کر ڈالے۔ دہلی اور آگرے کے بیچ میں

[1] سید حسین کو میر محمد امین کی سازش سے ایک ترک نے عرضی دینے کے بہانے قتل کیا اور بعد میں خود سیدوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

فریقین کا مقابلہ ہوا، اور دو دن کی خون ریز جنگ میں سیدوں کی باقی ماندہ جماعت کو شکست فاش نصیب ہوئی، سید عبداللہ گرفتار ہو گیا مغل بادشاہ نے سیدوں کے پنجے سے رستگاری حاصل کر لی اور آخر کار حقیقی معنوں میں عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی ؛ (صفر ۱۱۳۳ھ ؍ ۱۷۲۰ء) ؛

بدنظمی اور نادر شاہ کا حملہ

اس انقلاب پر خاندان مغلیہ کے قدیم نمک خوار خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر نوجوان بادشاہ قابلیت اور مستعدی سے کام کرے، تو سلطنت مغلیہ میں پھر وہی زور و استحکام چند سال میں پیدا ہو سکتا تھا جس کے لئے اس کے اجداد کئی نسل تک تیغ زنی کرتے رہے ؛ لیکن ہندوستان کی تقدیر میں لکھا تھا کہ اس مرتبہ موروثی بادشاہی کی بدولت اسے وہ نقصان پہنچے گا جس کی صدیوں تک تلافی نہ ہو سکے گی ؛ اس موقع پر جبکہ سلطنت کو غیر معمولی مدبر اور جفاکش سپاہی کی ضرورت تھی، قضا و قدر نے محمد شاہ جیسے عیش پسند اور ناکارہ شخص کو تخت پر لا بٹھایا جسے شاہانہ تہذیب اور درباری آئین و مراسم سے خوب واقفیت تھی لیکن استقلال سے کوئی کام کرنا نہ آتا تھا۔ دوسرے مشاغل عیش و عشرت نے چند ہی سال میں اُسے معاملات سلطنت سے بے خبر کر دیا تھا ؛ ۱۷۲۲ء میں نواب نظام الملک کو پایۂ تخت میں طلب کر کے خطاب نواب آصف جاہ اور منصب وزارت عطا کیا گیا تو یہ امید ہوتی تھی کہ اس تجربہ کار باتدبیر سردار کی سعی سے وہ خرابیاں دور ہو جائیں گی جو پچھلے آٹھ دس برس میں پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن محمد شاہ کی بزم عیش میں قابلیت کی پرسش نہ تھی۔ آصف جاہ کو چند ہی روز میں دربار دہلی کا رنگ دیکھ کر مایوسی ہو گئی اور دکن کو مراجعت کی ؛[1]

---

[1] آصف جاہ نے سلطنت کی اصلاح و استحکام کی غرض سے چند تجاویز پیش کی تھیں :-
اوّل یہ کہ اجارے پر جاگیروں کو دینے کا طریقہ موقوف کیا جائے۔ جو رعایا کی تکلیف و بربادی اور ملک کی ویرانی کا سبب بن گیا تھا۔ (۲) پیشکش کے نام سے جو روپیہ امیروں یا عہدہ داروں سے لیا جاتا ہے وہ نہ لیا جائے کیونکہ درحقیقت وہ رشوت کا محض ایک مہذب پیرایہ تھا ؛

نواب آصف جاہ کا دکن میں آنا اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ اوّل تو راجہ ساہو کے وزیر یا پیشوا بالاجی کی کوشش سے مرہٹے پھر زور پکڑتے جاتے تھے، دوسرے دربار دہلی کے اشارے سے حیدر آباد کے ناظم مبارز خاں نے آصف جاہ کے خلاف علم سرکشی بلند کیا تھا اور دکن کی صوبہ داری کے دعوے سے اورنگ آباد پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ مگر آصف جاہ کے دکن پہنچتے ہی یہ تمام مفسدے دب گئے۔ مبارز خاں لڑائی میں مارا گیا، مرہٹوں کو جابجا ناکامی نصیب ہوئی کیونکہ کسی مستقل مزاج اور مستعد دشمن کے مقابلے میں ان کے پاؤں نہ جمتے تھے۔ چنانچہ آخر میں ان کے دوسرے پیشوا باجی راؤ نے نواب نظام الملک سے مصالحت کرلی اور مرہٹے دکن کو چھوڑ کر گجرات اور مالوے پر چھاپے مارنے لگے، جہاں کوئی پختہ کار ایسا مغل سردار انھیں روکنے والا نہ تھا۔ ان کی پیہم یورشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صوبوں میں ہر طرف ویرانی اور بدنظمی پھیل گئی، نواب آصف جاہ کو دوبارہ محمد شاہ کی مدد کے لئے دہلی جانا پڑا (۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء) اور اسی کے چند ماہ بعد نادر شاہ کے حملے کی شکل میں وہ قہر الٰہی نازل ہوا جو سلطنت مغلیہ کی آیندہ تباہی کا پیش خیمہ تھا۔

خاندان صفوی کے زوال نے چند سال پہلے دولت ایران کو مغربی افغانستان کے غلزی اور ابدالی قبائل کی آماج گاہ بنا دیا تھا۔ نادر قلی نے، جو اوّل اوّل ڈاکوؤں کا سردار تھا ان حملہ آوروں سے وطن کو نجات دلائی اور خود بادشاہ بن گیا۔ پھر ابدالیوں کی مدد سے اس نے غلزی قبائل کا علاقہ چھین لیا اور اسی جنگ کے دوران میں دربار دہلی کو بھی لکھا کہ بعض افغانی سرداروں کو جو ہندوستان میں پناہ گزیں تھے، گرفتار کر لیا جائے یا ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ اس کے مراسلات پر یہاں کسی نے توجہ نہ کی اور اسی بہانے سے نادر شاہ کابل پر قابض ہو گیا جو سلطنت مغلیہ کا شمالی صوبہ تھا۔

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ (۳) محصول جزیہ جسے سیدوں نے رتن چند اور راجیت سنگھ کی رعایت سے موقوف کر دیا تھا پھر جاری کیا جائے۔ (۴) دولت ایران کو جس پر ان دنوں افغان یورش کر رہے تھے، مدد دی جائے کہ یہ نہ صرف موجب نیک نامی بلکہ اس احسان کا بدلہ ہوتا جو اس سلطنت نے ہمایوں بادشاہ پر کیا تھا۔ (منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۹۴۸)۔

پھر اُس نے سندھ اُتر کے لاہور کے صوبہ دار کو شکست دی اور محمد شاہ کو مقابلے کا ہوش اُس وقت آیا جب کہ وہ پائے تخت سے سو سوا سو میل کے فاصلے پر آپہنچا تھا (رمضان ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء)۔ کرنال کے قریب فریقین کا سامنا ہوا اور اگر ہندوستانی امرا میں باہم نفاق نہ ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ فتح بھی انھی کا ساتھ دیتی۔ لیکن کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نادر شاہ سے مل گیا پھر آصف جاہ کی کوشش سے دو کروڑ روپے پر مصالحت ہو گئی تو اسی برہان الملک نے غداری کی اور نادر شاہ نے دھوکے سے محمد شاہ کو بلا کر نظر بند کر لیا اور دہلی پہنچ کر مساجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ قرینہ کہتا ہے کہ شاید اسی واقعے نے اہلِ شہر کو برافروختہ کیا اور وہ ایرانیوں سے آمادۂ جنگ ہو گئے۔ بہرحال اس بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں کہ ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔ نتیجہ البتّہ سب کو معلوم ہے کہ نادر شاہ کے حکم سے اس کے وحشی قزلباشوں نے شہر کو لوٹ کر تباہ و تاراج کر دیا۔ کوئی ایسا ظلم نہ ہو گا جو ان سپاہیوں نے نہتّے اور بے بس شہریوں پر نہ توڑا ہو۔ اور خود ان کا قافلہ سالار جو دولت لوٹ لے گیا اس کا پوچھنا ہی کیا ہے کہ تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ نقد تھا اور تختِ طاؤس، کوہِ نور وغیرہ بے شمار جواہرات، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، شاہانہ ساز و سامان اس کے علاوہ :

نادر شاہ چند مہینے کے اندر واپس ایران چلا گیا۔ لیکن اس کے حملے میں اوّل تو وہ علاقے خراب ہوئے جو اب تک نسبتہً محفوظ تھے دوسرے ہندوستان کا سب سے دولتمند شہر ایسا تاراج و برباد ہوا کہ پھر عرصۂ دراز تک نہ پنپ سکا۔ مگر اس نقصان کے علاوہ سب سے بڑا گزند جو سلطنت کو پہنچا وہ یہ ہے کہ بادشاہ کا رہا سہا بھرم جاتا رہا اور اس کے امرا جو پہلے اس کی ناقابلیت کی وجہ سے سرکشی کرتے تھے اب اس کی بے بسی دیکھ کر زیادہ مطلق العنان ہو گئے اور محمد شاہ کی وفات کے وقت تک (۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) تمام بڑے بڑے صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ تیموری خاندان میں اور ایک صدی تک برائے نام سلطنت باقی رہی لیکن ان آخری بادشاہوں کا چند سطروں میں ذکر کر دینا کافی ہو گا کیونکہ کسی بڑے علاقے میں ان کی حکومت نہ چلتی تھی اور رسم نے

اس تاریخ میں تفصیل سے صرف اُن سلاطین کا حال لکھا ہے جو ہندوستان کے بڑے حصے پر فرماں روائی کرتے رہے تھے۔

سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار

محمد شاہ کی وفات سے کچھ عرصے پہلے نادر شاہ کو اُسی کے بعض فوجی سرداروں نے سازش کر کے مار ڈالا اور افغانستان میں احمد شاہ ابدالی یا درّانی اس کا جانشین ہوا (۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء)۔
اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے کمزور ہمسایوں پر حملہ کیا اور لاہور لے کر دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ اسے روکنے کے لئے ولی عہد سلطنت شاہزادہ احمد کو فوج دے کے بھیجا گیا اور اس مغل شہزادے نے سرہند کے قریب ابدالیوں کو شکست دی حملہ آور نقصان اُٹھا کے پسپا ہوئے (ربیع الاوّل ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء)۔ لیکن پنجاب پر مغلوں کا دوبارہ عمل دخل ہونے نہ پایا تھا کہ باپ کے مرض الموت کی خبر سن کر احمد کو واپس آنا پڑا اور ابدالیوں نے کابل جاتے جاتے پھر گھوڑے لاہور کی طرف موڑ دئے۔

اس مرتبہ ان افغانی حملہ آوروں سے پنجاب کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ احمد شاہ تخت نشین ہوتے ہی خانہ جنگی اور اہل دربار کی سازشوں میں اُلجھ گیا تھا اور اس کے چھ سال انھی جھگڑوں میں گزرے حتیٰ کہ اس کے نوجوان امیر اور آصف جاہ اوّل کے پوتے غازی الدین خاں نے اُسے گرفتار کر کے آنکھیں نکلوا دیں اور جہاندار شاہ کے ایک بیٹے کو عالمگیر ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا (۱۷۵۴ء) پھر خود وزیر بن کر پنجاب گیا اور کچھ زور کچھ فریب سے لاہور پر قابض ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کو یہ خبریں ملیں تو دوبارہ فوج لے کے آیا اور گو غازی الدین نے معافی مانگ لی تھی اور پنجاب پر درانیوں کا قبضہ بحال ہو گیا تھا، تاہم احمد شاہ ابدالی نے خاص پائے تخت کی طرف کوچ کیا اور بلا مزاحمت شہر میں داخل ہو گیا۔ دہلی پہلی بربادی سے پنپنے نہ پائی تھی کہ ولایتیوں نے دوبارہ اُسے تباہ و تاراج کیا۔ احمد شاہ ابدالی جنوب میں دور تک بڑھنا چاہتا تھا اور آگرے کا محاصرہ کر رہا تھا کہ اس کی فوج میں وبا پھوٹی اور وہ بادل ناخواستہ اپنے وطن کو واپس ہو گیا (۱۷۵۷ء)۔

احمد شاہ ابدالی سلطنت مغلیہ کے ساتھ بھلائی کرنی چاہتا تھا اور عالمگیر ثانی کی التجا پر اس نے نجیب الدولہ خاں کو اپنے قائم مقام کی حیثیت سے پائے تخت میں سپہ سالار بنا دیا تھا کہ جہاں تک بن پڑے اس ڈگمگاتی ناؤ کو ڈوبنے سے بچائے، لیکن غازی الدین کی سازشوں کے سامنے نجیب الدولہ یا بادشاہ کسی کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ جب اُسے پائے تخت میں طرفدار نہ ملے تو اس نے مرہٹوں کو اُبھارا اور ان کی مدد سے پھر شہر پر قابض ہو گیا۔ نجیب الدولہ نے رہیل کھنڈ میں پناہ لی۔ سلطنت کا ولی عہد شاہ عالم (ثانی) مشرقی صوبوں کی طرف نکل گیا اور غازی الدین کے اشارے سے مرہٹے پنجاب پر چھا گئے۔ افغانی عمّال نے لاہور چھوڑ کر کابل کا راستہ لیا اور احمد شاہ ابدالی کو چوتھی مرتبہ ہندوستان پر لشکر کشی کرنی پڑی۔

غازی الدین نے احمد شاہ کی آمد آمد سن کر عالمگیر ثانی کو اس شبہے پر قتل کرا دیا کہ وہ احمد شاہ سے درپردہ سازش کر رہا ہے اور کام بخش کے ایک بیٹے کی بادشاہی کا اعلان کیا (۱۷۵۹ء) لیکن اتنے عرصے میں احمد شاہ پنجاب میں مرہٹوں کو شکستیں دے کر تھارنپور کے قریب پہنچ گیا تھا لہذا غازی الدین نے بھاگ کر سورج مل جاٹ کے پاس پناہ لی اور پانی پت کی جنگ کے فیصلے تک دہلی کا تخت خالی رہا۔ اس لڑائی میں جس کا حال آگے آتا ہے، فتح حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ نے شاہ عالم ثانی کی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور چونکہ وہ دہلی میں موجود نہ تھا لہذا نیابتہً اس کے بیٹے جواں بخت کو تخت پر بٹھا کر خود واپس افغانستان چلا گیا[1] (۱۷۶۱ء)۔

شاہ عالم ثانی کچھ روز بنگال و بہار میں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد

[1] صاحب سیر المتاخرین اسے احمد شاہ کا چھٹا حملہ بتاتا ہے۔

انگریزوں کا مہمان بن کے دس برس الٰہ آباد میں مقیم رہا۔ پھر مرہٹوں کی امداد کی امید پر دہلی چلا آیا (۱۷۷۱ء) لیکن ہمت و ذہانت کے باوجود اس میں نہ اس قدر استقلال و قابلیت تھی نہ یہ اختیار و قوت کہ اپنے امیروں کی سازشوں سے نجات حاصل کر لیتا۔ آخر میں غلام قادر خاں نے اُس کی آنکھیں نکال لی تھیں اور جب انگریزوں نے دوبارہ اسے اپنی حمایت میں لیا تو درحقیقت وہ بالکل بے بس اور بے اختیار ہو چکا تھا (۱۸۰۴ء)۔

شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی اور پوتا بہادر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے لیکن یہ بیچارے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور صرف لال قلعے کے مالک تھے ورنہ ان کی کہیں حکومت نہ تھی۔ البتہ ہندوستان کی بادشاہ پرست رعایا دل سے ان کا شاید وہی ادب و احترام کئے جاتی تھی جو ان کے نامور بزرگوں کا ہوتا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انگریزوں کے ہندوستانی سپاہی بگڑے اور انھوں نے اس نووارد قوم کی حکومت کو الٹنا چاہا تو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے ان کی نظر بہادر شاہ ہی پر پڑی اور اہل شورش کی اسی قدردانی کے طفیل وہ غریب بے گناہ مارا گیا۔ یعنی انگریزوں نے فتح پائی تو اس بادشاہ کو معزول و جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا (۱۸۵۸ء) اور پھر کسی کو اس کا جانشین یا دہلی کا برائے نام بادشاہ بنانا بھی گوارا نہ کیا۔

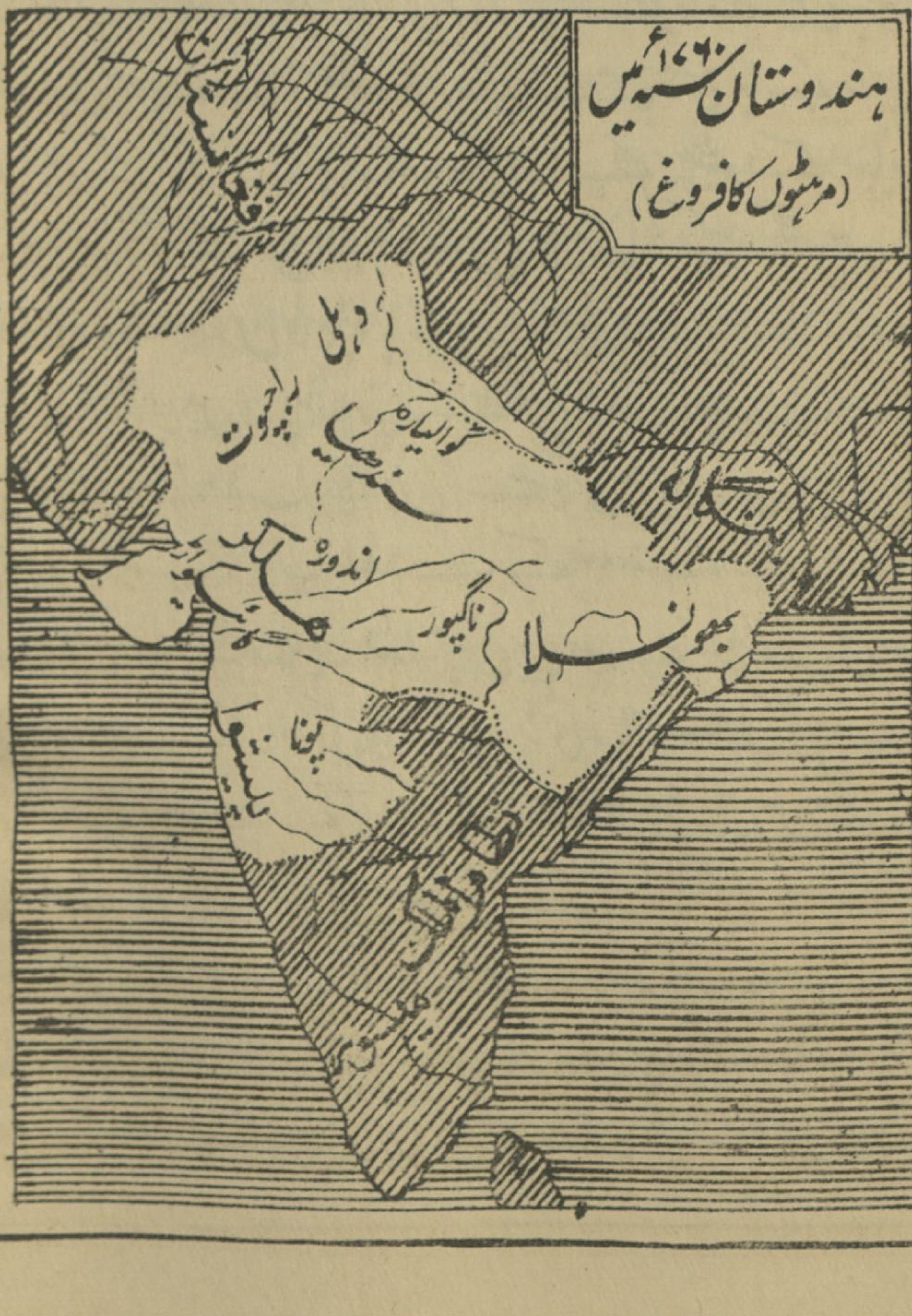
تتمہ

مرہٹوں کا فروغ	راجہ ساہو کی عیش پسندی کے باعث مرہٹہ ریاست کی باگ

اس کے وزیر بالاجی کے ہاتھ میں آگئی تھی اسی کا لقب پیشوا اور عہدہ بعد میں موروثی بن گیا اور انھی برہمن پیشواؤں کی انتظامی قابلیت اور اولوالعزمی نے مرہٹوں میں ایک نئی روح پھونک دی؛ بالاجی نے ریاست کا اندرونی انتظام درست کیا، اپنے سرکش جاگیرداروں اور بحری قزاقوں کی سرکوبی کی اور اسی زمانے میں امیر الامرا سید حسین علی نے دس لاکھ روپیہ سالانہ اور بوقت ضرورت ۱۵ ہزار سپاہی فراہم کر دینے کے عوض میں مرہٹوں کو دکن کی سردیسکھی اور چوتھ دینی منظور کرلی۔ کیونکہ اسے فرخ سیر کے مقابلے میں دہلی جانا تھا اور فوجی امداد کی ضرورت تھی لیکن بالاجی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مرہٹوں کے متفرق گروہوں کو ایک اتحاد میں وابستہ کر دیا اور قدیم دستور کے خلاف یہ طریقہ جاری کیا کہ نئی فتوحات میں ہر فوجی سردار کو اس کے کام کی نسبت سے مستقل جاگیر حصے میں دی جائے۔ اس تدبیر سے کئی مرہٹہ رئیس جو تنہا ہوکے باجگزار نہ تھے، پیشوا کے معاون ہوگئے اور ان کے اسی اتحاد کو تاریخ میں "مرہٹوں کا جتھا" کہنے لگے ہیں؛

بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا ہوا (۱۷۲۰ء) وہ دلیری اور حوصلہ مندی میں اپنے باپ سے بھی بڑھا چڑھا تھا؛ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے مقابلے میں اُسے دکن میں کامیابی کی امید نہ ہوسکتی تھی۔ البتہ مغلیہ سلطنت کے ضعف کے باعث گجرات اور مالوے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ پس یہی صوبے مرہٹوں کی جولاں گاہ بن گئے اور اسی زمانے میں ان کی چار بڑی بڑی ریاستوں کی بنیاد پڑی۔ (۱) راگھوجی بھونسلے نے برار کے شمال مشرق میں ناگ پور کو اپنی راجدھانی بنایا (۲) پیلاجی گائیکواڑ نے گجرات کے بڑے حصے پر قبضہ حاصل کیا اور موجودہ مہاراجہ بڑودہ اسی کے جانشین ہیں (۳) ملہار راؤ ہلکر اور (۴) رانوجی سندھیا مالوے پر چھا گئے اور اندور و گوالیار کی ریاستیں انھی کے وارثوں کے قبضے میں ہیں۔ واضح رہے کہ یہ پیشوا کے فوجی سردار تھے جنھیں اپنی

فوجی امداد کے معاوضے میں ان علاقوں میں بڑی بڑی جاگیریں دے دی گئی تھیں :
۱۷۴۰ء میں بالاجی مرا تو اس کا بیٹا بالاجی باجی راؤ پیشوا ہوا اسی کے زمانے میں بوڑھے راجہ ساہو نے وفات پائی اور پیشوا نے اس سے وصیت لکھوائی کہ مرہٹہ ریاست کا انتظام بالاجی باجی راؤ کے ہاتھ میں رہے گا ، یہ گویا ضابطہ حکمرانی کی سند تھی جس کے بعد ساہو کا لے پالک بیٹا محض ایک جاگیردار رہ گیا اور تمام اختیارات علانیہ پیشوا کے قبضے میں آگئے :
اسی بنا پر تارا بائی اور بعض مرہٹہ سرداروں سے پیشوا کو لڑائیاں لڑنی پڑیں لیکن آخر میں وہ اپنے مخالفوں پر غالب آیا اور ۱۷۶۰ء میں جب اس کی فوج نے نواب صلابت جنگ کو احمد نگر کے اضلاع دینے پر مجبور کیا اور دوسری طرف غازی الدین کی سعی و تحریک سے مرہٹہ سپاہی دہلی سے لاہور تک پھیل گئے تو کہنا چاہیئے کہ مرہٹوں کی قوت انتہائے عروج کو پہنچی - اور اگر اس وقت انھیں تمام ہندوستان پر بادشاہی کرنے کے خواب نظر آنے لگے ہوں تو یہ کچھ اچنبے کی بات نہ تھی :



پانی پت کی تیسری لڑائی

لیکن دربار دہلی کی جن سازشوں نے مرہٹوں کو یہاں تک بلایا تھا وہی آخر میں اُن کے لئے وبال جان ثابت ہوئیں کیونکہ اوّل تو روہیلوں سے ان کی جنگ چھڑ گئی پھر اسی کے ضمن میں شجاع الدولہ والیِ اودھ ان کا دشمن ہوگیا۔ لیکن ان دونوں سے کہیں زیادہ خوف ناک غنیم وہ تھا (احمد شاہ) جو شمال سے بڑھ رہا تھا کہ مرہٹوں کو پنجاب پر حملہ کرنے کی سزا دے۔ کھلے میدان کی جنگ میں کسی مستقل مزاج دشمن کے سامنے جم کر لڑنے کی مرہٹوں کو ابھی تک مہارت نہ تھی افغانیوں کے پنجاب میں گھستے ہی وہ بعجلت شمال سے ہٹ آئے اور جمنا اتر کے دہلی کے قریب جمع ہوئے تھے کہ خود احمد شاہ ابدالی نے یلغار کر کے یک بہ یک انھیں جا لیا۔ اور اگرچہ مرہٹوں کی تعداد حملہ آوروں سے زیادہ تھی لیکن انھیں سخت شکست ہوئی اور ایک دستہ فوج کے سوا، تقریباً سب کے سب مارے گئے؛ قریب قریب یہی حال مرہٹوں کی دوسری فوج کا ہوا جو ملہار راؤ ہلکر کے ماتحت دہلی کے جنوب میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیر المتاخرین کی روایت کے بموجب اس پر احمد شاہ کے سردار شاہ پسند خاں نے پندرہ ہزار سوار سے حملہ کیا تھا اور ایک دن اور ایک رات میں ستّر کوس کے قریب چل کر مرہٹوں پر اس طرح آ گرا تھا کہ ہلکر اور اس کے صرف تین سو آدمی بہ مشکل جان بچا کے نکل سکے ورنہ تمام سپاہی مارے گئے یا گرفتار ہو گئے (سنہ ۱۷۶۰ء)۔

دکن میں یہ خبریں پہنچیں تو پیشوا نے اس ذلت کا بدلہ لینے کی غرض سے بہت بڑا لشکر فراہم کیا اور اپنے چچیرے بھائی سداشیو کو جو بھاؤ کے نام سے مشہور ہے سپہ سالار بنا کے دہلی بھیجا۔ اہل لشکر کی کل تعداد کم سے کم تین لاکھ بیان کی جاتی ہے جس میں ایک لاکھ کے قریب باقاعدہ اور جنگ آزمودہ سوار و پیادہ سپاہی تھے اور باقی

رسد لانے والے نوکر چاکر یا وہ لوگ شامل ہیں جو لوٹ مار کی خاطر آملے تھے۔ مرہٹوں کو سب سے زیادہ ناز اپنے توپ خانے اور ان دس بارہ ہزار پیادوں پر تھا جو ابراہیم خاں گاردی کے ماتحت تھے۔ یہ مسلمان سردار فرانسیسی فوج میں رہ کر فن جنگ کے جدید قواعد و اُصول سے خوب واقف ہوگیا تھا اور اب اس نے مرہٹوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مختصر یہ کہ مرہٹوں کا اتنا زبردست لشکر نہ کبھی پہلے تیار ہوا تھا نہ کبھی آیندہ فراہم ہوا جتنا کہ اس وقت احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔

یہ افغان بادشاہ ان دنوں دوآب میں مقیم تھا کیونکہ مرہٹوں نے دہلی اور نواح دہلی کو اس طرح تاراج کیا تھا کہ وہاں رسد ملنی دشوار تھی دوسرے احمد شاہ کو والیٔ اودھ سے بھی ملاقات کرنی منظور تھی۔ غرض قلعۂ دہلی اور بعض دوسرے مقامات میں کچھ دستے متعین کر کے وہ اپنی فوج جمنا کے پار لے آیا تھا اور اسی جگہ اسے بھاؤ کے دہلی پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اس کی فوج میں چالیس ہزار ولایتی سپاہی تھے، اور مرہٹوں کی دو سو توپوں کے مقابلے میں چھوٹی بڑی کل چالیس توپیں بھی نہ تھیں لیکن جب وہ دہلی کی طرف بڑھا اور باغ پت کے مقام پر جمنا کو پھر عبور کر آیا تو مرہٹوں کو حملہ کرنے کی جسارت نہ ہوئی اور انھوں نے پانی پت کے قریب مورچہ بندی کر کے اپنا توپ خانہ لگا دیا کہ اسی کی آڑ میں مدافعانہ جنگ کریں۔ انھوں نے افغانوں کی رسد روکنے کی بھی تدبیریں کی تھیں مگر یہ سب الٹی پڑیں۔ مرہٹہ دستوں کو جا بجا ہزیمت نصیب ہوئی خود ان کا لشکر محصور اور رسد کے ذرائع مسدود ہو گئے۔ مجبور ہو کر مرہٹوں نے پوری فوج سے حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور

۶ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ (جنوری ۱۷۶۱ء) کے دن پانی پت کی تیسری جنگ عظیم واقع ہوئی۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ مرہٹہ سپاہی جان سے ہاتھ دھو کر میدان میں نکلے تھے۔ پہلو میں ابراہیم خاں گاردی جیسا ماہر فن اور بے جگر سردار آگے آگے تھے اور توپ خانے کی شرر باری کے بعد اس کے پیادہ سپاہی اس شدومد سے حملہ کر رہے تھے کہ احمد شاہ کے اتحادی رُہیلوں میں تہلکہ پڑ گیا۔ ادھر اس کا دوسرا اتحادی شجاع الدولہ جو چند گھنٹے پہلے تک مرہٹوں سے ساز و باز میں مصروف تھا گو اپنی جگہ پر جما رہا لیکن اس گھمسان میں اس نے کوئی مدد نہ کی اور فتح صرف افغانی سپاہ کی پامردی اور احمد شاہ کی کاردانی کے طفیل حاصل ہوئی۔ یہ بہادر سپہ سالار عقب میں کھڑا ہوا فوجوں کو اس خوبی سے لڑا رہا تھا کہ تھوڑی سی فوج نے مرہٹوں کا ریلا روک لیا اور ان کے ادھر الجھتے ہی احمد شاہ نے ایک رسالے کو حکم دیا کہ گھوڑے اڑا کے ان کے بازو پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اس خوفناک تندی سے ہوا تھا کہ مرہٹوں میں پریشانی پھیل گئی اور ملہار راؤ ہلکر کے میدان سے ہٹتے ہی ساری فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ افغانوں نے ہر سمت میں پندرہ پندرہ بیس بیس میل تک تعاقب کیا اور جو مفرور ادھر اُدھر دبک رہے تھے ان سے کینہ ور دیہاتیوں نے پچھلے مظالم کا بدلہ لیا۔"

عام اندازے کے مطابق اس میدان میں کم و بیش دو لاکھ مرہٹے مارے گئے اور ان کے نامی سرداروں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو مقتول یا مجروح نہ ہوا ہو۔ لیکن اس نقصان عظیم سے بھی زیادہ قابل لحاظ یہ بات ہے کہ پیشوا کو شمالی ہندوستان پر حکومت کرنے کی جو امیدیں پیدا ہوئی تھیں ان کا اسی ایک

شکست نے خاتمہ کر دیا اور وہ بندش بھی جس نے تمام مرہٹہ رئیسوں کو پیشوا کے ماتحت شیرازہ بند کر لیا تھا سست ہو گئی ؎

باب پانزدہم

فرنگی قوموں کی تجارت ہندوستان سے

اب ہم جس زمانے کے حالات بیان کریں گے وہ تاریخ ہند کا دور جدید ہے اور اس کی حدیں ہمارے زمانے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اُسے شروع کرتے وقت ہمیں سب سے اوّل ہندوستان اور یورپ کے درمیان قدیم تجارتی تعلّقات کا ذکر کرنا پڑے گا کیونکہ اسی کی بدولت ہند کے موجودہ فرماں روا اس مُلک تک پہنچے ہیں۔ واضح ہو کہ اوّل اوّل نہ تو جہازرانی کو یہ فروغ ہوا تھا جو آجکل حاصل ہے اور نہ یورپ سے ہندوستان تک کوئی سیدھا بحری راستہ کسی کو معلوم تھا، لہٰذا یہاں کا مال جہازوں پر لدکر یورپ جاتا بھی تھا تو بحرِ عرب سے بحرِ قلزم پہنچ کر مصر کے مشرقی ساحلوں پر اُسے اُتارنا پڑتا تھا اور وہاں وہ براہ اسکندریہ دوبارہ جہازمیں لدکر وینس اور جنوا کی منڈیوں تک پہنچتا تھا۔ وسطی راستہ افغانستان ہوکر ایران کے ساحل ساحل عراق عرب کے جنوب سے گزرتا اور فلسطین کی بندرگاہوں تک پہنچتا تھا اور تجارتی

قافلوں کا تیسرا راستہ وہ تھا جو کشمیر کے شمال مغرب سے گزر کر کاشغر پہنچتا اور وہاں سے اس کی دو شاخیں ہو جاتی تھیں۔ پہلی بحیرۂ خزر دریائے والگا اور ملک روس سے گزر کے جرمنی کے سواحل پر ختم ہوتی تھی اور دوسری وہ جو شمالی ایران کے راستے بحر اسود کی بندرگاہوں تک پہنچتی تھی۔ یہاں سے مال کے جہاز استنبول ہوتے ہوئے بحر متوسط (یا بحر روم) میں آجاتے تھے؛ غرض ان دنوں یورپ میں ہندوستان کے مال کی سب سے بڑی منڈیاں وینس و جنوا میں تھیں یا ملک جرمنی میں؛

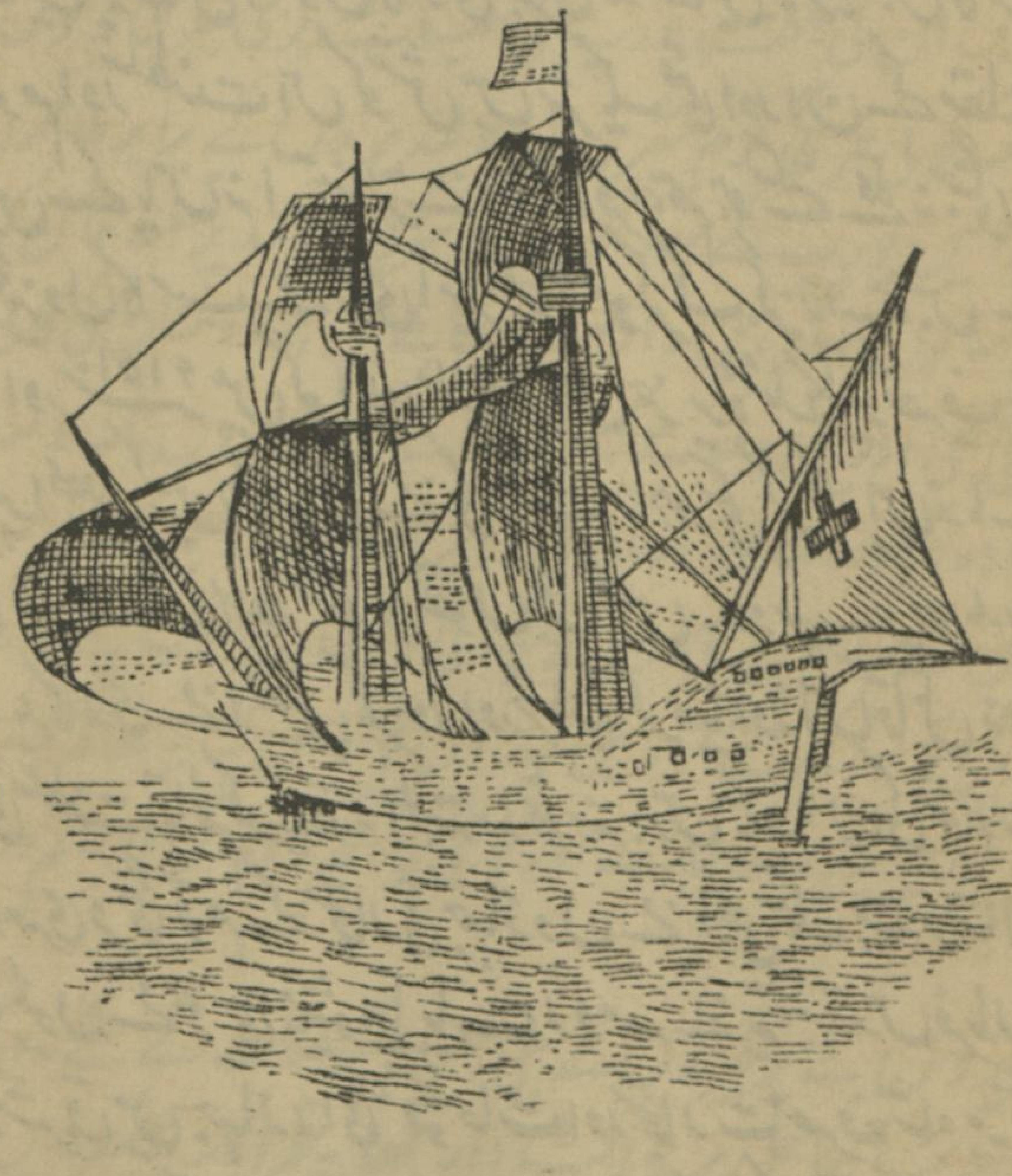
پرتگیزوں کی جہازرانی

لیکن یہ تینوں بہت طولانی اور بری راستے تھے اور یورپ کے باہمت جہازرانوں کو اس بات کی تلاش تھی کہ ممکن ہو تو ہندوستان کا کوئی بحری راستہ دریافت کرلیں۔ اس زمانے میں یورپ کے ملک تہذیب و تمدن میں ایشیا سے کہیں پیچھے تھے اور جہاں کہیں علم و شائستگی کی روشنی پھیلی تو وہ عرب فاتحین ہی کی بدولت پھیلی۔ چنانچہ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں سب سے اچھی حالت اسپین و پرتگال کی تھی جن پر صدیوں تک مسلمان فرمانروائی کرچکے تھے اور ان کے تسلط سے اسی زمانے میں ان ممالک نے آزادی پائی تھی؛ اسی آزادی نے یہاں کے لوگوں میں بڑے بڑے کام کرنے کا جوش پیدا کردیا تھا اور شہزادہ ہنری (سنہ ۱۳۹۴ء تا سنہ ۱۴۶۰ء) کی سرپرستی میں جسے جہازرانی کا بہت شوق تھا، پرتگال میں یہ فن بڑی ترقی کررہا تھا۔ اس امیر نے جہازرانی کا بہت بڑا مدرسہ اور کارخانہ قائم کیا تھا جس میں مشق و مہارت کے علاوہ نئی نئی ایجادیں کیجاتی تھیں کہ زیادہ تیز اور اچھے جہاز تیار ہوں پھر انھیں آراستہ کرکے "بحر ظلمات" میں بھیجا جاتا تھا کہ جنوب میں جہاں تک جا سکیں چلے جائیں؛ اسی پیہم کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۴۸۶ء میں دیاس نامی ایک ناخدا افریقہ کے انتہائے جنوب تک پہنچ گیا اور براعظم کے آخری سرے کے گرد گھوم کر جب وہ کنارے کنارے آگے بڑھا تو معلوم ہوگیا کہ اب ہندوستان کے سمندروں تک پہنچنے میں کوئی بری قطعہ حائل نہیں ہوگا؛ پندرھویں صدی کی یہ بہت بڑی "دریافت" تھی اور اس پر اہل پرتگال جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ کیونکہ پھر انھی نے افریقہ کے سرے کو راس امید کا موزوں نام دے کر بحر ہند میں اپنے جہاز ڈالے اور سنہ ۱۴۹۷ء میں واسکو ڈگاما پرتگال کی بڑی بندرگاہ سے جو جہاز لے کے چلا تھا وہی (مئی سنہ ۱۴۹۸ء) ساحل ملیبار پر لنگر انداز ہوا۔

اور یہ عالی حوصلہ ملاح کالی کٹ پہنچ گئے ؛

واسکو دِ گاما کے جہاز کی تصویر

تاریخ میں یہ پہلا جہاز ہے جو یورپ سے ہندوستان آیا



کالی کٹ کے رئیس کا لقب زمورن ہوتا تھا۔ اس نے ان پردیسیوں کی خاطر کی اور ان کے ملک سے تجارتی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ پرتگال کے بادشاہ کو اس نے لکھا کہ گرم مسالہ اور جواہرات کی ہمارے ہاں کمی نہیں اور ان کے عوض میں تم ہمیں سونا، چاندی اور مونگا بھجواؤ لیکن اس قسم کا لین دین جاری ہونے سے پہلے پرتگال والوں کو عرب سوداگروں سے مقابلہ کرنا پڑا جو بادِ مراد کے ساتھ ہر سال اپنی بادبانی کشتیاں لیکے سواحل ہند پر آپہنچتے اور یہاں کا مال بحرِ قلزم تک لیجایا کرتے تھے؛ انھیں ان فرنگی

رقیبوں سے رشک پیدا ہوا اور ادھر پرتگیزوں کی بعض حرکتوں نے زمورن کو بھی پرتگیزوں کا مخالف بنا دیا۔ اسی کے توڑ پر واسکو دگاما نے زمورن کے پرانے دشمن یعنی کوچین کے راجہ سے ساز باز کر کے عربوں کا بڑا ابرباد کر دیا (۱۵۰۲ء)۔ مگر چند سال بعد پرتگیزوں کو سخت شکست ہوئی اور آئندہ بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کرنی پڑی۔ ۱۵۰۹ء میں ان کے بیڑے کا ڈیو کے قریب ہندی اور مصری جہازوں سے معرکہ ہوا اور اس میں پرتگیزوں نے فتح پائی؛ غرض تھوڑے عرصے میں پرتگال والوں کا کوئی بحری مدِّ مقابل نہ رہا جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی تمام قوم اور سلطنت اس کوشش میں شریک تھی اور ان کے مقابلے میں محض بحری سوداگر تھے جن کے پاس نہ اتنے لڑنے والے فراہم ہو سکتے تھے نہ جنگی ساز و سامان۔

پرتگیزوں کا سب سے نامی امیر البحر البوکرک گزرا ہے جس نے خلیج فارس کے شہر ہرمز پر اور ۱۵۱۰ء میں گوا اور ۱۵۱۱ء میں جزیرہ "ملکا" پر تصرف حاصل کر لیا۔ لیکن سواحل ہند پر انھیں کہیں قبضہ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کی اسلامی سلطنتیں نہایت قوی اور منتظم ہاتھوں میں تھیں۔ دوسرے کچھ مدت بعد پرتگیزوں کی بداخلاقی اور بدکاری نے انھیں کمزور اور خراب کر دیا اور اس قابل نہ رکھا کہ اقصائے مشرق میں کوئی سلطنت قائم کر لیتے۔ البتہ ساٹھ ستر برس تک ان کی تجارت کو خوب فروغ رہا۔ کیونکہ کسی دوسری فرنگی قوم کے تجارتی جہازوں نے ابھی تک ہندوستان کا راستہ نہ دیکھا تھا دوسرے عیسائیوں کے دینی پیشوا پاپائے رومہ نے یہ "مقدس فرمان" (بل) شائع کر دیا تھا کہ مشرق میں جہاز رانی، فتوحات اور تجارت، صرف شاہ پرتگال کا حق ہے؛ لیکن جس وقت مذہبی آزادی نے بہت سے عیسائیوں کو پاپا کی اطاعت سے بے پروا کر دیا تو اس کے ان "فرامین" کی بھی کوئی وقعت نہ رہی۔ ادھر پرتگال کی سلطنت اسپین کے ساتھ ضم ہو گئی اور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۴۰ء تک وہاں کا کوئی علٰحدہ بادشاہ نہ رہا۔

ولندیزوں اور انگریزوں کی آمد

انگلستان کی ملکۂ الزبتھ کا قول تھا کہ ہوا اور سمندر کسی کی ذاتی ملک نہیں ہو سکتے کہ ان کے استعمال سے دوسروں کو روک دے پھر اسپین کے ساتھ انگریزوں کی جنگ چھڑی اور وہاں کا جنگی بیڑا طوفان میں برباد و فنا ہوا تو انگلستان کے ملاح نڈر ہو کے دور دور جانے لگے۔ اور جزائر ایشیا سے

تجارت کا راستہ کھل گیا۔ اس تجارت میں انگریز سوداگروں کو اتنا نفع ہوا کہ سنہ ۱۶۰۰ء میں لندن کے سوداگروں کی ایک جماعت یا کمپنی بن گئی اور اس نے الزبتھ سے یہ اجارہ لیا کہ اس جماعت کے سوا اور کوئی انگلستان کا باشندہ ایشیا سے تجارت کا مال نہ لائے گا۔ اسی کے دو سال بعد ملک ہالینڈ (یا اولند) میں ایک کمپنی قائم ہوئی جس کا سرمایہ بھی انگریزوں سے زیادہ تھا اور حکومت بھی اسے زیادہ مدد اور تقویت پہنچاتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اگر سولھویں صدی میں پرتگیز سوداگروں کا غلبہ رہا تو سترھویں میں ایشیا کے سمندروں پر ولندیز چھا گئے اور جب تک ان کی سلطنت یورپ کی سب سے بڑی بحری قوتوں میں شمار ہوتی رہی، اس وقت تک کوئی فرنگی قوم مشرق میں ولندیزوں کے برابر طاقتور نہ ہو سکی؛ مگر ابتدا میں یورپ کے سوداگر جزائر شرق الہند پر تسلط حاصل کرنے کے خواہاں تھے جو بیش قیمت گرم مسالوں کا گھر ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہندوستان کی کالی مرچ اور سونٹھ اتنی قیمتی نہ سمجھی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان مسالے کے جزیروں تک ولندیز کسی غیر کے قدم نہ آنے دیتے تھے اور ڈیڑھ صدی تک وہی وہاں بلا شرکت غیرے حکومت کرتے رہے۔ لنکا اور ہندوستان کے ساحل پر بھی ان کے تجارتی کارخانے خوب چمکے اور ان کا حسن انتظام اور تجارتی طریقہ دیگر اقوام کے لئے نمونہ بن گیا۔ اس کا خاص گر یہ تھا کہ تجارت کی کوٹھیوں کو جنگی قلعوں کی طرح مورچہ بند رکھا جائے اور کوٹھی کا مہتمم، سوداگر اور حاکم دونوں کے فرائض انجام دے؛

ولندیزوں نے پرتگیزوں کے بھی بعض مقبوضات لے لئے۔ ایک طرف سورت اور کوچین میں، اور مشرقی ساحل پر پلی کٹ اور مچھلی پٹم اور چنسرہ میں انکی بڑی بڑی کوٹھیاں بن گئیں جن کے ساتھ قلعے بنے ہوئے تھے اور حفاظت کے لئے فوجی جمعیت رہتی تھی؛

انگریزی کمپنی

مگر انگریز سوداگروں کی حالت دوسری تھی۔ انھیں تجارتی لین دین کے سوا کسی حکومت یا ملک گیری کا خیال نہ تھا اور نہ ان کا حکومت انگلستان سے کوئی سرکاری تعلق تھا۔ عرصۂ دراز تک وہ یہی کام کرتے رہے کہ یورپ کا سونا چاندی، اونی کپڑے، چھری چاقو اور شیشے کے برتن ہندوستان لاتے تھے اور اس کے بدل میں مسالے جواہرات اور یہاں کا بنا ہوا سوتی کپڑا وہاں پہنچاتے تھے؛ جزائر شرق الہند میں بھی سب سے

پہلے انگریز ملاحوں کے جہاز پہنچے تھے لیکن وہاں ولندیزوں کا غلبہ ہوا تو انگریزوں کی بحری تجارت زیادہ تر ہندوستان ہی کے ساتھ ہونے لگی۔ ۱۶۱۱ء میں انھوں نے مچھلی پٹم میں ایک کارخانہ کھولا اور دوسرے سال کمپنی کے کارندوں کو سورت میں کوٹھی بنانے کی جگہ مل گئی جو کہ ان دنوں مغلیہ سلطنت کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک مغربی ساحل پر انگریز سوداگروں کا سب سے بڑا مستقر یہی مقام رہا اور یہیں کمپنی کا میر مجلس یا اعلیٰ مہتمم رہا کرتا تھا، لیکن تاپتی کا دہانہ ریتی سے اٹتا جاتا تھا لہٰذا انھوں نے اپنا صدر مقام جزیرہ بمبئی کو قرار دے دیا جو شاہ انگلستان کو اپنی پرتگالی بیوی کے جہیز میں ملا تھا مگر اس نے بیکار جان کر دس پونڈ سالانہ کرائے پر کمپنی کے حوالے کر دیا تھا (۱۶۶۸ء)

اول اول انگریزوں کو ہند کی تجارت کے واسطے بھی اہل پرتگال سے لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ لیکن ۱۶۱۵ء میں انگریزوں نے گوا کے صوبہ دار کو سخت شکست دی جو اپنا تمام بیڑا لے کر آیا تھا کہ ان نو وارد حریفوں کا قلع قمع کر دے؛ اس کی شکست نے اُدھر تو انگریزوں کا حوصلہ بڑھا دیا اور اِدھر سلطنت مغلیہ کے حکام بھی انھیں اس قابل سمجھنے لگے کہ سورت اور اندرون ملک میں بیوپار کرنے کی اجازت دے دیں۔ بایں ہمہ پرتگیزوں سے لڑائی کی چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی اور ان میں سے جسے موقع ملتا وہ اپنے حریف کے جہازوں کو لوٹ لیتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۶۳۵ء میں فریقین کے درمیان صلح کا عہد و پیمان ہو گیا۔

طامس رو کا اصول

جہانگیر کے حالات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ۱۶۱۲ء میں انگلستان کا ایلچی طامس رو اس غرض سے ہندوستان آیا تھا کہ ہو سکے تو مغل شہنشاہ اور شاہ انگلستان کے درمیان باقاعدہ عہد نامہ مرتب ہو جائے مگر اس درخواست پر یہاں کوئی اعتنا نہیں کی گئی اور غالباً مغلیہ دربار کے بلند نظر امرا نے تجارتی معاہدہ کرنا سلطنت کی شان کے خلاف سمجھا؛ بہر حال طامس رو نے واپسی کے بعد ۱۶۱۶ء میں انگریز سوداگروں کو جس اصول پر چلنے کی تاکید کی تھی وہ اس کے خط میں بایں الفاظ تحریر ہے۔

"جنگ اور تجارت میں میل نہیں ہوتا پرتگال والے جو ایسے اچھے مقام اور علاقے ہوتے ساتھی بھوکے نظر آتے ہیں، اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے سپاہی نوکر رکھے ہیں جن پر سارا روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ ہالینڈ والوں کی بھی یہی غلطی ہے کہ تلوار کے زور سے اپنی بستی بسانی چاہتے ہیں۔ اُنھیں اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی اور بے شبہ بہتر سے بہتر

پیداوار کے بعض مقام ان کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن اس قبضے کو برقرار رکھنے کے لئے جو خرچ اٹھانا پڑتا ہے، ان کا سارا منافع اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر تمھیں نفع لینا منظور ہے تو اس کا گُر یہی ہے کہ سمندر ہی تک رہو اور چپ چاپ تجارت کئے جاؤ" بالفاظ دیگر طامس رو کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانی حکام کی اجازت لے کے امن و امان کے ساتھ بنج بیوپار کیا جائے۔ چنانچہ تقریباً ایک صدی تک انگریزوں کی حیثیت محض بیرونی تاجروں کی تھی جنھیں اپنے تجارتی کاروبار کے سوا اور کسی معاملے میں دخل نہ تھا۔ باقی تجارتی آزادی اور جان و مال کی حفاظت کے لئے انھیں مغل صوبہ داروں کے فرمان مل جاتے تھے اور ان کے امن و اطمینان میں کوئی شخص رخنہ اندازی نہ کرتا تھا؛ نوکروں یا کارندوں کو اپنے ضوابط کی پابندی کرانے کے لئے کمپنی کو سرکار نے معمولی مقدمات اور سزا کا اختیار دے دیا تھا اور بعد میں جب اس نے مدراس اور بمبئی کے قطعے آباد کئے تو وہاں اپنی طرف سے کوتوالی اور عدالت کے اور بلدی (میونسپل) محکمے بھی قائم کر دئے کہ جو محنتی مزدور ان بارونق منڈیوں میں آ بسے تھے ان میں انتظام رہے؛

مشرقی ساحل پر انگریزوں نے مچھلی پٹم میں کاروبار جاری رکھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ولندیزوں کی عداوت نے آخر کار انھیں یہاں سے نکلوا کے چھوڑا اور انھیں مجبوراً کوہم ندی کے دہانے پر اپنا ٹھکانا الگ بنانا پڑا۔ ساحل پر وہ چھوٹا سا ریتی کا قطعہ جسے ۱۶۳۹ء میں چینگل پٹ کے نایک یا زمیندار نے انگریزوں کو دیا، آج جنوبی ہند کا صدر مقام ہے۔ سرزمین ہند پر انگریزی کمپنی کی یہ پہلی ملک تھی، اور کسی کو یہ گمان بھی نہ گزر سکتا تھا کہ یہی مسکین ساہوکار جو ریاست چندرگری کے ایک معمولی مالگزار سے آج نکمی زمین کا ٹکڑا مانگ رہے ہیں، کچھ مدت بعد کشور ہندوستان کے مالک بن جائینگے! اس وقت تو کمپنی کو اڑیسے کے ساحل پر اپنی چند کوٹھیاں کھولنے میں بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی، اور سنہ ۱۶۵۰ء میں بنگالے کے صوبہ دار نے انھیں اپنے صوبے میں تجارت کرنے کی اور ہگلی اور قاسم بازار میں کوٹھیاں بنانے کی اجازت عطا کی تو وہ اس کو بہت بڑی نعمت سمجھے؛

قلعہ بند تجارت

دکن میں ان دنوں مرہٹوں نے طوفان مچا رکھا تھا اور سیواجی کے مسلح جرگے جہاں موقع پاتے ہاتھ مار جاتے تھے چنانچہ سورت کو بھی

انھوں نے دو مرتبہ لوٹا۔ اگرچہ انگریزوں کی کوٹھی اس غارتگری سے محفوظ رہی تاہم کمپنی کے ناظمایا (ڈائرکٹروں) کی ۱۶۸۶ء میں یہی رائے ہوگئی تھی کہ جب تک پختہ حصار نہ بنایا جائے مال کی حفاظت اور تجارت کی آزادی مخدوش ہے جس کا مطلب دوسرے لفظ میں یہ ہوا کہ انگریز بھی طاس روکا اصول ترک کرنے پر آمادہ ہوگئے اور انھیں چپ چاپ بیوپار کی بجائے "قلعہ بند تجارت" کا خیال آنے لگا۔ ادھر بنگالے کے صوبہ دار نواب شایستہ خاں نے اپنے علاقے میں ان کے مال پر محصول لگا دیا اور وہ لڑنے مرنے پر کمر بستہ ہوگئے۔ انھوں نے اپنے نزدیک مغل شہنشاہ سے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا تھا اور دس جہازوں میں فوج کے چھ دستے (کمپنی) انگلستان سے بھرتی کرکے ہندوستان کی طرف بھیجے تھے۔ غالباً یہی "مہم" تھی جس کے کارناموں کا ذکر ضمنی طور پر مورخ خافی خاں نے بھی کیا ہے (جلد دوم صفحہ ۴۲۱ تا ۴۲۸) کہ گنج سواری نام بادشاہی جہاز کو عرب سے آتے ہیں انگریزوں نے لوٹ لیا اور برہنہ کرکے بے بس اہل جہاز کی تلاشی لی۔ بعض عورتوں نے بے عزتی سے بچنے کے لئے سمندر میں گر کے یا خنجر مار کے اپنے تئیں ہلاک کیا اور اس تمام واقعے کی خبر شہنشاہ کو پہنچی (۱۱۰۰ھ) عالمگیر نے سورت کے متصدی اعتماد خاں کو حکم دیا کہ جہاں کہیں انگریز گماشتے ملیں قید میں ڈال دئے جائیں اور جزیرۂ بمبئی سے انھیں نکال دیا جائے جہاں کی فوج اور جنگی تیاریوں کا خافی خان نے چشمدید حال بیان کیا ہے۔

تھامسن کا بیان ہے کہ اس انگریزی مہم کا حشر بہت برا ہوا کمپنی کو بڑی ذلت اٹھانی پڑی۔ ہگلی اور قاسم بازار کے انگریز سوداگر کوٹھیاں چھوڑ چھوڑ کے فرار ہوگئے اور سورت اور مچھلی پٹم سے حکام شاہی نے انھیں نکال دیا۔ کپتان ہیت کے ماتحت جو بیڑا بھیجا گیا تھا وہ چاٹ گام تک آیا لیکن کچھ کئے بغیر مایوس و ناکام واپس گیا آخر انگریزوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنا قبول کیا اور دوبارہ انھیں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اسی اجازت کے کچھ دن بعد جاب کارنگ اپنے چند گماشتوں کو پھر ہگلی ندی کے مشرقی کنارے پر لیکر آیا (۱۶۹۰ء) جہاں ایک گھرے جوہڑ کے قریب اس نے پہلے بھی کوٹھی بنانی چاہی تھی کیونکہ وہ اس مقام کو بادشاہی عمال کی دسترس سے باہر جانتا تھا۔ آب و ہوا کے اعتبار سے یہ جگہ بہت خراب اور وبائی تھی اور اول اول جو لوگ یہاں آکے بسے وہ آئے دن بخار اور دیگر عوارض میں مبتلا رہتے تھے لیکن کارنگ نے یہ انتخاب کچھ ایسی نیک ساعت میں

کیا تھا کہ ان تکلیفوں کے باوجود یہ بستی ترقی کرتی رہی اور کلکتے کے نام سے مشہور ہوئی جو آج کل ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور چند سال قبل تک حکومت انگریزی کا صدر مقام تھا؛ ابتدا میں کمپنی نے اس بستی کے لئے تین گاؤں صوبہ دار بنگالہ سے خرید لئے تھے اور اسی زمین پر مال کی حفاظت کے لئے وہ چاردیواری تعمیر کی تھی جو تکمیل پانے کے بعد فورٹ ولیم کہلانے لگی۔

انگریزوں کی دوسری کمپنی

ادھر اسی زمانے میں پرانی کمپنی کے خود انگلستان میں بہت سے رقیب پیدا ہو گئے اور بعض لوگ شاہی فرمان کے خلاف اندر ہی اندر اپنے تجارتی جہاز اور گماشتے ہندوستان بھیجنے لگے۔ پھر آخر کمپنی سے مخالفت اس قدر بڑھی کہ پارلیمنٹ کو دبنا پڑا اور ایک نئی کمپنی کو بھی تجارت کرنے کیلئے شاہی فرمان مل گیا۔ اس نئی کمپنی میں انگلستان کے بہت سے ذی اثر لوگ شامل تھے اور اس کی طرف سے سر نکولاس ویٹ اور سر ولیم نورس جیسے معزز ایلچی دربار مغلیہ میں بھیجے گئے تھے۔ لیکن اس کمپنی کو زیادہ کامیابی نہ ہو سکی اور اس کی بعض حرکتوں نے حکام شاہی کو انگریزوں سے دوبارہ بدظن کر دیا۔ آخر دونوں جماعتوں کو باہمی رقابت کے نقصان نظر آئے اور وہ مصالحت پر آمادہ ہو گئیں۔ سنہ ۱۷۰۲ء میں پارلیمنٹ نے ان کے اتحاد کو بروئے قانون تسلیم کر لیا تھا مگر اس اتحاد کی تکمیل سنہ ۱۷۰۸ء میں ہوئی لیکن اس جھگڑے اور ملاپ کی وجہ سے دو اہم اصول جو طے ہوئے وہ یہ تھے کہ اول تو تجارتی معاملات میں کسی جماعت کو اجارہ دینے نہ دینے کا تمام اختیار انگریزی مجلس یا پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آ گیا دوسرے یہ کہ پارلیمنٹ نے اپنے اہل وطن کو بیرونی تجارت کی عام اجازت دینے کی بجائے گویا سوچ سمجھ کر اجارے کے طریق کو ترجیح دی چنانچہ ایک صدی تک اس اصول پر عملدرآمد ہوتا رہا اور سنہ ۱۸۱۳ء میں جب تک پارلیمنٹ نے اس طریقے کو منسوخ نہ کیا اس وقت تک سوائے مذکورۂ بالا متحدہ کمپنی کے انگلستان کا کوئی باشندہ بطور خود ایشیا کے ملکوں کا مال انگلستان لا کر لین دین نہیں کر سکتا تھا۔

فرانسیسیوں سے چشمک اور جنگ

غرض اٹھارھویں صدی کے آغاز میں دونوں کمپنیوں نے متحد جماعت بن کر تجارت شروع کی تو اس وقت انگریزوں کے مستقر تین تھے۔ بمبئی مدراس اور کلکتہ؛ ان تینوں کو قلعہ بند

کر لیا گیا تھا۔ اور ان کی دیواروں کے باہر بھی تھوڑی سی زمین کمپنی کی ملکیت بن گئی تھی کمپنی کے نظار کا دلی منشا یہ تھا کہ اس زمین سے اتنا مالیہ وصول ہو جایا کرے جو ان کے مقامی انتظامات، فوجی جمعیت اور دیوانی عہدہ داروں کے مصارف کو کافی ہو اور تجارت سے جو نفع ہو وہ حصہ رسد سرمایہ داروں کو مل جایا کرے، اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ یہ سوداگر عالمگیر ہی کے زمانے سے مشرق میں مقبوضات حاصل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے تھے۔ لیکن یہ محض خیالی پلاؤ تھے۔ دوسرے سلطنت ہند کی طرف سے تادیب و تنبیہ کی گئی تو چند ہی مصائب نے ان کے ہوش بگاڑ دیئے اور انھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ ملک گیری کی آرزو چھوڑ کر اپنے اصلی دھندے یعنی دکانداری اور بنج بیوپار میں مصروف ہو جائیں۔ اور یہ سبق انھیں ایسا ملا تھا کہ جب تک فرانسیسیوں نے نہ ابھارا اس وقت تک انھیں دوبارہ کبھی اس قسم کی ہوس پیدا نہ ہوئی؛ اصل یہ ہے کہ فرانسیسی انگریزوں کی نسبت زیادہ تیز تھے اور اس سے پہلے کہ انگریز سوداگروں کے ذہن میں بادشاہی کا خیال آئے ان کے نووارد حریفوں نے اپنی سلطنت قائم کرنے کی پوری تجویز مرتب کر لی تھی۔ ان کا زور بڑھتے دیکھ کر انگریز محض ان کی کامیابی میں سد راہ ہونا چاہتے تھے اور اسی لئے جنگ کی نوبت پہنچی لیکن جس وقت اس مقابلے میں انگریز فرانسیسیوں پر غالب آئے تو ان کا ہندوستان میں جو مرتبہ تھا وہ از خود انگریزوں کو حاصل ہو گیا اور بعض علاقوں پر قبضہ ہو جانے کے علاوہ کشورستانی کے وہ گر بھی ہاتھ آ گئے جو ڈیوما اور ڈوپلے جیسے شاطروں نے دریافت کئے تھے؛

اس اجمال کی شرح میں پہلے فرانسیسیوں کے ہند میں آنے کا مختصر بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ واقعات کا پورا سلسلہ نظر کے سامنے آ جائے:۔

فرانسیسیوں کی آمد اور ترقی

اپنے دوسرے ہمسایوں کی تجارتی اولوالعزمی دیکھ کر فرانسیسی سوداگر بھی سترھویں صدی کے آغاز میں ایشیائی سمندروں کی طرف اپنے جہاز بھیجنے لگے تھے لیکن ان کوششوں نے باقاعدہ صورت اس وقت اختیار کی جب کہ فرانس کے مشہور وزیر کولبیئیر کی سرپرستی میں ایک نئی کمپنی قائم ہوئی (سنہ ۱۶۶۴ء) اور اس کے گماشتوں نے سورت اور مچھلی پٹم میں شاہی حکام سے بعض تجارتی مراعات حاصل کر لیں (سنہ ۱۶۶۹ء)؛ اس کے چند ہی روز بعد ایک

بحری مہم روانہ کی گئی کہ ولندیزی تاجروں کو جبراً مشرق سے نکال دے۔ لیکن اس مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی اور آخر میں مشرقی ساحل پر صرف ایک قطعۂ زمین فرانسیسیوں کے پاس رہ گیا جسے انھوں نے سلطنت بیجاپور کے صوبہ دار شیر خاں لودھی سے خریدا تھا۔ اسی مقام پر ان کے سردار مارتین نے ہندوستانی معماروں کو بلا کر ایک خوش وضع شہر کی بنیاد ڈالی اور ہندی سپاہیوں کو مغربی قواعد جنگ کی مشق کرائی۔ فرانسیسی تلفظ کی رُو سے اس نئے شہر کا نام "پان دی شیری" ہوگیا۔ مگر انگریز دال کی جگہ ڈال اور شین کے بجائے چے بولتے ہیں ؛ ۱۶۹۳ء میں ولندیزیوں نے فرانسیسیوں کو یہاں سے نکال دیا تھا لیکن جب ان قوموں میں صلح ہوئی تو یہ شہر بھی واپس دے دیا گیا اور ۱۷۰۶ء تک مارتین ہی اس کا عامل یا گورنر رہا ؛

۱۷۲۵ء میں فرانسیسیوں نے ملیبار کے ساحل پر ماہی کا مقام لے لیا۔ لیکن ان کے سیاسی فروغ کا زمانہ وہ ہے جب کہ پان دی شیری میں دیوماان کا گورنر بنا (۱۷۳۵ء تا ۱۷۴۱ء) اس شخص کی ارکاٹ کے نواب دوست علیخاں سے دوستی تھی اور اسی کے داماد چندا صاحب نے تنجور کے راجہ سے کارے کال کی بندرگاہ جبراً فرانسیسیوں کو دلوا دی تھی ؛ چندا صاحب بہت ہوشیار اور مستعد آدمی تھا۔ اس کی درپردہ کوشش یہ تھی کہ دوست علی کے بعد ارکاٹ کی ریاست نواب کے بیٹے صفدر علی کو نہ ملے بلکہ یہ اس کا وارث بنجاؤں اسی بنا پر صفدر علی ہمیشہ اس کی طرف سے اندیشہ مند رہتا تھا۔ اور جب ۱۷۴۰ء میں نواب دوست علی مرہٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو صفدر علی نے اس شرط پر مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی کہ چندا صاحب کو ارکاٹ کے جنوبی علاقے سے خارج کر دیا جائے جہاں وہ اپنی حکومت جمانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں نے دھوکے سے ترچناپلی میں چندا صاحب کو گھیر لیا اور گرفتار کر کے ستارا لے گئے چندا صاحب نے محصور ہونے سے پہلے اپنے اہل و عیال اور ساس کو فرانسیسیوں کی حفاظت میں پان دی شیری بھیج دیا تھا۔ لہٰذا مرہٹوں نے ادھر یورش کی اور انھیں حوالے کر دینے کا مطالبہ کیا دیوما نے جواب میں کہلا بھیجا کہ چندا صاحب کی بیوی شاہ فرانس کی پناہ میں ہے اور جب تک ایک فرانسیسی بھی زندہ ہے کوئی اسے یہاں سے نہیں لیجا سکتا مرہٹوں نے حسب دستور روپیہ طلب کیا تھا اس کا بھی صاف جواب مل گیا اور گرد و نواح کی غارتگری

کرنے کے سوا انھیں فرانسیسی شہر پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس واقعے نے فرانسیسیوں کو تمام ہندوستان میں مشہور کر دیا کیونکہ مرہٹے اس وقت بڑے عروج پر تھے ان کی تاخت تاراج نے ہند کے اکثر حصوں میں سخت تلاطم ڈال رکھا تھا، جس کا کچھ حال ہم کتاب کے پچھلے حصے میں پڑھ چکے ہیں غرض ڈیوما کو اس بہادری کی بڑی داد ملی۔ نواب نظام الملک نے اس کے لئے خلعت بھیجا اور دربار دہلی نے اسے چار ہزاری منصب اور خطاب نوابی سے سرفرازی بخشی ؛

دوپلے ۱۷۴۱ء تا ۱۷۵۴ء

اسی زمانے میں ڈیوما اپنے عہدے سے دستکش ہوا تو یہ منصب اور خطاب اس کے جانشین دوپلے کو ملے جو ہندوستان میں فرانسیسیوں کا سب سے نامی گورنر گزرا ہے وہ پہلے بنگالے میں فرانسیسیوں کی تجارتی بستی چندرنگر کا عامل تھا اور وہاں اپنی قابلیت اور مستعدی سے اس گمنام موضع کو ترقی دے کر اس نے نہایت بارونق منڈی بنا دیا تھا انھی خدمات کے صلے میں کمپنی نے اسے ڈیوما کا جانشین بنایا لیکن حقیقت میں دوپلے کی آیندہ ناموری اور کامیابی میں اس کی بیوی کا بڑا حصہ ہے جو ہندوستانیوں کی عادات ورسوم اور زبانوں سے خوب واقف تھی۔ سیاسی معاملات کے سمجھنے میں اس نے ایسا رسا ذہن پایا تھا کہ دوپلے بغیر اس کے مشورے کے کوئی کام نہ کرتا تھا ؛

غرض اُدھر تو دوپلے اور اس کی بیوی نئے نئے منصوبے بنانے میں مصروف تھے اور اِدھر ارکاٹ میں ایک اور انقلاب واقع ہوا۔ یعنی پہلے تو صفدر علی کو اس کے برادر نسبتی مرتضیٰ علی نے قتل کر دیا اور خود نواب بن بیٹھا (سنہ ۱۷۴۲ء) اور اس کے بعد لوگوں میں برہمی پھیلی تو وہ اپنے صدر مقام سے بھاگ کر ولور چلا آیا اور ارکاٹ میں صفدر علی کے صغیر سن بیٹے کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ارکاٹ کا علاقہ اصل میں صوبہ دار دکن کے ماتحت ایک چھوٹا صوبہ تھا اور گو یہاں کی نظامت یا صوبہ داری قریب قریب موروثی بن گئی تھی تاہم قانوناً کوئی شخص اعلیٰ صوبہ دار کی بغیر اجازت ارکاٹ کا حاکم نہ ہو سکتا تھا۔ پس جب صفدر علی کو مار کے مرتضیٰ علی ارکاٹ کا حاکم بن بیٹھا تو دکن کے صوبہ دار نواب نظام الملک نے اس کی تنبیہ کے لئے فوج روانہ کی اور صفدر علی کے صغیر سن بیٹے کو وہاں کا حاکم تسلیم کر لیا لیکن اس کی اتالیقی کے واسطے اپنے دربار کے ایک امیر انور الدین کو مقرر

کردیا، اس انتظام کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ صفدر علی کا یہ بیٹا بھی کسی مقامی سازش کا شکار ہوا، اور نواب نظام الملک کی جانب سے ارکاٹ کی صوبہ داری انورالدین کو عطا کر دی گئی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی پہلی جنگ

اس اثنا میں انگلستان اور فرانس کی یورپ میں جنگ چھڑ گئی (۱۷۴۵ء) اور اس کا اثر ہندوستان تک پہنچا مگر فرانسیسیوں کی فوجی قوت کم تھی اور اسی لیئے دوپلے نے نواب انورالدین سے یہ اعلان کرا دیا کہ میرے علاقے میں کوئی فریق جنگ نہ کرنے پائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں کو اپنے بحری دستے کے پہنچنے کا انتظار تھا جو ۱۷۴۶ء میں لابوردونے کے ماتحت ہندوستان آگیا اور انگریزی بیڑے کو شکست دی۔ اس وقت دوپلے کی رائے یہ تھی کہ بلاتاخیر مدراس کو چھین کر ویران و منہدم کر دیا جائے کہ جنوبی ہند میں انگریزوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہے۔ لیکن لابوردونے خود رائے آدمی تھا اس نے اول تو بہت دن تک مدراس پر حملہ ہی نہ کیا اور پھر وہاں گیا تو فتح کرنے کے بعد بھی تاوان لے کے قلعہ واپس کر دیا۔ دوپلے کے ماتحت عہدہ داروں نے جو اس کے ساتھ تھے اس قسم کی صلح سے روکنا چاہا تھا مگر اس نے ایک نہ سنی بلکہ انھیں حراست میں لے لیا۔ پھر طوفان میں کئی فرانسیسی جہاز برباد ہو گئے تو لابوردونے واپس چلا گیا اور اب دوپلے نے بحری امداد کے بغیر خود مدراس پر قبضہ کر لیا۔ مدراس پر حملہ کرتے وقت اس نے انورالدین کو یہ فریب دیا تھا کہ شہر پر قبضہ ہوا تو اسے نواب کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن جب انگریزوں کو بحری شکست ہوئی اور مدراس فرانسیسیوں کے قبضے میں آگیا تو دوپلے نے عہد شکنی کی اور نواب کی فوج پر حملہ کر کے اسے پسپا کر دیا۔ انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ اس معرکے نے فرنگی سپاہیوں کی شجاعت اور جنگی قواعد کی فوقیت ثابت کر دی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ دوپلے کو قلعۂ مدراس کے برج اور مورچے تڑوانے پڑے اور اس نے نواب سے مصالحت کر لی، تو اس واقعے کی نوعیت بدل جاتی ہے دوسرے یاد رکھنا چاہیئے کہ فرانسیسیوں کی اس فوج میں اور بعد ازاں انگریزوں کی تمام فوجوں میں زیادہ تعداد ہمیشہ ہندوستانی سپاہیوں کی ہوتی تھی اور فرنگیوں نے جتنی لڑائیاں جیتیں ان میں اکثر یہی اجیر ہندوستانی سب سے پیش پیش ہوتے تھے۔

البتہ فرانسیسیوں کو اپنے انگریز حریفوں پر نمایاں فوقیت دی جا سکتی ہے کیونکہ

جب ۱۷۴۶ء میں تسخیر مدراس کا بدلا لینے انگریزوں کا بہت بڑا بیڑا ہندوستان آیا جس کی فوج میں خاص بادشاہی سپاہ کے دستے شامل تھے، تو گو ڈوپلے کے پاس کوئی جنگی جہاز نہ تھا اور نہ اتنی فوج تھی' باایں ہمہ اس نے نہایت استقلال سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ حملہ آور ڈیڑھ مہینے تک پانڈی چیری کا محاصرہ کئے رہے اور آخر میں ایک ہزار لاشیں چھوڑ کر انھیں ناکام واپس ہونا پڑا۔ مگر فرانس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہاں کے مدبر اپنے ہندوستانی گورنر کی مطلق قدر نہ سمجھے اور نہ اس کی کوششوں کی وہاں کوئی داد ملی۔ حتیٰ کہ جب دونوں قوموں میں صلح ہوئی تو شہر مدراس بھی انگریزوں کو واپس دے دیا گیا اور اپنے ہم وطنوں کی نافہمی سے ڈوپلے کی ساری محنت اور کامیابی خاک میں مل گئی۔ تاہم ان واقعات نے ہندوستان میں فرانسیسیوں کی ناموری کو چار چند بڑھا دیا اور جب دکن میں نواب نظام الملک کے انتقال پر فساد ہوا تو حکومت کے ناکام مدعیوں کی نظر فرانسیسیوں ہی پر پڑی اور چند سال کے اندر دکن کے ملکی معاملات میں ان کا اس قدر دخل بڑھ گیا کہ اگر خود سلطنت فرانس غلطی پر غلطی نہ کرتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

فرانسیسیوں سے دوسری لڑائی

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۷۴۸ء میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول نے وفات پائی۔ جانشینی کے لئے مرحوم کے دوسرے بیٹے نواب ناصر جنگ سے زیادہ موزوں کوئی نہ تھا کیونکہ نواب نظام الملک کے فرزند اکبر کو دربار مغلیہ میں باپ کی قایم مقامی کے سوا دکن کا کوئی تجربہ نہ تھا اور ناصر جنگ کو بارہا ان علاقوں میں اپنی بہادری اور حکمرانی کی قابلیت دکھانے کا موقع ملا تھا۔ غرض بڑے بھائی کے ادھر متوجہ ہونے سے پہلے دکن میں نواب ناصر جنگ کی مسندنشینی کا اعلان ہو گیا (۱۷۴۸ء) لیکن خود دکن کے اندر آصفجاہ اول کے چہیتے نواسے مظفر جنگ حاکم بیجاپور کو نانا کی وراثت کا دعویٰ تھا اور اسے ایک رفیق بھی ایسا ہی مل گیا جو سات سال مرہٹوں کے پاس قید رہنے کے باوجود ارکاٹ کی نوابی لینے سے مایوس نہ ہوا تھا۔ ہماری مراد چندا صاحب سے ہے جس کی اسیری کا حال ہم پہلے پڑھ آئے ہیں۔ اس بات کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا دشوار ہے کہ ان کی خط و کتابت کس طرح شروع ہوئی۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ چندا صاحب نے اسی گرفتاری میں مظفر جنگ کی رفاقت کا عہد کیا اور اس کے عوض میں ارکاٹ کی نوابی کا وعدہ لے لیا تھا۔ ان دونوں کی حالت کو دیکھ کر اس عہد و پیمان پر ہنسی آتی ہے لیکن فتنہ پرداز

دوپلے کو اپنی کیّادی کے جوہر دکھانے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا اور اس نے بڑے شوق سے سازش میں شرکت کی اول تو مرہٹوں کو بہت سا تاوان دے کے وہ چندا صاحب کو قید سے چھڑا لایا اور پھر ایسے پیمانے پر جنگ کی تیاریاں کیں کہ انورالدین والی ارکاٹ سے قریب قریب برابر کی قوت سے مقابلہ ہو سکتا تھا بایں ہمہ جب امبور کی پہاڑی گھاٹیوں میں جنگ کی نوبت آئی تو انورالدین کی دلیری نے فرانسیسیوں کی ہمت پست کردی اور اگر خود یہ سردار ہی نہ مارا جائے تو غالباً پھر دوپلے کو اس قسم کی ریشہ دوانی کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن تقدیر سازش کرنے والوں کے ساتھ تھی۔ میدان فرانسیسیوں کے ہاتھ رہا اور انھوں نے چندا صاحب کی نوابی کا اعلان کردیا۔ (۱۷۴۹ء)

اس فتح کی پانڈی شیری میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ دوپلے نے اپنے آورد کی دھوم سے دعوت کی لیکن اس ایک ہی لڑائی میں اتحادیوں کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ دوسرے انورالدین کا بیٹا محمد علی ابھی تک زندہ و سلامت تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ نواب ناصر جنگ نے ارکاٹ کی جانب پیش قدمی کی کہ اہل سازش کا قلع قمع کر ڈالے! صوبہ دار دکن کی آمد آمد نے اس علاقے میں غلغلہ بپا کر دیا۔ فرانسیسیوں کی فوج مقابلے سے پہلے بھاگنے پر کمر بستہ نظر آتی تھی۔ اور آخر میں خود مظفر جنگ اپنی کامیابی سے ناامید ہو کر ماموں کے پاس چلا آیا اور حراست میں لے لیا گیا۔ بظاہر سازش ختم ہو گئی اور ناصر جنگ کو شاید انتظار تھا کہ خونریزی کی نوبت آنے سے قبل باقی ماندہ باغی ابھی ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن اس کے فرانسیسی حریف محض فوج اور توپ و تفنگ کے بل پر لڑنے نہ آئے تھے سازش و فریب کا لشکر ان کے ساتھ تھا اور اگر ان کا دلیر سردار بُسّے جنوبی ہند کے مشہور قلعہ جنجی پر اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہا تھا تو ادھر دوپلے آصف جاہی لشکر میں سازش کا جال بچھا رہا تھا۔ دونوں جگہ فرانسیسیوں کو کامیابی ہوئی۔ جنجی کے سہ طبقہ قلعے کو بُسّے نے یورش کر کے چند گھنٹے میں چھین لیا۔ دوپلے نے ایک برہمن کی وساطت حیدرآباد کے بعض امیروں کو توڑ لیا اور جس وقت مقابلے کیلئے صف بندی ہوئی تو یہ سازشی امیر میدان میں نکلنے سے پہلو تہی کرنے لگے۔ نواب ناصر جنگ نے اپنے ہاتھی کو بڑھایا اور خود جا کر کڑپا کے نواب کو ملامت کی۔ جواب میں اس غدار نے بندوق اٹھا کر نواب کے سینے پر گولی ماردی اور نواب کے مر کر گرتے ہی

لوگوں نے مظفر جنگ کو مشکیں کھول کر مسند دکن پر لا بٹھایا ؛

انگریزوں کی مداخلت

تقدیر کی اس یاوری پر فرانسیسی پھولے نہ سماتے تھے۔ پانڈی چیری میں کئی دن تک خوشی کے جلسے ہوتے رہے کیونکہ نواب مظفر جنگ کی مسند نشینی کے معنی یہ تھے کہ گویا دکن فرانسیسیوں کی مٹھی میں آگیا اور چند سال بعد منہ میں آجائے گا۔ مشرقی حکومتوں کی کمزوری اور یورپ والوں کی وہ حکمت عملی یہی تھی جس کی بدولت وہاں کی چھوٹی چھوٹی قومیں آج آدھے ایشیا کی مالک نظر آتی ہیں اور ملک گیری کے اس فن کا پہلا استاد دوپلے تھا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اہل ہند اگر فرانسیسیوں کی چالوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے تو ایک اور فرنگی قوم موجود تھی جسے ارکاٹ میں اور پھر دکن میں فرانسیسیوں کا نفوذ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس نے بھی اب وہی ہتھیار سنبھال لئے تھے جن سے اس کے ہمسایوں نے یہ کامیابی حاصل کی اور نواب ناصر جنگ کے لشکر میں انگریزوں کی طرف سے ایک فوجی دستہ بھیج دیا گیا تھا ؛

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان میں ان فرنگی سوداگروں کی لڑائی کا سبب یہ ہوا تھا کہ فرانس اور انگلستان میں جنگ کی آگ بھڑکی تو ہر جگہ جہاں انگریز اور فرانسیسی قوم کے لوگ موجود تھے اس کے شعلے پہنچ گئے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ان کی یہ دوسری لڑائی محض مقامی عداوت پر مبنی تھی اور ایک اعتبار سے اس کی چھیڑ مدراس کے انگریز سوداگروں نے کی کیونکہ دوپلے نے اس موقع پر انکا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ لیکن انگریزوں کا عذر یہ تھا کہ اگر دربار دکن میں فرانسیسیوں کا اقتدار بڑھا تو وہ آئندہ جب چاہیں گے انگریزوں کو سواحل دکن سے نکلوا دیں گے اسی خیال سے انھوں نے آخر کار انور الدین کے بیٹے محمد علی کو مدد دینے کا تہیہ کر لیا اور ایک فوجی دستہ ترچناپلی بھیج دیا گیا جہاں حکومت ارکاٹ کے اس دعویدار نے پناہ لے رکھی تھی۔ محمد علی کی جنگی تیاریوں کی خبر سنی تو چندا صاحب نے اس کا فوراً قلع قمع کرنے کی ٹھان لی اپنی تمام فوج سے ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ یہ مستحکم قلعہ ایک بلند پہاڑی پر اس طرح واقع ہے کہ اسے حملہ کر کے فتح کرنا دشوار تھا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق کامیابی کی صورت یہی تھی کہ محصورین کی آمد و رفت کے راستے روک دیئے جائیں۔ اس میں

محاصرے نے طول کھینچا اور انھیں ادھر متوجہ پا کر انگریزوں کو یہ موقع مل گیا کہ خاص شہر ارکاٹ پر بے خبری میں حملہ کر دیں جو مدراس کے بالکل قریب واقع ہے شاید چندا صاحب کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ انگریز براہ راست اس کے شہر پر حملہ کر دیں گے کیونکہ اس کی لڑائی محمد علی سے تھی نہ کہ مدراس کے انگریز تاجروں سے؛ بہر حال انگریزوں کو اپنے منصوبوں میں کامیابی ہوئی کلائیو تین سو ہندوستانی اور دو سو گورہ سپاہی لیکر یکایک ارکاٹ میں داخل ہو گیا۔ (۱۷۵۱ء) اور اتنے چندا صاحب اپنے بیٹے کو فوج دے کے ادھر بھیجے اتنے ارکاٹ کی فصیل اور مورچے اس قابل ہو گئے تھے کہ کلائیو نے چندا صاحب کے بیٹے کا حملہ روک لیا۔ ادھر انگریزوں نے لوٹ کا لالچ دے کے ایک مرہٹہ سردار کو اپنے ساتھ ملا لیا اور میسور کے دلوائی یا سپہ سالار کی فوج، نیز تنجور کے راجہ کی امدادی سپاہ بھی محمد علی کی مدد کے لیے ترچناپلی آ گئی۔ ان فوجوں کے مقابلے میں چندا صاحب اور اس کے فرانسیسی رفیقوں کو ترچناپلی سے ہٹنا پڑا پھر وہ سری رنگم نامی ٹاپو پر گھر گئے اور کمک پہنچنے سے مایوسی ہوئی تو انھوں نے اطاعت قبول کر لی (جون ۱۷۵۲ء) بایں ہمہ انگریزوں نے چندا صاحب کو قتل کر دیا؛

فرانسیسیوں کا رسوخ دربار دکن میں

جب یہ اطلاع دوپلے کو پہنچی تو اس نے صفدر علی کے قاتل مرتضیٰ علی کو ریاست ارکاٹ کا دعوے دار بنا کے از سر نو جنگ کی تیاریاں کیں اور اپنی ریشہ دوانی سے انگریزوں اور اتحادیوں میں پھوٹ ڈلوا دی۔ لیکن اس کی توجہ کا اصلی مرکز دکن کو سمجھنا چاہیے جس کے سامنے ارکاٹ کے معاملات کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر صوبہ دار دکن فرانسیسیوں کا ہو گیا تو پھر محمد علی یا انگریزوں کو مغلوب کر لینا کچھ دشوار بات نہ تھی۔ اور قرائن کہہ رہے تھے کہ یہی حال رہا تو صوبہ دکن ایک دن فرانسیسیوں کے قبضے میں آ جائے گا۔ کیونکہ مسند نشینی کے دو مہینے کے بعد نواب مظفر جنگ کی انھی پٹھان امیروں کے تعاقب میں جان گئی جنھوں نے پہلے ناصر جنگ سے نمک حرامی کی اور اب مظفر جنگ سے لڑے اور شکست کھا کے بھاگے تھے۔ اس وقت بُسّے فوراً آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ کے ساتھ ہو گیا اور اسی کے قدم سے مسند دکن نے زینت پائی (۱۷۵۱ء) اس نواب کے فرانسیسیوں کی طرف

حائل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امرائے دکن باہمی نفاق اور سازش و رقابت کے مرض میں گرفتار تھے اور ان کی وفاداری پہ پوری طرح بھروسہ نہ ہوسکتا تھا۔ غرض بسے نواب صلابت جنگ کا بھی ویسا ہی منظور نظر درباری بن گیا۔ جیسا کہ مظفر جنگ کا معتمد علیہ تھا اور ۱۷۵۲ء میں فرانسیسی سپاہ کے مصارف کے نام سے شمالی سرکار ول کا زرخیز علاقہ اُسے عطا ہوا جس کی آمدنی تخمیناً چالیس لاکھ روپے سالانہ تھی؛ دکن کے بعض امرا نے بسے کے خلاف کئی مرتبہ سازبازکی اور فرانسیسیوں کو بہت سی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن بسے کی چالاکی اور مستقل مزاجی ان مشکلات پر غالب آئی اور حیدرآباد میں سات برس تک فرانسیسیوں کا طوطی بولتا رہا؛

دوپلے کی معزولی

مگر وہ کام جو نہ فرانس کے انگریز حریفوں سے بن پڑا نہ امرائے دکن کر سکے خود اہل فرانس کے ہاتھ سے انجام پانا لکھا تھا؛ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ دکن کی ان آویزشوں کا حال سن سن کر فرانس اور انگلستان کے سوداگر اپنے ملازموں سے نہایت ناراض ہوئے کہ وہ بغیر ان کی اجازت کمپنی کا تمام تجارتی روپیہ جنگ و جدال میں خراب کئے ڈالتے ہیں اور الٹا کمپنی کو مقروض بنا رہے ہیں ادھر انگریز سوداگروں نے اپنی حکومت کے سفیروں کی وساطت سے فرانس کے وزیروں اور تاجروں کو یقین دلادیا کہ اس فساد و خونریزی کا بانی مبانی دوپلے ہے اور جب تک وہ ہندوستان میں رہے گا فرانسیسی اور انگریزی سوداگروں کو کبھی اطمینان سے تجارت کرنی نصیب نہ ہوگی؛ فرانس کے مدبر دوپلے سے پہلے ہی کچھ خوش نہ تھے۔ حکومت برطانیہ کی پیہم شکایات پر انھوں نے مدراس کے انگریزوں سے مصالحت کرنے کے لئے گودیو کو ہندوستان بھیجا اور حکم دیا کہ دوپلے کو معزول کر کے واپس بھیجدیا جائے۔ گودیو ۱۷۵۴ء میں پانڈیچیری کے ساحل پر اترا اسی سال ۱۴ نومبر کو معزول دوپلے نے ہند کو خیرباد کہی جس وقت وہ بندرگاہ کی طرف چلا ہے تو شہر کی تمام آبادی اس کے ساتھ ساتھ تھی اور فرانس کے اس نامور گورنر کی یہ ذلت دیکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے؛

دوپلے، کے انگریز حریف اسے محض ایک مکار سازشی سمجھتے ہیں جسے دوسروں کو لڑانے اور اپنا کام نکالنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا، اور انصاف سے دیکھئے تو یہ ان کی رائے

تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ لیکن تھامسن کا خیال ہے کہ ایسے فن فریب کے علاوہ حصول اقتدار کا اور کوئی وسیلہ بھی اس کے پاس نہ تھا بعض اوقات فرانسیسی کمپنی نہ اسے روپیہ بھیجتی تھی نہ جہاز نہ آدمی۔ حکومت فرانس کی باگ لوئی پانزدہم جیسے نااہل بادشاہ اور اس کے بدچلن لاابالی امیروں کے ہاتھ میں تھی فرانس کے عوام الناس قحط اور مظالم کا شکار تھے اور ان کے دلوں میں آیندہ انقلاب کے خونی جذبات پرورش پا رہے تھے۔ غرض دوپلے کو اپنے وطن سے کسی قسم کی تقویت نہ پہنچتی تھی اور مقابلہ انگریزوں کے ساتھ تھا جن کی مالدار کمپنی اپنے ملازموں کو ہر قسم کا جنگی سازوسامان مہیا کر سکتی تھی اور جن کی حکومت صحیح معنی میں قومی حکومت بنتی جاتی تھی کیونکہ اب انگلستان کے بادشاہ یا وزیر پارلیمنٹ کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے ؛

دوپلے پر خود نمائی کا بھی الزام ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ نمود و نمایش کا شایق تھا۔ اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس نے معاشرت کے ہندوستانی طریقے اختیار کر لئے تھے۔ اور غالباً اہل مشرق کے اظہار جاہ و جلال کو طبعاً پسند کرتا تھا۔ چنانچہ بیان کرتے ہیں کہ نواب ناصر جنگ کے قتل اور اپنی تقدیری کامیابی کی یادگار میں دوپلے "فتح آباد" کے نام سے ایک نیا شہر آباد کرنا چاہتا تھا اور میدان جنگ میں ایک بلند منارے پر اپنے کارنامے کندہ کرانے کی بھی تجویز تھی۔ لیکن یہ ارادہ تھا ہی تو اس پر عمل کبھی نہیں ہوا ؛

افلاس اور مصیبت کے ساتھ پیرس کی گلیوں میں دس برس کاٹ کے یہ شخص جس نے ایشیا میں فرنگی سلطنت کا پہلا نقش درست کیا تھا، گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس کے ہموطنوں نے اس کی بڑی قدر کی اور فدائیان قوم کے زمرے میں جگہ دی۔ کیونکہ انیسویں صدی سے اہل یورپ کی شریعت میں ہر فعل جو قوم و وطن کے فائدے کی غرض سے کیا جائے مباح ہو گیا ہے گو بذاتہ برا ہو۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ دوپلے نے جو کچھ کیا اس کی غرض یہی تھی کہ اس کے ہم قوم فرانسیسیوں کا اقتدار بڑھے اور سلطنت وسیع ہو ؛

فرانسیسیوں سے تیسری لڑائی
۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۱ء

گو دیو (جسے حکومت فرانس نے ہندوستان کے انگریزوں سے مصالحت کرنے بھیجا) اس بات پر

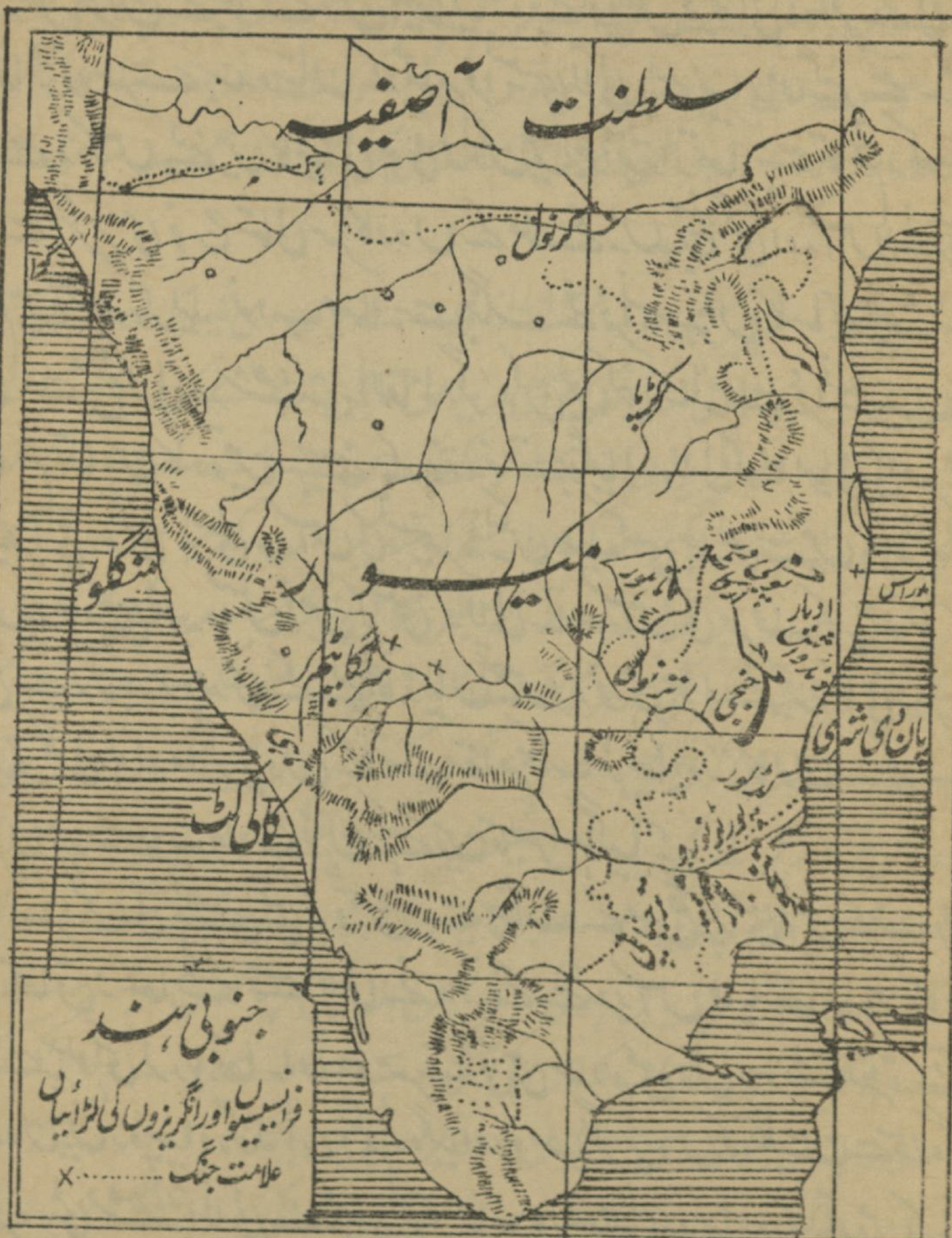
تلا ہوا تھا کہ جن شرائط پر ہو سکے صلح کر لی جائے۔ اس ارادے سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔ اور پہلی ہی شرط یہ قرار دی کہ فریقین ان مناصب اور خطابات سے دست بردار ہو جائیں جو شاہان مغلیہ کی طرف سے انھیں ملے تھے اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے ملکی معاملات میں آئندہ وہ کوئی حصہ نہ لیں۔ دیکھا جائے تو ان دونوں شرطوں میں فرانسیسیوں کا نقصان تھا لیکن گودیہو نے انگریزوں کی سب شرطیں مان لیں اور پان دی شیری میں ایک اور شخص کو عامل بنا کے وطن کی راہ لی۔ (۱۷۵۵ء)

مگر اس قسم کی مصالحت، دشمنی کے اصلی اسباب کو دور نہ کر سکتی تھی۔ چند مہینے بعد انگریزوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور فرانسیسیوں کے ساتھ پھر لڑائی چھڑ گئی اصل یہ ہے کہ صلح ہونے سے پہلے ہی انگریزوں کا ایک بحری دستہ ہندوستان روانہ ہو چکا تھا اور اب وہ مرہٹوں سے مل کر نواب صلابت جنگ پر حملے کی ساز باز کر رہے تھے تاکہ ارکاٹ کی طرح دکن میں بھی ان کا قدم جم جائے۔ شاید فرانسیسیوں کے ساتھ صلح ہو جانے کی وجہ سے وہ چند روز اس ارادے سے باز رہے دوسرے بنگالے میں نواب سراج الدولہ سے لڑائی چھڑ گئی اور انگریزی فوج کو کلکتے جانا پڑا جس کا حال آگے آئے گا۔ لیکن جب اس لڑائی سے فرصت ہوئی اور یورپ سے اطلاع آئی کہ خود فرانس و انگلستان کے درمیان جنگ کا اعلان ہو گیا تو انگریزی فوج نے سب سے پہلے چندر نگر کا رخ کیا جہاں فرانسیسیوں کی تھوڑی سی جمعیت مقابلے کی تاب نہ لائی اور شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا (۱۷۵۷ء) ہندوستان میں فرانسیسیوں کے ساتھ انگریزوں کی تیسری لڑائی کا یہ پہلا معرکہ تھا اور اسی ایک کامیابی نے بنگالے سے فرانسیسیوں کو بالکل بے دخل کر دیا۔

دکن کے معرکے

آخر حکومت فرانس کو بھی ہندوستان کا خیال آیا اور اس نے کافی ساز و سامان کے ساتھ ایک نامور فوجی سردار لالی کو اس طرف بھیجا جو یورپ کی لڑائیوں میں اپنی سپہ گری کے جوہر دکھا چکا تھا۔ دو ہزار فرانسیسی پیادے اس کے ماتحت تھے اور وہ ۱۷۵۸ء میں پان دی شیری پہنچ گئے۔ دلیری اور جنگی تجربے کے باوجود لالی ایک خود رائے اور بدمزاج امیرزادہ تھا اور ہندوستان میں جو فرانسیسی تاجر یا عامل تھے

ان کو سخت بداخلاق اور ناقابل اعتبار جانتا تھا۔ پانڈی چیری کے حاکم سے اس کی ایک دن بھی نہ بنی اور اس ناچاقی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کی رسد رسانی، باربرداری



جنوبی ہند
فرانسیسیوں اور انگریزوں کی لڑائیاں

وغیرہ کے جو انتظامات ہونے ضروری تھے ان سے ہندوستان کے فرانسیسی حکام نے عمداً بے پروائی کی اور عذر یہ کر دیا کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ لالی کو توپیں کھینچنے کے لئے گاڑیاں تک میسر نہ آتی تھیں با ایں ہمہ جس طرح بنا وہ اپنی فوج کو سینٹ ڈیوڈ کے قلعے تک لے آیا اور اس مستحکم حصار کو یورش کر کے چند روز میں انگریزوں سے چھین لیا۔ حالانکہ دوپلے کو اس کوشش میں کبھی کامیابی نہ ہوئی تھی ؛

لالی اب مدراس کو گھیرنے کی تیاری کر رہا تھا اور اسی غرض سے اس نے بسی کو حیدرآباد سے اور ادھر اُکن کو شمالی سرکاروں کے صدر مقام مچھلی پٹم سے طلب کیا تھا لیکن وہ شخص جو ان کے بجائے دکن بھیجا گیا، اپنے فرائض کو بخوبی ادا کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ دوسرے ہندوستان کے تمام فرانسیسی لالی سے بیزار ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ اسے مدراس لینے میں کامیابی ہوئی نہ دکن میں جو اقتدار تھا اسے قائم رکھ سکا ادھر بنگالے سے انگریزی فوج شمالی سرکاروں کے علاقے میں پہنچ گئی اور اس نے فرانسیسیوں کو مچھلی پٹم میں محصور کر لیا۔ نواب صلابت جنگ نے فرانسیسیوں کا ساتھ چھوڑ کے انگریزوں سے صلح کر لی سنہ ۱۷۵۸ء بہ الفاظ دیگر، دکن میں کئی سال سے فرانسیسیوں کا جو رسوخ قائم تھا اس کا دو تین مہینے کے اندر خاتمہ ہو گیا اور لالی کو کامیابی کی صرف ایک امید باقی رہ گئی۔ یعنی مدراس کی تسخیر۔ لیکن جب کسی جماعت میں باہم نفاق ہو تو غیروں پر وہ کبھی غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ لالی نے مدراس کی طرف کوچ تو کیا لیکن اس حال سے کہ نہ بار برداری کے لئے گاڑیاں تھیں نہ فوجی خزانے میں کافی روپیہ تاہم جس طرح ممکن ہوا وہ انگریزوں کے صدر مقام تک بڑھا اور "کالوں کے محلے" (بلیک ٹون) پر جسے اب جارج ٹون کہتے ہیں قابض ہو گیا۔

یہ فرانس کی بدنصیبی تھی کہ دشمن سے جنگ کے موقع پر بھی اس کے عہدہ داروں میں باہم اتفاق نہ تھا۔ بسی جسے لالی نے مدد کے لئے مدراس بلایا تھا۔ اس کا ساتھ دینے سے پہلوتہی کر رہا تھا۔ اور دوسرے فوجی سردار بھی دل برداشتہ نظر آتے تھے۔ تھوڑے دن میں روپیہ اور گولہ بارود کم رہ گیا اور ادھر انگریزوں کو انگلستان سے تازہ کمک پہنچ گئی (فروری ۱۷۵۹ء) لالی نے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لیا اور بیان کرتے ہیں کہ اس کی ناکامی کی خبر پانڈی چیری پہنچی تو اس کے حاسد ہموطن نہایت خوش ہوئے۔ ان ہموطنوں کی بداخلاقی دیکھ کر خود لالی نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس ناپاک بستی پر خدا کا عذاب نازل نہ ہوا تو انگریزوں کی آگ برسے گی۔ یہ قول صحیح ثابت ہوا۔ مدراس سے فرانسیسی سپاہ واپس ہوئی تو خود انگریزوں نے پانڈی چیری پر پیش قدمی کی اور فرانسیسیوں کو وانڈواش کے میدان میں شکست دیکر ان کے صدر مقام کا محاصرہ کر لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ لالی کو ادھر بھیج کر حکومت فرانس ایسی سوگئی کہ ڈیڑھ دو سال تک اس نے ہندوستان کی خبر نہ لی۔ اور جب امداد سے بالکل مایوسی ہوگئی تو لالی نے جنوری ۱۷۶۱ء میں ہتھیار ڈال دیئے اور فرانس کے سب شہروں پر انگریزی پھریرا لہرانے لگا۔ جب بدنصیب لالی اپنے وطن پہنچا تو وہاں کی حکومت نے ہندوستان کی شکستوں کا اسے ذمہ دار قرار دیا۔ اور وطن کے ساتھ بدخواہی کرنے کے "جرم" میں اس کا سر قلم کرا دیا۔

اگرچہ عہد نامہ پیرس مرتبہ ۱۷۶۳ء کی رو سے پان دی شیری دوبارہ فرانسیسیوں کو مل گئی لیکن اس تیسری لڑائی کے بعد پھر کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستان میں برابری کے دعوے سے انگریزوں کا مقابلہ کر سکتے۔ اس عہد نامے کے چھ سال بعد ان کی تجارتی کمپنی بھی ٹوٹ پھوٹ گئی اور کہنا چاہیئے کہ ہند میں ان کے سیاسی منصوبوں کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزوں کے ان پر غالب آنے کے بعض قابل ذکر اسباب یہ تھے کہ انگریزوں کی تجارت کی بنیاد بہت مستحکم تھی۔ بحری قوت زیادہ تھی۔ وطنی حکومت انگریزی کمپنی کی ہر موقع پر امداد و دستگیری کرتی تھی۔ اور چوتھے یہ کہ انگریزوں میں حسد و نفاق کی بیماری نہ تھی اور وہ مل کر کام کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ آخر میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جزیرہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ براعظم یورپ کی آویزشوں سے الگ تھا۔ اور وہاں آئے دن جو خونریزیاں ہوتی رہتی تھیں ان میں اپنا موقع دیکھ کر صرف اس حد تک شریک ہوتا تھا جس حد تک کہ اس کی جنگی قوت مساعدت کرے۔ حالانکہ فرانس برسوں تک یورپ کی بہت سی سلطنتوں سے لڑائی میں الجھا رہا اور لڑتے لڑتے مفلس اور کمزور ہوگیا۔ اسے یہ مصیبتیں اپنے نااہل حکام کی بدولت جھیلنی پڑیں اور جس طرح کناڈا اُس کے ہاتھ سے نکل گیا اسی طرح اور اسی زمانے میں ہندوستان کے مقبوضات اور یہاں آیندہ سلطنت کے منصوبے بھی غارت ہوگئے۔

پچھلے باب کے مشہور واقعات اور سنین

سنہ	واقعات ہند	بعض بیرونی واقعات
سنہ ۱۴۹۸ء	واسکوڈگاما کی آمد کالی کٹ میں	
سنہ ۱۵۱۰ء	البوکرک نے گوآ لے لیا۔	
		سنہ ۱۵۸۸ء ہسپانی بیڑے کی بربادی
سنہ ۱۶۰۰ء	لندن ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی	
سنہ ۱۶۰۲ء	ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی	
سنہ ۱۶۱۵ء	انگریزوں نے پرتگیزوں کو سورت کے قریب شکست دی۔	
سنہ ۱۶۱۲ء تا سنہ ۱۶۱۵ء	سر ٹامس رو کی سفارت دربار مغلیہ میں	
سنہ ۱۶۳۹ء	مدراس کا انگریزوں کے ہاتھ آنا۔	
سنہ ۱۶۶۴ء	کولبیئر کی سرپرستی میں فرانسیسی کمپنی قائم ہوئی۔	
سنہ ۱۶۶۸ء	چارلس ثانی شاہ انگلستان نے جزیرہ بمبئی کو انگریزی کمپنی کے حوالے کر دیا۔	
		سنہ ۱۶۸۸ء انگلستان میں انقلاب حکومت
سنہ ۱۶۷۴ء	فرانسیسیوں کی آمد پانڈیچیری میں	
سنہ ۱۶۸۶ء تا سنہ ۱۶۹۰ء	کمپنی کی لڑائی شہنشاہ عالمگیر سے	
سنہ ۱۶۹۰ء	کلکتہ کی بنیاد پڑی۔	
سنہ ۱۶۹۸ء	نئی انگریزی کمپنی قائم ہوئی	
سنہ ۱۷۰۸ء	دونوں کمپنیوں کے اتحاد کی تکمیل	

سنہ	واقعات ہند	بعض بیرونی واقعات
سنہ ۱۷۲۵ء	فرانسیسیوں کا قبضہ ماہی پر۔	لوئی پانزدہم کی تخت نشینی فرانس میں!
سنہ ۱۷۳۵ء	دیوماپاندی شیری کا گورنر ہوا۔	
سنہ ۱۷۴۰ء	کرناٹک پر مرہٹوں کی تاخت۔ نواب دوست علیخاں کا قتل	
سنہ ۱۷۴۱ء	ڈوپلے پاندی شیری کا گورنر ہوا۔	
سنہ ۱۷۴۵ء تا سنہ ۱۷۴۹ء	انگریزوں اور فرانسیسیوں کی پہلی لڑائی ہندوستان میں۔	
سنہ ۱۷۴۶ء	لابورونے نے مدراس چھین لیا۔	
سنہ ۱۷۴۸ء	پان ڈی شیری کے لینے میں انگریزوں کی ناکامی۔	
"	نواب ناصر جنگ کی مسند نشینی دکن میں۔	
		سنہ ۱۷۴۸ء انگریزوں اور فرانسیسیوں کی صلح یورپ میں
سنہ ۱۷۴۹ء	امبور کی جنگ نواب انوارالدین کا مارا جانا۔	
سنہ ۱۷۴۹ء تا سنہ ۱۷۵۴ء	فرانسیسوں سے دوسری لڑائی	
سنہ ۱۷۵۱ء	نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی دکن میں۔	
"	کلائیو نے اچانک ارکاٹ پر حملہ کیا اور قابض ہوگیا۔	
سنہ ۱۷۵۳ء	شمالی سرکاریں فرانسیسیوں کو عطا ہوئیں	

سنہ	واقعات ہند	بعض بیرونی واقعات
سنہ ۱۷۵۷ء تا سنہ ۱۷۶۱ء	فرانسیسیوں سے تیسری لڑائی	سنہ ۱۷۵۶ء یورپ میں جنگ ہفت سالہ کا آغاز
سنہ ۱۷۵۷ء	چندر نگر پر انگریزوں کا قبضہ	
سنہ ۱۷۵۹ء	مچھلی پٹم پر " "	
سنہ ۱۷۶۰ء	وانڈی واش کی لڑائی ۔	
سنہ ۱۷۶۱ء	پانڈی چیری پر انگریزوں کا قبضہ	

باب شانزدہم

(۱) انگریزوں کا فروغ ہند میں

سنہ ۱۷۵۰ء تا سنہ ۱۷۶۵ء

کلائیو کے قدم بنگالے میں

مغلیہ سلطنت کی کمزوری نے بنگالے کے صوبہ دار علی وردی خاں المخاطب بہ مہابت جنگ کو قریب قریب خود مختار بنا دیا تھا اور اُس نے اپنے نواسے نواب سراج الدولہ کو ولی عہد حکومت مقرر کیا تھا۔ سنہ ۱۷۵۶ء میں نواب علی وردی خاں کے انتقال کے بعد وہی بنگالے کا حاکم ہوا۔ اس کے بعض رشتہ دار جانشینی کے دعویدار تھے اور انہی میں سے ایک شوکت جنگ کا دیوان کلکتہ بھاگ آیا تھا۔ نواب کے عہدہ داروں نے ایسے مجرم کو گرفتار کرنا چاہا۔ انگریزوں نے اس کی حمایت کی اور حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پیام سلام سے کام نہ چلا تو سراج الدولہ نے مجبور ہو کر انگریزوں کی تنبیہ کے لئے کلکتہ پر فوج کشی کی۔ مگر مناسب ہوگا کہ اس واقعے کو ہم گیمن صاحب کی زبانی سنیں جن کی کتاب ہندوستان کی انگریزی تاریخوں میں بہت مستند مانی جاتی ہے:۔

کال کوٹھری کا واقعہ

"سنہ ۱۷۵۶ء میں نواب علی وردی خاں نے وفات پائی۔ اس کے جانشین نواسے نے جو کمزور ناتجربہ کار اور کسی قدر تند مزاج نوجوان تھا۔ سراج الدولہ کا لقب اختیار کیا۔ انگریزی کارخانے والوں کے ساتھ

اس نے اس بہانے چھیڑ نکالی کہ وہ کلکتے میں جنگی استحکامات تیار کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ تعجب نہیں کہ دراصل سراج الدولہ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں بنگالے میں بھی وہی واقعات نہ پیش آئیں جو کرناٹک (ارکاٹ) میں انھی دنوں پیش آئے تھے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اسے انگریزوں کی بارونق کوٹھی کی لوٹ سے بہت کچھ مال و متاع ہاتھ آنے کی امید ہو گئی ہو۔ بہرحال اس کے تیور بُرے دیکھ کر انگریزی کارخانے والوں نے اپنے فرانسیسی اور ولندیزی ہمسایوں کے پاس چندر نگر اور چنسیرہ میں ہرکارے دوڑائے اور مدد کی درخواست کی لیکن ان کوششوں کا نتیجہ نہ نکلا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مدد کلکتے پہنچ سکے۔ ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کے دن نواب نے شہر پناہ پر حملہ کیا جس کی مدافعت صرف ڈھائی سو گورہ سپاہی اور کم و بیش اسی قدر مسلح انگریز اور تقریباً ڈیڑھ ہزار دیسی بندوقچی کر رہے تھے۔ کارخانے کے میر مجلس ڈریک اور مجلس کے دیگر اراکین بھاگ کر جہازوں میں سوار ہو گئے اور شہر کو ایک دلیر انگریز ہولول کے سپرد کر کے انھوں نے بہاؤ کے رخ سمندر کی راہ لی۔ ۲۰ جون کو کلکتہ فتح ہو گیا اور باقیماندہ ۱۴۶ فرنگی بندوقچیوں کی تنگ کوٹھڑی میں قلعے کے ایک حجرے میں پہنچا دیئے گئے جہاں ۱۸ مربع فٹ کی جگہ میں، جس میں ہوا کے لئے صرف دو روشندان بنے ہوئے تھے انھوں نے جون کی گرم رات بغیر پانی کے گزاری پھر ہولول اور اس کے ساتھی جو زندہ رہے حراست میں مرشد آباد بھیج دیئے گئے اور کلکتے کو لٹوا دیا گیا۔[1]

(کیمبرج جلد اول صفحہ ۱۵۷)

تھامسن کے قول کے بموجب اس خوفناک ظلم کی خبر نے انگریزوں کو نواب کا سخت دشمن بنا دیا اور مدراس میں جتنی فوجیں جمع ہو سکیں انہیں کلائیو اور واٹسن کے ماتحت بنگالے کی طرف روانہ کر دیا گیا جہاں وہ چند ماہ کی تاخیر سے کلکتہ پہنچیں۔

[1] بعد کی انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ دوسرے دن اس "کال کوٹھری (Black Hole)" سے فقط ۲۳ آدمی زندہ نکلے تھے۔ حال میں جو انگریزی تاریخیں چھپی ہیں ان میں کوٹھری کا رقبہ نہیں بتایا جاتا۔ بلکہ نہایت "تنگ و تار" وغیرہ پر اکتفا کی گئی ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ سیر المتاخرین کا مولف جو انگریزوں کا حد سے زیادہ طرفدار ہے اور کلکتے پر سراج الدولہ کی فوج کشی کا حال نہایت تفصیل سے لکھتا ہے، اس سانحے کا مطلق ذکر نہیں کرتا ہے۔ ۱۲

سراج الدولہ نے کلکتے کی حفاظت مانک چند اور میر جعفر جیسے نااہل اور ناقابل اعتبار سرداروں کے سپرد کی تھی اور وہ بے لڑے بھڑے شہر چھوڑ کے ہٹ گئے کلکتے پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا اور سراج الدولہ نے پھر چڑھائی کی تو انگریزوں نے امی چند اور مرشد آباد کے بعض اور ساہوکاروں کو ملا کے صلح کا عہد و پیمان کر لیا۔ انگریزوں کی یہ پہلی خدمت تھی جو سیٹھ امی چند نے انجام دی[۱]۔ اس وقت دراصل فرانس اور انگلستان کی جنگ کا اعلان ہو گیا تھا جس کا اگلے باب میں ہم اشارہ کر آئے ہیں لہٰذا نواب کو جس طرح بنا ٹال کر کلائیو نے چندر نگر پر سمندر اور خشکی دونوں طرف سے حملہ کیا فرانسیسی جان توڑ کے لڑے لیکن ان کی تعداد اور جنگی ساز و سامان بہت کم تھا، قلعہ فتح ہو گیا اور اس مہم میں بھی امی چند کے گماشتے نند کمار نے انگریزوں کی مدد کی[۲]۔

لال کاغذ کی سازش

ادھر سے اطمینان ہوا تو کلائیو نے پھر امی چند اور انگریز سفیر کی مدد سے سراج الدولہ کے خلاف جس سے اس وقت انگریزوں کی صلح تھی سازش کی۔ نوابی کا لالچ دے کر میر جعفر کو ساتھ ملا لیا گیا اور اس نے اقرار کیا کہ بصورت کامیابی انگریزوں کو بہت سا روپیہ دے گا۔ معلوم ہوتا ہے اس قدر روپے کے قول و قرار سن کر امی چند کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اہل سازش سے مطالبہ کیا کہ معاہدے میں مجھے بھی تیس لاکھ دینے کی شرط ہونی چاہئے۔ کلائیو نے اس وقت اپنے اس دوست کے ساتھ بھی فریب سے کام لیا اور سازش کا معاہدہ دو مختلف رنگ کے کاغذوں پر لکھا گیا جن میں لال کاغذ جعلی یا فرضی تھا۔ اور اس میں امی چند کے تیس لاکھ کی شرط مندرج تھی؛ غرض جب سازش پکی ہو گئی تو انگریزی سفیر چپکے سے بھاگ آیا اور انگریزی فوج نے مرشد آباد پر پیش قدمی کی۔ غریب سراج الدولہ کو کسی اندرونی سازش کی خبر نہ تھی انگریزوں کا اس طرح اپنے پائے تخت پر آنا سن کر وہ نہایت برافروختہ ہوا اور چار و ناچار اپنی فوج لے کر سامنے آیا فریقین کا مقابلہ پلاسی نامی گاؤں کے میدان میں ہوا کہتے ہیں انگریزوں کی جمعیت پوری چار ہزار بھی نہ تھی لیکن درحقیقت وہ لڑنے نہیں آئے تھے بلکہ فقط سازش کی تکمیل مقصود تھی، اور پلاسی پہنچ کے جب یہ اطلاع ملی

---

[۱] کین جلد اول صفحہ ۱۶۰۔ [۲] کین جلد اول صفحہ ۱۶۱۔

کہ میر جعفر اپنے قول و قرار سے پھرتا معلوم ہوتا ہے تو کلائیو بھی سب لڑائی بھڑائی بھول گیا تھا۔ بارے دو سرے فوجی سرداروں نے ہمت بندھائی اور وہ معاملے کو آخر تک پہنچا دینے پر آمادہ ہو گیا ؛ (جون ۱۷۵۷ء)

سراج الدولہ کے لشکر میں صرف چند سردار ایسے تھے جنھوں نے لڑائی میں حق نمک ادا کیا۔ ورنہ سپہ سالار میر جعفر اور اس کے ساتھیوں نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ رنگ دیکھ کر سراج الدولہ کو اپنی کامیابی سے ناامیدی ہو گئی اور وہ ایک تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر مرشد آباد چلا آیا اور وہاں سے بھی فرار ہونا چاہتا تھا کہ راستے میں گرفتار ہوا اور قتل کرا دیا گیا ؛

یہی پلاسی کی وہ مشہور لڑائی ہے جس نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھی تھا مسن لکھتے ہیں کہ گو عواقب و نتائج کے اعتبار سے یہ جنگ تاریخ ہندوستان کی سب سے بڑی لڑائیوں میں داخل ہے لیکن اس کے جیتنے میں شجاعت و سپہ گری کو بہت ہی کم دخل تھا ؛ جو کچھ ہو، کلائیو نے تو اپنی جیبیں بھر لیں۔ اور کمپنی کو بنگالے کا مالک بنا گیا۔ کیونکہ گو بظاہر انگریزوں نے میر جعفر کو بنگالے کا نواب تسلیم کر لیا تھا مگر درحقیقت یہ مستقل قبضے کی تمہید تھی اور ابتدا ہی سے وہ میر جعفر کو اپنے تحت میں رکھنا چاہتے تھے۔ "دیسی نوابی لے کر اسے بہت کم خوشی نصیب ہوئی ہوگی کیونکہ انگریزوں نے اپنے اتحاد کی قیمت اور حملہ کلکتے کے نقصانات کے تاوان میں اسے دبا کر بے حساب روپیہ وصول کیا جس میں بیس لاکھ روپیہ تو صرف کلائیو نے اپنی ذات کے لئے لیا تھا اور مجلس انتظامی یا کونسل کے ارکان اور فوج کے بڑے عہدہ داروں کو جو بے شمار دولت ملی وہ اس کے علاوہ ہے۔ روپیہ اور جواہرات کشتیوں میں بھر بھر کے بھیجے گئے تھے اور نواب نے کلکتے کے گرد کا وہ علاقہ بھی جو "چوبیس پرگنے" کے نام سے مشہور ہوا انتظام اور مالگزاری وصول کرنے کے لئے کمپنی کو دے دیا تھا ؛[1]

نواب میر قاسم جنگ پلاسی کے اگلے سال کلائیو نے ایک انگریزی فوج ساحل جنوب کی طرف بھیجی جس نے مچھلی پٹم میں فرانسیسیوں کو گھیر لیا اور نواب نظام الملک سے اتحاد کرنے کا حال ہم پہلے پڑھ آئے ہیں ؛ دکن کی یہ لڑائیاں ابھی جاری تھیں کہ دلی کے شہزادے عالی گوہر نے بنگالے پر فوج کشی کی اور

[1] کتاب کے اس حصے میں جہاں بغیر حوالہ دیئے کوئی قول نقل کیا ہے وہ تھامسن کی عبارت کا ترجمہ ہے ؛

میر جعفر نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ بہار پہنچکر عالی گوہر کو اپنے باپ عالمگیر ثانی کے قتل کی اطلاع ملی اور اس نے شاہ عالم ثانی کے نام سے اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا جسے احمد شاہ ابدالی اور شمالی ہندوستان کے دیگر امراء نے بھی تسلیم کر لیا۔ (۱۷۵۹ء) لیکن یہ محض نام کی "شہنشاہی" تھی ور نہ ہمت و مستعدی کے باوجود شاہ عالم کے پاس نہ فوج تھی نہ خزانہ۔ مرہٹوں کے پنجاب اور دوآب میں گھس آنے کے باعث شجاع الدولہ بھی اسے کوئی مدد نہ دے سکا اور بعد میں احمد شاہ ابدالی سے جا ملا جس کا ذکر کتاب کے پچھلے حصے میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ غرض شاہ عالم سامنے سے ہٹ کر گیا چلا آیا۔ (۱۷۶۰ء)۔

ادھر انگریزوں کو دکن میں کامیابی ہوئی اور فرانسیسیوں کی طرف سے جو خلش تھی وہ مٹ گئی۔ چنسرہ پر حملہ کر کے ولندیزیوں کو بھی بنگالے سے خارج کر دیا گیا۔ اور ہر طرف سے اطمینان ہونے کے بعد انھوں نے پھر میر جعفر کو تنگ کرنا شروع کیا۔ صحت میں فتور آنے کی وجہ سے کلائیو انگلستان چلا گیا تھا۔ لیکن اس کے جانشین اور کمپنی کے دوسرے عہدہ دار کچھ کم حریص نہ تھے اور جب میر جعفر انھیں روپے دیتے دیتے تھک گیا تو انگریزوں نے اس کے داماد میر قاسم سے بہت سا روپیہ وصول کر کے میر جعفر کو مجبور کیا کہ نوابی سے دست بردار ہو جائے۔ سراج الدولہ کے اس بوڑھے اور نمک حرام سپہ سالار میں اخلاقی قوت کم تھی اور اب جسمانی طاقت بھی جواب دے رہی تھی۔ اس نے بغیر مزاحمت انگریزوں کا کہنا مان لیا اور میر قاسم بنگالے کا نواب بن گیا (ستمبر ۱۷۶۰ء) نئے نواب نے انگریز عہدہ داروں کو بے شمار زر و جواہر دینے کے علاوہ بردوان، مدناپور اور چاٹگام کے زرخیز اضلاع بھی کمپنی کے حوالے کر دیئے اور معاہدہ ہو گیا کہ وہ دشمن کے مقابلے میں میر قاسم کو فوجی امداد دے گی۔

× ×

"میر قاسم نہایت لائق اور محب وطن فرماں روا تھا"

اس نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کی اور ملک میں امن و انتظام قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمپنی کو اپنا تجارتی مال باہر سے لانے یا لے جانے کی پہلے سے اجازت عطا ہو گئی تھی اور اندرون ملک

جو محصول لئے جاتے تھے وہ ان سب سے مستثنیٰ کر دی گئی تھی، لیکن اس کے گماشتے اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے یعنی ذاتی طور پر تجارت کرتے اور ہندوستانی تاجروں کو بھی خود روپیہ لے لے کے کمپنی کے نام سے مال لانے، لیجانے کی تحریری سند دے دیتے تھے۔ مزید براں کمپنی نے میر جعفر سے نمک کا اجارہ لے لیا تھا۔ اور اسے اتنی قیمت پر فروخت کرتی تھی کہ غریب رعایا تباہ ہوتی جاتی تھی ؎ میر قاسم نے ان خرابیوں کو روکنا چاہا اور بنگالے کے انگریز گورنر سے گفتگو کی۔ نواب کے اعتراض ایسے تھے کہ گورنر کو کوئی جواب نہ بن پڑا اور اس نے معاہدہ کیا کہ کمپنی کے ملازمین اپنی ذاتی تجارت پر ہمیشت ۹ فی صدی کی رقم دے دیا کریں گے۔ لیکن کلکتے کے انگریز سوداگروں نے اس گورنر (ون سٹارٹ) کی ایک نہ سنی اور اس معاہدے پر عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا یہ زبردستی دیکھ کر میر قاسم نے مجبوراً تمام محصولات یک قلم موقوف کر دئے کہ اس کے ہم وطن سوداگر بھی نقصان میں نہ رہیں بلکہ ہر شخص بلا ادائے محصول تجارت کر سکے ؎

اب انگریزوں نے شاہ عالم سے میل جول بڑھانا شروع کیا جو ابھی تک بہار میں مقیم تھا۔ میر قاسم کو نظر آنے لگا کہ انگریزوں نے اس کی مسند نشینی کے وقت جو معاہدہ کیا تھا، اس پر اعتماد کرنا فضول ہے۔ دوسرے پٹنے کی انگریزی کوٹھی کے مہتمم نے علانیہ نواب کے عہدہ داروں سے جنگ چھیڑ دی اور جب نواب کی فوج پہنچی اور مقابلے میں اس کی پیش نہ گئی تو فرار ہونا چاہتا تھا مگر گرفتار ہو گیا اور اس کے بعض ساتھی مارے گئے ؎ یہ اطلاع پاتے ہی کلکتے کے انگریزوں نے دوبارہ میر جعفر کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا اور میر قاسم پر فوج کشی کی۔ تھوڑے تھوڑے دن کے تفاوت سے چند لڑائیاں ہوئیں جن میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی میر قاسم پٹنے کی طرف پسپا ہوا اور اس نے انگریزی فوج کے سردار کو کہلا بھیجا کہ اس شہر پر حملہ کیا تو جو انگریز قیدی میرے ہاتھ میں گرفتار ہیں ان کی خیر نہ ہوگی۔ انگریز اس دھمکی سے نہ رکے اور آخر نواب کے ایک فرانسیسی سردار شمرو نے انگریز قیدیوں کو قتل کرا دیا ؎

اس کے بعد میر قاسم بہار میں بھی نہ ٹھہر سکا اور اودھ کے علاقے میں چلا آیا۔

لہ یہ بیان کپتن کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ دیکھو جلد اول صفحات ۱۷۵، ۱۷۶-۱۲ -

اس کی ناکامیوں کا بڑا سبب یہ تھا کہ خود اس کے عہدہ دار دغاباز تھے اور بعض عین معرکۂ جنگ میں ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ درحقیقت اہل ہندوستان ان دنوں سخت خودغرضی اور بداخلاقی کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے ناعاقبت اندیش سرداروں کو نہ کسی آقا کی نمک حلالی کا پاس رہا تھا نہ اپنی قومی حکومت کے قیام کی پروا تھی۔ ذاتی غرض اور وقتی نفع کی خاطر وہ خود اپنے ہم وطن دوستوں یا آقا کی دشمنی پر تیار ہو جاتے تھے اور یہی وہ کمزوری تھی جس سے فائدہ اٹھا کر انگریز آہستہ آہستہ ملک پر مسلط ہو گئے۔ نواب وزیر والی اودھ نے میر قاسم کو پناہ دی تھی لیکن بعد میں دغا کی اور بدقسمت میر قاسم مجبور و مایوس ہو کر دہلی چلا آیا اور آگرے دہلی کے درمیان کسی جگہ مقیم ہو کر فوت ہو گیا۔ والی اودھ اور شاہ عالم ثانی نے بہار کو انگریزوں کے ہاتھ سے نکالنے کے لئے چڑھائی کی تھی مگر ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر شکست کھا کر صلح کر لی جس کی شرائط آگے آتی ہیں۔

پچھلے دور کے اہم واقعات و سنین

سنہ ۱۵۲۶ء	جنگ پانی پت اور بابر کا دہلی پر قبضہ
سنہ ۱۵۲۷ء	جنگ کنواہہ
سنہ ۱۵۳۰ء	ہمایون کی تخت نشینی
سنہ ۱۵۳۴ء	ہمایون اور بہادر شاہ والی گجرات کی لڑائی
سنہ ۱۵۴۰ء	شیر شاہ کا مقابلہ اور ہمایون کی شکست
سنہ ۱۵۵۶ء	پانی پت کی دوسری لڑائی
سنہ ۱۵۶۸ء	اکبر کی فتح چتوڑ
سنہ ۱۵۷۲ء	" گجرات
سنہ ۱۵۸۶ء	" کشمیر
سنہ ۱۵۹۵ء	" احمد نگر پر حملہ
سنہ ۱۶۰۱ء	خاندیس کا الحاق
سنہ ۱۶۰۵ء	اکبر کی وفات
سنہ ۱۶۲۸ء	شاہجہاں کی تخت نشینی
سنہ ۱۶۳۳ء	سلطنت احمد نگر کا خاتمہ
سنہ ۱۶۳۶ء	گولکنڈہ اور بیجاپور کی اطاعت
سنہ ۱۶۵۸ء	شاہجہاں کی نظربندی
سنہ ۱۶۶۵ء	سیواجی کی شکست اور اس کا آگرے جانا
سنہ ۱۶۸۶ء	بیجاپور کی تسخیر
سنہ ۱۶۸۷ء	گولکنڈے کی تسخیر
سنہ ۱۷۰۷ء	اورنگ زیب کی وفات
سنہ ۱۷۱۲ء	فرخ سیر کی پادشاہی اور سیدوں کا غلبہ
سنہ ۱۷۲۰ء	سیدوں کا خاتمہ

سنہ ۱۷۲۴ء	سلطنت حیدرآباد کی بنیاد
سنہ ۱۷۳۸ء	نادر شاہ کا حملہ
سنہ ۱۷۶۱ء	پانی پت کی تیسری لڑائی
سنہ ۱۷۵۶ء	نواب سراج الدولہ کی مسند نشینی نواب کلکتے کی تسخیر کرتا ہے
سنہ ۱۷۵۷ء	پلاسی کی لڑائی۔ میر جعفر کی مسند نشینی کا اعلان
سنہ ۱۷۵۹ء	چنسرے کی فتح۔ ولندیزوں کی قوت کا استیصال بنگالے میں
سنہ ۱۷۶۱ء	میر جعفر کی معزولی اور میر قاسم کا جانشین ہوتا...... مادھو راؤ اول پیشوا ہوا۔ نواب نظام علیخاں نے صلابت جنگ کی جگہ لی۔
سنہ ۱۷۶۳ء	میر قاسم کے ساتھ انگریزوں کی لڑائی
سنہ ۱۷۶۴ء	جنگ بکسر

حصۂ سوم

دورِ حال

از سنہ ۱۷۶۵ء تا زمانۂ حال

باب اوّل

بنگالے کی دیوانی اور شمالی سرکاروں کا معاملہ

جیسے ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ آج انگریزوں کا ہندوستان سے تعلق ہوئے ڈیڑھ سو سال ہوئے تھے کیونکہ انگریزوں کی کمپنی سنہ ۱۶۰۰ء میں بنی اور تقریباً اسی زمانے سے اسی کمپنی نے ہندوستان سے تجارت شروع کر دی اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے مختلف ساحلوں پر اپنے قدم جمائے۔ تجارت کے ساتھ بتدریج سیاست میں دخل دینا شروع کیا۔ ایک طرف اپنے ان رقیبوں کو زیر کیا جو خود ان کی طرح یورپ سے آئے تھے۔ دوسری طرف ہندوستانی رئیسوں کے ساتھ ساز باز کئے اور جب ضرورت آپڑی تو تلوار سے مقابلہ کیا۔ سنہ ۱۷۵۱ء کے محاصرۂ ارکاٹ کے بعد یہ آہستہ آہستہ جنوبی ہند کے مالک بن گئے اور جب سنہ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی ہوئی تو تمام بنگالہ ان کے ہاتھ میں آگیا۔ چنانچہ اس کامیابی کے بعد وہ جس کو چاہتے بنگالے کا نواب بنا دیتے تھے۔ نیز اس قبضہ بنگالہ سے ان کو پنجاب تک پیشقدمی کرنا آسان ہو گیا۔ لیکن اس تسلط کے باوجود جو انگریزوں کو کرناٹک اور

بنگالے پر حاصل ہوا تھا ان کی صرف تاجرانہ حیثیت تھی۔ ۱۷۵۱ء تک تو وہ صرف اپنے تجارتی احاطوں اور منڈیوں پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن جب وہ کرناٹک اور بنگال کے وسیع رقبوں پر مسلط ہو گئے تو تجارت کے ساتھ سیاست بھی ان کے ہاتھ میں آگئی تھی تاہم یہ سیاست بالواسطہ تھی۔ حکومت تو دیسی رئیس کرتے تھے اور کمپنی ان پر بالواسطہ نگرانی کرتی تھی۔ ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے جب کمپنی نے ہندوستان کی تین طاقتوں یعنے میر قاسم شجاع الدولہ اور شاہ عالم کو زیر کر دیا تو نہ صرف بنگالے میں کمپنی کی حقیقی عملداری قائم ہو گئی بلکہ اودھ تک اس کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ نیز ایک سال کے بعد یعنے ۱۷۶۵ء میں جب کمپنی کو شاہ عالم سے دیوانی بنگالہ کا فرمان مل گیا تو کمپنی کی حکومت پر ایک قانونی رنگ چڑھ گیا۔ اس فرمان کی رو سے انگریز بنگال کے جائز حاکم بن گئے۔ گویا اب ان کی حکومت ہندوستان میں ایک طرح سے باضابطہ تھی کیونکہ اس کو شہنشاہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں صحیح طور پر ۱۷۶۵ء سے شروع ہوتی ہے اور تاریخ ہند کے حصۂ سوم کو یہیں سے شروع کرنا چاہئے۔ دیوانی بنگالہ کی تفصیل آگے آتی ہے۔

کلائیو جو ۱۷۶۰ء میں انگلستان چلا گیا تھا "لارڈ" کا خطاب لے کر دوبارہ ہندوستان آیا۔ (۱۷۶۵ء) اس تمام عرصے میں بنگالے کی کونسل نے اپنے اختیارات سے بہت بری طرح کام لیا، وہ محض روپے کی خاطر ایک نواب کو تاراج اور دوسرے کو مسند نشین بنا دیتی تھی۔ اس کے سپاہی محض کرائے کے لوگ ہوتے تھے اور ان کے انگریز سردار "نذرانے" لے لے کر اپنی جیبیں بھرتے تھے۔ "بہت سے گماشتے کمپنی کی تجارت کا جس قدر خیال رکھتے تھے اسی قدر انہیں اپنے نجی لین دین میں انہماک تھا۔ اور ادھر غریب رعایا اس بدعملی اور انگریز تاجروں کے اجارے کی بدولت تباہ ہوئی جاتی تھی۔" بنگالے کی یہ حالت تھی جب کہ دوبارہ کلائیو ہندوستان آیا اور نظماء کمپنی کے حکم کے مطابق سب سے پہلے اس نے شاہ عالم اور نواب اودھ سے صلح کی گفتگو شروع کی۔ صلح کا عہدنامہ جن شرائط پر مرتب ہوا وہ یہ تھیں کہ صوبۂ بنگالہ کی (جس میں اڑیسہ اور بہار بھی شامل تھے) دیوانی یا مالگزاری وصول کرنے کا حق، ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کے معاوضے میں انگریزی کمپنی کو دے دیا جائیگا۔ اور جن اضلاع پر

وہ پہلے سے قابض تھی وہ اسی کے پاس رہیں گے۔ اس کے علاوہ جنوب کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ کرناٹک جو سلطنت حیدر آباد کا ایک صوبہ تھا حیدر آباد سے جدا کر کے کمپنی کے تحت کر دیا گیا اور شمالی سرکاریں بالکل کمپنی کے تصرف میں دیدی گئیں۔ یہ یاد رہے کہ شمالی سرکاریں صلابت جنگ کے عہد میں فرانسیسیوں کو دی گئی تھیں۔ اور کلائیو نے فرانسیسیوں کی مخالفت میں ان پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور اب شاہ عالم کے فرمان سے یہ قانوناً انگریزوں کو مل گئے جس سے حیدر آباد کو بڑی شکایت ہوئی۔ اس کے معاوضہ میں بوقت ضرورت کمپنی مرہٹوں کے مقابلے میں بادشاہ یا والی اودھ کو فوجی امداد دے گی۔ بادشاہ نے اودھ کے علاقے پر نواب اودھ کا قبضہ تسلیم کر لیا تھا لیکن الہ آباد اور کڑے کے اضلاع صرف خاص کے لئے اپنے قبضے میں رکھے تھے اور کچھ انگریزوں کی اعانت کی امید اور کچھ شمالی ہند کی حالت ناقابل اطمینان ہونے کے باعث، خود بدولت الہ آباد ہی میں مقیم تھے۔ شاہ عالم کا اس موقع پر دہلی نہ جانا اور الہ آباد میں وقت ضائع کرنا درحقیقت بڑی غلطی تھی جس کی پھر کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ کیونکہ پانی پت میں مرہٹوں کی ہزیمت کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا تھا۔ غازی الدین بھی موجود نہ تھا اور اس وقت شاہ عالم اگر اپنے بزرگوں کی اجڑی نگری میں پہنچ جاتا تو کیا عجب ہے کہ کسی حد تک سلطنت میں پھر جان پڑ جاتی، لیکن اول تو بنگالہ فتح کرنے کی دھن میں رہا، پھر انگریزوں کی امداد کے بھروسے الہ آباد میں بیکار دن گزارتا رہا اور آخر میں جب ہر پھر کر دہلی گیا تو وقت گزر چکا تھا۔

ملکی انتظامات

انگریز کمپنی کے ملکی انتظامات کی ابتدا اور تنسیخ و ترمیم کا مطالعہ اس کی لڑائیوں کے حالات سے بھی زیادہ ضروری اور مفید ہوگا۔ ٹامسن صاحب لکھتے ہیں کہ "کمپنی کے ملازمین ایسے بیوپاری لوگ تھے کہ جنھیں سب سے پہلے اپنی کمپنی کے مالی اغراض کا خیال رکھنا فرض تھا۔ یہ سچ ہے کہ انھیں حکومت کرنے کی بھی تھوڑی بہت مشق ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اپنے کارخانوں یا بستیوں کے حدود میں انھیں سپاہی بھرتی کرنے کا، جنگ و صلح کا، وصول مالگزاری کا اور مقدمات فیصل کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور اس حد تک انھوں نے بعض نازک وقتوں میں بھی کمپنی کی بہت مستعدی اور استقلال سے خدمت کی بایں ہمہ جس وقت بنگالے اور جنوبی ہند کے بڑے بڑے قطعات

ان کے ہاتھ آئے تو وہ حکومت کی اتنی وسیع اور اہم ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ثابت نہ ہوئے۔

کسی تجارتی جماعت کا محض نفع کمانے کے لئے قائم ہونا بالکل جائز ہے۔ لیکن حکومت کا مدعا رعایا کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ پس کمپنی کے لئے ضروری تھا کہ اب وہ ساہوکاروں کے طریقے کو کسی نہ کسی حد تک تبدیل کر کے عمدہ حکومت کے ابتدائی اصول اختیار کرے۔ کیونکہ کمپنی کے طریقے میں اور اس کے ملازمین کی تربیت میں جو نقص تھے وہ اس دور کے آغاز ہی میں صاف صاف نظر آ گئے تھے اور ۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۵ء تک انگریزوں نے بنگالے میں جو کچھ کیا اس کی روداد کی نسبت یہ لکھنا کچھ جھوٹ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی تاریخ کا سب سے تاریک باب ہے۔ اس وقت کمپنی کے گماشتوں کے قبضے میں بڑے اختیارات تھے اور ان میں سے اکثر ان اختیارات سے اپنے ذاتی فائدے کے لئے کام لیتے تھے۔ یعنے بنگالے کے نواب اور اس کی رعایا کو طرح طرح سے لوٹتے اور آزار پہنچاتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو جلد جیبیں بھر لیں"

بنگالے میں دوعملی

شاہ عالم سے معاہدے کی رو سے جو علاقہ کمپنی کو مل گیا تھا، اب کلائیو نے اس کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی اور وہ آئین جاری کیا جو انگریزی تاریخوں میں "ڈوئل سسٹم" یعنی دوعملی کے نام سے مشہور ہے۔ بنگالے کے نواب کا تو اب نام ہی نام رہ گیا تھا۔ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ بایں ہمہ کمپنی کو ابھی تک یہ ہمت نہ ہوئی کہ ملک کا سب انتظام اپنے انگریز ملازموں کے ہاتھ میں دے دیتی جنھیں حکمرانی کا مطلق تجربہ نہ تھا۔ لہٰذا کمپنی نے دو ہندوستانی نائب دیوان مقرر کئے۔ ایک محمد رضا خاں جو صوبۂ بنگال کی وصول مالگزاری کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا اشتاب رائے جسے بہار کا علاقہ سپرد کیا گیا تھا۔ مالگزاری، عدالت، پولیس وغیرہ سب محکمے انھی عہدہ داروں کے تحت میں دے دئیے گئے تھے۔ اور کمپنی فصل کے فصل روپیہ وصول کر لیتی تھی؛ اس طرح نام تو بنگالے کے نواب کا تھا اور اصلی حکومت کمپنی بہادر کی۔ پھر لطف یہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے بھی نظم و نسق کے اصلی ذمہ دار اس کے نائب دیوان تھے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اصلی خرابی جس کے لئے کمپنی کے نظما نے کلائیو کو تاکیدی احکام دے کر

ہندوستان بھیجا تھا، ابھی تک موجود تھی یعنی کمپنی کے انگریز ملازموں کی رشوت ستانی برابر جاری تھی اور نج کی تجارت کے ذریعے بھی وہ ملک کو لوٹے لیتے تھے۔ کلائیو نے بڑی ہمت سے کام لیا اور کونسل کے آدھے ارکان کو ان کی شرمناک حرکات پر معزول یا معطل کر دیا۔ فوجی عہدہ داروں کو جو دوہرا بھتہ ملتا تھا اس میں بھی اس نے کمی کی اور نج کی تجارت کے متعلق بعض قیود عائد کر دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان خرابیوں کے انسداد کے لئے وہ شخص کسی طرح موزوں نہ ہو سکتا تھا جس نے خود اپنی جیبیں رشوت کے روپے سے بھری تھیں اور جس کے جعل و فریب کے افسانے ابھی تک بالکل تازہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلائیو کے ہموطن اس کی صورت سے بیزار ہو گئے وہ اس کی گزشتہ کارروائیاں اس کے منہ پر کہنے سے نہ چوکتے تھے اور آخر میں انھوں نے اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔



اس طرح کچھ کامیابی اور کچھ ذلت و ناکامی کے ساتھ دو برس گزار کر کلائیو وطن کو واپس گیا اور وہاں بھی اس کے دشمنوں نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ چار سال بعد پارلیمنٹ میں اس کے "مظالم و غارت گری" سے اظہار نفرت کی تحریک کی گئی اور

اسے اپنی صفائی میں بہت لمبی چوڑی تقریریں کرنی پڑیں۔ پارلیمنٹ نے آخر میں یہ فیصلہ دیا کہ گو کلائیو نے ہندوستان کے امرا سے بہت کچھ روپیہ وصول کیا مگر "اسی کے ساتھ اس نے اپنے وطن کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں"۔

اگرچہ سرکاری طور پر اس سے پھر کوئی باز پرس نہیں ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کا ضمیر اس کے خلاف ہو گیا تھا کہ اس نے سنہ ۱۷۷۴ء میں خودکشی کر کے اپنا کام تمام کر لیا۔ کلائیو کا یہ انجام پڑھ کر جس قدر عبرت ہو کم ہے اور اس کے ساتھ ہی ڈوپلے کا افسوسناک حشر یاد آجاتا ہے کہ وہ دونوں شخص جنھوں نے ہندوستان میں فرنگی سلطنت کی بنیاد رکھی آخر میں دنیا سے ناشاد اٹھے۔

مرہٹوں کے حالات

کلائیو کے جانشین کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ مرہٹوں کا بھی کچھ حال بیان کر دیا جائے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد ان پر کیا گزری۔ تاکہ آئندہ واقعات آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

بالاجی باجی راؤ پیشوا کا تو اسی شکست کے صدمے نے کام تمام کر دیا تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا مادھو راؤ پیشوا بنایا گیا تھا (سنہ ۱۷۶۱ء) لیکن حکومت کی باگ اس کے چچا رگھوناتھ راؤ کے ہاتھ میں تھی، مادھو راؤ بہت قابل مگر تند مزاج نوجوان تھا اور اپنے چچا کی اتالیقی کو زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکا۔ ان میں بہت جلد ان بن ہو گئی۔ رگھوناتھ لڑ کر اپنے عہدے سے دست بردار ہو گیا اور مادھو راؤ نے فوراً اس کے اختیارات دوسرے عہدہ داراں کو تفویض کر دیئے۔ رگھوناتھ اورنگ آباد چلا آیا اور نواب نظام الملک کے ساتھ خفیہ خط و کتابت شروع کی۔ نواب موصوف نے اسے فوجی امداد دی اور رگھوناتھ نے اپنے نوجوان بھتیجے پر فوج کشی کی، مگر مادھو راؤ نے پھر اپنے روٹھے ہوئے چچا کو منا لیا۔ ان میں مصالحت ہو گئی اور رگھوناتھ دوبارہ مرہٹہ ریاست کا مدار المہام بن گیا؛ یہ مصالحت ۶ یا ۷ برس تک قائم رہی جس کے بعد رگھوناتھ کی بیجا رعایت اور سختیوں نے مادھو راؤ کو پھر اس سے ناراض کر دیا (سنہ ۱۷۶۸ء) اور اس مرتبہ جنگ کی نوبت پہنچی تو بھتیجے نے شکست دے کر چچا کو قید میں ڈال دیا۔

(سنہ ۱۷۶۹ء)۔

رگھوناتھ راؤ اور ناگپور کے بھونسلہ راجہ نے نواب نظام الملک سے دوبارہ مدد

کی درخواست کی۔ اور نواب موصوف نے اپنے کئی ضلعے جن پر جنگ پانی پت سے پہلے مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا تھا، پیشوا سے چھین لئے۔ جنوب میں بھی مرہٹوں کا اب ایک نیا رقیب (حیدر علی) پیدا ہوگیا تھا جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا اور اس طاقتور دشمن نے ان کے کئی جنوبی ضلعے لے لئے تھے۔ مگر مادھو راؤ کو اس کے مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور حیدر علی سلطان کو شکست کھا کے بہت سا روپیہ اور تمام مفتوحہ علاقہ واپس کرنا پڑا۔ انھی کامیابیوں کے کچھ عرصے بعد مادھو راؤ نے ۱۷۷۲ء میں وفات پائی۔

سندھیا اور ہلکر

اس اثنا میں مادھوجی سندھیا نے مالوے میں فروغ حاصل کیا اور مرہٹہ سوار پھر چنبل اتر کر شمالی ہندوستان کے علاقوں تک آنے لگے۔ ۱۷۷۱ء میں یہی مرہٹہ سردار شاہ عالم بادشاہ کو بھی الہ آباد سے دہلی لے کر آیا اور دربار کے امیروں کے ساتھ مل کر اس نے روہیلوں کا زور توڑا جو احمد شاہ ابدالی کے نائب بن کر پائے تخت پر مسلط ہوگئے تھے۔

۱۷۶۵ء میں ملہار راؤ ہلکر مرا تو اس کی بہو اہلیا بائی نے (جو بیوہ ہوگئی تھی) حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور تکاجی ہلکر کو اپنا وزیر جنگ بنایا۔ اہلیا بائی بڑی دانشمند اور نیک دل عورت تھی اور اس نے تیس برس کی حکومت میں اندور کو جو پہلے معمولی گاؤں تھا، ترقی دے کر نہایت بارونق شہر بنا دیا۔ اس کی ہردلعزیزی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب ۱۷۹۵ء میں وہ مری، تو اس کی ہندو رعایا نے دیوی بنا کے اسے پوجا اور آج بھی اندور کے بعض مقامات میں اس کی پرستش ہوتی ہے۔

حیدر علی سلطان

نواب نظام الملک اور مرہٹوں کے دوش بدوش انھی زمانے میں میسور کی مملکت نے تازہ قوت حاصل کی اور دکن کی ہر سلطنت کو اس نئے رقیب کا خوف پیدا ہوگیا۔ حیدر علی سلطان کے عروج حاصل کرنے سے پہلے جنوبی دکن کی یہ ریاست بہت کمزور سمجھی جاتی تھی۔ اصلی راجہ کا نام ہی نام باقی تھا ورنہ تمام اختیارات اس کے دیوان یا دلوائی کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ حیدر علی سلطان کی جو اوّل اوّل فوج میں رسالدار تھا، پہلے اسی دلوائی سے ناچاقی ہوئی اور جنگ کی نوبت پہنچی تو دلوائی کو سرنگا پٹم میں محصور ہونا پڑا۔ آخر میں حیدر علی سلطان نے اسے اور راجہ کو گرفتار کر کے ریاست پر خود قبضہ کر لیا اور اپنی جنگی مستعدی اور دلیری سے

ملک میں نئی روح پھونک دی۔ وہ بے علم اور سخت گیر آدمی تھا۔ لیکن فن جنگ سے اسے طبعی مناسبت تھی اور سپاہی کی قدر کرنی جانتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند سال میں میسور کی فوج نے جنوبی ہند میں اپنے نام کا سکہ بٹھا دیا۔ مدراس کے انگریز حیدر علی سلطان کے نام سے کانپتے تھے اور مرہٹے اور نواب نظام الملک بھی ہر وقت اس کے حملے سے اندیشہ مند رہتے تھے۔

۱۷۶۵ء میں انگریزوں نے نواب نظام الملک اور مرہٹوں کو اپنا طرفدار بنالیا اور پہلی جنگ میسور شروع ہوئی۔ انگریزی فوجیں میسور کے علاقے میں داخل ہوگئی تھیں۔ لیکن حیدر علی سلطان نے حملہ کرکے ملک ارکاٹ کو تاراج کر ڈالا۔ پھر ۱۷۶۹ء میں ۶ ہزار سوار لے کے یلغار کی اور ایک بہ یک مدراس جا پہنچا۔ اس کی فوج کی آمد دیکھکر انگریز نہایت خوف زدہ ہوگئے اور انھوں نے جس طرح بنا صلح کا عہد و پیمان کر کے حیدر علی سلطان کو رضامند کرلیا اور قرار پایا کہ انگریزوں پر کوئی حملہ ہو تو حیدر علی سلطان ان کی مدد کرے گا اور اگر میسور پر کوئی دشمن فوج کشی کرے تو انگریز حیدر علی سلطان کا ساتھ دیں گے۔

باب دوم

(۲) انگریزوں کا فروغ ہندوستان میں

کمپنی کا انتظام اور قحط ۱۷۷۰ء

محمد رضا اور شتاب رائے کو انگریزوں نے بالکل مطلق العنان نہیں رہنے دیا تھا بلکہ اپنی ایک خاص جماعت نگرانی کے لئے مقرر کر دی تھی جسے "بورڈ آف برٹش کمشنرز" کہتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے نوجوان انگریز مختلف اضلاع میں مقرر کر دیے گئے تھے کہ رعایا کو دیسی عہدہ داران مال کے ظلم سے بچائیں، اور کمپنی کے اغراض کا لحاظ رکھیں یعنی اس بات کی نگرانی کریں جو روپیہ وصول ہو وہ بلا خیانت وغبن کمپنی کے خزانے میں پہنچ جائے، لیکن یہ قاعدے محض کاغذ پر اچھے نظر آتے تھے ورنہ کمپنی کے ان انگریز ملازموں نے لوگوں پر بڑی سختیاں کیں اور کلائیو کے جانے کے بعد مجلس انتظامی کے ارکان بھی اسی رشوت ستانی کے مرض میں مبتلا ہو گئے جس کے علاج کے لئے کلائیو کو بھیجا گیا تھا۔ ان زیادہ ستانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۷۷۰ء میں بنگال میں خشک سالی ہوئی۔ تو مفلس ومظلوم رعایا فاقے مرنے لگی اور بیان کیا جاتا ہے کہ انگریزی علاقہ بنگال کی ایک تہائی آبادی بھوک سے ہلاک ہو گئی[۱]۔

۱۔ یہ سب بیان کین صاحب کی تاریخ ہند سے ماخوذ ہے۔ دیکھو جلد اول صفحہ ۱۸۲۔

کمپنی کو بھی اپنی طمع کی بدولت سخت خسارہ برداشت کرنا پڑا اور اگر ۱۷۷۲ء میں حکومتِ انگلستان اسے بہت بڑی رقم قرض نہ دیتی تو بے شبہہ وہ دوالیہ ہو جاتی۔

وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء تا ۱۷۸۵ء

کمپنی کی مالی حالت ایسی رہی تھی جب کہ وارن ہیسٹنگز بنگالے کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ ہندوستان میں کئی سال سے کمپنی کی ملازمت کر رہا تھا، اور اسے ہر قسم کے کام کا خوب تجربہ تھا۔ دوسرے دُبلے پتلے اور خاموش نظر آنے کے باوجود وہ بہت گہرا اور مستقل مزاج آدمی تھا۔ کمپنی کے صیغۂ مالگزاری اور دیوانی انتظام کی درستی میں جو کوششیں اس نے کیں، ان کا تفصیلی ذکر بے محل ہوگا لیکن اس سے قبل کہ ہم وارن ہیسٹنگز کی اصلاحات کا مختصر حال بیان کریں۔ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کمپنی کے انگریز ملازموں نے اس تمام بدانتظامی اور مالی نقصان کا الزام اپنے ہندوستانی نائبوں کے سر رکھا اور ان بیچاروں پر حساب فہمی کا مقدمہ چلایا۔ مگر ان کی بدنیتی کا کوئی ثبوت نہ مل سکا اور آخر میں وہ عزت کے ساتھ بری کر دیئے گئے۔ بایں ہمہ کمپنی نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سے مالگزاری کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ (۱۷۷۲ء)

وارن ہیسٹنگز کی اصلاحات

نئے گورنر نے اول اول ہر ضلع میں مالگزاری وصول کرنے کے لئے انگریز کلکٹر یا (محصل) مقرر کئے۔ لیکن یہ انتظام نہ چل سکا اور جو ملازم ملے وہ ناتجربہ کار نوجوان اور ملکی رسم و رواج اور زبان سے ناواقف تھے۔ تب ۱۷۷۳ء میں کمپنی کے علاقے کو ۶ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ہر صوبے میں ایک کونسل مقرر کی جو ٹھیکے پر دیہات دے دیتی تھی اور وصول مالگزاری کی نگرانی کرتی تھی۔ مال کے مقدمات اور بعض بعض دیوانی تنازعات کا فیصلہ بھی اسی کونسل کے سپرد تھا اور کونسل کی یہ عدالت "دیوانی عدالت مفصل" کہلاتی تھی۔ ان عدالتوں کے فیصلے کا مرافعہ کلکتے کی "صدر دیوانی عدالت" میں ہوتا تھا اور مال کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے واسطے ایک "مجلس مال" (یا بورڈ آف ریونیو) علیحدہ بنا دی گئی تھی۔ (۱۷۸۱ء) وارن ہیسٹنگز کا قصد یہ تھا کہ فوجداری مقدمات کا بھی کمپنی براہِ راست خود انتظام کرے چنانچہ ۱۷۷۲ء میں ایک "صدر عدالت نظامت" کلکتے میں قائم کی۔ لیکن یہ کام ابھی انگریز عہدہ داروں سے نہ چل سکا اور چار سال بعد مرشد آباد اور پٹنے میں پھر دو عدالتیں بنانی پڑیں

جن میں فوجداری مقدمات کی سماعت شتاب رائے کا بیٹا او محمد رضا خاں کرتے تھے اور "نائب ناظم" کہلاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اب وصول مالگزاری کا کام براہ راست کمپنی کی نگرانی میں آگیا اگرچہ دراصل تحصیل زر کی خدمت ہندوستانی زمیندار یا ٹھیکہ لینے والے ہی انجام دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ دیوانی مقدمات کے لئے ہر ضلع میں انگریزی عدالتیں قائم ہوگئیں جو پچھلے قوانین و رواج کے مطابق کام کرتی تھیں۔ باقی فوجداری مقدمات کا دشوار کام ابھی تک ہندوستانی عہدہ داروں ہی کے پاس رہا اور کہنا چاہیئے کہ انگریزی کمپنی کی اصلی (یعنی تجارتی) حیثیت میں اب بھی زیادہ فرق نہیں آیا۔

پارلیمنٹ کی مداخلت

حکومت کی یہ بدنظمیاں ہمیشہ نہیں رہیں بلکہ اس کے خلاف بہت سے اسباب پیدا ہونے لگے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگر اور گماشتے بنگالہ کی دولت لوٹ لوٹ کر وطن پہنچے اور وہاں امیرانہ شان وشوکت سے رہنے سہنے اور ملکی معاملات میں دخل دینے لگے تو انگلستان کے قدیم امرا کو ان سے حسد ہوا۔ یہ قدیم امرا اپنی خاندانی جاگیروں کے زور پر ملکی معاملات میں سب سے زیادہ دخیل تھے اور کچھ اپنے اثر سے اور کچھ روپیہ دے دے کر جسے چاہتے پارلیمنٹ کا رکن بنوا دیتے تھے۔ ہندوستان کے انگریز سوداگروں کی دولت و مال نے ان کا یہ اثر کم کر دیا۔ اب انہیں پارلیمنٹ کی رکنیت کے مقابلے میں ناکامیاں ہونے لگیں۔ غرض ادھر تو وہ کمپنی کے دشمن ہو گئے اور ادھر خود انگلستان کے لوگوں میں اس وقت انصاف و حریت کے جو نئے خیالات پھیل رہے تھے ان کا بھی کچھ نہ کچھ عکس پڑا اور وہاں کے وزرا کمپنی کے ملکی معاملات میں دخل دینے پر آمادہ ہو گئے۔

قانون تنظیمی مجریہ ۱۷۷۳ء

یہ ہم لکھ آئے ہیں کہ کمپنی کا ابھی تک کوئی خاص اصول حکومت نہ تھا۔ اس کے تین مرکزی کارخانے تھے جن کا اعلے عہدہ دار میر مجلس یا پریسیڈنٹ ہوتا تھا۔ قریب کی چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں اسی کے ماتحت کام کرتی تھیں اور اسی لئے اس کل علاقے کو ایک پریسیڈنسی یعنے ایک میر مجلس کا احاطہ کہتے تھے۔ مگر ان تین احاطوں میں باہم کوئی تعلق نہ تھا اور ہر میر مجلس براہ راست لندن کی مجلس نظما کے ماتحت ہوتا تھا۔ چونکہ اس طریقے میں بہت سی خرابیاں تھیں

اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہوی تھی لہٰذا پارلیمنٹ نے سب سے پہلے اسی کی اصلاح کی۔ ۱۷۷۳ء میں قانون تنظیمی (Regulating Act of 1773.)۔ اس کی رُو سے کلکتے میں ایک مجلس انتظامی یا کونسل قائم ہوی۔ اس کونسل میں گورنر جنرل اور چار ارکان شامل ہوتے تھے؛ بمبئی اور مدراس کے احاطے اس کونسل کے ماتحت کر دئے گئے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ایک عدالت عالیہ کی بنا پڑی جس کے تین ارکان کی نامزدگی خاص شاہ انگلستان کے ہاتھ میں تھی۔ کمپنی کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ آیندہ سے جنگی، مالی اور عدالتی معاملات کی روئداد انگلستان کے بعض وزیروں کی خدمت میں پیش کیا کرے۔

اس قانون میں ہندوستانی اُمرا یا ان کے کارندوں سے رشوت لینے کی ممانعت کی گئی تھی اور ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کوئی انگریز ہندوستان میں بارہ فی صدی سے زیادہ سود پر قرض نہ دے نہ بطور خود تجارت کا لین دین رکھے۔ غرض حکومت کی طرف سے کمپنی کے ہندوستانی معاملات میں یہ پہلی مداخلت تھی جس نے ہندوستان میں "دو عملی" کا آغاز کر دیا۔ اسے "دو عملی" اس لئے کہتے ہیں کہ اب حکومت تو کمپنی ہی کے ملازمین کرتے تھے مگر خود کمپنی انگلستان کے وزیروں اور پارلیمنٹ کی نگرانی میں آگئی تھی۔

"عدالتِ شاہی" سے تنازعہ

اوپر ذکر ہوا ہے کہ ۱۷۷۳ء کے "قانونِ تنظیمی" کی رو سے کلکتے میں حکومتِ انگلستان کی جانب سے ایک "عدالت عالیہ" قائم ہو گئی تھی جسے عام طور پر "عدالت شاہی" کہتے تھے، اور اس میں تین رکن اور ایک میر مجلس ہوتا تھا۔ ملک میں عدل و انصاف کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کا یہ پہلا عطیہ تھا جو اس نے اپنے ہندوستانی علاقے کو دیا؛ لیکن قانون مذکور ایسی بری طرح مرتب کیا گیا تھا کہ اس عدالت عالیہ کے اختیارات و حقوق کی اس میں کوئی وضاحت نہ تھی نہ ان قوانین کا ذکر کیا گیا تھا جن کے مطابق عدالت کام کرے؛ اس عجیب فروگزاشت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت عالیہ کے ارکان کمپنی کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں پر گرفت کرنے لگے اور انھوں نے قانون انگلستان کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ وہ کلکتہ کونسل کے ضوابط اور اضلاع کی دیوانی عدالتوں کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے اور ملازمین کمپنی کی جو بات خلاف قانون پاتے اس پر سختی سے محاسبہ کرتے تھے؛ کمپنی کے انگریز نوکر جو اپنے آپ کو اضلاع میں خود مختار جانتے تھے؛ اس دارو گیر

سے بہت گھبرائے اور انھوں نے کلکتہ کونسل کی وساطت سے اپنی شکایتیں انگلستان بھیجنی شروع کیں کہ عدالت عالیہ کی مداخلت سے انتظام میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے؛ لیکن اس جھگڑے کا آخری معرکہ ۱۷۷۹ء میں ہوا جب کہ ایک راجہ پر قرض خواہوں نے نالش کی اور عدالت عالیہ نے اسے حراست میں لینے کا حکم صادر کر دیا۔ گورنر اور اس کی انتظامی مجلس کے ارکان اس راجہ کے حامی تھے اور انھوں نے فوج بھیج کر عدالت کے پیادوں سے مقروض راجہ کو جبراً چھڑا لیا۔ اس پر عدالت عالیہ نے گورنر اور اس کے رفیقوں کو باضابطہ عدالت میں طلب کیا اور انھوں نے حاضر عدالت ہونے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی نظمائے کمپنی کو عدالت کی سخت شکایت لکھکر بھیجی اور یہ معاملہ پارلیمنٹ تک پہنچا۔ آخر ۱۷۸۱ء میں ایک ترمیمی قانون نافذ کیا گیا جس میں عدالت عالیہ کے فرائض و اختیارات کی توضیح کی گئی تھی اور کمپنی کی دیوانی اور فوجداری عدالتوں کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا عدالت عالیہ کی حدود صرف شہر کلکتہ میں محدود کر دی گئی تھیں البتہ انگریز جہاں کہیں ہوں اس کے زیر اثر مانے گئے تھے۔ باقی کلکتے کے باہر ہندو مسلمانوں کے مقدمات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اور اسی طرح مال کے تمام مقدمات بھی اس کے اختیارات سماعت کے باہر قرار دیئے گئے تھے۔ نیز صراحت کر دی تھی کہ عدالت عالیہ کمپنی کے کسی ملازم کو ایسے قصور پر جو ادائے فرائض کے اثنا میں سرزد ہو، سزا نہیں دے سکتی۔

مالی انتظامات جن اسباب سے کمپنی کی مالی حالت خراب ہوئی تھی ان کا مختصر حال ہم اوپر پڑھ چکے ہیں۔ اب نظمائے کمپنی کا سخت تقاضا تھا کہ جس طرح ممکن ہو مصارف میں کمی اور قرض اتارنے کا انتظام کیا جائے وارن ہیسٹنگز نے پہلی کفایت شعاری یہ کی کہ نواب بنگالہ کا سالانہ وظیفہ آدھا یعنی صرف سولہ لاکھ کر دیا۔ حالانکہ اس کے ساتھ بتیس لاکھ روپے سالانہ کی قرارداد تھی اور اب تک اسی پر عمل ہوتا رہا تھا؛ ہیسٹنگز نے دوسری کارروائی یہ کی کہ شاہ عالم کو بنگالے کی دیوانی کے عوض میں جو ۲۶ لاکھ روپے سالانہ دینا قرار پایا تھا، اسے بند کر دیا اور والی اودھ سے اندرونی معاہدہ کر کے کڑے اور الہ آباد کے شاہی اضلاع نواب موصوف کے ہاتھ فروخت کر دئے (۱۷۷۳ء) اس کا سبب ہیسٹنگز یہ بتایا تھا چونکہ بادشاہ نے اب الہ آباد کا قیام ترک کر کے مرہٹوں سے اتحاد کر لیا ہے لہذا ۱۷۶۵ء میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ فسوخ ہو گیا لیکن عہد کی یہ ایسی خلاف ورزی تھی کہ بعد میں جب ہیسٹنگز پر انگلستان میں مقدمہ

چلا تو اس کی فرد جرم میں ایک یہ الزام بھی شامل تھا۔ بہرحال وقت کے وقت ہیسٹنگز کی تدبیر کارگر ہو گئی بادشاہ کی جانب سے اگر کسی حملے کا اندیشہ ہوتا بھی تو والی اودھ کے مل جانے سے زائل ہو گیا۔ دوسرے وہ اضلاع جو خاص بادشاہی جاگیر مانے جاتے تھے انگریزوں نے خواہ مخواہ مالک بن کر والی اودھ کے ہاتھ بیچ دیئے اور مفت میں پچاس لاکھ روپیہ بھی وصول کر لیا۔ ایک اور چال ہیسٹنگز نے یہ کی کہ انگریزی فوج کا ایک حصہ نواب اودھ کو مستعار دے دیا کہ رہیلوں پر فوج کشی میں نواب کو مدد دے مطلب یہ تھا کہ ان دونوں علاقوں میں جنگ ہوتی رہے گی تو انگریزی امدادی فوج کی تنخواہ کمپنی کو دینی نہیں پڑے گی بلکہ اس کا بار اودھ کے خزانے پر ہوگا۔ دوسرے یہ عہد و پیمان بھی ہو گیا تھا کہ نواب کی فتح ہوئی تو وہ چالیس لاکھ روپیہ اور کمپنی کو نذر کرے گا۔

فرانسس اور نندکمار کا مقدمہ

قانون تنظیمی مجریہ ۱۷۷۳ء کے مطابق کلکتے میں چار ارکان کی جو انتظامی مجلس یا کونسل قائم کر دی گئی تھی تو اس کا یہ حال تھا اس کی کثرت رائے کے بغیر گورنر جنرل کوئی کام نہ کر سکتا تھا اس کونسل میں سب سے لائق اور ذہین رکن فلپ فرانسس تھا اور اس کونسل کے اجلاس شروع ہوتے ہی ہیسٹنگز کے کاموں پر نکتہ چینی شروع کی خاص کر عہد نامہ بکسر کے خلاف جو نیا معاہدہ والی اودھ کے ساتھ ہوا تھا اس پر نہایت سختی سے اعتراض کئے اور اسی طرح روہیلوں کی جنگ کو سراسر ناجائز قرار دیا۔ فرانسس کی دلائل اور گویائی کے سامنے ہیسٹنگز کی کچھ پیش نہ جاتی تھی اور سوائے ایک رکن کے جو ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کرتا رہا تھا، باقی تین ارکان ہیسٹنگز کے خلاف ہو گئے۔ اور اسی تین شجاع الدولہ والی اودھ کی وفات پر اس کے جانشین سے ایک نیا معاہدہ کیا (۱۷۷۵ء) جس کی رو سے بنارس کا علاقہ وہاں کے زمیندار یا راجہ کے حوالے کر دیا گیا کہ کمپنی کے باج گزار کی حیثیت سے قابض رہے نیز وہ جاگیر اور خزانہ جو اودھ کی بیگموں کے ورثے میں پہنچا تھا اسے بیگموں کو دلوا دیا اور نواب آصف الدولہ کی جو اس مال پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا، کوئی حجت نہ مانی۔

ہیسٹنگز کو یہ باتیں بہت ناگوار تھیں۔ ایک مرتبہ وہ استعفیٰ دینے پر بھی آمادہ

ہو گیا تھا۔ کیونکہ کثرت رائے کے مقابلے میں اس کی کچھ نہ چلتی تھی۔ اور ادھر فرانسس علانیہ اس پر رشوت ستانی اور بددیانتی کے الزام لگاتا تھا۔ اتفاق سے انھی دنوں نند کمار نے جس کا مختصر حال ہم بنگالے کی پہلی لڑائیوں کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں ہیسٹنگز کی رشوت ستانی کی بعض شہادتیں بہم کریں اور فرانسس کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ہیسٹنگز عدالت میں ان الزامات کی جواب دہی اور اپنی صفائی پیش کرے۔ ہیسٹنگز نے عدالت میں جانے سے انکار کر دیا اور چند ہی روز بعد خود نند کمار پر ایک شخص نے جعل سازی کی نالش کی اور اسی کی سزا میں اسے بلا تاخیر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ یہ آخری کارروائی ایسے وقت میں ہوئی تھی کہ قدرتی طور پر ہر شخص ہیسٹنگز پر شبہہ کرتا تھا کہ اسی نے سازش کر کے اپنے دشمن کا قصہ پاک کرا دیا ہو گا تاکہ نند کمار کو وہ ثبوت پیش کرنے کی مہلت ہی نہ ملے جن سے ہیسٹنگز کی رشوت ستانی ثابت ہوتی تھی۔

ہیسٹنگز کی خوش نصیبی سے انھی دنوں اس کا ایک مخالف رکن مجلس فوت ہو گیا اور اب اپنے ایک ساتھی کی رائے شامل کر کے وہ جو چاہتا تھا وہی کر لیتا تھا۔ کیونکہ بحیثیت میر مجلس اس کی دو رائیں شمار ہوتی تھیں۔ بایں ہمہ فرانسس کے ساتھ اس کی مخالفت قائم رہی اور ایک مرتبہ ان میں بہت سخت گفتگو ہوئی اور ڈوئل لڑنے کی نوبت پہنچی جو کہ ان دنوں انگلستان میں بھی جائز تھا۔ اس مقابلے میں فرانسس مجروح ہوا اور علاج کی غرض سے واپس وطن چلا گیا (۱۷۸۰ء) اب کلکتہ کونسل میں وارن ہیسٹنگز کی مخالفت کرنے والا کوئی نہ تھا اور گو انگلستان میں بعض مخالف اس کے خلاف مقدمہ کا مسالا تیار کر رہے تھے؛ لیکن ابھی تک ہندوستان میں ہیسٹنگز کا راج تھا اور وہ بے روک ٹوک اپنی رائے سے حکومت کرتا تھا۔

مرہٹوں کے معاملات

لیکن کلکتہ کونسل کے ان جھگڑوں کو چھوڑ کر اب ہمیں ہندوستان کی دو طاقتور حکومتوں پر نظر ڈالنی چاہیے جن سے اسی زمانے میں انگریزوں کو لڑائیاں پیش آئیں۔ ان میں مرہٹوں کا ذکر مقدم ہے جن کے پیشوا مادھو راؤ کے مرتے ہی پونا میں پھر خانگی جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے مادھو راؤ نے اپنے چچا رگھوناتھ کو قید سے آزاد کر دیا اور یہ وصیت کی کہ تم میرے بھائی نرائن راؤ کو مدد دینا جسے میں اپنے بعد پیشوا مقرر کرتا ہوں۔

لیکن ارکین سلطنت کی باہمی مخالفت نے اس وصیت پر عمل نہ ہونے دیا۔ نرائن راؤ نے اپنے چچا کو گرفتار کر لیا۔ اور ۱۷۷۳ء میں اس کا سخت خمیازہ بھگتا۔ یعنی رگھوناتھ کے طرفداروں نے نرائن راؤ کو جان سے مار ڈالا اور رگھوناتھ کو قید سے چھڑا کر پیشوا کی گدی پر بٹھا دیا، جوان بھتیجے کے اس قتل میں چچا کی شرکت ثابت نہیں ہے لیکن بیان کرتے ہیں کہ اس خونی سازش کی بانی مبانی رگھوناتھ کی بیوی انند بائی تھی اور اسی نے لفظ "گرفتاری" کو لفظ "قتل" سے بدل دیا تھا۔ اصلی واقعہ جو کچھ ہو اور عوام الناس خواہ کچھ ہی کہتے ہوں، اس میں شک نہیں کہ مرہٹہ سرداروں میں ایک بڑا گروہ رگھوناتھ کا مخالف ہو گیا اور جب نرائن کی بیوہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ان لوگوں نے فوراً اس کے پیشوا ہونے کا اعلان کر دیا رگھوناتھ کو پونا چھوڑ کے مالوے میں پناہ لینی پڑی کہ شاید سندھیا اور ہلکر کی مدد سے وہ دوبارہ حکومت حاصل کر سکے، لیکن مخالف گروہ کے سردار نانا فرنویس نے جو شیر خوار پیشوا کا اتالیق مقرر ہوا تھا، ان دونوں رئیسوں کو توڑ لیا۔ رگھوناتھ نے بھاگ کر گجرات میں پناہ لی۔

عہد نامۂ سورت

اب ایک تازہ پیچ یہ پڑا کہ بمبئی کے انگریزوں نے جن کا مدت سے سالسٹ اور بسین پر دانت تھا، اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ناکام رگھوناتھ سے کہا کہ اگر ان بندرگاہوں کو انگریزوں کے حوالے کر دو تو ہم تمھیں فوجی امداد دیں گے؛ لیکن رگھوناتھ اس شکستہ حالی میں بھی یہ معاہدہ کرنے پر تیار نہ تھا کہ ایسی بارونق بندرگاہیں جنھیں مرہٹوں نے پرتگیزوں سے چھینا تھا، انگریزوں کے حوالے کر دے؛ وہ انکار ہی کر رہا تھا کہ انگریزوں نے ازخود سالسٹ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا (دسمبر ۱۷۷۴ء) اور یہ پہلی چھیڑ تھی جو انھوں نے حکومت پونا سے کی؛ رگھوناتھ نے بھی یہ دیکھ کر اور کچھ اپنی مصیبتوں سے تنگ آ کر آخر کار مذکورۂ بالا شرائط مان لیں۔ مارچ ۱۷۷۵ء میں عہد نامۂ سورت پر دستخط ہو گئے اور انگریزوں نے رگھوناتھ کی مدد کے لئے تھوڑی سی فوج روانہ کی۔

عہد نامۂ پورندھر

لیکن قانون تنظیمی کی رو سے بمبئی کونسل کو ایسا معاہدہ کرنے کا اختیار نہ تھا اور اسی بنا پر جب یہ اطلاع کلکتے بھیجی گئی تو

وہاں کی اعلیٰ کونسل نے اسے نہایت ناپسند کیا اور اپنے وکیل کو پونا بھیج کر نانا فرنویس کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا جو عہد نامۂ پورندھر کے نام سے مشہور ہے (۱۷۷۶ء) اس کی شرائط یہ تھیں کہ انگریز رگھوناتھ کی اعانت سے ہاتھ اٹھالیں گے اور پیشوا کے خزانے سے رگھوناتھ کو تین لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملا کرے گا۔ لیکن سالسٹ کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوا اور یہ معاملہ ابھی ملتوی تھا کہ لندن سے نظمائے کمپنی کے مراسلات پہنچے جن میں عہد نامۂ سورت پر اظہار پسندیدگی کیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر بمبئی کے انگریزوں نے کلکتہ کونسل کے احکام کی کچھ پروا نہ کی اور رگھوناتھ کی اعانت کرتے رہے۔

اتفاق سے انھی دنوں ایک فرانسیسی امیر پونا آیا اور یہاں اس کی بہت کچھ خاطر تواضع کی گئی اس کا دعویٰ تھا کہ ضرورت ہو تو میں فرانس سے فوج کثیر ہندوستان میں لا سکتا ہوں۔ ادھر تھوڑے دن بعد ہی یورپ میں فرانس و انگلستان کی جنگ چھڑ گئی۔ غرض بمبئی کی کونسل کو اپنے عہد نامۂ سورت کے مطابق کام کرنے کے کئی حیلے مل گئے اور اس نے رگھوناتھ کی جانب سے خاص پونا پر فوج کشی کی۔

پہلی جنگ مرہٹہ ۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۲ء

سچ پوچھئے تو سالسٹ پر قابض ہو جانا اور رگھوناتھ سے بالا بالا عہد نامہ کرنا ہی انگریزوں کی طرف سے گویا جنگ کی ابتدا کر دینا تھا۔ کلکتہ کونسل کی کارروائی نے بیچ میں آ سے روک لیا تھا مگر بمبئی والوں نے پورندھر کے عہد نامے کو تسلیم ہی نہیں کیا اور اب مرہٹوں کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی (۱۷۷۹ء) ان کی فوج پونا سے اٹھارہ میل تک بڑھ آئی تھی لیکن مرہٹوں کے پے درپے حملوں نے اسے کمزور و پریشان کر دیا۔ وہ پسپا ہونے لگی اور آخر میں بمقام وڑگاؤں پر گھر کر ہتھیار ڈال دیئے (جنوری ۱۷۷۹ء) رگھوناتھ نے اپنے تئیں مرہٹہ سردار سندھیا کے حوالے کر دیا اور انگریزی فوج کے سرداروں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ بروچ و سالسٹ وغیرہ مقامات سے دست بردار ہونے کا عہد کیا اور اس کے معاوضے میں انھیں سلامت واپس بمبئی جانے کی اجازت مل گئی۔

یہ فوجی مہم تو ناکام و نامراد واپس آئی لیکن اب بڑودے کے دو[2] دعوی داران ریاست میں نزاع ہوئی اور انگریزوں کو اس بات کا موقع ملا کہ جو کام رگھوناتھ کے طرفدار بن کر پونا میں نہ کر سکے تھے وہ فتح سنگھ کے حامی بن کر گجرات میں انجام دیں کیونکہ یہ مہم نسبتہً آسان تھی۔ غرض ان کی ایک فوج نے جو شمالی ہند سے سورت پہنچ گئی تھی ۱۷۸۰ء میں گجرات کے صدر مقام احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور سندھیا کی فوج پر شب خون مار کے فتح پائی۔ اسی طرح رات کے وقت ایک فوجی دستہ کمندیں ڈال کے گوالیار کے مستحکم قلعے پر چڑھ گیا اور شہر بسین بھی چند روز کے محاصرے کے بعد انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ ان کامیابیوں نے انگریزوں کے حوصلے بڑھا دیے اور ۱۷۸۱ء میں انھوں نے پھر پونا پر فوج کشی کی۔ اب تک ان کا مقابلہ ایسی فوجوں سے ہوا تھا جن کی تعداد کم تھی اور جن کے پاس گولہ بارود بھی بہت ناکافی تھی لیکن مرہٹوں کے اصلی ملک میں جب انھوں نے دوبارہ پیش قدمی کی تو پھر انھی مصائب کا سامنا ہوا جو پہلی فوج کو پیش آئی تھیں۔ گو اب کے انگریزی سپاہ گھرنے سے بچ گئی لیکن اسے سخت نقصان اٹھا کے پسپا ہونا پڑا اور بچ کر نکل آنا ہی بہت غنیمت معلوم ہوا۔

راجہ بنارس اور اودھ کی بیگموں کا معاملہ

اس لڑائی نے کمپنی کا خزانہ خالی کر دیا تھا اور ہیسٹنگز کو ضرورت تھی کہ جس طرح ممکن ہو روپیہ فراہم کرے کیونکہ اب حیدر علی سلطان کے ساتھ بھی لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لیے ہیسٹنگز نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ اور اودھ کے نواب آصف الدولہ سے روپیہ لینا چاہا۔

گزشتہ عہدنامے کی بموجب چیت سنگھ ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ کمپنی کو ادا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہیسٹنگز اسے دبا کر کچھ اور بھی وصول کر لیا کرتا تھا۔ ان خلاف معاہدہ مطالبات سے راجہ بیچارہ ہی تنگ آگیا تھا اور ایک دو مرتبہ اس نے یہ زائد رقم بھرنے میں لیت و لعل بھی کی تھی۔ ہیسٹنگز نے اسی تاخیر کو تشدد کا حیلہ بنایا اور بنارس پہنچ کے راجہ کو حراست میں لے لیا۔ یہ ایسی کھلی ہوئی زیادتی تھی کہ بنارس کی مسکین رعایا بھی اپنے راجہ کی ذلت کی تاب نہ لائی اور انگریزی پہرے والوں پر شہر والوں نے حملہ کر کے راجہ کو قید سے چھڑا لیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ خود ہیسٹنگز کو

نکل جانے کا موقع مل گیا ورنہ جس قدر فوجی جمعیت اس کے ساتھ تھی غالباً وہ شہر کے غضب ناک بازاریوں کا مقابلہ نہ کر سکتی؛ بہرحال کچھ عرصے بعد انگریزی کمک آپہنچی اور اس نے چیت سنگھ کے چھوٹے چھوٹے قلعے بہ آسانی فتح کر لئے۔ پھر ہیسٹنگز نے اس راجہ کو معزول کر کے اس کے ایک دوسرے خاندانی کو گدی پر بٹھا دیا اور مستقل طور پر سالانہ خراج کی رقم بڑھا دی گئی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ہیسٹنگز کا اصلی مطلب حاصل نہ ہوا۔ چیت سنگھ کے محل میں بہت کچھ ساز و سامان اور روپیہ موجود تھا لیکن گرفتاری کے وقت فوج والوں نے اسے لوٹ لیا اور گورنر جنرل کو سرکاری خزانے کے لئے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ لہٰذا اب اس نے نواب اودھ کی طرف توجہ مبذول کی جس پر انگریزوں کا بہت سا روپیہ چڑھا ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ ایک امدادی فوج تو مستقل طور پر اودھ کے علاقے میں متعین تھی جس کے مصارف نواب کے ذمے تھے۔ اور ایک "اور غیر معمولی" فوج ہیسٹنگز نے چند سال سے وہاں بھیج رکھی تھی کہ اس کے مصارف بھی نواب برداشت کرے۔ اس کارروائی پر فرانسس نے کلکتہ کونسل میں جو اعتراض کئے ان کا حال اجمالاً ہم اوپر پڑھ چکے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قدر زر کثیر جو فوجی مصارف کے نام سے انگریز طلب کرتے تھے نواب سے باقاعدہ ادا نہ ہو سکا اور آخر میں ہیسٹنگز نے اسے اجازت دے دی کہ "بیگمات اودھ" یعنی نواب کی ماں اور دادی کے قبضے میں جو مال و متاع اور جاگیریں ہیں، انھیں چھین کر کمپنی کا روپیہ ادا کر دے؛ ان بیگموں کا دعویٰ تھا کہ یہ مال جائز طور پر ہمیں ورثے میں ملا ہے اور کلکتہ کونسل نے بھی چند سال پہلے انھی کے حق میں فیصلہ کیا تھا پس انھوں نے یہ روپیہ نواب کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اس وقت نواب نے ہیسٹنگز کی شہہ پا کر جس قدر نقد روپیہ یا جواہرات مل سکے، جبراً بیگموں سے چھین لئے۔

عہد نامہ سلبی ۱۷۸۲ء

لیکن مرہٹوں کی جنگ کمپنی کا خزانہ خالی کئے دیتی تھی اور اس کے نظما چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو اس جنگ کو ختم کر دیا جائے ادھر سندھیا کو بھی لڑائی میں اپنا نقصان

نظر آرہا تھا اور وہ حکومت پونا کے ساتھ انگریزوں کی صلح کرا دینے پر آمادہ تھا۔ چنانچہ طول طویل گفتگو کے بعد ۱۷۸۲ء میں عہد نامہ سلبی پر دستخط ہو گئے جسکی خاص خاص شرطیں یہ تھیں کہ (۱) مرہٹوں کے تمام علاقے سے جن پر انگریز قابض تھے قبضہ اٹھا لیا جائے گا البتہ سالسٹ بندرگاہ انگریزوں کے قبضے میں رہے گی (۲) سوائے انگریزوں کے اور کسی فرنگی قوم کے آدمی کو پونا میں سرکاری طور پر مہمان نہ رکھا جائے گا اور پرتگیزوں یا انگریزوں کے علاوہ اور کسی قوم کو اس علاقے میں تجارت کی اجازت نہ دی جائے گی (۳) حکومت پونا فتح سنگھ کو بڑودے کا راجہ تسلیم کرے گی اور (۴) رگھوناتھ یا رگھوبا کو تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ دیگی؛ بروچ کا ضلع جس پر انگریز متصرف ہو گئے تھے سندھیا کے حوالے کر دیا گیا اور مرہٹوں کے باقی علاقوں سے انھوں نے اپنی فوج ہٹالی۔ اس طرح پہلی جنگ مرہٹہ ختم ہو گئی اور کمپنی کو سالسٹ کی بندرگاہ کے علاوہ ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ریاست بڑودہ میں اس کا رسوخ جم گیا؛

مدراس کے معاملات

وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں احاطۂ مدراس کی انتظامی حالت بہت ابتر رہی۔ اصل یہ ہے کہ کمپنی کے ملازم ارکاٹ کی ریاست پر اس طرح قبضہ تو کر نہ سکے تھے جس طرح دیوانی ملنے سے بنگالے پر انگریزی عمل دخل ہو گیا تھا۔ پس آئے دن ان کا نواب محمد علی خاں سے جھگڑا رہتا تھا اور جنگی مصارف یا امدادی فوج کی تنخواہوں کے نام سے وہ ہمیشہ نواب سے بڑی بڑی رقمیں طلب کرتے رہتے تھے اس فوج کے مصارف کے واسطے ایک جاگیر بھی مدراس کے قریب نواب نے انگریزوں کے نام لکھ دی تھی با ایں ہمہ وہ مدراس کونسل کے مطالبات کو پورا نہ کر سکتا تھا اور جب بہت تقاضا ہوتا تو مجبور ہو کر کمپنی ہی کے ملازمین سے سودی روپیہ قرض لے کر مدراس کونسل کو ادا کرتا رہتا تھا اور یہ قرض خواہ اپنے کثیر سود کے عوض میں اس کا کوئی پرگنہ یا علاقہ رہن رکھ لیتے تھے؛ ان قرض دینے والوں میں پال بین فیلڈ کا نام بہت مشہور ہے جو کمپنی کے معمولی ملازم ہونیکے باوجود گورنر مدراس سے بھی زیادہ امیرانہ شان کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اور لندن میں

اس کی بیوی بڑے تکلف سے اپنے نیلے چرٹ میں بیٹھکر باغوں کی سیر کیا کرتی تھی ۔

اس قرض کے بارے تنگ آکر اور اپنے انگریز دوستوں کی صلاح سے محمد علی نے ۱۷۷۳ء میں تنجور کے راجہ کو سالانہ خراج میں اضافہ کرنے پر مجبور کیا اور آخر میں مدراس کونسل سے کہہ سُن کر اسے معزول کرا دیا تنجور پر انگریز قابض ہو گئے تھے لیکن نظمائے کمپنی کو اس معاملے کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کارروائی پر ناراض ہوئے اور انھوں نے لارڈ پگٹ کو دوسری مرتبہ مدراس کا گورنر بنا کے بھیجا کہ وہ معزول راجہ کو پھر بحال کر دے لیکن کونسل کے تمام ارکان پگٹ کے خلاف تھے انھوں نے کثرت رائے سے اس کی ایک نہ چلنے دی بلکہ آخر میں پگٹ کو حراست میں لے لیا اور وہ اسی قید کی حالت میں مر گیا۔ نظمائے کمپنی نے اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور حکومت مدراس کی وہی کیفیت رہی جو پگٹ کے آنے سے پہلے تھی یعنی میسور سے جنگ چھڑنے کے باعث کونسل کو روپے کی سخت ضرورت تھی اور محمد علی ان کے مطالبے پورے نہ کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۷۸۱ء میں انھوں نے نواب کو مجبور کر کے زمانۂ جنگ تک کے لئے تمام ریاست کی مالگزاری وصول کرنے کا اختیار لے لیا اور قرار پایا کہ نواب کے خانگی مصارف کے واسطے کل مالیے کا پانچواں حصہ اسے دے دیا جایا کرے گا ۔

میسور کی دوسری لڑائی ۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء

ہم پہلے پڑھ آئے ہیں ۱۷۶۹ء میں پہلی جنگ میسور کا خاتمہ جس معاہدے پر ہوا اس کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ فریقین پر کوئی حملہ ہو تو انگریز میسور کو اور حیدر علی سلطان، انگریزوں کو مدد دیں گے۔" معلوم ہوتا ہے کہ سلطان میسور کی دلی خواہش یہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رہیں۔ کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اسے بہت جلد کسی مددگار کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ اگلے ہی سال مادھوراؤ پیشوا نے اپنے ٹڈی دل سواروں سے میسور پر یورش کی اور اس وقت مدراس کونسل کو تردد پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس تردد کی مختلف وجوہ تھیں اول تو یہ کہ نواب محمد علی، حیدر علی کا سخت مخالف تھا اور اسے مدد دینے پر آمادہ نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کونسل کی حالت بہت ردی تھی نہ اس کے پاس روپیہ تھا

نہ سامانِ رسد اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر مرہٹے فتح پا لیتے تو اوران کا حلیف حیدر علی جیت جاتا تو دونوں صورتوں میں انھیں آئندہ کرناٹک (ارکاٹ) کی خیر نظر نہ آتی تھی۔ لہٰذا کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا جائے اس جنگ میں مرہٹوں کو کامیابی ہوئی اور حیدر علی کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑا پس اسی وقت سے وہ انگریزوں کا سخت دشمن ہو گیا کہ انھوں نے اپنے عہد کو پورا نہیں کیا اور عین وقت پر بے وفائی کی"

غرض حیدر علی کے دل میں انگریزوں کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کی دوستی پر بھروسہ کرنا غلطی ہے جو کچھ کرنا ہو وہ اپنی قوت بازو کے بھروسے پر کرنا چاہئے اس نے ایسی غیر معمولی متعدی اور انتظامی قابلیت پائی تھی جس کے دوست دشمن سب معترف ہیں۔ اور پچھلی شکست کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس کے پاس پہلے سے بھی زیادہ طاقتور فوج تیار ہو گئی اور مرہٹوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں اس نے جتنا علاقہ کھویا تھا اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیا۔ ۱۷۷۹ء میں سلطنت میسور کی سرحدیں کرشنا تک وسیع ہو گئیں۔ اور خود حکومت پونا اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ انگریزوں کے مقابلے میں سلطان میسور سے اتحاد کرے۔

ادھر مدراس کونسل نے ایک کارروائی یہ کی کہ پہلے نواب نظام علیخاں بہادر کے اپنے بھائی نواب بسالت جنگ کے نام ایک جاگیر علیحدہ کر دینے پر زور دیا اور پھر اس جاگیر پر خود تصرف حاصل کر کے ایک انگریزی فوج وہاں بھیج دی کہ اگر بسالت جنگ مزاحمت کرے تو اس کی جاگیر پر جبراً قبضہ کر لیا جائے۔ نواب نظام الملک کو یہ حرکت ناگوار گزری اور انگریزوں کو نظر آنے لگا کہ حکومت حیدر آباد بھی انگریزوں کے خلاف میسور و پونا سے متحد ہوا چاہتی ہے۔ مگر وارن ہیسٹنگز نے فوراً جاگیر مذکور سے دست برداری کر لی اور اس طرح نواب نظام الملک کی دشمنی سے اپنے تئیں محفوظ کر لیا۔

اسی اثنا میں لڑائی کا ایک تیسرا سبب یہ پیش آیا کہ فرانس و انگلستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں نے ان مقامات سے فرانسیسیوں کو نکالنا

شروع کیا جو اب تک ہندوستان میں ان کے مقبوضہ تھے۔ چنانچہ پانڈی چیری کا دوبارہ محاصرہ کر کے اسے لے لیا اور ماہی کے بندرگاہ پر بھی قابض ہو گئے۔ ساحل مالیبار کی یہ بندرگاہ گویا خاص میسوری علاقے کی بندرگاہ تھی۔ دوسرے انگریزوں سے ناچاقی کے بعد حیدر علی کے تعلقات فرانسیسیوں کے ساتھ بہت دوستانہ ہو گئے تھے۔ اور اس نے مدراس کونسل کو صاف صاف جتا دیا کہ اگر ماہی پر فوج کشی کی گئی تو یہ فعل سلطنت میسور کی دشمنی سمجھا جائے گا؛ لیکن انگریزوں نے اس کی پروانہ کی اور ان کے ماہی پر قابض ہوتے ہی میسور کی دوسری جنگ چھڑ گئی۔

حیدر علی نہایت قابل سپہ سالار تھا اور اول اول جو انگریز افسر اس کے مقابلے میں بھیجے گئے ان سب کو اس نے جابجا شکستیں دیں اور گھیر گھیر کر ہتھیار رکھوا لئے۔ سب سے پہلے کرنل بیلی اور اس کی چار ہزار فوج نے پولی لور پر گھر کر ہتھیار ڈال دئے۔ اور یہ کام حیدر علی نے اس عجلت اور خوبی سے کیا تھا کہ انگریزوں کی اصلی اور بڑی فوج جو صرف دس میل کے فاصلے پر موجود تھی، کوئی مدد نہ کر سکی اور حیدر علی نے پلٹ کر اسے بھی ہر طرف سے گھیر لیا۔ انگریزی سپہ سالار سرہکڑ منرو کو سوائے اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ اپنی بھاری توپیں پانی میں ڈبو کر جس طرح ممکن ہو مدراس ہٹ آیا، اور یہاں کی کونسل نے ہیسٹنگز سے کمک طلب کی۔ اس موقع پر اگر نواب نظام الملک اور ناگپور کا بھونسلہ راجہ انگریزوں کے درپردہ مددگار نہ ہو جائیں تو مدراس کی خیر نظر نہ آتی تھی۔ لیکن بھونسلہ راجہ نے سولہ لاکھ روپے انگریزوں سے لے لئے اور نواب نظام الملک نے بھی انگریزی فوج کو اپنے علاقے میں سے گزرنے کی اجازت دے دی۔

بنگالے کی تازہ فوج کے آجانے سے انگریزوں کی ہمت مضبوط ہو گئی دوسرے اب ان کے بہترین افسر بھی اسی طرح بھیج دئے گئے تھے، جن میں آیر کوٹ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ میسور کے تجربہ کار فرماں روا نے اس فوج کو بھی ساحل سمندر کے قریب گھیر لیا تھا اور فتح کا کامل یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس نازک وقت میں فرانسیسی بیڑا جو مدد کے لئے آیا تھا، واپس چلا گیا اور انگریزوں کو سمندر کی طرف سے رسد اور سامان جنگ پہنچنے کا راستہ کھل گیا۔ لڑائی کے تفصیلی حالات بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ انگریزوں کو حیدر علی کی خندقوں پر ایک طرف سے حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور ان کی توپوں نے میسوری فوج میں کھلبلی ڈال دی۔ حیدر علی میدان سے ہٹنا نہ چاہتا تھا مگر بیان کرتے ہیں کہ ایک منھ چڑھا نوکر اس کے سر ہو گیا کہ زندگی ہے تو پھر انگریزوں سے لڑ کر شکست دے لینا۔ غرض کوٹ کو فتح حاصل ہوئی (جنگ پورٹونووہ نومبر ۱۷۸۱ء) سلطان میسور ساحل سے اندرون ملک میں ہٹ گیا؛

باایں ہمہ کرناٹک میں ہر طرف حیدر علی کی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں اور اسکی یلغاروں نے انگریزوں کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ ۱۷۸۲ء میں تنجور کے قریب اس کے فرزند فتح علی (عرف ٹیپو سلطان) نے نمایاں فتح پائی اور دو ہزار انگریزی فوج کو کاٹ دیا۔ ادھر فرانسیسی بیڑا اور سپاہ بھی ہندوستان آ پہنچی اور اس بری فوج کا سپہ سالار بسے تھا جس کی کارروائی کی دکن بھر میں دھوم تھی؛ مگر ان عمدہ مواقع سے فائدہ اٹھانے کی حیدر علی کو زیادہ مہلت نہ ملی۔ اسی سال کی عمر پا کے اس نے ۱۷۸۲ء میں انتقال کیا اور فتح علی سلطان کو میدان جنگ سے واپس پائے تخت کو جانا پڑا جہاں اس کی مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی؛

فرانسیسی اور میسوری فوج کا مستقر کڈلور تھا اور اسی مقام کا ۱۷۸۳ء میں انگریزوں نے تازہ ساز و سامان کے ساتھ محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ سلطان میسور بذات خاص دوسری طرف مصروف جنگ تھا مگر انگریزوں کو کڈلور میں کوئی کامیابی کی امید نظر نہ آتی تھی اور غالباً انھیں محاصرے سے دست بردار ہونا پڑتا کہ اسی اثنا میں فرانس و انگلستان کی صلح ہو گئی اور ہندوستان کی فرانسیسی فوج نے بھی سلطان میسور کا ساتھ چھوڑ دیا۔ سلطان اس وقت ساحل ملیبار پر اس انگریزی فوج سے لڑ رہا تھا جو جنرل میتھو کے ماتحت بمبئی سے بھیجی گئی تھی۔ میتھو نے ریاست بدنور پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کی فوجیں میسوری علاقے میں پھیل رہی تھیں کہ یکایک فتح علی سلطان کے آنے کی اطلاع ملی اور قبل اس کے کہ میتھو اپنے منتشر دستوں کو یکجا کر سکے میسوری سپاہ کے پنجے میں پھنس گیا اور ہتھیار ڈال گئے ان قیدیوں میں جا ملا جن کی بہت بڑی تعداد پہلے سے میسور کے پائے تخت میں اسیر تھی؛ اس کے بعد سلطان نے بڑھ کر منگلور کا محاصرہ کر لیا اور وہیں فرانسیسی اور انگریزی سفیر اس کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

فرانسیسی یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ وہ آیندہ میسور کے حلیف بن کر انگریزوں کے خلاف جنگ نہ کریں گے اور انگریز سفیر صلح کا پیام لائے تھے، سلطان نے چند روز تک انھیں ٹھیرایا اور جب منگلور مسخر ہوگیا تو صلح نامے پر دستخط کر دیئے جس کی شرائط یہ تھیں کہ فریقین نے جو جو مقامات فتح کئے ہیں، ان سے دست کش ہو جائیں گے اور دونوں طرف کے قیدیوں کو آزادی دے دی جائے گی (عہدنامہ منگلور مارچ ۱۷۸۴ء)۔

ہیسٹنگز کی واپسی وطن کو

جنگ میسور ختم ہونے کے چند ماہ بعد ہیس ٹنگز کی میعاد حکومت بھی پوری ہوگئی اور وہ فروری ۱۷۸۵ء میں لندن چلا گیا۔ ان مشہور واقعات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے اس کی گورنری کے زمانے میں پنڈتوں کی ایک جماعت ہندو قوانین کا پہلا مجموعہ مرتب کرنے پر مامور ہوئی اور مسلمانوں کے مدرسۂ کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ نیز ایشیاٹک سوسائٹی کا افتتاح ہوا جس نے ہندوستان کے قدیم علوم تاریخ کے متعلق نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

انگلستان میں اول اول ہیس ٹنگز کی بہت قدر دانی ہوئی کیوں کہ اس میں شک نہیں کہ اس نے بڑے نازک وقت میں عنان حکومت ہاتھ میں لی تھی اور کمپنی کی قوت کو کہیں زیادہ مستحکم اور مقبوضات کو بہت وسیع کر گیا تھا۔ لیکن گو اس پر خود غرضی کا الزام نہ ہو تاہم کمپنی کی یہ خدمات اس نے جس طرح انجام دیں اس کے بہت سے پہلو قابل اعتراض ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷۸۸ء میں پارلیمنٹ نے ان الزامات کی تحقیقات کی اور اس میں برک شیریڈن جیسے نامور مقرروں نے ہیس ٹنگز پر ظلم و دغابازی فریب و رشوت ستانی کے سنگین الزام قائم کئے۔ انگلستان میں اس مقدمہ کا غلغلہ مچ گیا اور اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہاں کے لوگوں کی توجہ ہندوستان کے معاملات پر مبذول ہوگئی۔ پارلیمنٹ نے ہیس ٹنگز کو صاف صاف ثبوت نہ ملنے کے باعث الزامات سے بری کر دیا اور چونکہ اس کی ساری کمائی اس مقدمے کی نذر ہوگئی تھی لہذا کمپنی نے از راہ قدرشناسی اس کا چار ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کیا جو مرتے دم تک اسے ملتا رہا۔

پٹ کا قانون ہندوستان

وارن ہیسٹنگز کے عہد میں جو قبیح بدعنوانیاں ہوئی تھیں اور جو ہم ابھی پڑھ کر آئے ہیں تو اس سے انگلستان کے انصاف پرست لوگ بہت متاثر ہوئے اور اسی وجہ سے پارلیمنٹ نے ہیسٹنگز سے سخت باز پرس کی جس کا سلسلہ سات سال تک چلتا رہا۔ اگرچہ اس باز پرس سے ہیسٹنگز پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا ہم انگلستان کے حکام نے یہ محسوس کیا کہ ۱۷۷۳ء کا بنایا ہوا قانون تنظیمی بالکل بیفائدہ ہے اور اس طرح ہندوستان کے نظام حکومت میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں پٹ انگلستان کے وزیر اعظم تھے انھوں نے ۱۷۸۴ء میں ہندوستان کے لئے ایک نیا قانون بنایا جو خود ان کے نام سے پٹ کا قانون ہندوستان کہلاتا ہے۔ اگرچہ یہ قانون اس وقت بنا تھا جبکہ ہیسٹنگز ہندوستان میں ہی تھا لیکن اس کا نفاذ لارڈ کارنوالس نے کیا جو ۱۷۸۶ء میں ہیسٹنگز کا جانشین مقرر ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ اس قانون کی رو سے مجلس کلکتہ کے ارکان کی تعداد صرف تین کر دی گئی اور سرکاری طور پر انگلستان میں ایک ہیئۂ نظارت (Boord of Control) قائم کیا گیا جس میں ۶ رکن اور ایک میر مجلس ہوتا تھا۔ میر مجلس کو قریب قریب وہی اختیارات دیئے گئے تھے۔ جو آج کل وزیر ہند کو حاصل ہیں۔ ہندوستانی مقبوضات کے اندرونی معاملات میں بھی نظمائے کمپنی کے اختیارات کم کر دئیے تھے۔ اب وہ بادشاہ کی منظوری حاصل کئے بغیر اعلیٰ حاکم یعنے گورنر جنرل اور کمانڈر ان چیف یعنی سپہ سالار کا تقرر نہیں کر سکتے تھے۔ یوں بھی بادشاہ یعنی حکومت انگلستان کو حق تھا کہ کمپنی کے جس ملازم کو چاہئے عہدے سے معزول کر دے اور صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں مزید فتوحات یا علاقے لینے کے ساز باز میں لگے رہنا انگریزی قوم کی منشا اور شرافت اور حکمت عملی سب کے خلاف ہے۔ چنانچہ اسی قانون کی رو سے گورنر جنرل اور اس کی کونسل کو ممانعت کر دی گئی تھی کہ شدید ضرورت کے سوا ہندوستان کی کسی ریاست یا والی ریاست کے ساتھ نہ اعلان جنگ کریں نہ کسی قسم کا سیاسی معاہدہ۔

مختصر یہ کہ ان قوانین سے ہندوستان میں انگریزی حکومت ایک اصول پر آگئی اور گو پارلیمنٹ نے براہ راست ہندوستان کا ملکی انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تاہم اعلیٰ عہدہ داروں کا انتخاب اس کی نگرانی میں آگیا جس کے معنی یہ تھے کہ اب کمپنی معمولی سوداگروں کے بجائے صرف ایسے لوگوں کو مقرر کر سکے گی جو ملک میں انتظامی قابلیت کے جوہر دکھا چکے ہوں۔ چنانچہ کارنوالس کا گورنر جنرل مقرر ہونا اس بات کی عملی تصدیق ہے۔ اس لئے کہ اس شخص نے کبھی کسی تجارتی کمپنی کی ملازمت نہیں کی تھی۔

اس قانون کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ چھوٹے عہدوں کے واسطے بھی کمپنی کے نظما ایسے لوگوں کو

پسند کرنے لگے جو ذاتی اوصاف یا تعلیم و تربیت میں کچھ نہ کچھ ممتاز ہوتے اور حکمرانی کے فرائض کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ بعد کو چل کر ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

لارڈ کارنوالس سنہ ۱۷۸۶ئ تا سنہ ۱۷۹۳ئ

ہیسٹنگز کے جانے کے چند ماہ بعد لارڈ کارنوالس کمپنی کے مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر ہو کر کلکتے آیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس منصب پر کمپنی کی طرف سے انگلستان کا ایک نامی شخص مقرر ہوا جو پہلے کمپنی کا ملازم نہیں رہا تھا اور نہ اب تک ہندوستان میں بڑے سے بڑے عہدوں پر وہی لوگ مقرر کر دئے جاتے تھے جو پہلے سے یہاں ملازم رہے ہوں۔ کارنوالس امریکہ کی جنگ "استحصال آزادی" میں لڑ چکا تھا اور سلطنت برطانیہ کا رکن مانا جاتا تھا اگر اسے جنگ میں ناکامی نصیب ہوئی تھی۔ وہ آزاد مزاج پختہ رائے کا آدمی تھا پٹ کے قانون ہندوستان کی رو سے اس کے اختیارات بڑھ گئے اور خاص خاص معاملات میں اسے کونسل کی بغیر رضامندی کارروائی کرنے کا حق مل گیا نیز جنگی معاملات میں گورنر جنرل کی حیثیت اعلیٰ سپہ سالار کی ہو گئی اور فوج کے لڑانے کا اختیار اس کو دے دیا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ قانون ہند کی اس ترمیم کے زمانے میں انگلستان کے لوگ ہیسٹنگز کی ہندوستان کی لڑائیوں سے نہایت ناخوش تھے اور اس لئے ایک ضروری دفعہ یہ بڑھا دی گئی تھی کہ آئندہ سے کسی ہندوستانی رئیس کے ساتھ جنگی اتحاد (خواہ محض مدافعت کی غرض سے ہو) نہ کرے اور نہ مجلس نظارت (بورڈ اوف کن ٹرول) کی منظوری لئے بغیر کسی کے خلاف اعلان جنگ کرے "عدم مداخلت" کی یہ حکمت عملی کارنوالس کو بھی پسند تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اپنے زمانے میں جہاں تک ممکن ہو ملکی انتظامات کی اصلاح و درستی کرے اس کام کے لئے اپنی عمدہ صفات کے باعث وہ نہایت موزوں تھا۔ اور اس کے کلکتے پہنچتے ہی وہاں کے انگریز باشندوں کے اخلاق و آداب میں نمایاں فرق پڑ گیا۔

بنگالے کا دوامی بندوبست

کارنوالس کے انتظامات میں بنگالے کا دوامی بندوبست سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس وقت کمپنی نے بنگالے کی دیوانی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت وہاں مالگزاری کا طریقہ یہ تھا کہ زمینداروں کو سرکار کی طرف سے ٹھیکہ مل جاتا اور وہ کاشتکاروں سے سرکاری مالیہ تحصیل کر کے مقررہ رقم خزانے میں داخل

کر دیتے تھے اور باقی جو روپیہ وصول ہوتا وہ ان کا حق ہوتا تھا بہت سے ضلعوں میں زمینداروں کا یہ حق موروثی ہو گیا تھا اور ان کی جماعت جاگیرداروں کا ایک معزز گروہ سمجھی جاتی تھی۔ کمپنی نے زیادہ روپیہ وصول کرنے کے لالچ میں اس موروثی حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک ایک دو دو سال کے لئے گاؤں ان کو ٹھیکے پر دینے لگی جو سب سے زیادہ روپیہ دینے کا اقرار کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ادنیٰ درجہ کے لوگ بڑھ بڑھ کے بولی بولتے اور ٹھیکہ اپنے نام کرا لیتے اور وقت پر کمپنی کا مطالبہ پورا نہ کر سکتے تھے اس طرح ادھر تو قدیم زمینداروں میں افلاس پھیل گیا اور ادھر کمپنی کو بھی مجموعی طور پر خسارہ رہنے لگا غرض اس طریقے میں تبدیلی کی ضرورت پڑی اور سر جان شور اس کی تحقیقات پر مامور ہوا اس نے بھی تحقیق و غور کے بعد یہی رائے قایم کی کہ کمپنی کو اس طرح ہر سال ٹھیکے دینے میں نقصان رہے گا۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے طریق کے مطابق زمینداروں ہی کے ساتھ اول دس سال کے لئے معاملہ کر لیا جائے، لیکن لارڈ کارنوالس کی رائے دوسری تھی اور اس کا قول یہ تھا کہ اگر مالیہ ایک مرتبہ تشخیص کر کے دوامی ٹھیکہ دے دیا جائے تو زمیندار اور کاشتکار دونوں کا فایدہ ہے۔ وہ جب دیکھیں گے کہ زمین کی حیثیت میں ترقی دینے سے ان کی مالگزاری میں اضافہ نہیں ہوتا تو بڑے اطمینان سے اسے ترقی دینے کی کوشش کریں گے اور ان کی خوش حالی سے سرکار کو بھی فایدہ پہونچے گا۔ چنانچہ اس کی تحریک پر پارلیمنٹ نے بھی اس طریقہ کو ترجیح دی اور بنگالے میں "دوامی بندوبست" جاری ہو گیا جس نے وہاں کے زمینداروں کو مستقل طور پر اپنے مواضع کا جاگیردار بنا دیا (۱۷۹۳ء) اور گو سرکاری مالیہ بہت بڑھا کے تشخیص کیا گیا تھا۔ تاہم زمینداروں کو اپنے جاگیروں کے ترقی دینے کا موقع مل گیا اور ملک میں حقیقی فارغ البالی کی صورت پیدا ہوئی "دوامی بندوبست" کے مخالفین اس میں کئی نقص بتاتے ہیں جن میں سب سے بڑا یہ ہے کہ سرکاری ضرورتیں آئے دن بڑھتی رہتی ہیں اور اس کے لئے مالگزاری میں بھی اضافہ کی گنجایش رہنی چاہئے۔ لیکن یاد رہے کہ اگر اہل ملک دولت مند ہوں گے تو اول تو وہ اپنی قومی ضروریات اور مصارف کا بار خود ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ دوسرے زمینداروں کی خوش حالی سے ملکی تجارت

اور صنعت و حرفت کو جو فروغ حاصل ہو گا وہ سرکاری عہدہ داروں کے دولتمند ہونے سے ممکن نہیں ہے اس طرح درحقیقت زمینداروں کی خوش حالی سے سرکار کا کوئی نقصان نہیں ہے اور یوں بھی سرکار کا اصلی اور پہلا فرض تو یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پس پشت ڈال دے اور جہاں تک ممکن ہو رفاہ عام کی کوشش کرے کہ اس کی رعایا خوش دلی اور آسودہ حالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے اور اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ دوامی بندوبست کی بدولت بنگالے کے لوگ ہندوستان کے دوسرے صوبے والوں کی نسبت زیادہ آسودہ حال ہیں۔ پھر اسی آسودگی کی بدولت ان میں تعلیم و تہذیب نے جو ترقی کی اور ان کی آبادی جس تیزی سے بڑھی وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ہے البتہ کارنوالس کے قانون میں یہ کسر رہ گئی تھی کہ اول تو اس نے زمینداروں کی کاشتکاروں سے زیادہ ستانی کا کوئی تدارک نہیں کیا تھا۔ دوسرے زمینداروں کے سودخوار ساہوکاروں کے پنجے میں پھنس کر تباہ ہونے کی روک تھام نہیں ہوئی تھی ؛

عدالتی اصلاح

اسی سال کارنوالس نے مختلف عدالتوں کے اختیارات کی بھی حد بندی کی اور مال کی عدالتیں دیوانی عدالتوں سے بالکل علیحدہ کر دیں اس نے ہر ضلع میں ایک دیوانی عدالت قایم کی اور کلکتے ڈھاکے، پٹنے اور مرشد آباد میں چار بڑی عدالتیں بنائیں جن کے آخری مرافعے "صدر دیوانی عدالت کلکتہ" سماعت کرتی تھی۔ مذکورۂ بالا چار بڑے شہروں کے ارکان عدالت کا ایک کام یہ تھا کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں دورہ کرتے رہیں اور ہر ضلع کے مستقر پر کچھ عرصے رہکر وہاں کے فوجداری مقدمات کا فیصلہ کریں فوجداری مقدمات کی صدر عدالت بھی کلکتے میں علیحدہ قایم کر دی گئی تھی اور اسے "صدر نظامت عدالت" کہتے تھے۔ اس میں خود گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان شامل تھے اور ایک صدر قاضی اور دو مفتی مقدمات کے فیصلے میں انھیں مدد دیتے تھے گویا نائب دیوان کا عہدہ جس کے سپرد فوجداری مقدمات تھے اڑا دیا گیا۔ اسی طرح زمینداروں سے تمام عدالتی اور انتظامی اختیارات لے لئے اور ہر ضلع کی عدالت کے ماتحت ایک داروغہ پولیس اور چند برقنداز مقرر کر دیے کہ دیہات میں انتظام رکھیں ؛ بہ الفاظ دیگر اب کمپنی

صحیح معنی میں اپنے مقبوضات کی حکمراں بن گئی۔ مالگزاری عدالت اور پولیس کے سررشتے براہ راست اس کے ماتحت آ گئے تاہم عدالتوں میں ابھی تک قانون اسلامی ہی پر عمل درآمد ہوتا رہا اور ہر ضلع کی عدالت میں ایک قاضی ضرور ہوتا تھا کہ انفصال مقدمات مشورہ دے:

کارنوالس کی ایک اور اصلاح بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اسی نے کوشش کر کے نظمائے کمپنی سے ملازمین کمپنی کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا اور یہ اس رشوت ستانی' نجی کی تجارت اور نذرانے وصول کرنے کا علاج تھا جس کی بدولت کمپنی سخت بدنام ہو رہی تھی:

تیسری جنگ میسور ۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء

مگر کارنوالس کا زمانہ جنگ و جدال سے خالی نہیں رہا۔ اگرچہ وہ یہ قول قرار کر کے آیا تھا کہ جدید قانون کے مطابق ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا لیکن سلطان میسور کے ساتھ اس نے جو کارروائیاں کیں وہ ایسی زبردستی تھی کہ شدید ضرورت کے موقع کے سوا (اس موقع پر) ان کے جواز کی کوئی تاویل بہ مشکل کی جا سکتی تھی طرفہ تر یہ کہ اپنی مطلب براری کے لئے جو وسائل اس نے اختیار کئے ان سے کامیابی کی امید بھی مشتبہ تھی: جولائی ۱۷۸۹ء میں اس گورنر جنرل نے جو خط نواب نظام الملک کو بھیجا۔ اس میں دشمنوں کے خلاف نواب موصوف کو مدد دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور فحوائے کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ لکھنے والا سلطان میسور کو انھی دشمنوں میں شامل کرتا ہے:[1]

اگر اس قسم کی حرکتوں نے سلطان میسور کو انگریزوں کا مخالف اور فرانسیسیوں کا دوست بنا دیا تو یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی اور جب سلطان موصوف نے بعض تنازعات کی بنا پر راجہ ٹراونکور پر حملہ کیا جسے انگریزوں نے اپنی حمایت میں لے رکھا تھا تو جنگ کے چھڑنے میں کچھ کسر نہیں رہی؛ درحقیقت کارنوالس نے اندر ہی اندر مرہٹوں کو اور نواب نظام الملک کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ

[1] کین۔ جلد اول صفحہ ۲۳۸:

تینوں اتحادی میسور کا ملک فتح کر کے آپس میں تقسیم کر لیں گے (سنہ ۱۷۹۰ء) اور اسی تجویز کے بعد اس نے انگریز سپہ سالار جنرل میڈوز کو میسور پر فوج کشی کرنے کا حکم دے دیا۔ (فروری سنہ ۱۷۹۰ء)

اس جنگ کے تفصیلی حالات لکھنے باعث طوالت ہوں گے۔ کارنوالس خود میدان میں پہنچ گیا تھا اور گو اُسے پہلی مرتبہ سرنگاپٹم کے سامنے سے اپنی بھاری توپیں گاڑ کے بہت بری طرح پسپا ہونا پڑا تاہم آخر میں اتحادیوں نے اپنے اکیلے حریف کو مغلوب کر لیا اور اس نے تین کرور روپیہ اور کچھ علاقے دیکر اپنی جان بچائی۔ اتحادیوں نے اس علاقے کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ (سنہ ۱۷۹۲ء)

سر جان شور سنہ ۱۷۹۳ء تا سنہ ۱۷۹۸ء

کارنوالس کی میعاد ختم ہوئی تو سر جان شور اُس کا جانشین منتخب ہوا۔ وہ کمپنی کا پرانا ملازم اور "عدم مداخلت" کے اصول کا حامی تھا۔ لیکن جب نواب نظام الملک اور مرہٹوں کی جنگ چھڑی تو سوال پیدا ہوا کہ آیا پچھلے معاہدوں کی رو سے کمپنی کا یہ فرض ہے یا نہیں کہ نظام الملک کی اعانت کرے؛ مگر سر جان شور کا فیصلہ سننے سے پہلے ہمیں مجمل طور پر اس جنگ کے اسباب بیان کر دینے چاہئیں:۔

عہد نامۂ سلبی کی گفت و شنید کے دوران میں انگریزوں نے مادھوجی سندھیا کو ایک خود مختار فرمانروا تسلیم کر لیا تھا اور یہ ہوشیار سردار اس وقت سے برابر شمال میں اپنی قوت بڑھاتا رہا تھا۔ اس نے پیادہ اور توپ خانے کی ایک طاقتور فوج مرتب کر لی تھی جس کو جدید اصول پر قواعد جنگ سکھائے تھے اور بہت سے فرانسیسی افسر اس کی سرکار میں ملازم تھے؛ سندھیا کا یہ فروغ دیکھ کر خود اس کے ہم قوم یعنی پونہ کے مرہٹہ سردار حسد کرنے لگے تھے لیکن جب اُسے پائے تخت دہلی سے فرار ہونا پڑا جہاں اس نے بادشاہ کے مزاج میں بہت کچھ رسوخ حاصل کر لیا تھا تو اس وقت نانا فرنویس نے اسے کمک بھیجی اور ہلکر کو بھی اعانت پر آمادہ کیا۔ ان امدادی فوجوں کو لے کر سندھیا نے دوبارہ دہلی پر فوج کشی کی اور رہیلوں کو دفع کر کے پھر وہاں کے دربار پر حاوی ہو گیا؛ پھر اس نے اپنے رقیب نانا فرنویس کی طرف توجہ کی اور پونا جا کر اپنی فوج کی زور سے مادھوراؤ (ثانی) کو جو اب سن بلوغ کو پہنچ گیا تھا

باقاعدہ گدی پر بٹھا دیا اور اعلان کر دیا کہ آیندہ سے تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں رہیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اس بہانے سے نانا فرنویس کو الگ کر کے خود ریاست کا مالک بن جائے۔ مگر موت نے اس کو زیادہ بڑھنے کی مہلت نہ دی اور ۱۷۹۴ء میں اس کے مرتے ہی پھر پونا کی ریاست نانا فرنویس کے ہاتھ میں آگئی۔ یہی وقت تھا جب کہ مرہٹوں نے نواب نظام الملک سے اپنی چوتھ کی بقایا طلب کی اور نواب موصوف نے معاہدے کی بنا پر انگریزوں سے مدد مانگی۔

اس موقع پر سرجان شور کی "عدم مداخلت" نے کام دیا اور اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ مرہٹہ رئیسوں نے جنگ کی تیاری کی اور تاریخ میں آخری مرتبہ اُن کے سب سرداروں نے متحد ہو کے حیدر آباد پر یورش کی۔ کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ نواب کی فوج میں بعض افواہوں نے کھلبلی ڈال دی اور صبح ہوتے ہوتے قریب قریب تمام سپاہی فرار ہو گئے۔ نواب کو ہٹ کر کھرلا کے قلعے میں پناہ لینی پڑی جسے مرہٹوں کے ٹڈی دل نے آ کے محصور کر لیا۔ چونکہ کسی مدد کی امید باقی نہ تھی اور بہت کم رفیق ساتھ رہ گئے تھے، لہٰذا نواب نظام الملک کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی اور تین کروڑ روپیہ اور وہ ضلاع جنھیں مرہٹوں نے نواب صلابت جنگ کے عہد میں لے لیا تھا؛ حوالے کرنے پڑے۔

مرہٹہ جتھے کا زوال

اس فتح نے نانا فرنویس کے اقتدار کو انتہائے عروج پر پہنچا دیا لیکن اب نوجوان پیشوا مادھو راؤ ثانی کو اس کی اتالیقی سخت ناگوار تھی اور اودھر نانا فرنویس، رگھوناتھ کے بیٹے (باجی راؤ) سے پیشوا کی دوستی کا حال سن کر کھٹک گیا تھا باجی راؤ اس وقت حکومت پونا کی قید میں تھا۔ اور جب نانا فرنویس کو ان دونوں کی باہمی ملاقات کا حال معلوم ہوا تو اس نے پیشوا پر بھی نگہبان مقرر کر دیے اور باجی راؤ کی نگرانی بڑھا دی۔ مادھو راؤ اس بے بسی سے تنگ آگیا اور اپنے محل کی چھت پر سے کود کے جان پر کھیل گیا۔ اس واقعے نے مرہٹوں میں سازش د

رقابت کو تازہ کر دیا اور ایک جماعت باجی راؤ کی حامی ہو گئی اور دوسرے نے اُس کے بھائی جمناجی کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا؛ مگر آخر میں نانا فرنویس اپنے حریفوں پر غالب آیا اور دولت راؤ سندھیا کی مدد سے باجی راؤ (ثانی) کو پیشوا بنانے میں کامیاب ہو گیا، (دسمبر ۱۷۹۶ء)۔

باجی راؤ اپنے پیش رو سے بھی زیادہ آزاد مزاج تھا۔ اور اس نے سب سے پہلی کوشش یہی کی کہ نانا فرنویس اور سندھیا کو آپس میں لڑا دیا۔ نوجوان سندھیا کو بوڑھے فرنویس کے گرفتار کرنے میں کچھ دقت پیش نہ آئی اور پونا پر اس کا تسلط ہو گیا لیکن اس تسلط سے دولت راؤ نے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسے روپے کی سخت ضرورت تھی اور پیشوا کا خزانہ خالی تھا۔ پس اس نے حکم دیا کہ پونا کے سوداگر ساہوکار، رئیس یا عہدہ دار جس کے پاس روپیہ یا زیور ملے جبراً چھین لیا جائے اس کے دیوان شرزے راؤ گھاٹگے نے اس حکم کی تعمیل کی اور پونا کا کوئی دولتمند شخص نہ ہوگا جو اس کے مظالم سے محفوظ رہا۔

مرہٹوں کی ریاست میں زوال کے آثار اسی وقت سے پیدا ہو گئے تھے جب سے کہ عنان حکومت پیشوا کے ہاتھ سے نکل کر اس کے امیر و وزیر کے قبضے میں گئی۔ ان تازہ رقابتوں اور باہمی عداوتوں نے اُسے اور بھی کمزور کر دیا۔ بڑے بڑے مرہٹہ رئیسوں میں اندرونی فساد بپا ہو گئے اور کہنا چاہئے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اُن کے مشہور جتھے کا نام ہی نام رہ گیا۔ ایک بڑی کمزوری یہ پیدا ہوئی کہ مرہٹہ ریاستوں کی فوج میں اب زیادہ تر عرب، پٹھان یا راجپوت سپاہی نظر آتے تھے جن کے سردار بالعموم غیر قوم کے ہوتے تھے۔ تہذیب و تمدن آئین و قوانین یا دماغی قابلیت کے اعتبار سے مرہٹوں کو کوئی فوقیت حاصل نہیں تھی اور انکی قوت کا انحصار اول سے جنگ جوئی اور ہمسایوں کی کمزوری پر رہا تھا لیکن دولت اور جاگیرداری کے مزوں نے انھیں اب میدان جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل بھی نہ رکھا تھا اور اسی لئے ان کی حکومت کا زوال یقینی نظر آنے لگا تھا۔

سرجان شور کے عہد حکومت کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور نواب وزیر علیخاں ان کے

جانشین ہوئے۔ نواب موصوف کے نسب میں لوگوں کو شک تھا اور چونکہ ریاست اودھ کی فوجی قوت کچھ بھی نہ رہی تھی" لہٰذا سر جان شور بھی جو عدم مداخلت کا بڑا حامی تھا اس موقع پر دخل دینے سے باز نہ رہا۔ اس نے نواب وزیر علی کو معزول کر کے آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علیخاں کو مسندنشین کرا دیا اور ایک نئے معاہدے پر دستخط کرا لئے جس کی رو سے الٰہ آباد کا قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور فوجی مصارف کے نام سے جو روپیہ ریاست اودھ ادا کرتی تھی اُسے بھی بڑھا کر ۷۶ لاکھ سالانہ کر دیا گیا۔ نیز قرار پایا کہ انگریزی امدادی فوج کی تعداد جو اودھ میں رہتی تھی دس ہزار سے زیادہ بڑھنے نہ پائے گی ؎

باب سوم

کمپنی کی سیادت تمام ہندوستان پر

جنوب کی طاقتور حکومتیں کچھ اندرونی خانہ جنگی اور کچھ آپس کی لڑائیوں سے کمزور ہو گئی تھیں۔ شمالی ہند کی کسی طاقت میں دم باقی نہ تھا۔ کمپنی کے لئے اقتدار حاصل کرنے کا اس سے بہتر وقت نہ مل سکتا تھا اور جان شور کا جو شخص جانشین منتخب ہو کر آیا اتفاق سے وہ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔

ولزلی
۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء

نیا گورنر جنرل لارڈ مارننگ ٹن جو مارکوئیس اوف ولزلی کے خطاب سے زیادہ مشہور رہے، انگلستان کے طبقۂ اعلیٰ کا رکن تھا اس کی ادبی قابلیت، شعر گوئی اور فصیح تقریریں ہم وطنوں سے خراج تحسین وصول کر چکی تھیں۔ ہندوستان پہنچتے ہی اس نے قصد کر لیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزوں کی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع و مستحکم کر دیا جائے کہ یہاں کوئی اس کا حریف و مدمقابل نہ رہے اور جو دیسی ریاستیں باقی رہیں وہ اس کی سیادت یا بالادستی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

"عہد معاونت"

عدم مداخلت کے اصول کو چھوڑ کے اس نئے خیال کے مطابق ولزلی نے دیسی ریاستوں کے ساتھ جو طریق عمل

اختیار کیا، اسے (Subsidiary System) "عہد معاونت" کا اصول کہتے ہیں جس کے معنی یہ تھے کہ ہندوستان کی مختلف ریاستیں معاون اور کسی حد تک زبردست بنا کے کمپنی کے ساتھ متحد کرلی جائیں اور وہ سب کمپنی کی سیادت یا برتری کو تسلیم کریں۔ اس قسم کے معاہدے کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ کمپنی اتحاد کرنے والی ریاست کو بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت سے بچانے کا ذمہ لیتی تھی اور گورنمیں اپنے اندرونی معاملات میں بالکل خودمختار و آزاد ہوتا تھا لیکن اسے اپنے علاقے میں کچھ انگریزی امدادی فوج اور ایک انگریزی وکیل یا رزیڈنٹ کو رکھنا پڑتا تھا اور اس فوج کے مصارف اس کے ذمہ ہوتے تھے بلکہ اپنے کسی علاقے کی مالگزاری کو اس کام کے لئے مخصوص کردینا پڑتا تھا۔ نیز یہ عہد کرنا پڑتا تھا کہ کمپنی کی بغیر اجازت کسی دوسری حکومت سے تعلقات نہ رکھے گا نہ انگریزوں کے سوائے کسی دوسری فرنگی قوم کے آدمی کو اپنے ہاں جگہ دے گا۔

میسور کی چوتھی لڑائی

ایسے شخص کا، جس نے سب کو زیر کرنے کی ٹھان لی ہو بہت جلد اپنے ہمسایوں سے الجھنا ناگزیر تھا۔ اور ولزلی نے سب سے پہلے جنوبی دکن کی طرف توجہ کی جہاں فرانسیسی لوگ سلطان میسور کے ساتھ ساز باز میں مصروف تھے۔

انھی دنوں فرانس کے عظیم الشان و خونریز انقلاب نے اہل فرانس کے دل میں مساوات و آزادی کی آگ بھڑکا دی تھی اور ان کے سپاہیانہ جوش سے کام لینے کے لئے قدرت نے نپولین بوناپارٹ جیسے غیر معمولی سپہ سالار کو میدان میں لاکھڑا کیا تھا، انقلاب فرانس کے حالات یا نپولین کے حیرت انگیز جنگی کارناموں سے ہماری کتاب کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن اُسی زمانے میں نپولین ملک مصر میں پہنچ گیا تھا کہ بلاد ایشیا پر فرانسیسی پھریرا اڑائے اور ہندوستان سے انگریزی حکومت کو خارج کردے۔ ہندوستان میں یہ افواہیں گشت کرنے لگی تھیں کہ فرانسیسی عنقریب اس ملک پر حملہ کریں گے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے فرانسیسی افسر میسور و دکن میں پہنچ گئے تھے۔ فرانس کی نئی جمہوری حکومت فتح علی سلطان سے معاہدۂ اتحاد کی

گفتگو کر رہی تھی اور ادھر سلطان موصوف کو بھی پچھلی شکست کا قلق ابھی تک تازہ تھا۔ اپنی فوجی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اب اس نے محکمۂ بحری بھی قایم کیا تھا کہ منگلور کی بندرگاہ پر ایک جنگی بیڑا تیار کرائے۔ نظام حکومت اور آئین و قوانین میں اس نے بہت کچھ اصلاحیں کی تھیں اور سلطنت میسور پہلے کی نسبت کم علاقے رہ جانے کے باوجود نہایت منظم اور مستحکم طاقت ہوتی جاتی تھی۔ اسی اثنا میں ایک فرانسیسی ناخدا اپنے جہاز کی مرمت کرنے منگلور میں لنگر انداز ہوا۔ اور اس نے فتح علی سلطان سے فرانسیسی اعانت کے بہت کچھ وعدے کئے پھر جزیرۂ موری شس سے کوئی ایک سو فرانسیسی سپاہی بھی بھرتی کرکے لایا جنھوں نے سرنگاپٹم میں محبان انقلاب کی انجمن قایم کی اور آزادی کا درخت نصب کیا۔ سلطان ان باتوں میں خوشی سے حصہ لیتا تھا اور جمہوریۂ فرانس کا "شہری" بن گیا تھا لیکن اسے ان فرانسیسیوں سے کسی بڑی امداد کی امید نہ تھی اور اسی لئے وہ درحقیقت اپنی قوت بازو کے بل پر جنگی تیاریاں کر رہا تھا کہ اپنے دشمنوں سے سلطنت کی مدافعت کر سکے۔

چونکہ سلطان میسور سے تمام ہمسایہ طاقتیں خائف رہتی تھیں لہذا ولزلی نے پہلے اسی ریاست کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی اور نواب نظام الملک کے ساتھ پھر اتحاد کی تجدید کی۔ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ جب میسور کی تیسری لڑائی کے بعد مرہٹوں نے نواب موصوف پر حملہ کیا تو سرجان شور نے "عدم مداخلت" کے عذر پر اپنے قدیم حلیف کو کوئی مدد نہیں دی اور کھرڈلا میں محصور ہو کر نواب نظام الملک کو بہت نقصان کے ساتھ مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ اس نقصان کی بہت کچھ تلافی تو نواب موصوف نے چند ہی سال میں کر لی تھی اور جتنا علاقہ دیا تھا اس کا بڑا حصہ پھر مرہٹوں سے چھین لیا تھا۔ تاہم انگریزوں کا عین وقت پر اعانت سے انکار کر دینا بہ آسانی فراموش ہونے والی بات نہ تھی اور نواب نظام الملک کو اب اُن سے کسی دوستی کی توقع نہ رہی تھی۔ انھی اسباب سے ریاست حیدرآباد میں بھی فرانسیسی افسروں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور ایک بڑی فوج اسی قوم کے فوجی سرداروں کے ماتحت جدید قواعد جنگ کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ولزلی کو جنگ میسور میں مدد لینے کے علاوہ فرانسیسیوں کا رسوخ بھی گھٹانا ضروری معلوم ہوا اور اس نے ایک ایسی چال چلی کہ حیدرآباد کی باقاعدہ فوج بے لڑے بھڑے

ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی اور نواب نظام الملک کو انگریزوں کے حسب منشا کمپنی کیساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔

جب ادھر سے اطمینان ہوگیا تو ولزلی نے سلطان میسور سے جواب طلب کیا کہ وہ موری شش کے فرانسیسی گورنر سے کیوں رسل ورسائل کر رہا ہے؟ فتح علی سلطان انگریزوں کا ماتحت نہ تھا کہ ایسے سوالات کا جواب دینا ضروری سمجھتا اس نے ولزلی کے خط پر کوئی اعتنا نہ کی اور انگریزوں نے اسی بنیاد پر مشرق و مغرب دونوں طرف سے میسور پر حملہ کیا۔ انگریزوں کی اتنی بڑی فوج پہلے کبھی ہندوستان کے میدانوں میں لڑنے کے لئے نہ اتری تھی جتنی کہ اس وقت فراہم ہوئی اور فوجی سردار بھی بہت اچھے ملے تھے جن میں ولزلی کا بھائی بھی شامل ہے جو بعد میں "ڈیوک اوف ولنگٹن" کے خطاب سے مشہور ہوا۔

ان فوجوں نے سلطان میسور کو اپنے پائے تخت میں محصور کر لیا جہاں اس نے شیروں کی طرح لڑ کر جان دی اور آج بھی "سلطان شہید" کے محترم نام سے اہل میسور اس کے مقبرے پر پھول چڑھاتے ہیں۔ قلعہ فتح ہوتے ہی انگریزوں نے میسور کے قدیم حکمراں خاندان کے ایک لڑکے کرشنا راجہ کو مسند نشیں کرا دیا اور اس کی نابالغی کے زمانہ میں چند ارکین کی ایک مجلس نیابت بنا دی جو صغیر سن راجہ کی طرف سے ریاست کا انتظام کرتی تھی نواب نظام الملک کے اتحاد و امداد کے صلے میں چند پرگنے ریاست حیدرآباد کو دئے گئے اور کوئم بتور وغیرہ مغربی ساحل کے اضلاع پر کمپنی قابض ہوگئی۔ پیشوا اور اس کی حکومت خانگی جھگڑوں میں مصروف تھی انھوں نے اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا وہ سوچتے ہی رہے کہ کس کی طرف شریک ہوں اور وہاں جنگ کا خاتمہ ہوگیا (۱۷۹۹ء) مارنگٹن کو اسی فتح کے صلے میں "مارکوئیس آف ولزلی" کا خطاب ملا۔

کرناٹک اور اضلاع دکن کا الحاق

اگرچہ نواب نظام الملک کے ساتھ جنگ شروع ہونے سے پہلے امداد دوستی کا عہد و پیمان کیا گیا تھا لیکن جب فرانسیسیوں کا اثر زائل ہوگیا اور ادھر میسور کی خطرناک قوت مٹ گئی تو ۱۸۰۰ء میں ولزلی نے نواب نظام الملک سے ایک نئے معاہدے پر دستخط کرالئے جس کی شرطیں یہ تھیں کہ انگریزی فوج متعینہ ریاست حیدرآباد کی

تعداد بڑھادی جائے گی اور اس کے مصارف کے لئے تمام وہ علاقہ کمپنی کے حوالے کر دیا جائے گا جو کہ ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء میں سلطنت میسور کی تقسیم کے وقت نواب نظام الملک کو ملا تھا۔ گویا نواب موصوف کو اپنے جنوبی حریف کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے سے جو کچھ علاقہ حاصل ہوا تھا وہ سب ولزلی نے لے لیا۔

پھر اس نے کرناٹک یا ریاست ارکاٹ کی طرف توجہ کی یہاں کا نواب مدت سے کمپنی کے زیر اثر تھا اور یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ میسور کی لڑائیوں میں کمپنی نے کچھ عرصے کے واسطے اس کے تمام علاقے کی مالگزاری بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ یہ بھی کمپنی کی مہربانی تھی کہ محمد علی کو خطاب نوابی اور اندرونی اختیارات حاصل تھے ورنہ اس بیچارے کی اصلی قوت کبھی کی سلب ہو چکی تھی! انگریزوں کے اس قدیم حلیف نے ۱۷۹۵ء میں وفات پائی۔ اور اس کا بیٹا نواب عمدۃ الامرا باپ کا جانشین ہوا۔

یہ اپنے باپ کی طرح مُسرف اور قرضہ لینے میں بیباک نہ تھا اور نہ اس کے مدار اس کے انگریزوں سے ایسے دوستانہ تعلقات تھے۔ سلطنت میسور سے جب چوتھی مرتبہ جنگ چھڑی تو اس پر یہ الزامات بھی وارد کئے گئے کہ وہ فتح علی سلطان سے ساز باز رکھتا ہے۔ بایں ہمہ نواب عمدۃ الامرا کی زندگی تک نوابی کا بھرم بنا رہا۔ مگر ولزلی قطعی ارادہ کر چکا تھا کہ اس کے تمام اختیارات چھین لئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء میں اس نے وفات پائی تو گورنر جنرل نے اس کے بیٹے علی حسین کو نوابی کا خطاب اور سالانہ وظیفے دے کر چاہا کہ وہ ریاست کے معاملات اور تمام حقوق و اختیارات سے دست بردار ہو جائے! علی حسین میں مقابلے کی قوت نہ تھی لیکن اس نے اس قسم کا عہد و پیمان کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور ولزلی نے اُسے الگ کر کے اس کے ایک رشتہ دار عظیم الدولہ کو اسی شرط پر رضامند کر لیا۔ یعنی کرناٹک کا نواب اپنا راج پاٹ چھوڑ کے انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا اور یہ علاقہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۸۰۱ء۔

تنجور کی ریاست پر بھی یہی گزری کہ وہاں مسند نشینی کے لئے دو دعوے داروں میں نزاع ہوئی انگریزوں نے دونوں کو وظیفہ دے کر ریاست سے خارج کر دیا اور

اس چھوٹے سے علاقہ پر خود قابض ہو گئے ؛

نواب اودھ کے ساتھ نیا معاہدہ

جنوبی ہند میں یہ انتظام کرنے کے بعد ولزلی کلکتے آیا اور اب اس نے نواب اودھ کی طرف توجہ مبذول کی اس ریاست سے بھی اسے کسی قسم کی مزاحمت کا خوف نہ تھا اور پہلے سے کمزور ہونے کے علاوہ اس کی اندرونی حالت بھی ابتر تھی۔ دوسرے انگریزوں کی متعینہ سپاہ کے مقابلے کی نواب کو جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ولزلی نے جو کچھ شرطیں پیش کیں وہ اسے خواہ مخواہ منظور کر لینی پڑیں شرطیں یہ تھیں کہ اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد بڑھا دی جائے گی۔ حالانکہ پچھلے معاہدے کے وقت یہ تصریح ہو چکی تھی کہ انگریزی سپاہ کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ کی جائیگی لیکن فوجی قوت کے سامنے حجت ودلیل کی پیش نہیں جاتی نواب کو یہ شرط ماننی پڑی اور اس کے عوض میں فوجی مصارف کے نام سے اپنا آدھا ملک کمپنی کے حوالے کرنا پڑا جس میں دوآب ور رہیل کھنڈ کے اضلاع بھی انگریزوں کے قبضے میں آگئے ؛ (سنہ ۱۸۰۱ء)۔

عہدنامۂ بسین سنہ ۱۸۰۲ء

سنہ ۱۸۰۰ء میں نانا فرنویس نے وفات پائی جو حکومت پونا کا پرانا رکن رکین اور نہایت ہوشیار آدمی تھا۔ ادھر دولت راؤ سندھیا کی جسونت راؤ ہلکر سے جنگ چھڑ گئی جس نے سندھیا اور باجی راؤ پیشوا دونوں کو مغلوب کر لیا اور مرہٹوں کے اس آخری پیشوا نے پونا سے نکل کر انگریزوں کی پناہ لی انگریزوں نے فوراً اس سے عہدنامہ بسین پر دستخط کرا لئے (دسمبر سنہ ۱۸۰۲ء) جس میں گویا مرہٹوں کے اعلیٰ سردار یعنی پیشوا نے کمپنی کی سیادت تسلیم کر کے اس کے ساتھ "عہد معاونت" کر لیا حسب معمول اس معاہدے کی شرطیں یہ قرار پائی تھیں (۱) آیندہ سے پونا میں انگریزی فوج امدادی رہے گی۔ اور اس کے مصارف کے لئے پیشوا کو ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ مالگزاری کا علاقہ کمپنی کے حوالے کرنا پڑے گا (۲) کسی بیرونی ریاست سے پیشوا سیاسی تعلقات قایم نہ کرے گا اور انگریزوں کی منشا کے خلاف کسی غیر قوم کے آدمی کو ملازمت میں نہ رکھے گا۔ (۳) نواب نظام الملک اور

مرہٹوں کے تنازعات میں پیشوا کمپنی کے حکم اور اس کے فیصلے کو تسلیم کرے گا؛ اس معاوضے میں انگریزوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ اپنے اتحادی کی مدد کریں گے اور اُسے بیرونی حملوں سے بچائیں گے۔ چنانچہ ایک انگریزی فوج باجی راؤ کے ساتھ پونا بھیجی گئی اور وہ دوبارہ اپنی حکومت پر بحال ہو گیا۔

مرہٹوں کی دوسری لڑائی۔ ۱۸۰۳ء

آپس کی پھوٹ اور لڑائی نے جب یہ نوبت پہنچائی کہ "جتھے" کا سردار ہی ٹوٹ کر انگریزوں سے جا ملا تو اس وقت سب سے زیادہ فکر سندھیا کو پیدا ہوئی جو نانا فرنویس کے بعد اپنے تئیں حکومت پونا کا مختار کار سمجھتا تھا۔ ہلکر نے اس کی فوج کو شکست دے کے پونا پر قبضہ کر لیا تو اس کے نزدیک یہ حریف کی محض عارضی کامیابی تھی اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ سندھیا کے پاس جو فوجی ساز و سامان، باقاعدہ سپاہ توپخانہ اور فرانسیسی افسر ملازم تھے ان کے مقابلے میں جسونت راؤ ہلکر کی فتح کچھ پائدار نظر نہ آتی تھی۔ دوسرے ہلکر پونا کے لوگوں کو بھی اپنا طرفدار نہ بنا سکا تھا اور مرہٹوں کی تیسری آزاد قوت یعنی ریاست ناگپور علانیہ اس کی مخالف اور سندھیا کے ساتھ تھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس خانہ جنگی کا فیصلہ ہونے سے پہلے، اچانک انگریز بیچ میں کود پڑے۔ ہلکر کو پونا سے ہٹنا پڑا اور معاملات کی صورت ہی بالکل بدل گئی عہدنامۂ بسین کا علم ہوتے ہی یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہو گئی کہ اب سندھیا ہو یا بھونسلہ پونا میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے انھیں ہلکر کی بجائے انگریزوں سے لڑنا پڑے گا۔ انگریزی گورنر جنرل کے مراسلات نے بھی اسی خیال کی تصدیق کر دی اور ایک طرف تو بھونسلہ کو صاف صاف جتا دیا گیا کہ اب اگر اس نے ریاست حیدرآباد یا پونا کی جانب نظر اٹھا کے دیکھا تو انگریز اُسے اپنے ساتھ دشمنی اور اعلان جنگ تصور کریں گے۔ اور ادھر سندھیا سے کہہ دیا گیا کہ یا تو وہ بھی بسین کے معاہدے میں شریک ہو جائے اور یا پیشوا کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھے۔

اس خط و کتابت کے ساتھ ساتھ ولزلی بہت بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ حیدرآباد، مدراس اور بمبئی کی فوجیں شمال کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ

اشارہ ہوتے ہی ناگپور کے علاقے میں داخل ہوجائیں اور ادھر سندھیا کے مقابلے کی غرض سے بہار و اودھ کے دستے تیار تھے کہ شمالی ہند اور مالوے کے ان شہروں پر حملہ کردیں جو سندھیا یا اس کے فرانسیسی جنرل پیراں کے ہاتھ میں تھے۔ پیراں کا مستقر علی گڈھ میں تھا اور اس کے ماتحت فوجی دستے میرٹھ اور دہلی وغیرہ تمام مشہور شہروں میں متعین تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کی حفاظت کے لئے بھی جسے غلام قادر خاں نے اندھا کردیا تھا۔ پیراں کی فوج کا ایک کرنیل دہلی میں تھا اور سندھیا کی ملازمت میں ہونے کے باوجود پیراں نے ان دنوں وہ شہرت و قوت حاصل کرلی تھی کہ اگر اس گوشۂ ملک کا (جو اب صوبۂ دہلی و صوبۂ آگرہ میں شامل ہے) اسے خود مختار بادشاہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نامور فرنگی جرنیل کی یادگار علی گڈھ میں اب ایک باغ اور کوٹھی رہ گئی ہے۔ جو مدرسۃ العلوم مسلمانان کے احاطے میں داخل اور اس کے دارالاقامہ کا کام دیتی ہے یا پیراں کا بوڑھا پوتا جو علی گڈھ کے بازاروں میں بھیک مانگتا پھرتا ہے۔[1]

ولزلی کے آخری مراسلات ایک قسم کا اعلان جنگ تھے جس کے چھڑنے میں کچھ دیر نہ لگی۔ قلعہ احمد نگر لینے کے بعد مرہٹوں سے انگریزوں کی پہلی لڑائی اسئی کے میدان میں ہوئی جو اورنگ آباد کے شمال مشرق میں چھوٹا سا گاؤں ہے۔ سندھیا اور بھونسلہ کی متحدہ فوجوں کا شمار انگریزی تاریخوں میں ۵۰ ہزار کے قریب بتایا گیا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ولزلی کے پاس پورے ۴ ہزار سپاہی بھی نہ تھے۔ اس کمی کے باوجود فتح انگریزوں کی ہوئی اور غنیم کی سب توپیں اور خیمہ خرگاہ مال غنیمت میں ہاتھ آیا۔ اسی طرح شمالی ہند کی انگریزی فوج نے پیراں کو شکست دی

[1] اس موقع پر انگریز ملاح ٹامس کا ذکر کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو دیسی ریاستوں کی فوج میں نوکریاں کرتے کرتے آخر میں اتنا قوی ہوگیا کہ اپنی ذاتی فوج بنا کے ہانسی کا مالک بن بیٹھا اور ایک خود مختار فرمانروا کی حیثیت سے بہت دن اس علاقے میں حکومت کرتا رہا۔ این روئے ستلج کے سکھوں سے بھی اس کی اکثر لڑائیاں ہوئیں جن میں بالعموم وہی کامیاب رہا ہے ۱۲

اور لسواڑی کی جنگ میں سندھیا کی رہی سہی طاقت بھی ٹوٹ گئی۔ دہلی اور آگرے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا (سنہ ۱۸۰۳ء)

ان پیہم شکستوں نے مرہٹوں کی دونوں طاقتور ریاستوں کو نڈھال کر دیا اور انھوں نے صلح کی درخواست کی۔ ماہ دسمبر کے شروع میں اول ناگپور کے راجہ نے اڑیسہ کا ملک انگریزوں کے حوالے کر کے اس قسم کے شرائط پر "عہد معاونت" کر لیا جیسی کہ پیشوا کو کرنی پڑی تھیں (عہد نامۂ دیوگاؤں) اسی مہینے کی آخری تاریخ سندھیا نے بھی عہد نامۂ ارجن گاؤں پر دستخط کر دئے جس کی رو سے اُسے دوآب کا تمام مغربی علاقہ اور احمد نگر اور بڑوچ انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے اور یہ اقرار کرنا پڑا کہ شاہ عالم بادشاہ یا انگریزوں کے کسی معاون سے آیندہ کوئی واسطہ نہ رکھے گا۔ چند سال بعد اُسے انگریزی امدادی فوج کو بھی اپنی ریاست میں یا سرحدوں کے قریب چھاؤنی ڈالنے کی اجازت دینی پڑی اور کہنا چاہیے کہ مرہٹوں کی سب سے قوی ریاست نے بھی آخر کار کمپنی کی سیادت تسلیم کر لی۔

ہلکر سے لڑائی سنہ ۱۸۰۴ء و سنہ ۱۸۰۵ء

جسونت راؤ ہلکر پونا سے آنے کے بعد اندور میں مقیم تھا۔ اور ان معرکوں میں کسی طرف سے بھی شریک نہیں ہوا کیونکہ گو حکومت پونا کا انگریزوں کے زیر اثر آجانا اُسے بھی شاق ہوا، تاہم سندھیا اور بھونسلہ راجہ اس کے رقیب تھے اور ان کی شکستوں سے شاید اس کو خوشی ہوئی۔ لیکن اسے بہت جلد باہمی نفاق کی سزا بھگتنی پڑی اور ولزلی نے شمالی مالوے اور ناگپور سے فرصت پاتے ہی اندور کا رخ کیا۔ جسونت راؤ مصالحت پر آمادہ تھا لیکن کمپنی نے جو قوت اب حاصل کر لی تھی اس کے لحاظ سے ولزلی معمولی شرطوں کو ماننے والا نہ تھا اور جب تک اندور پر پورا اقتدار نہ جم جائے اُسے مصالحت منظور نہ تھی۔ چنانچہ اس نے جسونت راؤ کو راجہ ماننے ہی سے انکار کر دیا اور جنگ چھڑ دی۔ (سنہ ۱۸۰۴ء)۔

اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہیے کہ وہ حریف (یعنی انگریز) جس کے مقابلے میں سندھیا کی باقاعدہ اور کثیر فوج پچھلے سال ایک مرتبہ بھی فتح نہ پا سکی تھی، ہلکر کے باقاعدہ سوار اور امیر علی کے غارتگر پنڈاروں سے کئی دفعہ شکست کھا کے

سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہوا۔ امیر علی کے علاوہ کئی دیسی رئیس و راجہ اس موقع پر جسونت راؤ کے حلیف ہو گئے تھے اور اس کا قول یہ تھا کہ انگریزوں کی ساری بہادری توپ خانے کے بل پر ہے۔ ورنہ ذاتی شجاعت کا امتحان ہو تو مرہٹوں کی برچھی اور مغلوں کی تلوار کے سامنے وہ کیا ٹھہر سکتے ہیں ؟[1]

دلزلی نے اندور پر دو طرف سے فوج کشی کا حکم دیا تھا۔ لیکن پچھلی لڑائیوں نے شمالی دکن کو ایسا تباہ و ویران کر دیا تھا کہ وہاں رسد میسر آنی محال تھی؛ مجبوراً جنوب کی انگریزی فوج کو اپنا کوچ ملتوی کرنا پڑا۔ البتہ شمال سے جو فوج چلی وہ دشمن کے علاقے میں کچھ دور تک بڑھ آئی تھی، اور ہلکر کے اتحادیوں نے اسی کو ہر طرف سے گھیر کے چھاپے مارنے شروع کر دئے۔ کیونکہ جسونت راؤ پرانی وضع کا مرہٹہ سپاہی تھا اور "قزاقانہ جنگ" کا طریقہ اسے دل سے پسند تھا۔ اور اسے اتحادی بھی ایسے ہی ملے جو اس فن میں طاق تھے؛ غرض ان تیز پا اور منچلے دشمنوں نے انگریزی فوج کو اسقدر ستایا کہ وہ اپنی بھاری توپیں چھوڑ کے پسپا ہونے لگی اور اس پسپائی میں مرہٹوں اور پنڈاروں کی بن آئی۔ وہ بھیڑوں کی طرح انگریزی فوج کے آگے پیچھے ادھر ادھر ہجوم کئے رہتے تھے اور جب موقع ملتا ہاتھ مار جاتے انگریزی فوج سخت مصیبت میں پھنس گئی اور اس کے جو بچے کھچے سپاہی بھاگ کر آگرہ پہنچ سکے ان کی صورت دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہفتوں سے نہ انھیں آرام کی نیند سونا نصیب ہوا تھا نہ پیٹ بھر کے کھانا۔

اس کامیابی نے ہلکر اور اس کے رفیقوں کا حوصلہ بڑھا دیا اور اب وہ دہلی میں سندھیا کی جگہ لینے کی تجویزیں سوچنے لگا لیکن حقیقت میں اس کی بے قاعدہ فوجیں کسی مستقل مزاج دشمن سے عہدہ برا نہ ہو سکتی تھیں۔ وہ محض آوارہ گرد منچلوں کی بھیڑ تھی جسے لوٹ کے لالچ نے چند دلیر سرداروں کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا تھا۔ ادھر تھوڑے ہی دن بعد انگریزوں کی تازہ دم فوجیں میدان میں پہنچ گئیں اور ڈیگ پر ہلکر کو شکست ہوئی (نومبر ۱۸۰۴ء) انگریزی فوج نے اس قلعے کو حملہ کر کے

---

[1] کین جلد اول صفحہ ۳۰۹-۱۲

چھین لیا۔

ناکامی کے باوجود بہادر ہلکر کا دم خم وہی تھا اور اس کے جاں باز رفیق بھی رفاقت سے منہ نہ موڑتے تھے۔ فتحمند انگریزوں نے بڑھ کر بھرت پور کا محاصرہ کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ اسی رو میں اس قلعے کو بھی چھین لیں، ان کی شدید گولہ باری قلعے کے دمدموں کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور ان کو چار و ناچار سخت نقصان اٹھا کے پسپا ہونا پڑا۔ وہ اگر کامیابی کے جوش میں بھرے ہوئے تھے تو جاٹوں نے بھی اپنے سب سے بڑے قلعے کی مدافعت میں جان کی بازی لگا دی تھی۔ انگریزی سپہ سالار کو تین مہینے کی سخت جدوجہد کے بعد قلعہ سر کرنے سے مایوسی ہو گئی۔ فوج کو اس نے واپس جانے کا حکم دے دیا (فروری ۱۸۰۵ء) بھرت پور کا قلعہ ہندوستان میں ناممکن التسخیر سمجھا جانے لگا۔

ولزلی کا استعفا

ہلکر کا جتھا ابھی تک مغلوب نہیں ہوا تھا اور ادھر ولزلی کی مسلسل لڑائیوں نے کمپنی کے دوالیہ ہونے کی نوبت پہنچا دی تھی اس میں شک نہیں کہ اس کے زمانے میں بڑے بڑے علاقے کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہوئے، لیکن وقت کے وقت جنگی مصارف کا جو بار پڑ رہا تھا وہ نظمائے کمپنی کو پریشان کئے دیتا تھا۔ دوسرے ولزلی جیسے امیرانہ مزاج کے آدمی کی ایسی جماعت کے ساتھ نبھنی دشوار تھی جو کچھ ہی فروغ کیوں نہ پا گئی ہو آخر تو سوداگروں کی کمپنی تھی۔ ایک سال پہلے بھی جب اس کے شوق کشورکشائی پر نظمائے کمپنی نے نکتہ چینی کی تو ولزلی لندن کے ان "پنیر فروشوں" کی نوکری چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن اسے ارمان تھا کہ مغربی ہند میں جو لڑائی چھڑی ہے اسے انجام تک پہنچا جائے چنانچہ ترک ملازمت سے باز رہا مگر جب ہلکر اور اس کے جتھے نے انگریزوں کو دو ایک شکستیں دیں اور کسی طرح زیر ہوتے نظر نہ آئے تو نظمائے کمپنی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا انھوں نے لارڈ کارنواِلس کو جو امن پسند مشہور تھا دوبارہ گورنر جنرل بننے پر رضامند کر لیا اور گو اس کی صحت خراب ہو چکی تھی لیکن کمپنی کی منت سماجت پر آخر وہ لندن سے روانہ ہو کر ۲۹ جولائی ۱۸۰۵ء کے دن کلکتے آ پہنچا اور ولزلی با دلِ ناخواستہ ہلکر کی جنگ ختم ہونے سے پہلے ہندوستان سے

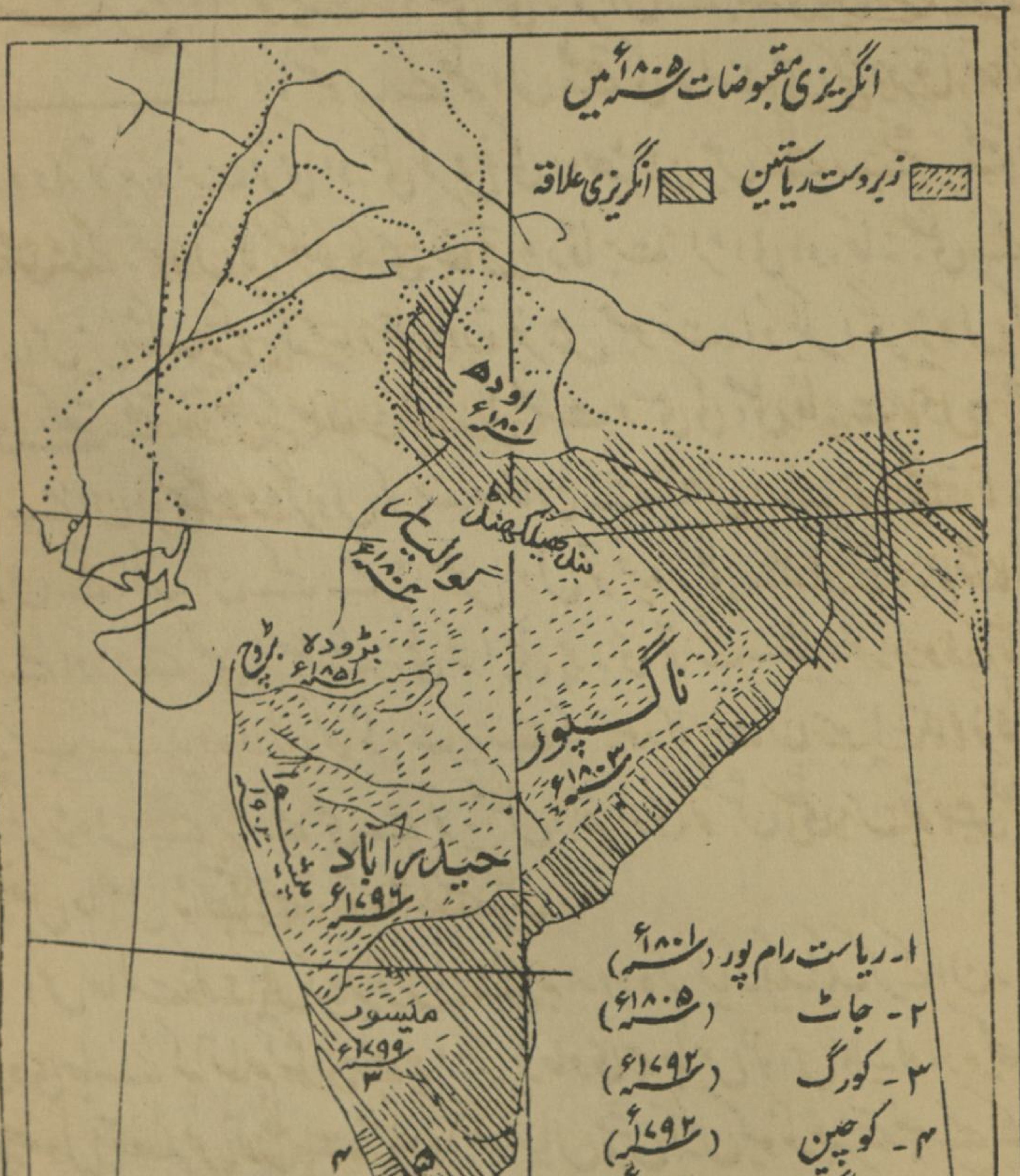
رخصت ہو گیا؛

ولزلی کی حکمت عملی کے نتائج

ولزلی جب ہندوستان آیا تو کمپنی مقبوضات یا فوجی قوت کے لحاظ سے ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں پر کوئی خاص فوقیت نہ رکھتی تھی۔ مگر اس کے عہدہ داروں اور ان کی ریاستوں کے حکمراں طبقے کی حالت میں بڑا فرق تھا یعنی انگریز عہدہ دار تو ہر وقت قومی اور ملکی فروغ کی ادھیڑ بن میں لگے رہتے تھے اور ہندوستان کے رئیسوں کا مشغلہ باہمی نفاق و رقابت، لڑائی اور خانہ جنگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حیدر علی اور آخر میں جسونت راؤ ہلکر انگریزوں کو اپنا قومی دشمن سمجھتے تھے۔ خاص کر سلطان میسور کی محنت و سعی کی اصلی غایت ہی یہ تھی کہ جس طرح بنے ان فرنگی سوداگروں کو ہندوستان سے نکال دے جو دیکھتے دیکھتے کئی صوبوں کے مالک بن گئے تھے؛ لیکن اول تو حیدر علی کے طاقتور ہم وطن اس کے دشمن ہو گئے اور اسے کبھی یہ مہلت نہ ملی کہ اپنی پوری قوت سے انگریزوں پر حملہ کرتا۔ دوسرے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ میسور کا سلطان ہو یا اندور کا راجہ اگر وہ انگریزوں سے لڑتے بھی تھے تو یہ محض انفرادی کوشش تھی اس قوت عظیم کا سہارا انھیں حاصل نہ تھا جسے "قوم" کہتے ہیں؛

اس حالت کو دیکھ کر اگر ولزلی نے یہ ارادہ کر لیا کہ ایک ایک کرکے ان ریاستوں کی قوت توڑ دی جائے کہ تمام کشور ہند پر انگریز حاوی ہو جائیں تو اس کا یہ ارادہ کچھ بے محل نہ تھا اگرچہ حصول مقصد میں توقع سے زیادہ دشواریاں پیش آئیں کیونکہ غیر متحد ہونے کے باوجود ہندوستان کے جن رئیسوں کے ساتھ جنگ چھڑی ان کی شجاعت و جانبازی نے انگریزوں کی ہمتیں پست کر دیں۔ بایں ہمہ جب ولزلی واپس انگلستان روانہ ہوا تو ایک حد تک اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں ہگلی سے جمنا تک اور جنوبی ہند میں تمام شرقی سواحل پر کمپنی کا قبضہ تھا اور مغربی دکن اور وسط ہند کی جو دیسی ریاستیں باقی تھیں انھوں نے انگریزوں کی سیادت تسلیم کر لی تھی؛ مختصر یہ کہ ولزلی ہی وہ شخص ہے "جس نے ڈیڑھ سو برس سوداگری سیاسی فن فریب اور جنگ و جدال کرنے کے بعد" انگریزی کمپنی کو صحیح معنی میں ہندوستان کا فرمانروا بنا دیا؛۔ اکبر اعظم کا جانشین اب کمپنی کا وظیفہ خوار و دست نگر ہے۔

مرہٹوں کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کے سرگروہ ایک ایک کر کے انگریز گورنر جنرل کے سامنے سر جھکاتے اور ادھر نواب نظام الملک برطانوی قوت سے مرعوب ہو چکے ہیں اور والی اودھ کی ریاست و حکومت کمپنی کی مٹھی میں آگئی ہے کہ جب چاہے اسے فنا کر دے ۔



گزشتہ تین ابواب کے مشہور واقعات اور سنین

سنہ	واقعات	دیگر اہم واقعات
۱۷۶۵ء	شاہ عالم بادشاہ سے بنگالے کی دیوانی کا حاصل ہونا۔ عہد نامۂ الہ آباد	

سنہ ۱۷۶۷ء	میسور کی پہلی جنگ	
سنہ ۱۷۷۱ء	کمپنی دیوانی کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔	مرہٹوں کی چڑھائی میسور پر؛ بادشاہ کا اتحاد مادھوجی سندھیا سے سنہ ۱۷۷۲ء مادھو راؤ اول کی وفات اور نرائن راؤ کا مسند نشیں ہونا۔
سنہ ۱۷۷۲ء تا سنہ ۱۷۸۵ء	وارن ہیسٹنگز کی حکومت بنگالے میں اور پھر کمپنی کے تمام مقبوضات ہند پر	
سنہ ۱۷۷۳ء	قانون تنظیمی کا نفاذ۔ عہد نامۂ بنارس (سنہ ۱۷۷۳ء)	نرائن راؤ کا قتل اس کا چچا رگھوناتھ پیشوا ہوتا ہے۔ سنہ ۱۷۷۴ء رگھوناتھ کا اخراج شیرخوار مادھوراؤ (ثانی) کی جانب سے نانا فرنویس کی حکومت پونا میں؛
سنہ ۱۷۷۵ء	نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ کی وفات اس کے جانشین سے مجلس کلکتہ نیا معاہدہ کرتی ہے؛ سورت کا عہد نامہ مرہٹوں کی جنگ کا آغاز؛	
سنہ ۱۷۷۶ء	عہد نامۂ پورندھر۔	
سنہ ۱۷۷۹	عہد نامۂ ورگاؤں	
سنہ ۱۷۸۰ء	احمد آباد وبسین وگوالیار کی تسخیر؛	
"	دوسری جنگ میسور کا آغاز۔ انگریزی فوج کی شکست۔	
سنہ ۱۷۸۱ء	چیت سنگھ راجہ بنارس کی گرفتاری	

سنہ	واقعات	سنہ	واقعات
	ہیسٹنگز کا والی اودھ سے دوسرا عہد نامہ ؛		
سنہ ۱۷۸۱ء	قانون تنظیمی کی ترمیم پورٹو نوووو کی جنگ ؛		
سنہ ۱۷۸۲ء	حیدر علی کی دوسری نمایاں فتح اور فرانسیسی فوج کی آمد ہندوستان میں		
سنہ ۱۷۸۲ء	عہد نامۂ سلبی اور مرہٹوں کی جنگ کا خاتمہ ؛		
سنہ ۱۷۸۴ء	جنگ میسور کا خاتمہ۔ عہد نامۂ منگلور ؛ پٹ کا قانونِ ہند نافذ ہوتا ہے ؛		
سنہ ۱۷۸۶ء تا سنہ ۱۷۹۲ء	کارنوالس کا زمانہ ؛		
سنہ ۱۷۸۸ء تا سنہ ۱۷۹۵ء	ہیسٹنگز پر مقدمہ اور اس کی تحقیقات پارلیمنٹ میں ؛		
سنہ ۱۷۹۳ء تا سنہ ۱۷۹۸ء	سر جان شور کا زمانہ۔		
		سنہ ۱۷۹۴ء	مادھوجی سندھیا کی وفات دولت راؤ اس کا جانشین ہوتا ہے۔
		سنہ ۱۷۹۵ء	کھرڈلا کی جنگ اور عہد نامہ
		سنہ ۱۷۹۶ء	باجی راؤ ثانی کی مسند نشینی پونا میں۔
سنہ ۱۷۹۷ء	آصف الدولہ والئ اودھ کی وفات		ٹکاجی ہلکر کی وفات ؛
سنہ ۱۷۹۸ء تا سنہ ۱۸۰۵ء	ولزلی کا عہد حکومت۔		
سنہ ۱۷۹۹ء	میسور کی چوتھی لڑائی اور سرنگاپٹم کی تسخیر ؛		
سنہ ۱۸۰۰ء	نواب نظام الملک کے ساتھ نیا معاہدۂ اتحاد		نانا فرنویس کی وفات

سنہ ۱۸۰۱ء	نواب عمدۃ الامرا کا انتقال اور کرناٹک و تنجور کا الحاق ۔ نواب اودھ سے ولزلی کا نیا معاہدہ ۔
سنہ ۱۸۰۲ء	عہد نامۂ بسین
سنہ ۱۸۰۳ء	مرہٹوں سے تیسری جنگ کا آغاز ۔ جنگ اسئی و لسواڑی دہلی اور آگرے کی تسخیر عہد نامۂ دیوگاؤں ۔ " " انجن گاؤں ۔
سنہ ۱۸۰۴ء	ہلکر سے جنگ اور اندور پر فوج کشی انگریزی فوج کی پسپائی ۔ ڈیگ کی فتح ۔
سنہ ۱۸۰۵ء	محاصرۂ بھرت پور کی ناکامی ۔

باب چہارم

کمپنی کا تسلّط ہندوستان پر

ولزلی نے اپنے زمانے میں کمپنی کو ہندوستان کی سب سے بڑی جنگی قوت بنا دیا تھا اور ہند کے جو رئیس اور راجہ مغلوب نہ ہو سکے وہ بھی ایک حد تک مرعوب ضرور ہو گئے تھے۔ اور اگرچہ ولزلی کے ہندوستان سے رخصت ہونے کے وقت معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی ملک گیری کا سیلاب رک گیا اور عجب نہیں کہ الٹا پھر جائے لیکن درحقیقت یہ عارضی بات تھی۔ اہل ہند کی سیاسی قوت کا شیرازہ کبھی کا بکھر چکا تھا وہ صدیوں تک مطلق العنان راجہ مہاراجہ اور سلطان و شہنشاہ کی رعیت رہے تھے اور آزادی رائے یا قومی حکومت کی کوئی قدر یا آرزو ان کے دل میں باقی نہ تھی۔ اس آخری صدی کی شورش و بدامنی کی بدولت ان میں بلا کی خودغرضی نفاق اور بے اعتباری پیدا ہو گئی تھی اور اگر صحیح معنی میں کوئی دور اندیش محب وطن تھا بھی تو وہ اہل وطن کی دشمنی کے خوف سے ملکی معاملات میں حصہ نہ لیتا تھا اور اگر لیتا تھا تو محسود بن کر کسی سازش کا شکار ہو جاتا تھا یا خود بھی اسی قسم کی ذلیل اور خودغرضانہ رقابت و سازش پر مجبور ہوتا جو ہر ہندوستانی ریاست کی قوت کو فنا کئے ڈالتی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے رہنے والے دماغی اور اخلاقی انحطاط کے

جس درجے پر پہنچ گئے تھے اسے دیکھ کر یہ پیشین گوئی کرنی دشوار نہ تھی کہ جلد یا بدیر یہ وسیع ملک انگریزوں کے قبضے میں آجائے گا۔ کیونکہ خود اہل ملک میں اپنے تئیں بچانے کی صلاحیت نہ رہی تھی؛ البتہ بیرونی معاملات نے ہندوستان کی محکومی کو چند سال کے واسطے معرض التوا میں ڈال دیا یعنی حکومت برطانیہ نپولین کے ساتھ یورپ کی لڑائیوں میں الجھی ہوئی تھی اور جنگی ساز و سامان، روپیہ اور سپاہی فراہم کرتے کرتے پریشان ہوئی جاتی تھی۔ دوسرے نظمائے کمپنی کو سب سے زیادہ فکر اس قرضے کی تھی جو ہندوستان کی لڑائیوں کے طفیل کمپنی کو لینا پڑا تھا اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، انھوں نے کارنوالس کو اسی غرض سے دوبارہ گورنر جنرل بنا کے ہندوستان بھیجا کہ وہ "عدم مداخلت" کے اصول کا حامی اور نہایت کفایت شعار آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ اجل نے کارنوالس کو مہلت نہ دی۔ وہ کلکتہ پہنچ کر دو ڈھائی مہینے کے بعد مر گیا اور سر جارج بارلو اس کا جانشین مقرر ہوا۔

بارلو
۱۸۰۵ء تا ۱۸۰۷ء

بارلو کمپنی کا پرانا اور نہایت مستعد ملازم تھا اس کی اطاعت گزاری کے ثبوت میں یہ لکھنا کافی ہے کہ ولزلی کی ماتحتی میں وہ اس کی جنگجوئی کا مؤید تھا اور جوں ہی کارنوالس کلکتہ کی بندرگاہ پر اترا بارلو "عدم مداخلت" کا حامی بن گیا اور نظمائے کمپنی کی تازہ ہدایات پر کمال مستعدی کے ساتھ عمل کرنے لگا۔ جسونت سنگھ اور امیر خاں سے اس نے نہایت آسان شرطوں پر صلح کر لی اور دریائے جمنا اور بندھیل کھنڈ کو کمپنی کی مغربی سرحد قرار دیکر عہد کیا کہ اس کے پار انگریز کسی ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں گے حالانکہ ولزلی نے راجپوت ریاستوں کے ساتھ معاونت کے عہد و پیمان کر لئے تھے اور اسی بنا پر وہاں کے راجہ مرہٹوں کے خلاف انگریزوں کے حلیف بن گئے تھے؛ اب جو انگریزوں نے ان کی دستگیری کرنے سے ہاتھ اٹھایا تو سندھیا اور ہلکر کی بن آئی اور انھوں نے کوٹہ، بوندی، جے پور اور اودے پور کو دل بھر کے لوٹا اور اتنے دن کی سب کسر نکال لی؛ انگریزی سپہ سالار لارڈ لیک نے بارلو کی اس عدم مداخلت کی سخت مخالفت کی لیکن یہ گورنر جنرل نظمائے کمپنی کے احکام کے سامنے کسی مصلحت اور پرانے عہد و پیمان کی پروا نہ کرتا تھا۔ لیک نے ناراض ہو کر

اپنے ملکی اختیارات سے استعفیٰ دے دیا۔

ویلور کا مفسدہ

بارلو کے عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ویلور کی ہندی سپاہ بگڑ گئی اور اس نے کئی سو گورہ سپاہیوں کو قتل کر ڈالا (۱۸۰۶ء) اس فساد کی اصلی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انھی دنوں نئی وردی پہننے کا حکم آیا تھا اور سپاہیوں کو نئی طرز پر مونچھیں بنانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ان احکام نے مدراس کے ہندو سپاہیوں کو بدظن کر دیا اور ان میں یہ خیال پھیل گیا کہ سرکار انھیں عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ غرض وہ انگریزوں سے برگشتہ ہو گئے اور اسی قلعے میں سلطان میسور کے جو بیٹے نظر بند تھے انھیں اپنا سردار بنایا، لیکن بہت جلد انگریزی فوج آپہنچی اور اس نے ویلور کا قلعہ سر کر لیا۔ سرکش سپاہیوں کی کثیر تعداد قتل ہوئی اور میسوری شہزادوں کو وہاں سے ہٹا کر کلکتے کے قریب قید کر دیا گیا۔

لارڈ منٹو
۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء

بارلو کا تقرر عارضی تھا اور اسے مستقل ہو جانے کی امید تھی بھی تو ویلور کے مفسدے کی بدولت باطل ہو گئی۔ نظمائے کمپنی نے اسے مدراس کا گورنر بنانے پر اکتفا کی اور لارڈ منٹو کو گورنر جنرل بنا کے ہندوستان بھیجا جو وارن ہیسٹنگز پر مقدمہ دائر ہونے کے وقت دارالعوام کا منتظم تھا اور بعد میں کمپنی کی مجلس نظارت کا صدر نشین ہو گیا تھا۔ غرض ہندوستان کے معاملات سے اسے کافی واقفیت تھی اور وہ بھی "عدم مداخلت" کے اصول کا حامی تھا۔ لیکن اتنی بڑی فوج اور قوت کے ہوتے ساتھ انگریزوں کا اپنی سرحدوں میں قانع ہو کر بیٹھ رہنا محال تھا جب کہ دیسی ریاستیں نفاق کی بدولت مقابلے کی قوت نہ رکھتی تھیں اور ان کی باہمی لڑائیوں میں دخل دینے کے بہت سے موقعے حاصل تھے۔ چنانچہ کمپنی کے قرضے کی طرف سے کسی قدر اطمینان ہوتے ہی "عدم مداخلت" کے اس نئے حامی نے بھی بندیل کھنڈ میں لڑائی چھیڑ دی اور چند سال کی جد و جہد کے بعد یہاں کے رئیسوں کو مغلوب کر کے اس علاقے کو انگریزوں کا مقبوضہ بنا لیا۔ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۱۲ء)

پنجاب اور سندھ

منٹو نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ جنوبی پنجاب کے معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا اور این روئے ستلج کی ریاستوں کو جن پر

سکھ حملے کرتے رہتے تھے؛ اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان دنوں پنجاب میں رنجیت سنگھ نے سکھوں کے جتھے اور ان کے مشہور سرگروہوں کو متحد کر کے بڑی قوت پیدا کر لی تھی اور منٹو نے اس کے ساتھ اتحاد کرنا ضروری سمجھا (عہدنامۂ امرت سر ۱۸۰۹ء) نیز سندھ کے امیروں کے ساتھ یہ دوامی معاہدہ کر لیا کہ "کمپنی ہمیشہ ان کی دوست رہے گی" (۱۸۰۹ء)

شاہی فرمان تجارت کی تردید

ادھر پارلیمنٹ میں کمپنی کے انتظامات کے متعلق دوبارہ بحث و نکتہ چینی شروع ہو گئی تھی کیونکہ اسے مشرقی تجارت کا جو اجارہ دیا گیا تھا وہ ۱۸۱۳ء تک کے واسطے تھا اور یہ مدت اب ختم ہونے والی تھی؛ کمپنی کے حصہ دار قدرتی طور پر اس مدت میں توسیع کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ ممالک ہند پر جو تسلط انھیں حاصل ہے اس میں کوئی فرق نہ آئے۔ لیکن انگلستان کے بعض اہل الرائے ان کے ملکی انتظام کو نہایت ناقص اور خراب سمجھتے تھے اور جن کو ہندوستان میں کمپنی کی حکومت اور عدالتی کارروائی سے واقفیت تھی وہ بیان کرتے تھے کہ جب سے انگریزی تسلط ہوا ہے بنگالے میں تمام جرائم روز افزوں ترقی پر ہیں؛ اور اس میں کچھ انگریز عہدہ داروں کا بھی قصور نہ تھا بلکہ درحقیقت کارنوالس نے ہندوستانیوں کو ملکی معاملات سے بے دخل کر کے جو نظام حکومت قائم کیا تھا وہ نہ پوری طرح مشرقی تھا نہ مغربی۔ اور اس کی کل ٹھیک نہ بیٹھی تھی ضرورت اس بات کی تھی کہ اہم معاملات خود اہل ہند کے مشورے سے طے کئے جائیں اور بڑے بڑے عہدوں پر ان کو بھی جگہ دی جائے۔ نیز جس اہتمام کے ساتھ کمپنی نے تجارت اور جنگی محکموں کو ترقی دی تھی اسی قدر غور و احتیاط سے عدالت اور پولیس کے سررشتوں کی اصلاح کی جائے مگر ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے دینے میں نہ صرف کمپنی بلکہ خود انگلستان کے وزیروں کو تامل تھا اور وہاں جو لوگ ہندوستان کے خیر اندیش کہلاتے تھے وہ بھی زیادہ زور اسی بات پر دیتے تھے کہ اہل ہند کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح پر توجہ کی جائے۔ اور وہاں انگریز مشنری یعنی مسیحی داعی اور مغربی علوم سکھانے والے معلم بھیجے جائیں؛ لیکن کمپنی کے نکتہ چینوں میں دوسرا قوی گروہ تاجر پیشہ اشخاص کا تھا جو کمپنی کو تجارت کا اجارہ دینے کی سخت مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اب انگلستان میں صنعت و حرفت کو جو ترقی ہو گئی ہے اس کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ

یہاں کے کارخانوں کی مصنوعات کے لئے ہندوستان کی منڈیوں پر صرف چند سوداگروں کا قبضہ نہ رہے بلکہ جو شخص چاہے وہاں کی تجارت سے فائدہ اٹھائے؛ چنانچہ ان کی کوشش کامیاب ہوئی انگلستان کے مدبرین مدت سے تجارت پر ہی اپنی قومی فلاح و بہبود کا انحصار جانتے ہیں انھوں نے مخالفین کا ساتھ دیا۔ کمپنی کے نئے فرمان شاہی میں صرف چین کی تجارت کا اجارہ باقی رہ گیا اور ہندوستان کی تجارت کے دروازے ہر ایک کے واسطے کھول دیئے گئے؛ (۱۸۱۳ء)

پارلیمنٹ کے ان مباحثوں اور ہندوستان سے تجارت کی عام آزادی مل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں بہت سی نئی انگریزی دکانیں کھلنے لگیں اور نہ صرف انگریز تاجروں کی بلکہ دیگر سرمایہ داروں اور مشنریوں کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ پس یہی وہ زمانہ سمجھنا چاہئے جس میں اہل ہند پر مغربی خیالات اور جدید تمدن کا اثر پڑنا شروع ہوا؛

مارکوئیس اوف ہیسٹنگز ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء

لارڈ منٹو کا جانشین (ارل اوف میورا) مارکوئیس اوف ہیسٹنگز امریکہ اور یورپ کی لڑائیوں میں نام کر چکا تھا اور اگرچہ ہندوستان میں حاکم اعلیٰ مقرر ہونے کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن اس کا طویل زمانۂ حکومت کمال مصروفیت میں بسر ہوا۔ اور گو وہ بھی انگلستان سے یہی ارادہ کر کے چلا تھا کہ جنگ و جدال یا کشور کشائی سے احتراز کرے گا مگر ہندوستان پہنچ کر اس کے خیالات بدل گئے اور اس کے عہد میں تین بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ملک گیری کا جو منصوبہ ولزلی نے باندھا تھا وہ اسی گورنر جنرل کے وقت میں پورا ہوا اور شمال کی دو مملکتوں کے سوا تمام ہندوستان انگریزوں کے زیر اقتدار آگیا؛

مگر ہیسٹنگز کی پہلی جنگ ان ہی شمالی دو مملکتوں میں سے ایک (نیپال) کے ساتھ چھڑی۔ کوہستان ہمالیہ کا یہ ملک اگرچہ طول و عرض میں سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس کا زیادہ علاقہ پہاڑی اور غیر آباد ہے اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس تمام ملک کی آبادی کا اندازہ ۲۰ لاکھ نفوس کیا جاتا تھا؛ یہ پہاڑی لوگ

[1] یہ تمام بیان اور جنگ کے حالات کین کی تاریخ ہند سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ ۱۴ تا ۲۰

نسل کے اعتبار سے تاتاری یا مغل مانے گئے ہیں جن میں آریا نسل کی آمیزش ہے۔ سیاسی طور پر وہ سلطنت چین کے باج گزار تھے اور ان کا قدیم صدر مقام گورکھا تھا جس کی وجہ سے انھیں پہلے "گورکھالی" کہتے تھے اور وہی بعد میں "گورکھا" رہ گیا۔ ان پست قامت لوگوں میں جنگجوئی، دلیری، جفاکشی وغیرہ پہاڑیوں کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت غالباً وہ جنوب کے زرخیز میدانوں پر قبضہ کرنا اور دریائے گنگا کو اپنے ملک کی جنوبی سرحد بنانا چاہتے تھے۔ شمال مغرب میں دریائے ستلج تک ان کا عمل دخل ہو گیا تھا اور چند مستحکم قلعے قبضے میں تھے۔ کماؤں کے تمام علاقے پر وہ چھائے ہوئے تھے اور انگریز مصنفین کا بیان ہے کہ اب اپنے پائے تخت کھٹ منڈو کے جنوب میں گورکھپور کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے حالانکہ اس کے شمالی اضلاع کو انگریز عہدہ دار نواب اودھ کا عطیہ اور اپنی ملک سمجھتے تھے؛ غرض اسی بنا پر پہلے دربار نیپال سے خط و کتابت اور پھر جنگ کی نوبت پہنچی اور وہ آلۂ جنگ جسے برسوں کی محنت سے کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں نے تیار کیا تھا، حرکت میں آیا۔ ۱۸۱۴ء میں نیپال سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا؛

گورکھا سپاہ کی کل تعداد ۱۲ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور ان کے مقابلے میں ہیسٹنگز نے چار انگریزی فوجیں روانہ کی تھیں جو تعداد میں کئی گنی زیادہ اور بہترین آلات حرب سے آراستہ تھیں؛ جنگ کا جو نقشہ بنایا گیا تھا اس کے مطابق جنرل گلیسپی کا کام یہ تھا کہ وہ ڈیرہ دون لے کر مغرب کی فوج سے جا ملے جو کہ جنرل اوکڑلونی کے ماتحت گورکھا ملاؤں کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ نیپالی سپہ سالار امر سنگھ اسی شمالی قلعے (ملاؤں) میں تھا اور ڈیرہ دون کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک مختصر دستہ اس نے کالنگا کی گڈھی میں متعین کر دیا تھا جنگ کا پہلا معرکہ اسی مقام پر ہوا اور گورکھوں کی مٹھی بھر جماعت نے گلیسپی کے تین حملے سخت نقصان کے ساتھ پسپا کئے۔ انھیں میں جنرل گلیسپی مارا گیا اور دشمن نے اپنی قلیل تعداد سے کہیں زیادہ آدمی کاٹ دیے۔ پھر جب انگریزوں کی بھاری توپیں آئیں اور گڈھی کو گھیر کے اس کا پانی روک دیا تو بھی گورکھوں نے ہتھیار نہ رکھے بلکہ جس طرح بنا بچ کر نکل گئے؛ کین کا بیان ہے کہ نکلنے کے وقت ان جری محصورین کی کل تعداد ستر یا اس سے بھی کم رہ گئی تھی!

کالنگا کی اس شکست نے دوسری فوجوں کی ہمت پست کر دی۔ اوکڑلونی کی پیش قدمی رک گئی اور مشرقی فوجوں پر اس سے بھی زیادہ بری بنی:۔ نیپالی پایۂ تخت (کھٹ منڈو) کو (جو انگریزی مستقر سے کوئی سو میل دور ہوگا) فتح کرنا جنرل مارلے کے سپرد کیا گیا تھا مگر وہ تھوڑی ہی دور بڑھا تھا کہ ہراول کے بعض دستوں کو دشمن نے کاٹ دیا اور مارلے وہیں رک کر کمک طلب کرنے لگا۔ کمک پہنچی تو اس کی ماتحت فوج کا شمار ۱۳ ہزار ہوگیا جو کینن صاحب کے الفاظ میں دشمن سے قریب قریب دس گنا زیادہ تھا۔ بایں ہمہ مارلے میدان میں نہ ٹھہرا اور تنہا رات کے وقت گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی چھاؤنی دانا پور میں بھاگ آیا:۔ ایک اور مشرقی سپاہ کو بھی کئی زکیں ہوئیں اور اس میں ایک سال سے بھی زیادہ مدت صرف ہوگئی مگر معلوم ہوتا ہے کماؤں کے پہاڑی لوگ درپردہ گورکھوں کے خلاف ہوگئے اور انھیں کے ایک سردار بام ساہ نے جو دربار نیپال کا فوجی سردار اور کماؤں کی حفاظت پر مقرر تھا تمام مستحکم مقامات انگریزوں کے حوالے کرکے صلح کرلی اور اس سے امر سنگھ کا گویا بازو ٹوٹ گیا اور وہ ملاؤں میں ہر طرف سے گھر گیا۔ اب گورکھوں کی سپاہ جو تعداد میں پہلے ہی بہت کم تھی زیادہ عرصے تک اپنے نقصانات نہ برداشت کرسکی اور دربار نیپال کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ کالی ندی کے پار تمام علاقے کے دعوے سے دست بردار ہوکر صلح کرلے (عہد نامۂ سنگولی ۱۸۱۶ء) کماؤں کا یہی وہ پہاڑی ضلع ہے جس میں الموڑہ اور مسوری وغیرہ مشہور گرمائی مقامات واقع ہیں:۔

جنگ نیپال میں انگریزوں کی پچھلی ناکامیاں سن کر ہیسٹنگز کو صلح بہت غنیمت معلوم ہوئی کیونکہ گوالیار اور دکن کے مرہٹہ سردار ارکان کھڑے کر رہے تھے اور ادھر مشرقی راجپوتانے اور وسط ہند میں امیر خاں کا زور بڑھ گیا تھا۔ یہ افغان سردار اپنے دوست جسونت راؤ ہلکر کے بعد اس جتھے کا سرگروہ بن گیا تھا جس کی ترکتازیوں کا حال ہم ولزلی کی آخری لڑائیوں کے حالات میں پڑھ آئے ہیں۔ لیکن جب راجپوتوں کی ریاستوں نے دوبارہ انگریزوں کے ساتھ رفاقت کا عہد و پیمان کرلیا، نیز پنڈاروں کی لڑائی میں سندھیا کے الگ رہنے کا اعلان ہوا تو اس وقت امیر خاں نے بھی سر تسلیم خم کر دیا۔ اور "عہد معاونت" کے عوض میں

اسے وہ ریاست (ٹونک) ملی جس پر اب تک اس کی اولاد حکمراں ہے؛ اب پنڈاروں کے سرگروہ دوست محمد خاں، واصل محمد خاں اور چیتو رہ گئے جن کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی بلکہ سترھویں صدی کے مرہٹوں کی طرح لوٹ مار پران کا گزارہ تھا۔ وہ یکایک انگریزی علاقے میں آدھمکتے اور چوتھ کا مطالبہ کرتے اور اسی حیلے سے رعایا کو ستاتے اور لوٹتے تھے؛ ۱۸۱۶ء میں انھوں نے مشرقی ساحل کے کئی علاقوں کو تاراج کر دیا اور کٹک اور مچھلی پٹم وغیرہ کئی زرخیز اضلاع کو پامال کر گئے۔ اسی زمانے میں اڑیسہ دوآب اور گجرات میں بھی کئی بغاوتیں ہوئی تھیں لیکن یہ مقامی ہنگامے معمولی فوج کشی اور کشت و خون کے بعد فرو کر لئے گئے اور ہیسٹنگز نے پنڈاروں کے استیصال کی غرض سے وہ عظیم الشان لشکر تیار کیا جس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی؛ اس اہتمام اور جنگی ساز و سامان کا حال پڑھ کر ہمیں مغل بادشاہوں کی جنوبی مہمات خاص کر وہ فوج کشی یاد آجاتی ہے جو عالمگیر نے مرہٹوں اور دکن کی دو سلطنتوں کے استیصال کی غرض سے کی تھی؛ اور صاف صاف نظر آتا ہے کہ جب کسی ملک کے باشندوں کو عام طور پر لوٹ مار کا مزہ پڑ جاتا ہے اور ان کا ذریعۂ معاش ہی قزاقی بن جاتا ہے تو اس وقت ان بے قاعدہ گروہوں کو گھیرنا اور مغلوب کرنا، نہایت دشوار ہو جاتا ہے چنانچہ ہیسٹنگز کی اس مہم کے متعلق تھاسن کا بیان ہے کہ کمپنی کے سارے عہد حکومت میں اتنی بڑی فوج نہ کبھی پہلے میدان میں اتاری گئی تھی نہ آئندہ فراہم ہوئی۔ اور یہی سبب تھا کہ پنڈارے وسط ہند کے علاقے میں گھر گئے اور گروہ در گروہ قتل ہوئے حتیٰ کہ سال بھر میں ان کا شیرازہ بکھر گیا اور بڑے بڑے سرگروہ مغلوب ہو گئے؛ اگرچہ ملک میں ہمارے زمانے تک ٹھگی اور ڈکیتی کا سلسلہ جاری رہا تاہم ان کا وہ جتھا جس میں تیس تیس ہزار مسلح ڈاکو علاقے کے علاقے پامال کرتے چلے جاتے تھے؛ ٹوٹ گیا اور کم سے کم دور کے علاقوں کو ان کی دست برد سے نجات ملی جس کے لئے اہل ہند کو دور اندیش ہیسٹنگز کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

مرہٹوں سے آخری جنگ

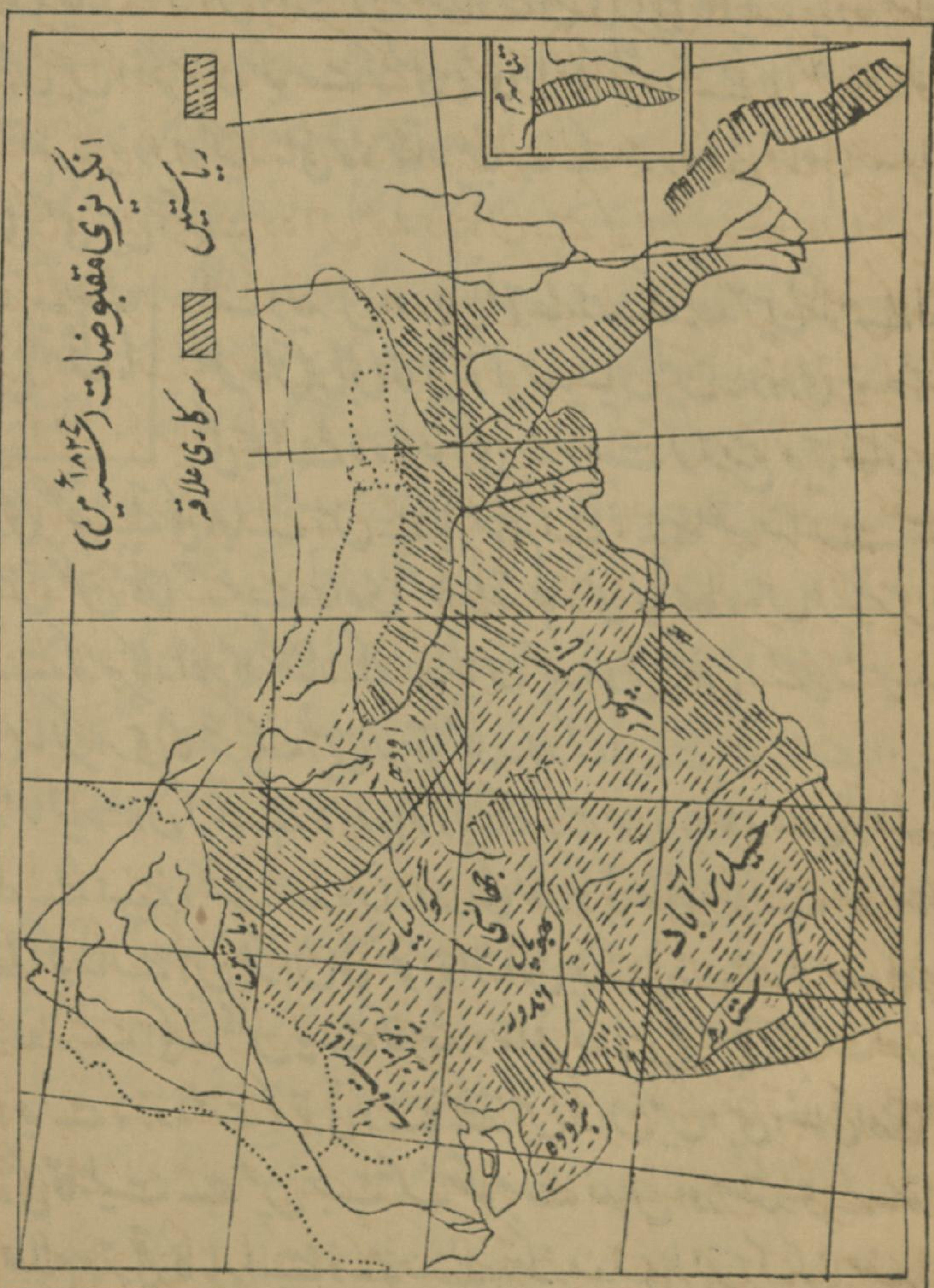
ادھر سے فرصت پانے کے بعد ہیسٹنگز نے مرہٹہ ریاستوں کی طرف توجہ کی۔ واضح رہے کہ

گو باجی راؤ پیشوا نے انگریزوں کے ساتھ "عہدنامۂ معاونت" کیا اور ان کی فوجوں کو اپنے ملک میں چھاؤنی بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ تاہم ان قدیم حقوق کو جو مرہٹہ ریاستوں پر پیشوا کو حاصل تھے انگریزوں نے اسی طرح رہنے دیا تھا کیونکہ گوالیار، اندور اور ناگپور کی ریاستوں سے ہمیشہ لڑائی کا خدشہ رہتا تھا۔ اور اس لئے پیشوا کو دوست بنانے کے ان حقوق کو قائم رکھنے میں انگریزی حکومت کا فائدہ تھا۔ لیکن خود باجی راؤ نے مجبوری کی حالت میں انگریزوں کی سیادت تسلیم کرلی تھی ورنہ درحقیقت وہ اس عہد و پیمان سے کچھ خوش نہ تھا اور انگریزوں کا دباؤ اسے ناگوار گزرنے لگا تھا۔ جنگ نیپال کے زمانے میں اس نے بعض کام ایسے کئے جو انگریزی رزیڈنٹ کی منشا کے خلاف تھے دوسرے اب ہیسٹنگز کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ پیشوا کی سیادت کا دعویٰ دوسری مرہٹہ ریاستوں پر قائم رہے غرض باجی راؤ کو ایک نیا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا جس کی خاص خاص شرطیں یہ تھیں کہ پیشوا اپنے قدیم حقوق سے دست بردار ہو جائے گا، اس کے ملک میں انگریزی فوج کی تعداد بڑھا دی جائے گی اور اسے احمد نگر کا پورا صوبہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑے گا۔ (عہدنامۂ پونا۔ جون ۱۸۱۷ء)

ان سخت شرائط نے باجی راؤ کو بالکل بیزار کر دیا۔ معاہدے پر دستخط کرنے سے علانیہ انکار کی اسے مجال نہ تھی مگر دل میں اس نے لڑائی کی ٹھان لی اور اندر ہی اندر جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ جنگ کا پہلا معرکہ نومبر ۱۸۱۷ء میں ہوا لیکن انگریزوں کی فوج کے مقابلے میں اسے کامیابی کی کوئی امید تھی تو یہ کہ دوسری مرہٹہ ریاستیں ساتھ دیں گی اسی لئے وہ اپنی فوج لئے جابجا پڑا پھرتا تھا اور انگریزی سپاہ تعاقب کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ ماہ مئی ۱۸۱۸ء میں اس نے گھر کر ہتھیار رکھ دیئے۔ ہیسٹنگز نے اسے معزول کر کے جلاوطن کر دیا اور وہ کانپور کے قریب بیٹھور میں آبسا جہاں کمپنی کی طرف سے اُس کو آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

مرہٹوں کے سب سے بڑے سرگروہ پیشوا کی ریاست کا خاتمہ ہونے سے پہلے ریاست اندور سے بھی لڑائی چھڑ گئی تھی جہاں ان دنوں جسونت راؤ کے صغیرسن بیٹے کی طرف سے اس کی بیوہ تلسی بائی حکومت کرتی تھی۔ تھامسن کا بیان ہے کہ

خود وہ انگریزوں کے خلاف نہ تھی لیکن اس کے سپاہی اور عہدہ دار قابو سے باہر ہو گئے اور آخر میں انھوں نے تلسی بائی کو قتل کر دیا۔ انگریزی سپاہ سے اس فوج کا مقابلہ مہدپور کے میدان میں ہوا (دسمبر ۱۸۱۷ء) اور اس میں اندور والوں نے شکست کھائی۔ ہیسٹنگز نے



ریاست اندور کا بہت سا علاقہ چھین لیا اور وہاں ایک مجلس انتظامی قائم کر دی جو انگریز رزیڈنٹ کے مشورے سے ریاست کا انتظام کرتی تھی۔ (عہدنامۂ منڈسور ۱۸۱۸ء)
ان جہات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ہند اور جنوب مغربی ہند کا بہت سا نیا علاقہ

کمپنی کے قبضے میں آگیا اور نیپال و پنجاب کے سوا جو دیسی ریاستیں باقی رہیں۔ انھوں نے کامل طور پر کمپنی کی سیادت قبول کرلی۔ حقیقت میں کمپنی کی فوجی قوت اب اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کسی حریف کو اس کے مقابلے میں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی اور اسی لئے کہنا چاہیئے کہ اس وقت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں انگریزی حکومت کو کسی بڑی لڑائی پیش آنے کا خطرہ نہ رہا اور ولزلی کا منصوبہ پورا ہو گیا۔ یعنی خود مختار پنجاب کے علاوہ باقی تمام ہندوستان کمپنی کی مٹھی میں آگیا؛

اندرونی انتظامات

جنگ و جدال اور ان فتوحات کے بعد ہیسٹنگز نے اندرونی نظم و نسق میں بھی قابل ذکر تبدیلیاں کیں۔ دوامی بندوبست کی بجائے وہ میعادی بندوبست کو ترجیح دیتا تھا دوسرے "زمینداری" طریقے کی بجائے اس نے بالعموم اپنے اپنے مقبوضات میں یا جہاں جہاں ممکن تھا "رعیت داری" طریقہ جاری کیا تھا۔ اس طریقے میں فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ سرکار اور کاشتکار کے درمیان تیسرا کوئی شخص (یعنی زمیندار یا جاگیردار) مالگزاری کا شریک نہیں رہتا' بلکہ سرکار کسان سے براہ راست اور زیادہ شرح سے' مالیہ وصول کرتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اول تو سرکار کو اس کام کے لئے اپنے ماتحت عہدہ داروں کی تعداد بڑھانی پڑتی ہے اور یہ نہ صرف غریب رعایا کو ستاتے ہیں بلکہ ان کی تنخواہ اور ان پر نگرانی رکھنے کا سرکار پر بار پڑتا ہے۔ دوسرے ایک نقص یہ ہے کہ ہندوستانی کسان کچھ اپنی جہالت اور زیادہ تر مفلسی کی وجہ سے نہ زراعت کو ترقی دے سکتے ہیں نہ ان میں اپنی اخلاقی اور مالی حالت کو سنوارنے کی قابلیت ہے پس جب تک حکومت خلوص اور مستعدی کے ساتھ ان کی اندرونی اصلاح و ترقی کا بار اپنے ذمے نہ لے ہر جگہ زمینداری طریقہ ترک کرنا مفید نہ ہوگا؛ ہیسٹنگز کے دوسرے کام بھی ہندوستانی اہل الرائے کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ اسی نے ضلع کے محصل یا کلکٹروں کو از سر نو فوجداری اختیارات دیئے اور اخبارات کی آزادی پر سخت قیود عاید کیں بلکہ یہ قانون بنایا (۱۸۱۸ء) کہ حکومت جس اخبار والے سے ناراض ہو اسے بلا عدالتی تحقیقات کے جلاوطن کر سکتی ہے۔

ہیسٹنگز کا استعفیٰ اور ایم ہرسٹ کا تقرر

اگرچہ مارکوئیس اوف ہیسٹنگز اپنی فتوحات اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے کمپنی کے سب سے نامور گورنر جنرلوں میں شمار ہوتا ہے لیکن آخر میں ایک معمولی بات پر اسے استعفیٰ دینا پڑا۔ شرح اس کی یہ ہے کہ ان ہی دنوں ریاست حیدر آباد میں ایک انگریزی بنک قائم ہوا جس کے ایک حصہ دار سے گورنر جنرل کے ذاتی تعلقات تھے یہ بنک حکومت انگریزی کی سرپرستی کے زور پر ریاست کو جو قرض دیتا تھا اس کا پچیس فی صدی کے حساب سے سود وصول کرتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ لاکھوں کے قرضے پر یہ شرح سود سراسر ناروا سمجھی جائے گی۔ کفالت میں بنک والوں نے ریاست کے بعض علاقے رہن کر لئے تھے اور آخر میں جب اس شرح سود کا بہت چرچا ہوا تو انھوں نے درپردہ ۵۲ لاکھ قرض دے کر ۶۰ لاکھ کا تمسک بھی لکھوا لیا تھا۔ سنہ ۱۸۲۰ء کے اخیر میں یہاں نیا رزیڈنٹ مقرر ہوا جسے آتے ہی ان سب کارروائیوں کا علم ہو گیا اور اس نے ہیسٹنگز کو ان کے تدارک پر توجہ دلائی۔ اوّل اوّل ہیسٹنگز نے بنک والوں کا ساتھ دیا لیکن آخر میں اسے رزیڈنٹ کی بات ماننی پڑی اور جب دوسری جگہ سے قرض لے کر بنک کا حساب بیباق کر دیا تو یہ بنک ٹوٹ گیا۔ انگلستان میں اس واقعے سے ہیسٹنگز کی بدنامی ہوئی لہٰذا اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس کی جگہ لارڈ ایم ہرسٹ گورنر جنرل مقرر ہو گیا۔ سنہ ۱۸۲۳ء

برما اور بھرت پور

برما کی پہلی جنگ اور قلعہ بھرت پور کی تسخیر اس عہد کے مشہور واقعے ہیں۔ انگریز مورخوں کا بیان ہے کہ برما کا راجہ اور اس کے مشیر نہایت احمق اور مغرور تھے اور جانتے تھے کہ ہمارے برابر کسی سلطنت میں نہ فوج ہے نہ قوت۔ اسی شیخی میں انھوں نے اپنے سپہ سالار کو حکم دے دیا کہ بنگالے سے انگریزوں کو نکال دے۔ چنانچہ برمی فوج نے انگریزی علاقے میں پیش قدمی کی اور یہاں کی کسی سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا انگریزوں نے راجہ کے برخلاف اعلان جنگ کر دیا۔

یہ جنگ تقریباً دو سال جاری رہی اور ایم ہرسٹ کو تین تین مرتبہ فوجیں آراستہ کر کے خشکی اور سمندر کی راہ سے بھیجنی پڑیں۔ آخر برما کی سپاہ اپنے وطن کی مدافعت

نہ کر سکی اور جب انگریزی فوج کا ایک دستہ برمی پائے تخت کے قریب پہنچ گیا تو راجہ نے گھبرا کر صلح کر لی (فروری ۱۸۲۶ء) اس معاہدے کی رو سے اسے اراکان، تناسرم، اور آسام کے اضلاع انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے اور حکومت ہندوستان کے لئے آیندہ کل برما اور جزیرہ نمائے ملایا میں اپنا اقتدار بڑھانے کی راہ نکل آئی۔

ان ہی دنوں بھرت پور کا راجہ مرا تو گدی کے لئے اس کے وارثوں میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ متوفی کے بھائی نے اس کے بیٹے کا حق دبانا چاہا اور خود بھرت پور کا مالک بن بیٹھا۔ ایم ہرسٹ نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اگرچہ انگریزی توپوں کی گولہ باری اس مرتبہ بھی قلعے کا کچھ نہ بگاڑ سکی لیکن انگریز انجنیر فصیل تک سرنگ لگانے میں کامیاب ہو گئے اور بارود کی مقدار کثیر بھر کے اُسے اڑا دیا۔ اسی کے ساتھ فوج نے حملہ کیا اور بیرونی حصار کو فتح کر لیا۔ اس حملے میں کئی نامی جرنیل مارے گئے اور مہم کا خرچ بہت ہوا۔ لیکن ہندوستان کے انگریز عہدہ دار یہ بات دکھانی چاہتے تھے کہ بھرت پور ان کے مقابلے میں ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ سو ان کا یہ ارمان پورا ہو گیا (۱۸۲۷ء)۔

ایم ہرسٹ کے زمانے میں صوبہ بمبئی، کچھ، مالوہ، راجپوتانے اور دوآب میں کئی فساد برپا ہوئے اور کشت و خون کی نوبت پہنچی لیکن یہ مقامی شورشیں چند روز میں رفع دفع ہو گئیں۔ البتہ برما کی جنگ نے ہندوستان کے خزانے پر ایسا بار ڈالا کہ ایم ہرسٹ کے زمانے میں ملکی انتظامات کے متعلق اور کوئی اصلاح عمل میں نہ آ سکی اور وہ ۱۸۲۸ء میں اپنی پنج سالہ میعاد پوری کر کے واپس چلا گیا۔

لارڈ ولیم بنٹنگ
۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء

ولیم بنٹنگ جو مدراس میں گورنری کی خدمت انجام دے چکا تھا ۱۸۲۸ء میں گورنر جنرل بنا کے دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا اور اس کے عہد میں کئی مشہور ملکی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ وہ بذات خود نہایت روشن خیال اور نیک دل حاکم مانا جاتا ہے اور اس کا زمانۂ حکومت لڑائی اور خوں ریزی کے ذکر سے خالی ہے۔ دوسرے اندرونی انتظامات اور نئے اصول عمل کی بنیاد رکھنے کے واسطے اس سے بہتر فرصت کا کوئی وقت نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اب کمپنی کا ہندوستان کے بڑے حصے پر تسلط جم گیا تھا اور اس کے اقتدار کے خلاف سر اٹھانے کی کسی کو مجال نہ تھی۔ البتہ

ہندوستان کی دیسی ریاستیں اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار تھیں اور بنٹنگ کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ یہی تھا کہ آیا قدیم معاہدوں کے موافق اُن باجگزار یا ماتحت والیان ریاست کو آیندہ آزاد رہنے دیا جائے یا کسی حد تک اُن کے اندرونی معاملات میں بھی کمپنی کی حکومت دخل دے؟ انصاف کا تقتضا تو یہ نظر آتا تھا کہ انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جب تک وہ اپنے "عہد معاونت" کی خلاف ورزی نہ کریں، انگریزی حکومت بھی اُن کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے۔ چنانچہ بہت سے انگریز اہل الرائے کی رائے یہی تھی کہ جب تک دور ریاستوں میں کوئی جنگ و فساد نہ ہو، کمپنی کو اُن کے اندرونی معاملات سے سروکار نہ ہونا چاہئے۔ لیکن دوسری طرف ایک گروہ کہتا تھا کہ اگر کمپنی نے ان ریاستوں کو بیرونی حملے سے بچانے کا ذمہ لیا ہے تو کیا وجہ کہ وہ اُن کی غریب رعایا کو خود رئیسوں کے ظلم وستم یا بد انتظامی سے نہ بچائے؟ اگر کمپنی رئیس کی حامی اور محافظ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ انھیں بھی ایک حد تک اپنی نگرانی میں رکھے گی تاکہ ان رئیسوں کو اپنی رعایا کے ستانے کا موقع نہ ملے۔

میسور و کورگ

غرض بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جس کی عقدہ کشائی ہیسٹنگز کے جانشین کو کرنی تھی لیکن ہیسٹنگز اور ایمہرسٹ کی لڑائیوں نے کمپنی کو پھر زیر بار کر دیا تھا۔ اور اس لئے نظار کی رائے یہ تھی کہ ان ریاستوں کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو دست اندازی نہ کی جائے مبادا کوئی اور فساد برپا ہو اور کمپنی کو فوج کشی کرنی پڑے۔ بنٹنگ بھی اسی اصول کا حامی تھا اور تا امکان کسی بڑی ریاست سے چھیڑ نکالنی نہ چاہتا تھا مگر جیسا کہ کمپنی کی پچھلی تاریخ سے ثابت ہے اس قسم کے اصول وقتی مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور ملکی مدبرین کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر موقع پر کسی خاص اصول کی پابندی کریں، بنٹنگ نے بھی بعض ریاستوں کے معاملے میں "عدم مداخلت" کی چنداں پروا نہ کی اور جب راجۂ میسور کی بہت سی شکایتیں جمع ہو گئیں تو اُس نے اُسے معزول اور بے دخل کر کے ریاست کا انتظام براہ راست کمپنی کی نگرانی میں لے لیا (۱۸۳۲ء)؛ دو سال بعد ریاست کورگ کا حشر اس سے بھی برا ہوا یعنی وہاں کے راجہ کے مظالم حد سے بڑھے ہوئے نظر آئے، بنٹنگ نے فوج بھیج کے اسے جبراً معزول کر دیا اور کورگ کا علاقہ مستقل طور پر کمپنی کے مقبوضات میں

شامل کر لیا گیا (۱۸۳۴ء) ۔

اودھ کے زرخیز علاقے پر بھی کمپنی کے بعض عہدہ دار قبضہ کرنا چاہتے تھے اور وہاں کا انگریز رزیڈنٹ (مسٹر مے ڈک) برابر والیٔ اودھ کی نا اہلی اور بدنظمی کی شکایت لکھتا رہتا تھا۔ دوسرے انگریز بھی یہی کہتے تھے کہ نواب یا "شاہ اودھ" کے عہدہ دار ملک کو تباہ کئے ڈالتے ہیں لیکن کیبن کا بیان ہے کہ وہاں زراعت کو ترقی تھی اور خود انگریزی علاقوں کے لوگ بکثرت وطن چھوڑ چھوڑ کے وہاں آ رہے تھے[1]۔ اس کے بعد دوسرا رزیڈنٹ وہاں بھیجا گیا تو اُن شکایت ناموں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل کو ایسی حالت میں اودھ کا الحاق ناجائز نظر آیا اور اُس نے نظمائے کمپنی کی مخالفت کی جس پر وہ لوگ اُس سے ناخوش ہو گئے تاہم بنٹنگ نے اپنے جانے کے وقت تک اس معاملے میں کوئی کارروائی نہیں کی اور زیادہ تر ملک کی اندرونی اصلاح کے کام میں مصروف رہا ۔

ملکی اصلاح اور جدید تعلیم

بنٹنگ نے سب سے پہلے "ستی" کی رسم کا انسداد کیا اور اعلان کرا دیا کہ آئندہ شوہر کی لاش کے ساتھ کسی ہندو بیوہ کو جلایا گیا تو اس کام میں جتنے شریک ہوں گے سب پر خون کا مقدمہ چلایا جائے گا (۱۸۲۹ء)، پھر اس نے راجپوتانے میں دختر کشی کے روکنے کی کوشش کی اور پنڈاروں کی ذرّیات کی خبر لی جو ٹھگی اور ڈکیتی کا پیشہ کرتے تھے۔ اور اُن کے انسداد اور گرفتاری کی غرض سے ٹھگی ڈکیتی کا محکمہ قائم کر دیا ۔

کارنوالس ہر صوبے میں جو عدالتیں بنائی تھیں اور اُن کے ارکان دورے کرتے پھرتے تھے انھیں بنٹنگ نے توڑ دیا اور ان کی بجائے ہر ضلع میں الگ الگ عدالتیں بنائیں جو دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرتی تھیں۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے پچاس برس میں جرائم اور دیوانی مقدمات کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ صوبے کی عدالتیں انھیں سماعت نہ کر سکتی تھیں ؛ اسی سلسلہ میں اُس نے ایک اور عدالت العالیہ بھی الہ آباد میں قائم کر دی کہ شمال مغربی علاقے کے لوگوں کو کلکتے آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے ۔

[1] کیبن کی "تاریخ ہند" جلد دوم صفحہ ۱۱۶۔

مگر مغربی تعلیم کی ہندوستان میں اشاعت، بنٹنگ کا سب سے بڑا کارنامہ مانی جاتی ہے۔ اب تک کمپنی کی طرف سے تعلیمی کاموں کے لئے بہت ہی قلیل رقم دی جاتی تھی اور اس کا مصرف بھی سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ ہندو مسلمان کے دو ایک مدرسوں کو مالی مدد دی جائے یا بعض مغربی کتابوں کے عربی فارسی اور سنسکرت میں اور مشرقی کتابوں کے زبان انگریزی میں ترجمے کئے جائیں، جب سرکاری مدارس قائم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو انگریز اہل الرائے نے چاہا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں دی جائے لیکن سرکاری کونسل کا ایک رکن مکالے تھا جو انگلستان کا مشہور مصنف گزرا ہے اُس کو اصرار تھا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان کو قرار دیا جائے اور بڑے بڑے پادری بھی اُس کے ہم خیال ہو گئے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک مغربی علوم اور زبان کی تعلیم سے دین مسیحی کے پھیلنے میں آسانی پیدا ہوتی تھی؛ مختصر یہ کہ مکالے کی پر جوش تقریروں کے سامنے مخالفین کی کچھ پیش نہ گئی اور انگریزی کو سرکاری مدارس کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُس وقت جب کہ ہندوستان میں لوگ مغربی زبانوں سے بالکل ناآشنا تھے، جدید علوم وفنون کی اشاعت صرف اسی طریقے پر ہو سکتی تھی کہ یورپ کی زبانوں کو سیکھا جائے البتہ سیکھنے کے بعد خود تعلیم یافتہ ہندیوں کا فرض تھا کہ تالیف وتراجم کے ذریعہ سے مغرب کے مفید علم وفن اپنے ہم وطنوں کو سکھائیں کیونکہ کسی ملک میں تعلیم اسی وقت عام ہو سکتی ہے جب کہ خود ملکی زبان میں علمی کتابیں موجود ہوں ؛

فرمان ۱۸۳۳ء

بنٹنگ کے عہد حکومت کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ کمپنی کے گزشتہ فرمان (نافذہ ۱۸۱۳ء) کی مدت ختم ہوئی اور ۱۸۳۳ء میں ایک نیا فرمان شاہی عطا ہوا جس میں ہندوستانی رعایا کے حقوق کا بھی صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور سلطنت برطانیہ کی جانب سے یہ اصول قائم کیا گیا ہے کہ "مذکورہ علاقے (یعنی مقبوضات کمپنی) کا کوئی باشندہ محض اپنے مذہب مولد یا نسل ورنگ کی بنا پر کمپنی کی کسی خدمت یا ملازمت یا عہدے سے محروم نہ کیا جائے گا!"

اسی مشہور فرمان میں، جس کا آج تک سیاسی بحثوں میں حوالہ دیا جاتا ہے، شمال مغربی اضلاع کو ملا کر ایک نیا صوبہ بنانے کا بھی اعلان کیا گیا تھا اور کچھ عرصے بعد

وہاں "لفٹنٹ گورنر" مقرر ہونے لگے جنھیں خود گورنر جنرل نامزد کردیا کرتا تھا۔

ولیم بنٹنگ کی تعریف مکالے نے جن الفاظ میں کی ہے وہ بہت کم کسی کو نصیب ہوتے ہیں اور یہ الفاظ آج بھی اس کتبے کی بدولت محفوظ ہیں جو کلکتے میں ولیم بنٹنگ کی مورت کے نیچے کندہ ہے:

"یہ مورت ولیم کیونڈش بنٹنگ کی ہے جو سات سال تک کمال فراست و دانائی، دیانت و نرمی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرتا رہا۔ اس نے اتنی بڑی حکومت ملنے کے باوجود ایک معمولی آدمی کی طرح سادگی اور اعتدال کو فراموش نہ کیا اس نے ایشیائی جبر و مطلق العنانی میں برطانوی آزادگی کا رنگ بھرا۔ وہ کبھی اس بات کو نہ بھولا کہ حکومت کی غایت محکوموں کی فلاح و بہبود ہے۔ اُس نے ظالمانہ رسموں کو مٹایا اور ہتک آمیز امتیازات دور کیے۔ اُس نے رائے عامہ کے ظاہر کرنے کی آزادی دی اور برابر اپنی رعایا کی اخلاقی اور دماغی حالت کو بہتر بنانے کی فکر کرتا رہا۔ اس کی یادگار یہ مورت یہاں اُن لوگوں نے نصب کی ہے جو مذہب و ملت زبان و معاشرت میں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اُس کے عمدہ عہد کی یاد میں بالاتفاق سرِ عقیدت و سپاس خم کرتے ہیں"۔

سر چارلس مٹکاف

۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۶ء

ولیم بنٹنگ کے ہندوستان سے رخصت ہونے کے بعد سر چارلس مٹکاف اُس کا جانشین ہوا جو کمپنی کا پرانہ تجربہ کار اور نہایت لائق عہدہ دار تھا لیکن اول تو اس منصب کے لئے نظمائے کمپنی کو انگلستان ہی کے کسی امیر کا تقرر کرنا پڑتا تھا دوسرے وہ مٹکاف سے خوش بھی نہ رہ سکے۔ وہ روشن خیال اور منصف مزاج شخص تھا اور اُس نے ایک ہی سال کی حکومت کے زمانے میں وہ قیود اٹھادیں جو ہیسٹنگز نے اخبارات پر عائد کردی تھیں۔ نظمائے کمپنی اس واقعہ سے ناراض ہوئے اور اگرچہ مٹکاف کو گورنر جنرلی کی بجائے شمال و مغربی صوبے کی گورنری پر نامزد کردیا گیا تھا، لیکن اُسے نظما کے ساتھ نباہ کرنا دشوار نظر آیا اور وہ ان کی ملازمت چھوڑ کر علیحدہ ہوگیا۔

باب پنجم

لڑائیاں اور نئی فتوحات

لارڈ اوک لینڈ
۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء

اس عہد کا سب سے مشہور واقعہ افغانستان کی پہلی جنگ ہے جہاں اُن دنوں بارک زئی قبیلے کا سردار دوست محمد خاں فرمانروائی کرتا تھا۔ احمد شاہ دُرّانی (یا ابدالی) کے بعد ان علاقوں کی حکومت کوئی نصف صدی تک احمد شاہ کی اولاد میں رہی لیکن سلطنت کے بڑے عہدے بارک زئی قبیلے کے قبضے میں تھے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۶ء میں دوست محمد خاں نے اپنے مقتول بھائی کے انتقام میں شاہ شجاع پر فوج کشی کی اور شکست دے کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریز مدبرین کے دماغ سے فرانس کا خوف زائل ہو چکا تھا اور اس کی جگہ "روسی خطرہ" انھیں پریشان کرنے لگا تھا کیونکہ انیسویں صدی کے شروع میں ایران و ترکی کے انحطاط کی بدولت سلطنت روس کی حدیں برابر وسیع ہو رہی تھیں اور نظر آنے لگا تھا کہ اگر اس کی پیش قدمی کی یہی رفتار رہی جو وسط ایشیا میں تھی، تو چند ہی سال میں سواحل ایران اور ممالک افغانستان میں روس کا سکہ رواں ہو جائے گا اور پھر ہندوستان کی بھی خیر نہ ہوگی۔ اسی خیالی خطرے کی پیش بندی کے واسطے یہ تجویز ہوئی کہ ممکن ہو تو ایران و

افغانستان کے ساتھ معاہدۂ اتحاد کر لیا جائے اور ضرورت کے وقت انھیں روسیوں کے خلاف مدد دی جائے کہ یہ بلا ہندوستان سے دور ہی رہے۔ چنانچہ کپتان برنیر کو سفیر بنا کے کابل بھیجا گیا اور اُدھر سے روسیوں نے بھی ایک شخص کو کابل روانہ کیا کہ انگریزوں کی کاٹ کرے۔ امیر دوست محمد خاں نے انگریزوں کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ وہ افغانستان کو پشاور واپس دلوا دیں جس پر اُن دنوں رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دوست محمد خاں صرف یہ چاہتا تھا کہ پشاور پر کوئی افغانی حاکم مقرر کر دیا جائے، خواہ وہ رنجیت سنگھ ہی کے ماتحت رہے اور انگریزوں کی دوسری تمام شرطیں اُسے منظور تھیں۔ لیکن اوک لینڈ نے سکھوں سے بگاڑ نی پسند نہ کی اور بعض نوجوان مشیروں کی صلاح سے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے ساتھ مل کر دوست محمد خاں پر فوج کشی کا منصوبہ باندھا۔ کابل کا یہ بوڑھا اور معزول تاجدار یعنی شاہ شجاع مدت سے ہندوستان میں پناہ گزین تھا۔ کابل میں لوگ اس سے نفرت کرتے تھے اور اگر اس کا کچھ بادشاہی اثر تھا بھی تو اتنے دن کی جلاوطنی میں زائل ہو گیا تھا فرمانروائی کی اُس میں اہلیت نہ تھی نہ جنگ کا مرد میدان تھا۔ برخلاف اس کے دوست محمد خاں دانشمند منصف مزاج اور بہادر سردار تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ شجاع کی طرح ظالم و مطلق العنان فرمانروا نہ تھا بلکہ افغانی امرا کے مشورے سے کام کرتا تھا۔ ایسے شخص کے مقابلے میں اوک لینڈ اور اُس کے ناوان دوست کابل پر مہم لے جا رہے تھے جسے اکثر انگریز مصنف "خطائے عظیم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مہم کابل کا حسرتناک انجام

اعلان جنگ ہوتے ہی (۱۸۳۹ء) انگریزی فوجوں نے دونوں جانب سے افغانستان پر پیش قدمی کی اور جنوبی فوج نے راستے میں امرائے سندھ کے بھی کئی قلعے چھین لیے اور نہایت لایعنی حیلوں سے جبراً بہت سا روپیہ وصول کیا[۱]۔ پھر یہ دونوں فوجیں دشوار گزار راستے طے کر کے قندھار پر آملیں اور چند روز بعد قلعۂ غزنی بھی دوست محمد خاں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ امیر موصوف کے پاس انگریزوں کی فوج کثیر کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ کافی سپاہی تھے نہ جنگی ساز و سامان۔ لہٰذا وہ پائے تخت کو چھوڑ کر

[۱] کین کی تاریخ ہند جلد دوم صفحہ ۱۲۷۔

شمال میں ہٹ گیا اور تعاقب میں جو انگریزی دستہ بھیجا گیا تھا وہ شکست کھا کے پسپا ہوا۔ لیکن کابل کا قبضے میں آجانا ظاہر میں بہت بڑی کامیابی تھی اور انگریزوں نے بلاتاخیر شاہ شجاع کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس رسم کو ادا ہوئے کچھ مدت نہ گزری تھی کہ مختلف قبیلوں نے ایسے بادشاہ کی اطاعت سے انحراف کیا جو ایک غیر قوم کی مدد سے تخت نشین ہوا تھا، اور جب تک انھیں بہت سا روپیہ نہ دیا گیا وہ خاموش نہ ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے اس مہم کی صلاح دینے والوں نے دیگر ضروریات جنگ کا اندازہ تو کیا تھا مگر خرچ کی یہ مد ان کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ آوک لینڈ یہ مفت کا ڈنڈ بھرتے بھرتے عاجز آ گیا اور آخر اس نے قبائل کو روپیہ دینا بند کر دیا۔ اس خداداد آمدنی کے بند ہوتے ہی ملک میں ہر طرف بغاوتیں ہونے لگیں اور ان کے فرو کرنے کے لئے جو انگریزی دستے بھیجے گئے انھیں دو ایک مقام پر شکست نصیب ہوئی۔ باقی جہاں کہیں انھوں نے فتح پائی وہاں بھی اس کا اثر دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ان پریشانیوں میں جس واقعے نے انگریزوں کی ہمت بڑھائی وہ یہ تھا کہ امیر دوست محمد خاں نے خلاف امید خود آکر اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا اور کلکتے چلا آیا جہاں اس کی بہت عزت اور مدارات ہوئی (سنہ ۱۸۴۰ء)۔

دوست محمد خاں کے ہردلعزیز حاکم ہونے میں شبہ نہیں لیکن اس کی اطاعت سے وہ دشمنی کم نہ ہوئی جو افغانوں کو انگریزوں کے ساتھ تھی۔ دوسرے اس امیر کا بیٹا امیر محمد اکبر خاں جو اپنے باپ سے بھی زیادہ بہادر اور مستعد سردار تھا، انگریزوں کے خلاف فوج لے کر کابل آ رہا تھا۔ مگر سب سے بڑے دشمن تو خود کابل کے عوام الناس تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ انگریزی فوج کو اندرونی قلعے (بالاحصار) اور بیرونی چھاؤنی میں گویا محصور کر لیا تھا اور تمام رسد رسانی کے راستے بند کر دیے تھے۔ انگریزی سپاہ نے اگر باہر نکل کر دو ایک حملے کئے بھی تو چنداں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار وہ اپنے غلبہ پانے یا باہر کی امداد آنے سے نا امید ہو گئی۔ اکبر خاں سے انگریز سرداروں نے گفتگو شروع کی اور اس نے اجازت دی کہ توپیں دے کر اور کچھ یرغمال چھوڑ کر وہ واپس ہندوستان چلے جائیں (نومبر سنہ ۱۸۴۱ء)۔

مگر اکبر خاں صرف اپنی فوج کا ذمہ لے سکتا تھا، قبائل پر اس کا زور نہ تھا

نہ غالباً اس نے اس بارے میں کوئی دخل دیا۔ غرض کابل سے نکلتے ہی انگریزی فوج پر خونخوار پٹھانوں نے چھاپے مارنے شروع کئے اور گندمک تک آتے آتے برف باری، فاقہ کشی اور افغانوں کے حملوں نے اُن کی تمام فوج کو تباہ کر دیا۔ کابل سے فوج اور بہیر کے چودہ پندرہ ہزار آدمی روانہ ہوئے تھے لیکن ان میں سے صرف ایک شخص زندہ بچ کر جلال آباد پہنچا جہاں ایک اور انگریزی فوج قلعے میں مورچہ بند تھی۔ (جنوری ۱۸۴۲ء)

لارڈ النبرو ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء

اس تباہ کن مہم کا ذمہ دار تھوڑے ہی دن بعد ولایت چلا گیا اور لارڈ النبرو نے اس کی جگہ لی۔ کابل کی افسوسناک ہزیمت کا بدلا لینا، النبرو اپنا فرض جانتا تھا اور ابھی تک وہ انگریزی فوجیں قندھار و جلال آباد کے قلعوں پر بھی قابض تھیں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہاں کمک بھیجنے میں دقت نظر آتی تھی اور "درۂ خیبر کا نام سن کر سپاہیوں کی جان نکلتی تھی۔" دوسرے راجہ رنجیت سنگھ فوت ہو چکا تھا (۱۸۳۹ء) اور اس کے جانشینوں کی طرف سے پوری طرح اطمینان نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے اتحاد کا عہد نباہ سکیں گے یا نہیں؟ لہٰذا ایسی حالت میں فوج کا افغانستان جانا اور بھی مخدوش ہو گیا تھا۔ تاہم قندھار و جلال آباد کی سپاہ تازہ کمک پہنچے بغیر نکل نہ سکتی تھی اور آخر جنرل پولک فوج لے کے درۂ خیبر میں داخل ہو گیا۔ پھر جلال آباد کی فوج کو ساتھ لیکر وہ ادھر سے بڑھا اور ادھر سے قندھار کی انگریزی فوج نے کابل پر پیش قدمی کی (۱۸۴۲ء) اس باقاعدہ لشکر کا افغانی مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور شاید انھیں اس بات کا بھی انتظار تھا کہ انگریز کابل پہنچ جائیں تو پھر انھیں ہر طرف سے آ گھیریں مگر النبرو کے نزدیک پچھلی ذلت کا بدلہ اتر گیا تھا اور اُس نے تاکیدی احکام بھیج دیئے تھے کہ انگریزی فوج بلاتاخیر واپس چلی آئے۔ چنانچہ کابل کے بڑے بازار کو جلانے اور ویران غزنی کو برباد کرنے کے بعد یہ فوج عظیم اُلٹے پاؤں واپس پھری اور بغیر نقصان اٹھائے اپنی سرحد میں پہنچ گئی۔ دوست محمد خاں کو افغانستان جانے کی اجازت ملی اور وہ بلا دقت پھر اپنے ملک کا فرمانروا بن گیا (۱۸۴۳ء) بہ الفاظ دیگر اس تمام نقصان جان و مال کا جو پچھلے چار سال میں کمپنی کو اٹھانا پڑا تھا، کوئی بھی نتیجہ نہ ہوا اور جو حالت جنگ سے پہلے تھی وہی جنگ کے بعد ہو گئی۔ بایں ہمہ النبرو اپنی اس آخری مہم کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتا تھا اور اُس نے

دو اعلان شائع کئے جن میں بڑی تعلّی تھی اور ایک میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ جنرل ناٹ مندر سومنات کے وہ کواڑے کر واپس آرہا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے مقبرے میں لگے ہوئے تھے اور اب ایں جانب کے حکم سے اُس مقبرے کو توڑ کر لائے گئے ہیں؛ پھر شمالی ہند کے راجہ مہاراجوں کو دعوت دی تھی کہ وہ سب جلوس بنا کے دھوم دھام سے ان کواڑوں کو سومنات کے مندر تک لے جائیں؛ یہ محض طفلانہ نمائشی خیال تھا۔ جس پر کسی نے عمل نہ کیا اور انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ لوگوں نے لعنت ملامت کی یہ کواڑ بھی مصنوعی ثابت ہوئے اور ابھی تک آگرے میں پڑے ہوئے ہیں کسی نے اُن پر توجہ نہ کی؛ اسی طرح الن برو نے ستلج کے کنارے فیروز پور پر فتحمند فوجوں کے استقبال کی بڑی شان و شوکت سے تیاری کی تھی؛

سندھ کا الحاق ۱۸۴۳ء

الن برو کے زمانے میں سندھ کے الحاق سے کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اور اس کے لئے امیران سندھ سے جنگ مول لینی پڑی یہ امیر بلوچی قوم کے سردار تھے جن کے بزرگوں نے دریائے سندھ کی وادیٔ زیریں پر حملہ کر کے اُسے اپنی حکومت میں داخل کر لیا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کے تین خاندان علیٰحدہ علیٰحدہ ریاستوں میں فرمانروائی کرتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے سے انھیں اس قدر احتراز تھا کہ جب ۱۸۳۰ء میں لفٹنٹ برنیر کی سفارت × × × دریا کے راستے اس ملک سے گزری کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں بعض تحائف لے جائے تو انھیں گزرتے دیکھ کر ایک امیر چلایا کہ بس اب خیر نہیں۔ کیونکہ فرنگی نے ہمارے ملک کو دیکھ لیا! بایں ہمہ ۱۸۳۲ء میں انھیں ایک "عہد نامہ کر لینے پر آمادہ کر لیا گیا جس کی رو سے انھوں نے دریا میں تجارت کا مال لانے لے جانے کی اجازت دے دی لیکن فوجوں کو راستہ دینے سے قطعی انکار کر دیا۔ فریقین کی طرف سے پختہ قول و قرار ہو گیا تھا کہ وہ کبھی ایک دوسرے کے مقبوضات پر لالچ کی نظر نہ ڈالیں گے، مگر اس معاہدے کے باوجود انگریزی فوجیں اسی راستے افغانستان گئیں اور امیران سندھ سے جبراً "عہد معاونت" لے لیا جس میں اُنھیں فوج رکھنے اور خراج ادا کرنے کی شرط بھی چار و ناچار قبول کرنی پڑی؛ جب افغانستان کی جنگ ختم ہوئی تو پھر اُن پر یہ الزام لگائے گئے کہ

تم نے رسد رسانی کا ٹھیک انتظام نہیں کیا اور جنگ کے زمانے میں انگریزی فوج کے کوچ میں حرج ڈالا۔ ان الزامات کی تحقیقات اور یہ قضیہ چکانے پر چارلس نپیر کو مقرر کیا گیا جو تازہ ولایت اور بہت تیز مزاج فوجی تھا اس میں شک نہیں کہ علی مراد اپنے بھائی یعنی خیرپور کے امیر کی بجائے خود ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے مکر و فریب سے نپیر کو سخت مغالطے ہوئے لیکن اصل یہ ہے کہ خود نپیر کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ جس طرح ممکن ہو کوئی حیلہ نکال کے سندھ کا ملک دبا لے چنانچہ انگریزوں نے ان امیروں کو اتنا دق کیا کہ آخر کار وہ لڑنے پر کمربستہ ہو گئے اور اس وقت فوج بھیج کر دو شکستوں میں ان کی قوت توڑ دی گئی (۱۸۴۳ء) سندھ کی ریاستوں سے کمپنی کا "عہد معاونت" لے لینا تو شاید اس بنا پر ٹھیک بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسی سرحدوں پر جہاں آئے دن حملے کا اندیشہ ہو سندھ کی کمزور ریاستوں کا آزاد رہنا مصلحت کے خلاف تھا۔ لیکن ان ریاستوں کے فنا کر دینے کی نہ ضرورت نظر آتی ہے نہ کوئی جائز وجہ، لہٰذا سوا اس کے کیا کہا جائے کہ انھیں کمال بے دردی سے ملک ستانی کی چکی میں پیس دیا گیا۔ خود نپیر نے صاف گوئی اور دیدہ دلیری سے اپنی تحریر میں اقبال کیا ہے کہ ہمیں سندھ چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن ہم اسے ضرور چھینیں گے اور یہ نہایت مفید اور شریفانہ بدمعاشی ہوگی" (ٹامسن)۔

گوالیار کی لڑائی

ایلن برو کے زمانے کا ایک اور واقعہ جس نے اس کے شوق نمائش و کشور کشائی کو نمایاں کیا، جنگ گوالیار ہے (۱۸۴۳ء)۔ اس ریاست کے راجہ نے اسی زمانے میں وفات پائی اور ایک نو عمر بیوہ اور لے پالک بچہ اپنے وارث چھوڑے۔ اگرچہ گوالیار انگریزی اثر میں آ گیا تھا۔ لیکن اس کی فوجی قوت ابھی تک بنی ہوئی تھی اور یہ بات انگریز حکام کو ناگوار تھی۔ پس راجہ کے مرتے ہی انگریزی رزیڈنٹ نے کسی اپنے آدمی کو راج کمار کا اتالیق اور مدار المہام بنانا چاہا۔ فوج والوں نے اسے بجا مداخلت سمجھ کر اس کی تجویز رد کر دی۔ رزیڈنٹ دھول پور چلا آیا اور ایلن برو نے فوراً فوج کشی کی تیاریاں کیں، انگریزی سپاہ اور جنگی ساز و سامان کے مقابلے میں گوالیار کے سپاہی اگرچہ بہادری سے لڑے لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور انھیں دو جگہ

شکست ہوئی۔ رانی کو قبول اطاعت کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا اور مجبور ہو کر اس نے ایلن برو کی شرطیں تسلیم کر لیں جن میں سب سے پہلی یہ تھی کہ ریاست کی ۳۰ ہزار فوج کو گھٹا کر صرف دس ہزار کر دیا جائے اور جب تک راج کمار جوان ہو، ریاست کے کاروبار انگریز رزیڈنٹ کی نگرانی میں ایک مجلس انتظامی انجام دے۔

"اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد مجلس نظماء نے ایلن برو کو واپس طلب کر لیا۔ مجلس کو اعتراف تھا کہ ایلن برو اپنے وطن کا پرجوش اور بے غرض خادم ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ متلون مزاج، کم اندیش اور نمائش پسند آدمی ہے اور اتنے بڑے اختیارات کا اس کے ہاتھ میں رہنے دینا کسی طرح خدشے سے خالی نہ ہوگا۔"

سر ہنری ہارڈنگ ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء

مجلس نظماء نے ایلن برو کی جگہ سر ہنری ہارڈنگ کو منتخب کیا جو یورپ کی لڑائیوں میں نام پا چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس کا زمانہ "پہلی جنگ پنجاب" کے باعث مشہور ہے جس میں سکھوں کی قوت ٹوٹی اور انگریزوں کا اثر قائم ہو گیا۔

انگریز مورخوں نے اس لڑائی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور کئی سال تک اندرونی جھگڑوں کے بعد سکھوں نے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا۔ وہ ابھی تک بالکل بچہ تھا اور اس لئے حکومت اس کی ماں کے ہاتھ میں تھی جو اپنے برہمن دیوان لال سنگھ اور سپہ سالار تیج سنگھ کی مدد سے فرمانروائی کرتی تھی؛ لیکن درحقیقت قوت کے مالک پانچ فوجی سردار بن گئے تھے اور ان کی چیرہ دستیوں سے رانی اور اس کے مشیر تنگ آ گئے تھے۔ پھر جب ان سرداروں کو حصول ناموری کے لئے تازہ فتوحات اور جنگ و جدال کا شوق ہوا تو انگریز مورخوں کے بقول، رانی اور لال سنگھ نے عیاری سے انھیں انگریز علاقوں کی طرف ڈھکیل دیا اور ان کے ستلج اترتے ہی کمپنی کی جانب سے اعلان جنگ کر دیا گیا۔ (۱۸۴۵ء)

"کیا بلحاظ جوش مذہبی و دلیری اور کیا بلحاظ جنگی ساز و سامان اور قواعد دانی ایسے قوی دشمنوں سے انگریزوں کا اب تک ہندوستان میں مقابلہ نہ ہوا تھا جیسے کہ یہ سکھ تھے۔ کیونکہ ان کی جنگی تربیت فرانسیسیوں نے کی تھی اور ان کے پاس اعلیٰ درجے کا

توپ خانہ تھا جس سے وہ بخوبی کام لینا جانتے تھے ۔ انگریزی فوجوں سے چار میدانوں میں، ان کا مقابلہ ہوا، مدکی فیروز شاہ، علی وال، اور سبراؤن ۔ چاروں میں آخری جیت انگریزوں کی ہوئی اور بظاہر پائے تخت لاہور تک کوئی ان کی پیش قدمی روکنے والا نہ رہا (۱۸۴۶ء) لیکن اس کی نوبت آنے سے پہلے عہد نامۂ لاہور پر دستخط ہو گئے جن کی رو سے سکھوں کو بیاس تک کا علاقہ کمپنی کے حوالے کرنا اور اپنی فوج کی تعداد کو گھٹانا پڑا ۔ سکھ سردار گلاب سنگھ نے تاوان جنگ کے نام سے ایک کروڑ روپیہ اس شرط پر انگریزوں کو ادا کیا کہ اُسے کشمیر کا راجہ تسلیم کر لیا جائے نیز کچھ انگریزی فوج اور انگریزی رزیڈنٹ لاہور میں متعین کر دئے گئے کہ ضرورت ہو تو رانی اور اُس کے دیوان کی مدد کریں ۔ (۱۸۴۶ء) ۔

اس کامیابی کے صلے میں سر ہنری کو لارڈ کا خطاب عطا ہوا اور یہی رتبہ انگریزی سپہ سالار سر ہیو گف کو ملا ۔ اس جنگ میں پنجاب کی اندرونی آزادی برقرار رہی اور علاقہ بھی کچھ زیادہ ہاتھ سے نہ گیا لیکن لاہور میں انگریزی رزیڈنٹ اور فوج کا رہنا درحقیقت اس بات کی علامت تھی کہ اب یا چند سال بعد یہ تمام علاقہ کمپنی کے تحت میں آ جائے گا کیونکہ سکھوں کی جنگجو قوم میں دوراندیشی یا سیاسی تدابیر کو سمجھنے اور مل کر کام کرنے کی قابلیت نہ تھی جو کہ ایشیائی قوموں کی سب سے بڑی کمزوری ہے ۔

ہارڈنگ کی حکومت کا باقی زمانہ بعض اندرونی اصلاحوں میں صرف ہوا ۔ اس نے فوج کی تعداد گھٹا کر خرچ میں تخفیف کی اور پہلی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ آئندہ سرکاری ملازمت میں اُن کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی ہو اور انگریزی عہد کی پہلی نہر (نہر گنگ) اور نئی ریلیں بنانے کی تجاویز بھی اس کے زمانے میں مرتب ہوئیں گو ان کی تکمیل چند سال بعد ہوئی ۔

لارڈ ڈل ہوزی
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء

جب ڈل ہوزی گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا تو اس کی عمر چھتیس برس کی تھی اور اب تک ہندوستان میں اس قدر کم عمر کوئی گورنر مقرر نہیں ہوا تھا ۔ اگرچہ سب انگریزی مورخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ بہت ذہین سخت گیر اور محنتی حاکم تھا اور مجلس تجارت انگلستان کی میر مجلسی کے زمانے میں اسے انتظامی معاملات میں بھی

خوب واقفیت حاصل ہو گئی تھی لیکن ہندوستان میں اُس نے جو طرز عمل اختیار کیا اس پر بعض انگریز اعتراض کرتے ہیں اور بعض مدح و ستائش۔ لیکن یہ بحث ہم مختصر طور پر آگے کریں گے مناسب یہ ہے کہ پہلے اُس کے زمانے کے مشہور واقعات بیان کر دیئے جائیں :-

سکھوں سے دوسری جنگ ۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء

سکھوں سے دوسری جنگ اور پنجاب کا الحاق اس زمانے کا سب سے زیادہ اہم واقعہ ہے اس لڑائی کی اصلی بنیاد یہ تھی کہ لاہور کی مجلس انتظامی پر انگریز رزیڈنٹ حاوی ہو گیا تھا اور پنجاب کے اکثر اضلاع میں وصول مالگزاری کے واسطے انگریز عہدہ دار مقرر کر دیئے گئے تھے۔ سکھوں کو یہ بات قدرتی طور پر ناگوار تھی اور اُن کے بعض مشہور سرداروں نے علانیہ اس انتظام کی مخالفت کی اور آخر میں سردار مول چند ناظم ملتان نے اپنا استعفا بھیج دیا۔ جسے رانی قبول کرنا چاہتی تھی نہ عام رعایا با ایں ہمہ لاہور سے دو انگریز بھیج دیئے گئے کہ وہ صوبۂ ملتان کو اپنی تحویل میں لے لیں اور اگرچہ شہر میں داخل ہوتے وقت سردار مول چند نے اُن کا اچھی طرح استقبال کیا لیکن جب وہ باہر اپنے پڑاؤ پر جانے لگے تو ایک شخص نے اُن پر حملہ کیا اور بیان کرتے ہیں کہ سردار مول چند کے سپاہی بھی اس حملہ میں شریک ہو گئے۔ ان انگریزوں کے قتل کا الزام سردار موصوف پر لگایا جاتا ہے اور انگریز مورخ لکھتے ہیں کہ ان سازشوں میں خود رانی بھی در پردہ معین و مددگار ہو گئی تھی حالانکہ پہلی لڑائی کے وقت رانی اور اُس کے مشیر دل سے انگریزوں کے طرفدار تھے خاص کر سپہ سالار تیج سنگھ نے ان کی خیر خواہی میں بعض اوقات اپنی ہم قوموں کو بے دریغ کٹوا دینے میں بھی تامل نہیں کیا تھا؛

القصہ ملتان کے سردار مول راج پر بعض انگریز عہدہ داروں نے مل کر یورش کی اور اپنی حکومت سے اجازت یا کمک آنے کی بھی راہ نہ دیکھی۔ سردار موصوف کو قلعہ بند ہونا پڑا مگر شہر میں محصور ہو کر اُس نے جس پامردی اور شجاعت کے ساتھ انگریز محاصرین کا مقابلہ کیا وہ تاریخ میں یادگار رہے گا؛

ادھر لاہور میں انگریزی رزیڈنٹ نے چند اشخاص کو سازش کے الزام پر

گرفتار کر لیا اور اسی سلسلے میں رانی کو بھی بنارس جلاوطن کر دیا گیا ساتھ ہی پنجاب میں عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور ہنو کے حاکم سردار چتر سنگھ اور اس کا بہادر بیٹا راجہ شیر سنگھ علانیہ انگریزوں سے منحرف ہو گئے۔ اس جگہ ملتان کی جاں بازانہ مدافعت یا چلیانوالے اور گجرات کی مشہور لڑائیوں کا مفصل بیان لکھنا موجب طوالت ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ انگریزوں کے جنگی ساز و سامان اور اعلیٰ انتظام کے مقابلے میں سکھوں کی خالی دلاوری کچھ کام نہ آئی اور گجرات کی شکست نے (فروری ۱۸۴۹ء) اُن کی فوجی قوت توڑ دی۔ ڈلہوزی نے فوراً تمام پنجاب کو کمپنی کے مقبوضات میں داخل کر لیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے (۱۰) دہ سالہ وارث یعنی دلیپ سنگھ کو نہ صرف ریاست سے محروم کر دیا گیا بلکہ راج کی ذاتی املاک[1]، محلات اور قیمتی ظروف و جواہرات پر بھی ڈلہوزی نے قبضہ کر لیا اور کنور دلیپ سنگھ کے ذاتی مصارف کے واسطے ایک ہزار پونڈ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا جو اُس کے بالغ ہونے پر بڑی حجت و بحث کے بعد بمشکل ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ تک بڑھا دیا گیا تھا۔ سکھوں کے جنگجو فرقوں سے ہتھیار لے لئے گئے اور ملکی انتظام کی غرض سے تجربہ کار و مستعد انگریز عہدہ داروں کی ایک مجلس انتظامی قائم ہوئی جس کی نگرانی خود گورنر جنرل کرتا تھا۔

برما سے دوسری جنگ ۱۸۵۲ء

ڈلہوزی نے دوسری جنگی مہم ریاست برما پر بھیجی جس کی اندرونی قوت پہلے ہی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ بعض انگریز سوداگروں نے گورنر جنرل کی خدمت میں عرضی پیش کی اور اُس میں اہل برما کی بد سلوکی اور عداوت کی شکایتیں کیں۔ ڈلہوزی نے ایک جنگی جہاز تحقیقات کے واسطے روانہ کیا اور جب انگریزی مطالبات پر برما کے راجہ نے چنداں التفات نہ کی تو انگریزی سفیروں نے گفت و شنید بالائے طاق رکھ کر اپنے جہاز سے گولہ باری شروع کر دی اور ادھر ڈلہوزی نے بڑے اہتمام سے برما پر فوج کشی کی تیاری کی۔ اس جنگ میں

[1] ملاحظہ ہو کین کی "تاریخ ہند" جلد دوم صفحہ ۲۰۱۔ راجہ کی ذاتی املاک کی اسی غنیمت میں کوہ نور ہیرا بھی کمپنی کے ہاتھ آیا جو آج کل شاہان انگلستان کے تاج کا سب سے قیمتی جواہر ہے۔

انگریزی سپاہ کو کوئی بڑی لڑائی لڑنی نہ پڑی۔ راجہ اندرون ملک میں ہٹ گیا اور بندرگاہ رنگون پر انگریز قابض ہو گئے راجہ نے معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا مگر ملک مفتوحہ یعنی جنوبی برما یا پیگو پر انگریزی فوج کا قبضہ تھا لہٰذا ڈلہوزی نے اُس کے الحاق کا اعلان کر دیا اور وہاں کا انتظام براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔[1]

قانون بازگشت

لیکن ڈلہوزی کے عہد میں بیرونی ملک کا اتنا علاقہ کمپنی کو نہ ملا تھا جتنا خود ہندوستان کی معاون و زبردست ریاستوں کا قبضے میں آ گیا۔ اس کارروائی کے لئے ڈلہوزی نے ایک عجیب قاعدہ نکالا تھا جسے "قانون انقراض یا بازگشت" (Doctrine of lapse) کہتے ہیں۔ ڈلہوزی کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان کی سب ریاستیں حقیقت میں کمپنی کی ملک ہیں اور جب اُسے یہ حق حاصل ہے کہ جس رئیس کو چاہے گدی پر بٹھائے تو یہ بھی جائز ہے کہ جو رئیس لاولد فوت ہو اُس کی ریاست پر خود قبضہ کر لے خواہ متوفیٰ کے دوسرے رشتہ دار یا کوئی باقاعدہ لے پالک بیٹا موجود ہو۔ ڈلہوزی اُن کی وراثت کو ناجائز بتاتا تھا اور نظمائے کمپنی بھی اس کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ چنانچہ ستارا کا راجہ مرا تو اس کے لے پالک وارث کو محروم کر کے ریاست کا الحاق کر لیا گیا اور جیت پور، بھگت، سنبھل پور، ناگ پور وغیرہ سات ریاستوں پر یہی گزری۔ ان میں سب سے بڑی ریاست ناگپور کی تھی اور وہاں کے انگریز رزیڈنٹ نے بہت زور دیا تھا کہ اس ریاست کا "قانون بازگشت" کی بنا پر الحاق کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہ ہوگا" مگر اُس کی سب دلیلیں بے کار ثابت ہوئیں اُس کی تجاویز رد کر دی گئیں بلکہ تنبیہ کی گئی۔ ریاست ناگپور انگریزی کمشنری بن گئی۔

ایک اور قانون وضع ہوا جس کی رو سے کوئی ایشیائی اعلیٰ نسب اور قابلیت کے اعتبار سے کتنا ہی حق دار کیوں نہ ہو ایک ہزار پونڈ سالانہ مشاہرے کی سرکاری ملازمت سے بھی محروم رہ گیا۔

برار و اودھ کا الحاق

ہندوستان میں اگرچہ مسلمانوں کی بادشاہی کا خاتمہ ہو گیا تھا

---

[1] کین جلد دوم صفحہ ۲۰۶۔

لیکن ان کی دو بڑی ریاستیں ابھی تک باقی تھیں جن کی قوت رفتہ رفتہ بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ پس لندن سے نظمائے کمپنی بار بار تحریک کرتے تھے کہ ان ریاستوں کے وسیع و زرخیز علاقے لے لئے جائیں اور ان کے مسلمان رئیسوں کو وظیفے پر الگ کر دیا جائے ڈلہوزی سے بہتر اس خدمت کو انجام دینے والا شاید کوئی نہ ہو سکتا تھا اور اس نے الحاق برما سے فرصت پاتے ہی ریاست حیدر آباد کی طرف توجہ مبذول کی۔ انگریزی سپاہ متعینۂ حیدر آباد کے مصارف برداشت کرنے کے علاوہ نواب نظام الملک کو انگریز سرداروں کی ماتحتی میں ایک اور فوج بھی رکھنی پڑتی تھی جس کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور نیز کمپنی کے عہدہ دار شکایت کرتے تھے کہ نواب موصوف نے ریاست کے تمام انتظامات اپنے وزیروں کے سپرد کر دیئے ہیں جو کثیر شرح سود پر قرضہ لے لے کر ریاست کو زیر بار کئے ڈالتے ہیں۔ نظمائے کمپنی کی دانست میں یہ وجوہ ریاست حیدر آباد کا الحاق کرنے کے لئے کافی تھیں، مگر معلوم نہیں ڈلہوزی یکبارگی اتنا بڑا علاقہ لیتے ہوئے جھجکتا تھا یا کوئی اور سبب پیش آیا غرض اس نے نظمائے کمپنی کے منشاء کی پوری تعمیل نہ کی اور صرف ملک برار لینے پر اکتفا کی اس کے متعلق جو معاہدہ ہوا تھا (۱۸۵۳ء) اس کی رو سے برار ممالک محروسہ سرکار عالی ہی میں شامل رہا لیکن وہاں کا انتظام اور مالگزاری کمپنی کی تحویل میں آگئی کہ اس آمدنی سے مذکورۂ بالا فوجی مصارف پورے کر لے نیز اپنے انتظامی مصارف نکال کر باقی روپیہ سرکار عالی کے خزانے میں داخل کر دیا کرے۔

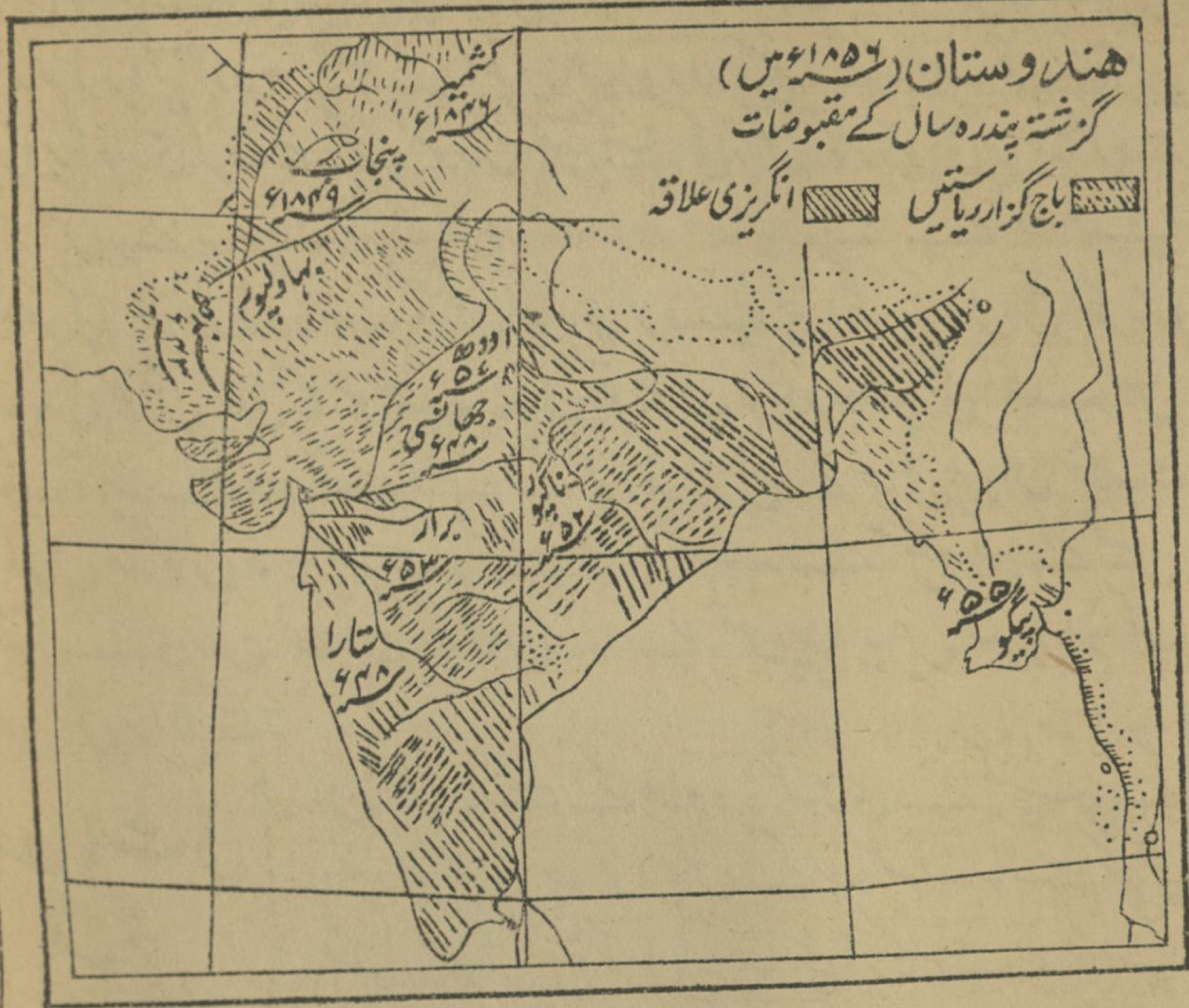
ریاست حیدر آباد سے یہ تصفیہ کرنے کے دو تین سال بعد اودھ کی بادشاہی کا خاتمہ کر دیا گیا اور وہاں کے بادشاہ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتے لے آئے (۱۸۵۶ء)۔ واضح ہو کہ ۱۸۳۷ء میں شاہان اودھ سے یہ عہد و پیمان ہو گیا تھا کہ اگر کمپنی بادشاہ کے انتظام کو بالکل خراب اور ناقابل اصلاح پائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ ریاست کا نظم و نسق انگریز رزیڈنٹ کی نگرانی میں لے لے۔ مگر اس صورت میں تمام عہدہ دار ہندوستانی ہی رہیں گے۔ اور جو کچھ آمدنی میں سے روپیہ بچے گا وہ بھی اودھ کے خزانے میں جمع ہوتا رہے گا۔ چند سال پہلے سر ہنری لارنس نے بھی یہ شرائط حکومت ہندوستان کو جتا دی تھیں۔ لیکن ڈلہوزی

ان باتوں کو ماننے والا شخص نہ تھا اور اگر اس نے مذکورۂ بالا معاہدہ کا حوالہ دیا بھی تو نظام کے کمپنی نے کوئی شنوائی نہ کی۔ اودھ کے بادشاہ کو جبراً بادشاہی سے محروم کر دیا گیا اور ہر ضلعے میں انگریز عہدہ دار پہنچ گئے۔ اور انگریزی آئین و ضوابط جاری کر دیئے گئے۔ مورخ کین کمپنی کی اس کارروائی پر معترض ہے کہ اس نے نہ صرف بے ضرورت اور معاہدے کے خلاف کام کیا بلکہ فوراً وہ سب آئین جاری کر دیئے جو انگریزوں کی نظر میں رعایا کی خوش حالی کا موجب ہوں تو ہوں۔ خود رعایا کی نظر میں ہتک آمیز تھے وہ لکھتا ہے کہ "گورنر جنرل کے خیال میں اس انقلاب سے لاکھوں بندگان خدا مسرت و آزادی کی نعمت سے متمتع ہوئے لیکن تھوڑے ہی دن بعد ان بندگان خدا نے جس پیرایہ میں شکریہ ادا کیا وہ بالکل نرالا تھا۔"[1]

خطابات کی منسوخی

ان الحاقات کے علاوہ ڈلہوزی نے کمپنی کے وظیفہ خوار راجہ نوابوں کے قدیم خطابات کو بھی فضول سمجھ کر منسوخ کر دیا۔ چنانچہ ارکاٹ کا نواب جس کے بزرگوں نے انگریزی حکومت کی ہندوستان میں گویا آبیاری کی تھی، اور تنجور کا راجہ دونوں کے ورثا آیندہ اپنے خطاب سے محروم کر دیئے گئے۔ معزول پیشوا باجی راؤ نے ۱۸۵۳ء میں وفات پائی اور اس کے وارث نانا صاحب کو ڈلہوزی نے اس وظیفے سے محروم کر دیا جو کمپنی باجی راؤ کو دیا کرتی تھی۔ دہلی کے نام نہاد بادشاہ کو بھی یہ اطلاع دے دی گئی کہ یہ خطاب اور قلعۂ معلیٰ کی حکومت صرف آپ کے دم تک ہے بعد میں کمپنی آپ کے جانشین کو نہ یہ خطاب دے گی نہ یہاں رہنے کی اجازت البتہ فیاضی کے ساتھ ایک معقول وظیفہ جاری کر دے گی۔

[1] صفحہ ۲۰۸ و ۲۰۹۔



اندرونی انتظام اور ہند سے رخصت

ڈلہوزی نے امور عامہ کا نیا محکمہ قائم کیا اور سررشتۂ ڈاک میں بعض آسانیاں پیدا کیں۔ لیکن اس کے زمانے کی سب سے مشہور تجاویز وہ ہیں جو سر چارلس ووڈ نے انگلستان سے بھیجیں اور "تعلیمی مراسلے" کے نام سے موسوم ہوئیں۔ ان میں ہر صوبے کے اندر ایک یونیورسٹی اور کالج بنائے جانے کا خاکہ پیش کیا گیا تھا اور خانگی مدارس کو سرکاری امداد دینے کے قواعد تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈلہوزی کی اصلی مصروفیت اور وجہ شہرت اس کے وہی کام تھے جن کا ہم اوپر ذکر پڑھ آئے ہیں۔ اس کے زمانے میں کمپنی کے مقبوضات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے اور اسی وجہ سے اوّل اوّل اس کی بہت تعریفیں ہوتی رہیں۔ لیکن جب سال دو سال کے بعد ہی

ہندوستان میں وہ عظیم الشان ہنگامہ بپا ہوا جسے "غدر ۵۷ء" کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ انگلستان کے بہت سے اہل الرائے ڈلہوزی کے سخت مخالف ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے حق میں یہ کانٹے اسی نے بوئے تھے جو بعد میں پھلے۔ یہ حمایت اور مخالفت ابھی تک موجود ہے اور اکثر نئے مصنف ڈلہوزی کو انصاف و دین داری ذہانت و دور اندیشی، اعلیٰ قابلیت اور قوم پرستی کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اس کی ان تحریروں پر جن میں اس نے فوجی قوت کے بڑھانے پر زور دیا تھا عمل کیا جاتا تو انگریزوں پر یہ مصیبت کبھی نہ پڑتی جو ۱۸۵۷ء میں پڑی۔ لیکن ڈلہوزی کے متعلق رائے قائم کرنے میں اگر ہم کنن کی پیروی کریں تو اس کے کاموں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد اس کے پیشرو ڈال گئے تھے اور اس نے تکمیل کی، جیسے الحاق پنجاب، اودھ اور برما۔ دوسرے وہ جن کی خود ڈلہوزی نے بنیاد ڈالی۔ جیسے قانون بازگشت یا قدیم خطابات کی منسوخی۔ اور سرسری غور کرنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلی خدمت اس نے بہت بری طرح انجام دی۔ دوسری قسم کے کام اس کی بے انصافی ظاہر کرتے ہیں جن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی۔ قانون بازگشت خاص ڈلہوزی کا طبع زاد تھا اور دو ہی سال بعد ملکۂ وکٹوریہ نے عام اعلان کے ذریعے اس کو منسوخ و باطل ٹھہرایا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈلہوزی کوئی دور اندیش یا مصلحت شناس حاکم نہ تھا۔ البتہ اب جبکہ ۵۷ء کا واقعہ دلوں سے محو ہو چکا ہے اور ڈلہوزی اور اس کے معاصرین کا دور ختم ہوئے سالہا سال گزر گئے ہیں اگر انگریزوں کی موجودہ نسلیں اسے اپنا محسن سمجھیں، تو یہ کچھ حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ وسائل جائز تھے یا ناجائز، ان کی بدولت بہت بڑا علاقہ انگریزوں کی عملداری میں ضرور داخل ہو گیا بلکہ کہنا چاہیے کہ ہندوستان کے اچھے سے اچھے قطعات کے وہ مالک بن گئے۔ بایں ہمہ گو ڈلہوزی اپنی قوم کا بھلا کر گیا مگر خود اس کا انجام اچھا نہ ہوا۔ یعنی جسمانی صحت خراب ہو گئی بیوی کو بہت عزیز رکھتا تھا وہ داغ مفارقت دے گئی غرض اس کی حالت ایسی ردی تھی کہ جب ۵۷ء کا ہنگامہ ہوا اور لوگوں نے جا و بیجا

حملے کیے تو وہ اُن کا کوئی جواب تک نہ دے سکا اور سخت مصائب و تکالیف برداشت کرکے سینتالیس، اڑتالیس برس کی عمر میں مرگیا۔

لارڈ کے ننگ ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۲ء

ڈلہوزی کا جانشین کے ننگ منتخب ہوا اور لندن سے چلتے وقت اُس نے حسب دستور جو تقریر رخصتی ضیافت کے موقع پر کی تھی اُسے بعد کے واقعات نے یادگار بنا دیا ہے۔ کیونکہ اثنائے تقریر میں اُس نے کہا تھا کہ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستان کا مطلع بظاہر کیسا ہی صاف کیوں نہ نظر آتا ہو' یہ ممکن ہے کہ وہاں یک بیک کوئی بادل اُفق پر نمودار ہو جائے جو اوّل اوّل کف دست سے بڑا نہ ہو لیکن پھیلتے پھیلتے سارے آسمان پر چھا جائے اور آخرکار ہماری سلامتی کو خطرے میں ڈال دے" سچ پوچھیے تو اس قسم کے خطرات محض خیالی نہ تھے بلکہ ہندوستان میں عام ہل چل کے اسباب موجود تھے اور ایک انگریز مصنف کے الفاظ میں "ڈلہوزی ہندوستان سے رخصت ہوا ہے تو ملک کی حالت آتش فشاں پہاڑ کی سی تھی" اور اس آتش فشاں کا بہت جلد ہیجان میں آجانا کچھ بھی بعید از قیاس نہ تھا۔

"غدر ۱۸۵۷ء"

کے ننگ کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ اُسے ہندوستان میں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ملک میں وہ ہنگامۂ قیامت بپا ہو گیا جسے عام طور پر "غدر ۱۸۵۷ء" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس خونی جدوجہد میں زیادہ حصہ اُن ہندوستانی سپاہیوں کا تھا جو انگریزوں سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ ان سپاہیوں کی ناراضی کے اسباب بہت معمولی اور اکثر غلط فہمی پر مبنی تھے اور انھیں انقلاب سلطنت کا اگر ارمان تھا بھی تو شعور نہ تھا اور اودھ یا ہندوستان خاص کے چند اضلاع کے سوا، عام رعایا یا طبقۂ اعلیٰ کے افراد نے کہیں بھی اس جنگ و جدال میں شرکت نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ فوجوں نے اپنے انگریز عہدہ داروں کو مار مار کر دل ٹھنڈا کر لیا تو پھر یہ آگ جس قدر جلد بھڑکی تھی اُسی قدر جلد سرد ہو گئی اور صرف تین مقامات یعنی کانپور۔ لکھنؤ اور دہلی میں سمٹ آئی جہاں کچھ روز تک جم کر مقابلہ ہوتا رہا۔ کانپور میں اہل شورش کو نہایت مستعد سرغنہ ملا تھا یعنی باجی راؤ کا لے پالک بھتیجا نانا صاحب' جسے اپنے وظیفے کے بند ہونے کا سخت غصہ اور پیشوا بننے کا

شوق تھا، جون ۱۸۵۷ء میں اس نے اپنے باغی سپاہیوں کا لشکر لے کر کانپور کے گورہ سپاہیوں کو گھیر لیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ تین ہفتے کے بعد گوروں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ انھیں براہ دریا الہ آباد جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ مگر اُن کے کشتیوں میں سوار ہوتے ہی ناناصاحب کی سپاہ نے دونوں کناروں سے آگ برسادی اور جو مرد زندہ بچے تھے انھیں گرفتار کرکے گولی ماردی۔ عورتیں اور بچے حراست میں لے لیئے گئے تھے لیکن جب انگریزی فوج آپہنچی اور نانا کو شہر کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو کہتے ہیں کہ اس نے یا اُس کے رفیقوں نے کمال بے دردی سے اُن عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرادیا۔

لکھنؤ کی رزیڈنسی کو بھی ہزاروں ہندوستانی سپاہیوں نے گھیر لیا تھا (جولائی ۱۸۵۷ء) اور وہاں کا رزیڈنٹ سرہنری لارنس، اُسی محاصرے کے دوران میں گولے کا زخم کھاکر مارا گیا۔ ستمبر کے مہینے میں انگریز سپہ سالار ہےوے لاگ لڑ بھڑ کر رزیڈنسی کے اندر تو پہنچ گیا لیکن پھر نکل نہ سکا اور جب تک بہت بڑی فوج امداد کے لیئے نہ آئی، ان محصورین کی گلوخلاصی نہ ہوئی۔ اس اثناء میں نانا صاحب کے مشہور سردار تانتیا توپی نے انگریزی فوج کو شکست دے کر پھر کانپور پر قبضہ کر لیا مگر تسخیر لکھنؤ کے بعد انگریزی سپاہ نے اس پر حملہ کیا اور شہر کو دوبارہ چھین لیا۔

باغی سپاہیوں کی سب سے زیادہ تعداد دہلی میں جمع ہوئی جہاں انھیں یہ آرزو کھینچ لائی تھی کہ ہندوستان کے نام نہاد بادشاہ کو صحیح معنی میں دوبارہ فرمانروا بنایا جائے۔ لیکن ضعیف العمر بہادر شاہ میں نہ یہ جرات تھی نہ قابلیت کہ اس موقع پر ہاتھ پاؤں ہلاتا۔ بے سری فوجیں تھوڑے دن بعد خود بخود بے دل ہونے لگیں اور تھوڑی سی انگریزی سپاہ نے دہلی کو آکر گھیر لیا تو اُس وقت بھی باغی سپاہی مل کر کوئی بڑا حملہ نہ کر سکے کیونکہ ان میں اتحاد عمل مفقود تھا۔ آخر جب پنجاب سے سکھوں اور سرحدی پٹھانوں کی تازہ بھرتی کی ہوئی فوج آپہنچی تو انگریزی سپہ سالار نے شہر پر دھاوے کا حکم دیا اور چند روز بازاروں میں کشت وخون کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا (ستمبر ۱۸۵۷ء) شہر کے لوگ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے اور اُن پر ایسی سخت مصیبت پڑی کہ نادر شاہ یا احمد شاہ کے وقت میں بھی نہ پڑی تھی۔ بہادر شاہ اور بعض شاہزادے ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے تھے۔ اسی مقام پر گرفتار ہوئے اور شہزادوں کو گولی ماردی گئی۔

خود بہادر شاہ کو رنگون بھیج دیا گیا اور اُنھوں نے زندگی کے باقی دن اسی جلا وطنی اور تکلیف میں گزارے حالانکہ اس بے گناہ کا اس جنگ و فساد میں کوئی حصہ نہ تھا۔

شہر دہلی کی فتح سے انگریزوں کی سلطنت کو جو پچھلے چند ماہ میں متزلزل نظر آنے لگی تھی، بڑی تقویت پہنچی اور دشمن کا اب کوئی خاص مرکز جہاں اُس کی بڑی تعداد جم کر مقابلہ کرتی۔ اس کے سب جتھے ٹوٹ گئے اور چھوٹے چھوٹے گروہ جو باقی رہے انھیں مغلوب کرنا زیادہ دشوار نہ تھا اگرچہ تانتیا توپی اور جھانسی کی رانی نے کچھ عرصے تک انگریزی فوج کو سخت پریشان کیا اور بعض مقامات پر زک دی۔ ان کی کوشش سے اندور و گوالیار میں بھی بعض دستے انگریزوں سے بگڑ گئے اور اپنے افسروں کو مار ڈالا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سب فتنے فرو ہو گئے، جھانسی کی رانی لڑائی میں مردانہ وار لڑتی ہوئی کام آئی۔ ۱۸۵۹ء میں تانتیا توپی کو کسی رازدار نے دغا سے گرفتار کرادیا اور اُسے پھانسی دے دی گئی صرف ناناصاحب وہ شخص ہے جو انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا اور ترائی کے جنگلوں میں چھپ کر غائب ہو گیا۔

اس فسادِ عظیم کے وقت اڑیسہ، ناگپور، بمبئی اور جنوبی ہند کے وسیع علاقوں میں بالکل امن و امان رہا۔ ریاست حیدرآباد کے نامور وزیر سر سالار جنگ نے انگریزوں کو مدد بھیجی، ریاست نیپال نے بھی کچھ امدادی فوجیں بھیجیں اور سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ سکھوں نے بھی اپنے نو وارد آقاؤں کا ساتھ دیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کے یہ جنگجو انگریزی فوج میں بھرتی نہ ہو جاتے تو لڑائی کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ بہر حال ۱۸۵۸ء کے اخیر تک یہ خوفناک شورش قریب قریب ختم ہو گئی تھی اور اعلان عام کر دیا گیا تھا کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر چلے آئیں اب ان سے کوئی باز پرس نہ ہوگی مگر اس سے بھی زیادہ اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ نے بالاتفاق ہندوستان کو براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت لے لینے کا فیصلہ کر لیا اور اگست ۱۸۵۸ء کے قانون کی رو سے یہاں کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی۔

لہ اول اول جا بجا فوجی عدالتیں قائم کر دی گئی تھیں، اور لوگوں کو خفیف شبہات پر بھی سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ ۱۲

پچھلے دو باب کے مشہور واقعات و سنین

سنہ	واقعات ہند	بیرون ہند
۱۸۰۵ء	کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آتا ہے۔	نپولین بوناپارٹ کی شہنشاہی کا اعلان فرانس میں۔
۱۸۰۵ء	بارلو کارنوالس کا جانشین ہوا۔	
۱۸۰۶ء	ویلور کا فساد۔	
۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء	منٹو گورنر جنرل مقرر ہوا۔	
۱۸۰۹ء	رنجیت سنگھ اور امیران سندھ سے دوستانہ معاہدے۔	
۱۸۱۳ء	کمپنی کے شاہی فرمان کی تجدید۔	
۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء	ہیسٹنگز (یا موئرا) کا زمانہ۔	
۱۸۱۴ء تا ۱۸۱۶ء	جنگ نیپال اور عہدنامۂ سگولی۔	۱۸۱۵ء نپولین کی حکومت کا خاتمہ
۱۸۱۷ء	پنڈاروں کا استیصال۔	
۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء	مرہٹوں سے تیسری جنگ: باجی راؤ نے اطاعت قبول کی۔	
۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء	ایمہرسٹ کا زمانہ۔	
۱۸۲۴ء تا ۱۸۲۶ء	پہلی جنگ برما، اراکان کا الحاق۔	۱۸۲۵ء نکولس اول کی تخت نشینی ملک روس میں۔
۱۸۲۷ء	بھرت پور کی تسخیر۔	
۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء	ولیم بن ٹنگ کا زمانہ۔	
۱۸۲۹ء	ستی کا انسداد۔	
۱۸۳۱ء	ریاست میسور کمپنی کی نگرانی میں لے لی گئی۔	
۱۸۳۳ء	کمپنی کے فرمان کی تجدید۔	
۱۸۳۴ء	ریاست کورگ کا الحاق۔	

۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۶ء مٹکاف کا زمانہ اور اخبارات کی آزادی۔	۱۸۳۷ء ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی
۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء اوک لینڈ کا زمانہ۔	
۱۸۳۹ء افغانستان پر پہلی فوج کشی۔	
۱۸۴۱ء کابل سے انگریزی سپاہ کی پسپائی اور تباہی۔	
۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء ایلن برو کا زمانہ۔	
۱۸۴۲ء افغانستان کی دوسری مہم۔	
۱۸۴۳ء ملک سندھ کا الحاق۔	
" گوالیار پر فوج کشی۔	
۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء سر ہنری ہارڈنگ کا زمانہ۔	
۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء سکھوں سے پہلی جنگ۔	
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء ڈلہوزی کا عہد حکومت۔	
۱۸۴۸ء سکھوں سے دوسری جنگ۔ ملتان کا محاصرہ۔	
۱۸۴۹ء جنگ گجرات اور ملک پنجاب کا الحاق۔	
" ریاست ستارا کا الحاق۔	
۱۸۵۲ء جنگ برما اور پیگو کا الحاق۔	
۱۸۵۳ء ریاست ناگپور کا الحاق۔	
" برار پر انگریزی تصرف۔	
	۱۸۵۵ء الکزنڈر دوم کی تخت نشینی روس میں۔
۱۸۵۶ء ملک اودھ کا الحاق اور واجد علی شاہ کی معزولی۔	
۱۸۵۶ء کیننگ گورنر جنرل مقرر ہوا۔	
۱۸۵۷ء کلکتہ، مدراس اور بمبئی یونیورسٹی کی بنا پڑی۔	
۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء ہندوستان کا عظیم ہنگامہ۔	
۱۸۵۸ء کمپنی کی حکومت کا خاتمہ (اگست) ملکۂ وکٹوریہ کا اعلان ہندوستان میں (نومبر)	

باب ششم

شاہانِ برطانیہ کا عہدِ حکومت

۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۲ء

نئے آئین اور اعلانِ شاہی

قانون مجریہ ۱۸۵۸ء کی رُو سے ہندوستان کی حکومت نے ایک نئی صورت اختیار کر لی مجلس نظارت و نظمائے کمپنی کی بجائے وزیر ہند Secretary of State for India کا عہدہ قائم کیا گیا اور ہندوستان کے معاملات میں مشورہ دینے کی غرض سے ایک نئی کونسل یا مجلس بنی جس میں بکثرت تعداد ایسے اراکین کی ہوتی تھی جو کم سے کم دس برس ہندوستان میں رہ چکے یا ملازمت کر چکے ہوں۔ کمپنی کے گورنر جنرل کے خطاب میں "نائب شاہ" یا وائسرائے کا اضافہ ہوا اور اس کا تقرر شاہی منظوری سے کیا جانے لگا۔ وزیر ہند سلطنت برطانیہ کی مجلس وزرا کا رکن ہوتا تھا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہندوستان کے معاملات کی اب مجلس وزارت براہ راست ذمہ دار قرار پائی اور پارلیمنٹ انگلستان کے اراکین کو اس سے باز پرس کرنے کا حق ہو گیا۔

اس جدید آئین کا ملکۂ وکٹوریہ کی جانب سے ماہ نومبر میں اعلان ہوا تھا اور یہ شاہی اعلان اہل ہند کو جو حقوق دینے کا وعدہ کرتا ہے ان کی بنا پر اسے کبھی کبھی ہند کا

"میگنا کارٹا" "یعنی منشور اعظم" موسوم کرتے ہیں۔ ڈلہوزی کی حکمت عملی نے انگریزوں کی طرف سے یہاں کے ادنیٰ اعلیٰ سب کو سخت بدظن کر دیا تھا اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ چند سال سے نظمائے کمپنی اور انگلستان کے اکثر اہل الرائے اپنے مقبوضات بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور دیسی ریاستوں کی بدانتظامی یا پس ماندگی، غرض ہر حیلے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے علاقے چھیننے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی خونریزی آسانی سے فراموش ہونے والی شے نہ تھی۔ جو علاقے کمپنی پہلے لے چکی تھی انھیں واپس کرنا تو کسی کو منظور نہ تھا اور سات آٹھ مہینے کی جنگ و جدال کے بعد لوگ بھی قابو میں آ گئے تھے تاہم ان کی بدگمانی اور باطنی عداوت کو دور کرنا ضروری تھا اور اس لئے مذکورۂ بالا اعلان میں سب سے اول ہندوستان کے راجہ، نوابوں ہی کو یہ اطمینان دلایا گیا تھا کہ آئندہ اُن کے حقوق و مراتب میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کی جائے گی اور جاگیرداروں کے دعوے پر بھی انصاف و توجہ کے ساتھ غور ہوگا۔ یہی بات کیننگ نے (جو اب ہند کا پہلا وایسرائے ہو گیا تھا) دل نشین کرنے کی کوشش کی اور جا بجا بہت سے درباروں میں، اور خطوں میں اعلان کیا کہ خود مختار رئیسوں کے لے پالکوں کو ان کا صحیح وارث تسلیم کیا جائے گا اور کسی ریاست کے حکمراں خاندان کا استیصال جائز نہیں سمجھا جائے گا، پھر اس نے اودھ کے تعلقداروں کی تالیف قلوب کی جو سب سے زیادہ پریشان اور بدظن ہو رہے تھے اور جن کے متعلق پہلے سخت قوانین جاری کرنے کی تجویز تھی۔ کیننگ نے ان کی جاگیرداری کے اکثر حقوق محفوظ کر دیئے، اگرچہ چند سال بعد ان پر بعض قیود عائد کر دی گئیں اور کیننگ نے جو رعایتیں ۱۸۵۹ء میں کی تھیں ان میں اس کے جانشین کے وقت میں تخفیف کر دی گئی۔

اعلان شاہی میں ہندوستانی رعایا کو کامل مذہبی آزادی دیئے جانے کا عہد تھا۔ یعنی یہ کہ سرکار ان کے عقائد یا دینی رسموں میں ہرگز کسی قسم کی دست اندازی نہ کرے گی اور ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا نہ یہ امر اس کے قانونی حقوق اور سرکاری حفاظت میں رہنے کے مانع ہوگا اسی سلسلے میں یہ بھی تحریر تھا کہ سرکاری ملازمت اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دینے میں کسی نسل و ملت کا امتیاز نہ کیا جائے گا بلکہ جو شخص اپنی تعلیم و تربیت اور لیاقت و

اوصاف کی بنا پر کسی خدمت کے انجام دینے کی قابلیت رکھتا ہے اسے بغیر کسی تعصب وتامل کے ہر قسم کے عہدے پر مقرر کیا جا سکے گا۔

اس اعلان میں ۱۸۵۷ء کے تمام مجرموں کو سوائے خونیوں کے عام معافی دی گئی تھی اور اس کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ہندوستان کے انگریز عہدہ داروں کا ایک گروہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد چاہتا تھا کہ ہندوستانیوں پر بہت سختی کی جائے اور ان کے چھوٹے سے چھوٹے قصور کا شدید انتقام لیا جائے حتیٰ کہ جب کیننگ نے اس بارے میں زیادہ گرم جوشی نہ دکھائی تو کلکتے کے انگریزوں نے اس پر اعتراض کیے اور ولایت عرضی لکھ کر بھیجی کہ اس کو واپس بلا لیا جائے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ خود کیننگ کے الفاظ میں "قانون اور سلطنت میں جس قدر قوت تھی اس حد تک سختی کرنے میں" اس نے کوئی باک نہ کیا اور انگریزی فوج یا عہدہ داروں کے تشدد کے دو ایک افسانے آج بھی شمالی ہندوستان کی ہر بستی میں محفوظ ہیں اور انھیں بیان کرنے والے وہ لوگ بھی شاید مل جائیں گے۔ جنھوں نے یہ مصیبتیں اپنی آنکھ سے دیکھی یا خود جھیلی ہیں۔

قانونی اور مالی انتظامات

اسی زمانے میں وہ مجموعۂ قوانین مرتب ہوا جس پر میکالے کی صدارت میں ایک جماعت کئی سال سے غور وبحث کر رہی تھی اور جسے "تعزیرات ہند" کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۱۸۶۱ء میں اس کا ہر جگہ نفاذ ہو گیا اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جو قوانین وضوابط جاری تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے۔ ضابطۂ فوجداری ودیوانی بھی انھی ایام میں مرتب اور نافذ ہوئے اور ہر بڑے صوبے کے صدر مقام پر الگ الگ عدالت ہائے عالیہ قائم کر دی گئیں (۱۸۶۱ء) اسی سال مجلس وضع قوانین میں بھی توسیع ہوئی اور اس میں چند غیر سرکاری اراکین کا اضافہ کیا گیا جسے ہندوستان میں نیابتی طرز حکومت کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے اگرچہ ابھی تک غیر سرکاری اراکین کو اہل ملک منتخب نہیں کرتے تھے بلکہ وائسرائے اپنی پسند سے جسے چاہتا اسے رکنیت کے لیے نامزد کر دیتا تھا۔

ان دنوں ایک دقت ملکی آمد وخرچ کا موازنہ (بجٹ) تیار کرنے میں پیش آ رہی تھی ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں انگریزی خزانہ خالی ہو گیا تھا اور اب سرکار کو

قرضہ ملنا بھی دشوار تھا آمدنی کم اور مصارف کی بیشی کیننگ کو پریشان کئے دیتی تھی اور انھی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے وزیر ہند نے ایک ماہر کو بھیجا تھا کہ ہندوستان کے مالیات (فینانس) کی اصلاح و درستی کرے۔ اس شخص نے ملک میں دورہ کیا اور دفتری کاروبار میں بہت سی آسانیاں پیدا کیں لیکن مصارف کی بیشی اس طرح دور نہ ہو سکتی تھی اور سرکار کو کئی ٹیکس لگانے پڑے جن کی سخت مخالفت ہوئی۔ بیرونی تجارت پر جو محصول وہ لگانا چاہتا تھا اس کی تجویز انگریز سوداگروں نے نہ چلنے دی البتہ "انکم ٹیکس" یعنی لوگوں کی آمدنی پر محصول لگا دیا گیا جس سے سرکاری مداخل میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا۔

سرحدی جھگڑے اور اڑیسہ کا قحط

کیننگ کے وقت سے ہی ہندوستان میں اندرونی جنگ پیش آنے کے خطرات زائل ہو گئے تھے اور اس کے تین جانشینوں کو بھی کوئی بڑی لڑائی پیش نہ آئی۔ ۱۸۶۲ء میں وہابیوں پر فوج کشی کرنی پڑی یا دو سال بعد ریاست بھوٹان سے جنگ چھڑی تو یہ بیرونی لڑائیاں تھیں اور ان سے ہندوستان کے امن و امان میں کوئی رخنہ نہیں پڑا۔

(۱) وہابیوں نے شمال مغربی سرحد پر اپنا مستقر بنا لیا تھا اور اس طرف کے آفریدی پٹھان اور ہندوستان کے بہت سے پُرجوش مجاہد وہاں جمع ہو گئے تھے جن کے حملہ کرنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا تھا۔ ان فدائیان مذہب کے استیصال کی غرض سے جو انگریزی فوجیں روانہ ہوئی تھیں انھیں کئی مرتبہ زک ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن آخر میں جب کچھ پٹھان سردار انگریزوں سے مل گئے اور مجاہدین کے لشکر میں نفاق ہوا، تو انگریزی لشکر "مہابن" کے علاقے میں ان کے بڑے قلعے تک جا پہنچا اور اسے آگ لگا دی باایں ہمہ انگریز مدبرین وہاں مستقل قدم جمانے کو مخدوش جانتے تھے اس لئے بہت جلد فوجیں واپس بلائیں اور وہابی مجاہدین کے منتشر کر دینے ہی پر اکتفا کی گئی۔

(۲) بھوٹان کے لوگ اپنی پہاڑیوں سے اُتر اُتر کے انگریزی علاقوں پر یورش کرتے رہتے تھے اور جب اُن کے راجہ کے پاس سفارت بھیجی گئی تو اس کے درباریوں نے انگریزی سفیر کی خوب ہنسی اُڑائی اور کہا جاتا ہے کہ جبراً ایک

عہد نامے پر دستخط کرا لیے (۱۸۶۴ء) بیچارے سفیر نے جس طرح ممکن ہوا اپنی جان بچائی اور اُس کے کلکتے پہنچنے کے چند ماہ بعد بھوٹان سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر اس جنگ میں کوئی بڑی لڑائی پیش نہ آئی اور انگریزوں نے اندرونی علاقے میں دور تک بڑھنے کی بجائے صرف سرحدی دروں کو مورچہ بند کر لیا پھر اس شرط پر صلح کر لی گئی کہ بھوٹان والے چند جنوب مشرقی اضلاع سے لا دعویٰ ہو جائیں گے اور اس کے معاوضے میں حکومت ہندوستان انھیں تقریباً ایک لاکھ روپیہ سالانہ ادا کر دیا کرے گی جسے وہ از راہ فخر "خراج" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

انھی ایام میں انگریزی عہد کا دوسرا خوفناک قحط اڑیسہ میں پڑا جہاں اول خشک سالی کی وجہ سے فصلیں جل گئیں اور دوسرے سال سیلاب اور پانی کے طوفان نے کھیتی کا ناس کر دیا۔ اس کثرت باراں کی وجہ سے وہاں رسد پہنچنے میں سخت دقت پیش آئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ (کینن صاحب کی روایت کے بموجب) صوبہ کی کل آبادی میں سے ایک چوتھائی یعنی دس لاکھ آدمی فاقہ کشی کے باعث ہلاک ہو گئے (۱۸۶۶ء) اور عرصۂ دراز تک ملک نہ پنپ سکا۔

صوبوں کا مالی انتظام

لارڈ میو کے زمانے میں (۱۸۶۹ء تا ۷۲ء) ہندوستان کے مصارف و مداخل میں توازن قائم کرنے کی شدید ضرورت لاحق ہوئی کیونکہ کئی سال سے حکومت کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو جاتا تھا۔ پچھلے بیس سال کے عرصے میں جب سے ہندوستان کے بعض وسیع علاقوں کا کمپنی کے مقبوضات میں الحاق ہوا، ملکی آمدنی دگنی ہو گئی تھی لیکن اسی نسبت سے مصارف میں بھی اضافہ ہوا تھا اور انگریز اہل الرائے کو سخت فکر تھی کہ کسی طرح ان میں کمی اور مداخل میں اضافے کی صورت نکالی جائے۔ میو نے اپنے عہد میں سب سے زیادہ اسی معاملے پر توجہ کی اور امور عامہ کا خرچ قریب قریب بالکل اڑا دیا۔ فوجی مصارف میں بھی اس نے کسی قدر تخفیف کی اور ادھر آمدنی کی بیشی کے لیے "انکم ٹیکس" کی شرح بڑھا دی جو پہلے ہی لوگوں کو بہت شاق تھا۔ اس نے محصول نمک میں بھی اضافہ کیا تھا اگرچہ غالباً اس محصول سے آمدنی میں اتنی بیشی نہ ہوئی جتنی کہ غریب غربا کو تکلیف ہوئی۔ مگر ان مالی انتظامات میں

اس کی سب سے بڑی اصلاح اس کو سمجھنا چاہیئے کہ صوبوں کی مقامی حکومتوں کے مصارف کی حد بندی کی اور پولیس، تعلیمات وغیرہ چند محکمے ان کے سپرد کردیئے اور اختیار دیا کہ حکومت اعلیٰ کی منظوری سے وہ مقامی محصولات لگا سکتی ہیں۔ ان صوبوں کے مصارف کے متعلق ابھی تک کوئی ضابطہ نہ تھا اور وہ جس قدر روپیہ چاہتیں سرکاری خزانے سے طلب کر لیتی تھیں، خود اُن کے حکام کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہوتا تھا نہ مصارف کے لیئے کوئی سالانہ رقم مقرر تھی نتیجہ یہ تھا کہ جن صوبوں کے حکام زیادہ مسرف اور بیباک ہوتے تھے وہ بہت سا روپیہ "شاہی خزانے" سے حاصل کر لیتے اور اگر نہ دیا جاتا تو تقاضے کر کر کے گورنر جنرل کو پریشان کر دیتے تھے۔ اور جہاں کے حکام تقاضے کرنا پسند نہ کرتے تھے وہ صوبے خسارے میں رہ جاتے۔ میئو نے آئندہ سے ہر صوبے کے واسطے ایک رقم معین کر دی اور اسے وایسرائے کی منظوری لیئے بغیر خرچ کرنے کا اختیار دیا جس سے کام میں بہت سہولت ہوگئی اور سرکاری موازنے میں بھی خرچ کی ایک بڑی مد معین ہوگئی جس میں کمی بیشی کا اندیشہ نہ رہا۔

ملک میں نئی تحریکیں

اب ہندوستان کے ہر گوشے میں مغربی آئین جاری تھے انگریزی تعلیم پھیل رہی تھی انگریزی تصانیف اور اخبارات کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور یورپ کے نئے تمدن کے جلوے ہر طرف نظر آنے لگے تھے۔ ان اسباب کا اہل ہند کے خیالات اور معاشرت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا اور ہم اسی زمانے میں بعض نئی تحریکیں ہوتی دیکھتے ہیں جن کے بانی خیالات جدیدہ سے متاثر ہوئے اور اپنے اپنے طرز پر ہم وطنوں کی اصلاح میں کوشاں تھے ان میں بابو کیشب چندر سین بہت مشہور شخص ہوا ہے جس نے فرقہ "برہمو سماج" کی بناڈالی۔ ہندوؤں میں مذہبی اصلاح کی یہ تحریک درحقیقت راجہ رام موہن رائے نے شروع کی اور بُت پرستی چھوڑ کر وحدانیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن بابو کیشب چندر نے ان اصول کو مرتب شکل میں اہل وطن کے سامنے پیش کیا اور باقاعدہ ایک مذہبی فرقہ بنایا جس کے پیرو اب بھی بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس مذہب میں دنیا کے تمام مذہبوں کے بانیوں کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اور یہ لوگ کسی کو بُرا نہیں کہتے

عبادت کی ان کے ہاں کوئی خاص صورت لازمی نہیں ہے اور صرف خدا تعالیٰ اجل شانہٗ کو وحدہ لاشریک ماننا کافی سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان خاص کے علاقوں میں جو مذہبی اصلاح سوامی دیانند سرستی نے شروع کی اُس کی نوعیت دوسری ہے۔ سوامی دیانند ویدوں کی قدیم تعلیم کو رواج دینا چاہتے تھے۔ "آریہ سماج" فرقے کی انھیں نے بنا رکھی جو بت پرستی کو ناجائز کہتے ہیں اور وحدانیت کے قائل ہیں اگرچہ خدا، روح اور مادہ یہ تینوں چیزیں اُن کے ہاں ازلی مانی جاتی ہیں۔ دیانند جی نے اپنی تحریروں میں دوسرے مذہبوں کی تردید اور مذمت کی تھی اور اسی لئے عیسائی، مسلمان اور قدیم خیالات کے ہندو غرض سب سے آریہ سماجیوں کی مخالفت ٹھن گئی اور چند سال پہلے تک سخت مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے۔

اس عہد کا تیسرا مشہور مصلح سید احمد خاں کو سمجھنا چاہیئے جو دِلّی کے خاندانی امیرزادے تھے اور بہت دن تک سرکار انگریزی کی ملازمت میں رہے۔ اپنے ہم وطن مسلمانوں کے عبرتناک زوال کا ان کے دل میں درد تھا اور وہ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ اگر چند روز تک یہی حالت رہی تو ہر ملک میں جہاں سات سو برس تک اس کروفر سے حکمرانی کی تھی مسلمان نہایت ذلیل و خوار ہو جائیں گے اور شاید آخر میں ان کا نام و نشان اسی طرح مٹ جائے گا۔ جیسے ہندوستان کی قدیم دراوڑی قوموں کا مٹ گیا۔ واقعی زوالِ سلطنت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اخلاقی، ذہنی اور تعلیمی حالت میں جو انقلاب ہوا اور جس کا اندازہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہایت مایوس کن تھا۔

اس مختصر بیان کو پڑھنے کے بعد غالباً سید احمد خاں کی کامیابی کا راز سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ انھوں نے مسلمانوں کی دنیاوی حالت کو درست کرنے کا سامان کیا یعنی سخت کوشش کی کہ وہ انگریزوں سے میل جول اور مغربی تعلیم اور سرکاری ملازمت پر مائل ہوں۔ ۱۸۶۹ء میں سید صاحب خود ولایت گئے اور وہیں اپنے فرزندوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ پھر ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ کا افتتاح کیا تاکہ وہ مسلمان جو مغربی تعلیم کی ضرورت کو سمجھتے تھے مگر انگریزی مدرسوں میں اپنے

لڑکوں کو داخل کرتے جھجکتے تھے اس کالج سے فایدہ اٹھاسکیں۔ یہ بہت بڑا کام تھا جسے سرکار انگریزی نے پسند کیا اور مسلمانوں میں بھی ایک چھوٹا سا گروہ سید صاحب کا معین و مددگار بن گیا۔ سید صاحب کی تحریر و تقریر اور ان کے نامور ہم نشین مولانا حالی کی زندۂ جاوید نظموں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہلچل ڈال دی اور گو پرانے خیال کے مسلمانوں نے بہت کچھ مخالفت کی مگر جہاں تک سید صاحب کی تعلیمی جد و جہد کا تعلق ہے۔ ان کی تحریک خاطر خواہ کامیاب ہوئی اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں مغربی علوم کی جس قدر ترویج نظر آتی ہے یہ سب انھی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

دربار قیصری اور جنوبی ہند کا قحط

انھی دنوں لارڈ لٹن[1] کے عہد میں (۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۰ء) انگلستان کی پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملکہ وکٹوریہ کو "قیصرۂ ہند" کا لقب دیا جائے اور اس کے اعلان کی رسم ہندوستان میں اس طرح منائی گئی کہ دہلی میں پہلی جنوری ۱۸۷۷ء کے دن بہت بڑا دربار منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے راجہ نواب بڑے بڑے رئیس اور سرکاری عہدہ دار جمع ہوئے شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ وایسرائے کا جلوس نکلا اور دربار میں اس نے شاہی اعلان پڑھ کر سنایا۔

دہلی کے میدانوں میں جس وقت یہ دھوم دھام اور جلسے ہو رہے تھے اس وقت جنوب میں فاصلۂ دراز پر ہزاروں بندگان خدا فاقہ کشی سے دم توڑ رہے تھے صوبۂ مدراس ریاست میسور اور دکن کا علاقہ اس بلائے قحط کے پنجے میں گرفتار تھا' جو بہت دن تک اور بہت دور دور تک مسلط رہی × × × " اڑیسہ کے قحط میں رسد رسانی کی جو مشکلات پیش آئی تھیں انھی سے یہاں سابقہ پڑا اور سرکار نے اپنے خزانے اور لوگوں کے چندے سے بہت کچھ روپیہ امدادی کاموں میں صرف کیا لیکن "تخمینہ کیا گیا ہے کہ پھر بھی پچاس لاکھ نفوس ہلاک ہوئے[2]"۔ انگریزی حکومت کو ہندوستان کے

[1] اس باب کے آخر میں ہم نے ہند کے سب وائسراؤں کے ناموں کی فہرست لگا دی ہے الگ الگ ہر ایک کا نام اور سنین عہد حکومت نہیں لکھے اور صرف اہم واقعات اور خاص خاص وائسراؤں کا ذکر کر دینا کافی سمجھا ۱۲۔

[2] تھامسن صفحہ ۳۹۲ - ۱۲ -

ان صوبوں میں قائم ہوئے ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں گزری مگر یہ تیسرا مہیب قحط تھا جو اس کے عہد میں پڑا اور لاکھوں انسانوں کا خاتمہ کر دیا۔

معاملات افغانستان اور لڑائیاں

اس موقع پر مناسب ہو گا کہ لارڈ لٹن کی لڑائیوں سے لے کر اپنے زمانہ تک دولت افغانستان کے مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں۔ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں نے انتقال کیا اور اس کے چاہیتے بیٹے امیر شیر علی اور بڑے بیٹے افضل خاں میں تخت کے لئے نزاع ہوئی انگریزی حکومت دوست محمد خاں کی حلیف تھی اور اس لئے امیر شیر علی کو انگریزوں سے امداد کی بہت کچھ امیدیں تھیں۔ لیکن یہاں سے جواب مل گیا کہ اگرچہ حکومت ہندوستان سلطنت روس کی دست درازی سے دولت افغانستان کو بچانے کے لئے تیار ہے مگر وہ کابل کے خانگی جھگڑوں میں کسی قسم کا دخل دینا نہیں چاہتی۔ غرض شیر علی کو ادھر سے ناامیدی ہو گئی اور وہ اپنی قوت بازو سے بھائیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس خانہ جنگی نے دولت افغانستان کی قوت کو منقسم اور کمزور کر دیا اور جب انگریزوں نے اندر ہی اندر قلات کے خان سے کوئٹہ خرید لیا تو امیر شیر علی ان کی کوئی مزاحمت نہ کر سکا (۱۸۷۶ء) مگر اس نے ناراض ہو کر روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے اور ۱۸۷۸ء میں وہاں کا ایک سفیر دربار کابل میں آ پہنچا۔ حکومت برطانیہ کو یہ امر کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا اور چونکہ روسی ابھی ترکوں سے ایک بڑی لڑائی لڑ چکے تھے لہذا انگلستان کے وزرا نے غالباً یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کابل کے متعلق جو کچھ ہو سکے فوراً کر لیا جائے تاکہ سلطنت روس افغانستان کی کوئی امداد نہ کر سکے۔ غرض امیر شیر علی کے خلاف اسی وقت اعلان جنگ کر دیا گیا اور تین دروں سے تین انگریزی فوجیں ملک افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ شیر علی اپنے پایہ تخت سے نکل گیا اور اسی غریب الوطنی میں وفات پائی اس کے بیٹے یعقوب خاں نے انگریزوں کے حسب مراد شرایط پر صلح کر لی (مئی ۱۸۷۹ء) اور روسی سفیر کی بجائے ایک انگریزی رزیڈنٹ کابل پہنچ گیا۔

افغانستان کے لوگ شرایط صلح سے خوش نہ تھے اور انگریزی رزیڈنٹ کو ملک میں آئے کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ افغانستانی فوج اور شہر والوں نے رزیڈنسی پر

حملہ کیا اور آگ لگادی۔ انگریز رزیڈنٹ اور اس کے تمام رفیق کام آئے اور از سرِ نو کابل پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اس فوج کشی کو تیسری جنگ افغانستان ۱۸۷۹ء کے نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ یہ کوئی علٰحدہ لڑائی نہ تھی بلکہ مذکورۂ بالا مہم کے سلسلہ میں انگریزی فوج دوبارہ کابل پر بڑھی اور قبضہ کر لیا۔ اس کی کوئی باقاعدہ مزاحمت نہیں ہوئی کیونکہ امیر یعقوب خاں خود انگریزی لشکر میں چلا آیا تھا اور انھی کی رفاقت میں آخر اپنے تخت سے دست کش ہو کر ہندوستان آگیا جہاں اس کا خاندان اب تک آباد ہے۔

اب کابل میں باقاعدہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اس ملک پر بظاہر انگریزوں کا مستقل قبضہ ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی بڑے بڑے شہروں میں انگریزی فوجیں مقیم تھیں اور جنگی قانون کے زور پر لوگوں سے ہتھیار لے لئے گئے تھے خاص پایۂ تخت میں جنرل رابرٹس کا حکم چلتا تھا اور کئی مہینے تک کوئی بڑی لڑائی بھی پیش نہ آئی لیکن اول تو باشندوں نے مال گزاری ادا کرنے سے انکار کیا اور ان دیہاتیوں کا انگریزی توپ و تفنگ بھی کچھ نہ بگاڑ سکی' دوسرے گرمی کا موسم آتے ہی ایک طرف تو غازیوں کے گروہوں نے کابل کی انگریزی فوج پر حملے شروع کئے اور ادھر ہرات سے امیر شیر علی کے دوسرے بیٹے سردار ایوب خاں نے لشکر کشی کی اور میوند پر انگریزی فوج کو شکست دے کر قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ ان سب واقعات نے یہ بات حکومت انگلستان کے اچھی طرح ذہن نشین کر دی کہ افغانستان کی سرکش و جنگجو رعایا پر فرمانروائی کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے اور خطرۂ جان کے علاوہ اس میں روپیہ کا اتنا خرچ ہے کہ ہندوستان کا خزانہ یہ بار نہیں اٹھا سکتا۔ غرض نئے وایسرائے (لارڈ رپن) نے ہندوستان آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ امیر افضل خاں کے بیٹے امیر عبدالرحمٰن خاں کو روسی علاقے سے بلا کر کابل میں تخت نشین کر دیا شاید امیر شیر علی کی اولاد سے اسے مصالحت کی امید نہ تھی۔ دوسرے سچ پوچھئے تو کابل کے شاہی خاندان میں امیر عبدالرحمٰن خاں جیسا منتظم اور بیدار مغز کوئی فرمانروا بھی نہ مل سکتا تھا جس کے جلوس نے (۱۸۸۰ء) تخت افغانستان کو چار چاند لگا دیئے۔ تاج پوشی کی رسم ادا ہوتے ہی انگریزی فوجیں واپس ہندوستان چلی آئیں۔

امیر عبدالرحمٰن خاں نے انگریزوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس کی پابندی کی

اور سلطنت روس سے دولت خداداد کا کوئی سیاسی تعلق نہ رہا۔ انگریزوں کی جانب سے امیر موصوف کو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیا جانا قرار پایا اور بعد میں یہ رقم اٹھارہ لاکھ کر دی گئی۔ اس تمام خرچ اور پچھلے مصارف اور کشت و خون کا جو کچھ فایدہ سرکار انگریزی کو ہوا وہ مشرقی بلوچستان کا الحاق اور بعض سرحدی قبایل پر شاہانہ حقوق کا حاصل ہونا تھا جس نے سلطنت انگریزی کی حدود کو ہستان سلیمان کے اس پار تک وسیع کر دیں۔ پشاور کے آگے سرحدی قبایل کی خود مختاری اور طبعی سرکشی میں ابھی تک زیادہ فرق نہیں آیا ہے تاہم دولت افغانستان ان پر انگریزوں کی بادشاہی تسلیم کرنے لگی اور وہاں جنگی چوکیاں بن جانے سے انگریزی علاقے پر بے خبری میں حملہ ہونے کا اندیشہ کم ہو گیا۔ مگر در حقیقت امیر عبدالرحمن خاں کا ان قبایل پر انگریزی اقتدار تسلیم کر لینا، بڑی گہری حکمت پر مبنی تھا۔ اور انگریز مدبرین اگر یہ سمجھتے ہوں کہ انھوں نے یہ علاقہ امیر موصوف کے ہاتھ سے نکال لیا تو یہ ان کی نادانی تھی کیونکہ اس پہاڑی علاقے سے کسی مالی منفعت کی امید نہ تھی اور عبدالرحمن خاں ضرور اس بات کو جانتا ہوگا کہ ان قبایل پر انگریزوں کا پورا تسلط ہونا دشوار ہے۔ پس کہنا چاہیے کہ اس نے اپنے اور انگریزوں کے درمیان ایک مدافعانہ دیوار حائل کر دی۔ اس کے انگریزی قبضے میں جانے کا اندیشہ نہ تھا اور آئندہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ جب کبھی سلطنت انگریزی ان حدود پر عمل دخل بڑھائے گی۔ وہاں کے قبایل اس کے دشمن ہو جائیں گے اور اسے قبضہ رکھنا مصیبت ہو جائے گا۔

سرحدی لڑائیاں

چنانچہ جب لینڈون کے زمانہ میں "حامیان کشورستانی" کی صلاح سے نہ صرف سرحدی پہاڑ کی چوٹیوں پر بلکہ دوسری طرف کی ڈھلانوں پر جا بجا مورچے اور جنگی قلعے تیار کیے جانے لگے۔ نیز بلوچستان میں انگریزوں نے اور پاؤں پھیلائے اور شمال میں ریاست چترال پر بھی عمل دخل کرنا چاہا تو شمال سے جنوب تک سینکڑوں میل کی سرحد پر وہ خوفناک آگ بھڑک اٹھی جس میں سرکار کا روپیہ اور سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا۔ اور پھر بھی کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی (جنگ تیراہ ۹۷ء و ۹۸ء)۔

آخر لارڈ کرزن کے زمانہ میں ان قبایل سے مصالحت کی راہ نکالی گئی۔ ان کے

سالانہ "وظیفے" مقرر ہوئے انگریزی چوکیاں جو پہاڑ کی دوسری جانب تھیں اٹھالی گئیں اور انگریزی فوج کی بجائے وہیں کے باشندوں کی فوج مرتب ہوئی ایک "شمالی مغربی سرحدی" صوبہ علیحدہ بنانا پڑا (سنہ۱۹۰۱ء) جس کا چیف کمشنر براہ راست وایسرائے کے ماتحت رہتا ہے اور اس کا بڑا کام یہی ہے کہ سرحدی قبایل پر نگرانی رکھے اور ان خطرناک غازیوں کی روک تھام کرے جو اب تک ہندوستان کے میدانی علاقوں میں ہاتھ مار جاتے ہیں۔

ملکی معاملات اور مطالبات

لارڈ لٹن کے زمانے میں جنوبی ہند کے خوفناک قحط کا کچھ حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس قحط سالی اور آئے دن کی گرانی اجناس اور بعض دیگر اسباب نے ان دنوں لوگوں میں عجب بد دلی اور بے اطمینانی پیدا کر دی تھی جرایم کی نمایاں کثرت ہوتی جاتی تھی۔ خاص کر میسور و دکن کے علاقوں میں معلوم ہوتا تھا کہ اسی قسم کی ٹھگی و ڈکیتی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا وسط ہند میں بڑے اہتمام سے انسداد کرنا پڑا تھا ان جرایم کی روک تھام میں جو تشدد کیا گیا اس نے لوگوں کو اور بھی سرکار کی جانب سے ناراض کر دیا اور اسی لئے اب ان کی تالیف قلوب ضروری تھی۔ چنانچہ لارڈ رپن کے زمانے میں (سنہ۱۸۸۰ء تا سنہ۱۸۸۴ء) یہ کوشش کی گئی اور دیسی اخبارات کی آزادی پر جو شدید قیود لٹن عاید کر گیا تھا۔ انھیں منسوخ کر دیا گیا۔ پھر سنہ۱۸۸۲ء میں "قانون بلدیات" (Local Self Government Act.) جاری ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ شہر و اضلاع میں ایسی مجالس قایم کی جائیں جن میں ہندوستانی باشندوں کو مقامی انتظامات میں کچھ حصہ دیا جائے۔ سنہ۱۸۸۱ء میں میسور کی ریاست بھی جس پر پچاس برس سے انگریزوں نے عمل دخل کر رکھا تھا وہاں کے اصلی وارث کو دے دی گئی تاکہ اہل ہند کو سرکار انگریزی کے عہد و پیمان کی جانب سے جو بدظنی تھی وہ رفع ہو جائے۔ اس کے بعد بعض انگریز عہدہ داروں ہی کی تحریک سے "نیشنل کانگرس" (ہند کی قومی انجمن) وجود میں آئی اور سنہ۱۸۸۵ء میں اس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ اس انجمن کے قیام کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان میں بھی انھی جمہوری اصول کے مطابق حکومت دی جائے جن پر یورپ کے ممالک میں عمل درآمد ہوتا ہے۔ چونکہ محکوم ہونے کی وجہ سے اہل ہند یہ کام خود نہ کر سکتے تھے

لہذا انھوں نے اپنے مطالبات سرکار انگریزی کی خدمت میں پیش کئے کہ وہ رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری عطا فرمائے۔ چند سال کے بعد جب اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں دور دور کے لوگ شریک ہونے لگے اور انھوں نے خود انگریزی مصنفین و مدبرین کے حوالوں سے زور دینا شروع کیا کہ اہل ہند کو ان کے حقوق دئے جائیں تو اس وقت بہت سے انگریز عہدہ دار کانگرس کے مخالف ہو گئے اور شمالی ہند کے مسلمانوں کی طرف سے بھی اس کی مخالفت کی گئی با ایں ہمہ اس انجمن نے رفتہ رفتہ اتنی قوت پائی کہ سرکار کو رائے عامہ کا پاس کرنا اور کانگرس کے بعض مطالبات جزوی طور پر ماننے پڑے چنانچہ پہلے ۱۸۹۳ء میں اور پھر ۱۹۰۹ء و ۱۹۲۰ء میں مجالس وضع قوانین کی توسیع عمل میں آئی اور ہندوستان کے صوبوں کی مجلسوں میں ہندوستانی اراکین کی تعداد جنھیں کثرت رائے سے خود باشندگان ملک منتخب کرتے ہیں بڑھادی گئی اور گورنر اور گورنر جنرل کی اعلیٰ انتظامی مجالس میں بھی ہندوستانی لوگ شریک کئے جانے لگے۔

نئے الحاقات اور معاہدے

برما کی فوجی قوت اب ایک معمولی ریاست کی سی رہ گئی تھی اور وہاں کے پائے تخت میں انگریز رزیڈنٹ متعین تھا۔ ایک موقع پر انگریز سوداگروں کی کسی جماعت سے راجہ ناراض ہو گیا اور اس پر جرمانہ کر دیا جس کی انھوں نے سرکار انگریزی سے فریاد کی۔ راجہ پر ظلم و بدعہدی کے اور بھی کئی الزام تھے لہذا انگریزی بری اور بحری فوج سے اس پر حملہ کیا گیا اور گو راجہ نے دو ایک شکستوں کے بعد اپنے تئیں بعض شرائط پر حوالے کر دیا تھا لیکن اسے ہندوستان میں لاکے نظر بند کر لیا اور ۱۸۸۶ء میں برما کے الحاق کا اعلان کر دیا گیا۔

ملک برار کے متعلق جو معاہدہ ہوا تھا اس کا ذکر ہم پڑھ چکے ہیں۔ لارڈ کرزن کے زمانہ میں ایک جدید عہد نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے یہ صوبہ دوامی پٹے پر انگریزی علاقے میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۰۴ء میں ایک مہم تبت پر بھیجی گئی جس کا مدعا یہ تھا کہ اس ملک کی حکومت روسیوں سے کسی قسم کا سیاسی تعلق نہ رکھے بعد میں جب روس و برطانیہ کے درمیان

۱۹۰۷ء کا مشہور عہد نامہ ہوا تو اس وقت بھی انگریزوں نے تبت کو روسیوں کے حلقۂ اثر میں شامل نہ ہونے دیا۔

تعلیمی ترقی

اندرونی طور پر یہ زمانہ کئی لحاظ سے مسلسل ترقی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے پچھلے بیس برس میں جابجا چھوٹے بڑے سینکڑوں انگریزی اور دیسی مدرسے قایم ہوئے ہندوستان کے شہروں میں انگریزی تعلیم اتنی سرعت کے ساتھ پھیلتی نظر آئی کہ بعض دور اندیش انگریز تو اسے خطرناک سمجھنے لگے اور اہل ہند کے دل میں یہ قدرتی ولولہ پیدا ہوا کہ دیگر متمدن ممالک کی طرح ہمارے وطن میں بھی تعلیم بالکل عام ہو جائے اور کوئی شخص اس نعمت سے محروم نہ رہے بلکہ ممکن ہو تو جرمنی، جاپان وغیرہ بعض ملکوں کی مانند ابتدائی تعلیم یہاں سرکار کی طرف سے مفت اور جبری کر دی جائے تاکہ ہندوستان کی جاہل اور پیچ قومیں بھی نوشت و خواند سے واقف ہو کر بہتر زندگی بسر کرسکیں اور صدیوں سے جو غفلت اہل ہند پر چھائی ہوئی ہے اس کے دور ہونے کی صورت نکلے ؛ کانگرس والے بھی جن کا ہر سال ملک میں اثر بڑھتا جاتا تھا، سرکار سے یہی مطالبہ کرتے تھے اور گو سرکار نے پوری طرح ان کی درخواست نہیں مانی تاہم اس شور و شغب سے فائدہ پہنچا اور خود اہل ملک میں تعلیم کی شدید ضرورت کا احساس بڑھ گیا؛

ریلوں کی بھی اس زمانے میں بڑی ترقی ہوئی اور ہندوستان کا کوئی بڑا شہر ایسا نہ رہا جہاں ریل نہ پہنچی ہو۔ سفر کے اس نئے ذریعے نے اور ڈاک اور تار کی سہولت نے دور دور کے لوگوں کو میل جول بڑھانے میں بہت مدد دی اور قومیت کے خیال کو تقویت پہنچائی۔ کم سے کم تعلیم یافتہ اہل ہند اپنے تئیں ایک ملک کا باشندہ اور ایک دوسرے کے دکھ درد کا شریک سمجھنے لگے ادھر کانگرس کے سالانہ جلسوں اور اخبارات نے یہی خیالات پھیلائے اور پشاور و مدراس کے لوگ رنگ روپ لباس اور زبان کے اختلاف عظیم کے باوجود اپنے آپ کو ایک قوم کا فرد کہنے لگے ؛

دہلی کے دربار

انھی دنوں جب ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی (۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء) اور شاہ ایڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوئے شہر دہلی میں بڑی دھوم دھام کا دربار کیا گیا جس میں ہند کے ہر گوشے کے

امیر و رئیس جمع تھے ان میں بادشاہ کی تاجپوشی کا اعلان ہوا اور یہی رسم موجودہ بادشاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کے موقع پر منائی گئی۔ جس میں خود بادشاہ موصوف ہندوستان تشریف لائے جو کہ تاریخ ہند میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے (۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء)۔

چند سال پہلے لارڈ کرزن کی تجویز سے صوبۂ بنگال کے دو حصے کر دیئے گئے تھے (۱۹۰۵ء) اور اس پر بنگالی ہندو نہایت ناراض ہوئے تھے کہ بنگالی قوم کو اس طرح دو صوبوں میں منقسم کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی متحدہ آواز میں پہلی سی قوت نہ رہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور گو نئے صوبے کے مسلمانوں کو اس تقسیم سے فائدہ پہنچنے کی امید تھی کیونکہ اس میں ان کی تعداد زیادہ تھی لیکن تعلیم یافتہ ہندو بنگالیوں کے سامنے نہ ان کی مخالفت چلی نہ سرکار کا استقلال۔ آخر بادشاہ سلامت نے اپنی تاج پوشی کے موقع پر وہ تقسیم منسوخ کر دی اور مشرقی بنگالے کو علیحدہ کرنے کی بجائے بہار و اڑیسہ کا ایک صوبہ الگ بنانے کا اعلان فرمایا۔ اس عنایت نے بہت سے بنگالیوں کو سرکار کا احسان مند بنا دیا لیکن افراط پسند اور جوشیلے جوانوں میں انگریزی حکومت سے جو شدید نفرت پھیل گئی تھی وہ کئی سال تک اپنا ظہور دکھاتی رہی اور آئے دن سرکار کے خلاف سازش و شورش کے واقعات ہوا کئے بلکہ یہ مخالفت آگے چل کر پنجاب و مہاراشٹر تک پہنچی اگرچہ انارکسٹوں کا اصلی مستقر بنگالہ ہی رہا۔

شاہ جارج پنجم نے اسی دربار کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ آئندہ سے ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتے کی بجائے دہلی کو بنا لیا جائے گا چنانچہ سال آئندہ (۱۹۱۲ء) اس پر عملدرآمد ہو گیا اور اس پرانی راج دھانی کو انگریزوں نے بھی آخر کار وہی مرتبہ دیا جو ہندو راجہ اور مسلمان سلاطین کے عہد میں اسے حاصل تھا۔

باب ہفتم

انگریزی آئین ونظام حکومت

فرمانروائے وقت یعنی شاہ جارج پنجم کا عہد خود ہمارا زمانہ ہے جو آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ اس زمانے کے سب سے نمایاں واقعات وہ ہیں جو اہل ہند کے سیاسی مطالبات کے سلسلے میں رونما ہوئے۔ ان مطالبات کا ذکر اور اہل ہند کی انگریزی حکومت سے کشمکش کا حال اگلے باب میں ہماری نظر سے گزرے گا لیکن اسے بیان کرنے اور اپنی تاریخ کو ختم کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم اپنے موجودہ آئین اور نظام سلطنت پر ایک نظر ڈال جائیں تاکہ اہل ہند کے سیاسی مطالبات ومقاصد کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

سیاسی تقسیم ہندوستان کا برطانی علاقہ (جس میں برما بھی شامل ہے) اس وقت دس بڑے اور پانچ چھوٹے صوبوں میں منقسم ہے۔

بڑے صوبے

(۱ و ۲) انگریزوں کے ہندوستان میں سب سے پرانے صوبے مدراس اور

بمبئی ہیں۔ ان شہروں میں جنھیں خود انگریز سوداگروں نے آباد کیا، شروع سے ان کا ایک ایک صدر یا گورنر اور اس کی انتظامی مجلس مقرر ہوتی تھی۔ اس لئے ان دونوں صوبوں کو نیز بنگالے کو صدارت (یا احاطہ) کہتے تھے اور بنگالے میں گورنر جنرل مقرر ہونے کے بعد بھی مدراس و بمبئی کے گورنر اپنی اپنی جگہ کافی آزاد رہے اور ان کا یہ امتیاز محکمۂ مالگزاری، جنگلات اور اہم تقررات کے انتظام میں ابھی تک باقی ہے۔ مالی مسائل کے علاوہ اپنے صوبے کے اندرونی معاملات میں وہ وزیر ہند سے براہ راست خط و کتابت بھی کر سکتے ہیں۔

۱۸۳۹ء میں انگریزوں کا عدن کی بندرگاہ پر قبضہ ہوا، تو اس کا انتظام بھی گورنر بمبئی کے تفویض کر دیا گیا اور چار سال بعد سندھ فتح ہوا تو اسے بھی احاطۂ بمبئی میں داخل کر دیا۔ لیکن اب یہ طے ہو گیا ہے کہ آیندہ آئینی اصلاحات کے ساتھ سندھ کو مستقل اور جداگانہ گورنری صوبہ بنا دیا جائے گا۔

(۳ و ۴ و ۵) ۱۸۷۴ء تک بنگالہ، بہار، اڑیسہ، اور آسام، واحد صوبہ رہے اور ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگالہ علیحدہ صوبہ بنایا گیا تو اس کی اکثر اہل بنگال نے سخت مخالفت کی چنانچہ وہ تقسیم منسوخ ہوئی اور اس کی بجائے اب وہ تمام علاقہ تین گورنری صوبوں میں بانٹ دیا گیا۔ جن میں ایک تو بنگالہ ہے اور دوسرا صوبۂ بہار و اڑیسہ اور تیسرا آسام کو قرار دیا ہے۔ اڑیسہ کے متعلق بھی آئندہ توقع ہے کہ جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے گا۔

(۶) صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کچھ مدت بنگالے میں شامل اور پھر دو الگ صوبے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں ان دونوں کو ملا کر ایک نائب گورنر کے تحت میں دیا گیا اور اب وہ مذکورۂ بالا نام سے ایک بڑا گورنری صوبہ ہو گیا ہے۔

(۷۔۸۔۹)۔ صوبۂ پنجاب میں نائب گورنر مقرر تھا اور ناگپور کا صوبہ اور بھی چھوٹا تھا۔ لیکن ۱۹۲۱ء سے یہ دونوں گورنری صوبے بنا دیے گئے۔ اور حال میں پنجاب سے پشاور و راولپنڈی کے علاقے الگ کر کے ایک جدید صوبۂ سرحدی قائم کر دیا ہے۔

صوبۂ برار کو دوامی پٹے پر سرکار نظام سے لے کر ناگپور کے ساتھ ملایا اور اس پورے صوبے کا نام صوبۂ متوسط قرار دیا گیا ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ آیندہ آئینی اصلاحات کے وقت برار سرکار عالی کو اگر واپس نہ کیا گیا تو بھی اس پر حضور نظام کی

سیادت اور ملکیت کو زیادہ نمایاں طور پر تسلیم کر لیا جائے گا۔

(۱۰)۔ ملک برما کی فتوحات کا حال گزشتہ ابواب میں ہم پڑھ چکے ہیں ۱۹۲۲ء میں اسے بھی سلطنت ہند ہی کا ایک گورنری صوبہ بنا دیا گیا اگرچہ خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ اسے ہندوستان سے بالکل علٰحدہ کر دیا جائے گا۔ اور اس کی حکومت کا تعلق براہ راست برطانیہ سے ہوگا جیسا خود ہندوستان یا لنکا وغیرہ دوسرے ممالک کا ہے۔

چھوٹے صوبے

ان بڑے صوبوں کے علاوہ بلوچستان، اجمیر و میواڑ، دہلی کورگ اور انڈمان کا انتظام علٰحدہ چیف کمشنروں یا سیاسی عاملوں کے تحت میں ہے جو براہ راست وائسرائے کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اسی لئے ان کو جداگانہ صوبے شمار کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کا باقی ماندہ ایک تہائی کے قریب رقبہ دیسی ریاستوں میں منقسم ہے اور ان میں اپنی وسعت، آبادی اور مرتبے کے اعتبار سے سب سے بڑی ریاست حیدر آباد ہے بڑی ریاستوں میں علٰحدہ علٰحدہ اور چھوٹی ریاستوں میں، کئی کئی کے واسطے مشترکہ ایک انگریزی قائم مقام یا رزیڈنٹ مقرر ہے اور ان ریاستوں کی نگرانی ذاتی طور پر وائسرائے سے تعلق رکھتی ہے۔ انگریزی علاقے کی مجلس وضع قوانین کو اب تک ان ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہیں ہے مگر تجویز ہے کہ آیندہ انگریزی صوبوں اور دیسی ریاستوں کی ایک مشترکہ مجلس وفاق قائم کی جائے اور ریاستوں کے بعض معاملات کی نگرانی اسی مجلس کے تفویض کر دی جائے۔

پارلیمنٹ اور وزیر ہند

لیکن جیسا کہ سب کو معلوم ہے وائسرائے یا ہندوستان کے انگریزی حکام ہندوستان کی قسمت کے مالک نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستان کی اصلی حکمران انگریز قوم ہے جو برطانی پارلیمنٹ کے ذریعے تمام سلطنت برطانیہ کے ساتھ کشور ہندوستان پر بھی حکومت کرتی ہے۔ ہندوستان کے انگریز حکام اصولاً اس پارلیمنٹ کے ملازم ہیں اور یہاں کے نظم ونسق کی آخری ذمہ داری اسی مجلس کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے وزیروں کی طرح پارلیمنٹ ایک وزیر ہند بھی مقرر کرتی ہے اور اسی کے ذریعے ہندوستان میں اپنے احکام و قوانین کو نافذ کرتی ہے۔

وزیر ہند کی ایک مجلس (انڈیا کونسل) علیحدہ بنا دی گئی ہے جس میں کم سے کم آدھے (یعنی ۶ ارکان) ہندوستان کے وظیفہ یاب عہدہ دار ہوتے ہیں۔ یہ انتظام ۱۸۵۸ء سے قائم ہے جب کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر براہ راست وزارت برطانیہ کے ہاتھ میں دی گئی۔ لیکن چونکہ وزیر ہند کی مجلس بہت کچھ کمپنی کی مجلس نظما کے اصول پر قائم ہوئی تھی اس لئے ابتدا سے انتظامی دقتیں موجود رہیں۔ وزیر ہند اور ہندوستان کے حاکم اعلیٰ (وایسرائے) کے اختیارات کی کبھی تفصیلی اور قطعی طور پر حد بندی نہ ہو سکی اور کئی بار بعض وزیر ہندوستان کے چھوٹے معاملات میں بھی دخل دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے جملہ نظم و نسق کا جوابدہ وزیر ہند ہی ہوتا ہے اور اصولاً یہاں کے تمام انتظامات پر اسی کی نگرانی ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع میں جو حیرت انگیز ترقی گزشتہ صدی میں ہوئی اس نے قدرتی طور پر اس نگرانی کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ دوسری طرف جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ صورت ہندوستان کی حکومت کے لئے بعض اوقات پریشانی اور شکایت کا موجب ہوئی۔ اسی لئے مجوزہ اصلاحات میں امید کی جاتی ہے کہ حکومت ہندوستان اور وزیر ہند کے اختیارات کو صاف اور معین کر دیا جائے گا۔[1]

وایسرائے، گورنر اور ان کی مجلسیں

وزیر ہند اور برطانی پارلیمنٹ کی نگرانی کے باوجود ہندوستان کی اندرونی حکومت بہت کچھ وایسرائے اور گورنروں کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یہ اعلیٰ عہدہ دار بھی بالکل شخصی حاکم نہیں ہوتے بلکہ انتظامی معاملات میں تو ان کو اپنی اپنی مجالس عاملہ (اکزیکیوٹو کونسل) سے مشورہ لینا واجب ہے اور نئے قانون بنانے کے واسطے مجالس وضع قوانین کی منظوری ضروری ہوتی ہے۔

وایسرائے کی جماعت مقننہ کے بھی دو شعبے ہیں۔ ایک مجلس مملکت اور دوسری جمعیت مقننہ (لے جس لے ٹیو اسمبلی) کہلاتی ہے۔ زیادہ اختیارات

---

[1] وزیر ہند اور اس کی مجلس کے اختیارات کے صاف طور پر طے نہ ہونے سے جو آئینی دشواریاں پیش آئی ہیں، ان کو لارڈ کرزن نے اپنی کتاب برٹش گورنمنٹ ان انڈیا میں وضاحت سے لکھا ہے نیز دیکھو کیمبرج ہسٹری ششم ۲۰۶۔

اسی دوسری مجلس کو حاصل ہیں اور اسی میں نمایندوں کی زیادہ تعداد ہندوستان کے تمام اقطاع سے منتخب ہوکر دارالسلطنت دہلی (یا شملہ) میں جمع ہوتی ہے۔ یہ مجلس دستور سلطنت میں تبدیلی نہیں کرسکتی نہ اُس کو ممالک خارجہ یا صلح وجنگ کے معاملات طے کرنے کا اقتدار حاصل ہے لیکن اہل ہندوستان کے واسطے وہ نئے قوانین وضع کرسکتی ہے جو وزیر ہند کی منظوری سے ملک میں نافذ ہوجاتے ہیں۔ انتظامی اعلیٰ عہدہ داروں کے طرز عمل پر تنقید و نکتہ چینی کرنے کا بھی اس مجلس کو حق حاصل ہے اگرچہ ان عہدہ داروں کا تقرر اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ سلطنت کی آمد وخرچ کا گوشوارہ بھی اس مجلس میں پیش ہوتا ہے اور خاص خاص مدات کے سوا باقی اکثر مصارف کی یہی مجلس منظوری دیتی ہے۔

ہر بڑے (یا گورنری) صوبے میں اسی قسم کی مجالس مقننہ موجود ہیں جن میں اسی صوبے سے لوگ منتخب ہوتے اور صوبے کے اندرونی معاملات میں حکومت عاملہ کو مشورہ دیتے ہیں وایسرائے کی اجازت سے وہ اپنے اپنے صوبے کے واسطے نئے قانون بھی بناتے ہیں اگرچہ ان کے اختیارات وایسرائے کی مجلس وضع قوانین کے برابر وسیع نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ حکومت میں رعایا کی نیابت اور شراکت کے یہ جدید طریقے بہ تدریج ہندوستان میں جاری ہوئے ہیں اور مختلف سنین میں برطانی پارلیمنٹ سے ان کی منظوریاں نئے دستوری قوانین کی صورت میں صادر ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سنہ ۱۸۶۱ء، سنہ ۱۸۹۲ء، سنہ ۱۹۰۹ء اور آخر میں سنہ ۱۹۱۹ء کے قوانین خاص اہمیت رکھتے ہیں اور سنہ ۱۹۱۹ء ہی کے دستوری قانون پر اس وقت عمل ہو رہا ہے جس کے بننے اور سنہ ۱۹۲۱ء میں نافذ ہونے کا حال اگلے باب میں ہماری نظر سے گزرے گا۔

مجالس ضلع اور بلدیات

برطانی ہند کے ہر ضلع اور ہر بڑے قصبات اور شہروں میں الگ الگ مجالس ضلع (لوکل بورڈز) اور مجالس بلدیات (میونسپلٹیز) بھی قائم ہیں جو چھوٹے چھوٹے مقامی معاملات کا انتظام کرتی اور بعض مقامی محاصل جمع کرکے انھیں حفظان صحت، تعلیم، سڑک بنانے اور اسی طرح کے دوسرے شہری کاموں میں خرچ کرسکتی ہیں۔ مگر ان مقامی مجالس کو تعزیری یا دیوانی قوانین بنانے کا اختیار نہیں ہے۔

اعلیٰ انتظامی عہدہ دار

وضع قوانین کی مجلسوں کی بدولت ہندوستان کے منتخب قائم مقاموں یا نمایندوں کو ملکی معاملات میں رائے زنی کرنے کا کافی موقع ملنے لگا ہے لیکن ملک کا نظم و نسق بیشتر اعلیٰ عہدہ داروں ہی کے ہاتھ میں ہے جن کا تقرر ابھی تک برطانیہ میں کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑے حاکم یعنی وایسرائے کو تو برطانیہ کا وزیر اعظم خود منتخب کرتا ہے لیکن صوبے کے گورنر، اور انتظامی مجلسوں کے ارکان کا انتخاب وزیر ہند کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہی ارکان مختلف محکموں کے اعلیٰ حاکم یا وزیر ہوتے ہیں۔ البتہ ۱۹۲۱ء کی اصلاحات سے اتنا ہوا ہے کہ صوبوں کے بعض محکمے ہندوستانی وزیروں کے حوالے کر دیے گئے ہیں، جن کا انتخاب مجلس وضع قوانین کے ارکان کی رائے پر موقوف ہے۔

وایسرائے کی مجلس انتظامی میں بھی اب سات میں سے تین ارکان ہندوستانی ہوتے ہیں لیکن ان کا انتخاب وزیر ہند کے ہاتھ میں ہے۔

اسی طرح جنگی، ملکی اور فنی بڑے (یا شاہی) عہدوں کے لئے مقابلے کا امتحان برطانیہ میں ہوتا ہے۔ ان میں ہندوستان کے لوگ روز افزوں تعداد میں نامزد اور کامیاب ہونے لگے ہیں مگر ابھی تک بڑی تعداد انگریزوں کی ہے اور ان کا تقرر ہو جانے کے بعد ہندوستان کا کوئی بڑا حاکم یا مجلس وضع قوانین انھیں وزیر ہند کی منظوری کے بغیر برطرف نہیں کر سکتی۔

دیہات، تعلقے اور اضلاع

ملک کے انتظام کی پہلی کڑی گاؤں ہوتی ہے۔ اس میں سرکاری مالیہ وصول کرنے کی غرض سے ایک دو پٹیل (یا نمبردار) کوتوالی کا چوکی دار اور ایک پٹواری مقرر ہوتا ہے جو گاؤں کی تمام اراضی کی پیمایش ان کی عام حالت، پیداوار، اور ہر زمیندار کی سرکاری مالگزاری کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ تین چار سو دیہات کے مجموعے کو تعلقہ یا تحصیل کہتے ہیں، یہ مغلیہ زمانے کے محل یا پرگنے کی جانشین ہے اس کا حاکم تحصیلدار کہلاتا ہے۔ وہ سرکاری مالگزاری وصول کرنے کے علاوہ اپنے علاقے کے عام انتظام کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ جرائم کی سراغ رسانی اور مجرموں کی گرفتاری کوتوالی کے جوانوں، تھانہ داروں وغیرہ کا کام ہے لیکن مالی اور دیوانی مقدمات

سننے کے علاوہ تحصیلدار کو فوجداری اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ پورے ضلع میں سب سے بڑا مرتبہ حاکم ضلع (کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر) کا سمجھنا چاہیئے جسے اپنے سارے ضلع میں بہت کچھ انتظامی اور عدالتی اختیارات دیئے گئے ہیں۔ وہ عموماً شاہی سلسلے (امپیریل سروس) کا عہدہ دار ہوتا ہے اور مالگزاری وصول کرنے کے علاوہ ضلع کی عام حالت اور انتظامات پر نگرانی رکھنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔ ضلع میں دوسری دیوانی اور فوجداری عدالتیں بھی قائم ہیں جو جرائم کی سزا دیتی اور آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتی ہیں۔

مجوزہ اصلاحات

ہندوستان کے دوسرے بڑے محکموں اور نظم و نسق کے تفصیلی حالات تم آئندہ ان کتابوں میں مطالعہ کرو گے جو اسی بارے میں تحریر کی گئی ہیں لیکن اس مختصر بیان کو ختم کرتے وقت یہ بتانا مناسب ہوگا کہ آئندہ کے لیئے جو اصلاحات زیر غور ہیں، ان کے عمل میں آنے سے بڑے بڑے عہدوں پر اہل ہند کی تعداد بڑھنے لگے گی۔ صوبوں کی مجالس مقننہ کے اختیارات میں اضافہ ہوگا اور گورنر کی انتظامی مجلس عاملہ کے تمام ارکان یا وزراء کو صوبے کی یہی نمایندہ مجلسیں منتخب کیا کریں گی۔ اگرچہ گورنر کو بعض انتظامی اور ہنگامی اختیارات ایسے دے دیئے جائیں گے جو اس وقت صرف وایسرائے کو حاصل ہیں۔

وایسرائے کی مجلس عاملہ میں بھی غالباً ہندوستان کے منتخب شدہ ارکان لیئے جانے لگیں گے۔ لیکن ان سب سے دلچسپ اور اہم تجویز یہ ہے کہ انگریزی صوبوں اور دیسی ریاستوں کے وکلا یا نائبوں کی ایک نئی مجلس وفاق قائم کی جائے اور اس قسم کے معاملات جن کا تمام ہندوستان سے یکساں تعلق ہے، جیسے ریل، ڈاک، سکہ نئے قوانین وغیرہ اسی مجلس میں طے ہوا کریں۔ ریاستوں کی اندرونی آزادی یا رئیسوں کے اعزاز و وقار میں کوئی فرق آنے نہیں پائے گا البتہ جن باتوں کا ملک کے جملہ علاقوں اور باشندوں سے تعلق ہے، ان میں یہ ریاستیں بھی مجلس وفاق کے فیصلوں کی اسی طرح پابند ہو جائیں گی جس طرح دوسرے انگریزی صوبے۔

بابِ ہشتم

عہدِ حاضرہ

ہندوستان میں شاہ جارج پنجم کے زمانے کو دہلی کی تیسری سلطنت کے نام سے یاد کرنا غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی تخت نشینی کے ساتھ ہی دہلی، ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دی گئی اور دسمبر ۱۹۱۲ء میں وایسرائے (لارڈ ہارڈنگ) باضابطہ کلکتہ چھوڑ کر نئے پائے تخت میں منتقل ہو گئے۔

حادثۂ بم

نئے پائے تخت میں داخل ہوتے وقت، وایسرائے اور بعض حکام و رؤسا کا جلوس شہر کے بڑے بازار یعنی چاندنی چوک سے گزر رہا تھا کہ وایسرائے کے ہاتھی پر کسی نے خطرناک آتشی گولہ پھینکا جو بڑی آواز سے پھٹا اور گو خود وایسرائے کے چند خفیف زخم آئے لیکن ان کی خواصی کا آدمی ہلاک ہو گیا۔ سخت کوشش اور تلاش کے باوجود گولہ پھینکنے والے کا پتہ نہیں چلا۔ مگر لارڈ ہارڈنگ نے اس موقع پر کمالِ تحمل سے کام لیا اور اپنے سیاسی طرزِ عمل میں کسی قسم کی سختی اختیار نہیں کی۔

سیاسی بیچینی

ملک میں سیاسی بیچینی کے اور آثار بھی ظاہر ہوتے رہے۔ ایک طرف تو سیاسی جماعتیں علانیہ مطالبہ کرنے لگی تھیں کہ ہندوستان کو

ہوم رول یا حکومت خود اختیاری دے دی جائے اور دوسری طرف شورش پسند لوگ حکومت سے نفرت و بیزاری پھیلاتے اور چوری چھپے برابر اخبارات و رسائل چھاپتے رہتے جن میں انگریز حکام کو قتل کرنے اور ملک میں فساد و بدامنی پھیلانے کا اشتعال دلایا جاتا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں سکھوں کا ایک گروہ جو محنت مزدوری کرنے امریکہ جانا چاہتا تھا، واپس ہندوستان آیا انھیں کناڈا میں اترنے کی اجازت نہیں ملی اور یہ لوگ کلکتہ کے قریب اپنے جہاز سے اترے تو غصّے میں بھرے ہوئے تھے۔ حکام نے ان کو ریل میں واپس پنجاب بھیجنا چاہا تو انھوں نے بلوہ کر دیا اور اس ہنگامے میں کئی انگریزی اور دیسی سپاہی مارے گئے۔ بلوائیوں میں سے بعض قتل یا گرفتار ہونے سے بچ گئے اور چھپ کر پنجاب پہنچے جہاں انھوں نے حکومت انگریزی کے خلاف شورش پھیلانی شروع کی۔ حالانکہ سکھوں کی قوم ۱۸۵۷ء کے بعد سے انگریزوں کی برابر وفادار رہی اور سرکار کی طرف سے بھی اس وفاداری کی کافی قدر ہوتی رہی تھی۔

جنگ عظیم لیکن کچھ مدت کے لئے یہ سب شورشیں اس خوفناک جنگ کی خبروں میں گم ہو گئیں جو اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ کی سلطنتوں میں چھڑی اور برابر چار سال تک شد و مد کے ساتھ جاری رہی۔ انگریزوں نے فرانس و روس کا ساتھ دیا اور بھی کئی سلطنتیں انھی کی طرفدار ہو گئیں۔ لیکن ترک، جرمانیہ اور آسٹریا کے ساتھ ہو گئے۔ چار سال تک کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ آدمی کو مارنے کے عجیب عجیب آلات اور نئی نئی ایجادوں سے کام لیا گیا فرنگی حکومتوں کو اپنے ایک ایک سپاہی کی جان ایشیا کے ملکوں اور قوموں سے زیادہ عزیز تھی۔ لیکن اس جنگ میں انھی حکومتوں نے ایک کروڑ سے زیادہ سپاہی کٹوا دئے۔

جنگ کے سب سے خوں ریز معرکے فرانس، آسٹریا، روس اور دردانیال کے میدانوں میں پڑے لیکن فلسطین، عراق اور افریقہ کی جرمن نوآبادیوں میں بھی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں اور ان میدانوں میں انگریزوں کے ساتھ ہندوستانی سپاہیوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ جنگ کے شروع میں ایک جرمن جنگی دریانورد (کروزر) نے مدراس پر گولہ باری کی تھی مگر اسے بہت جلد برطانی جنگی جہازوں نے گھیر کر غرق آب کر دیا اور اس کے بعد سے ہندوستان تک جنگ عظیم کی کوئی چنگاری اڑ کر نہ آئی۔

جنگ سے ایک ہی سال پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ حکومتِ برطانیہ ہندوستان کی فوج سے کسی بیرونی لڑائی میں کام نہ لے گی[1] لیکن جنگ کا اعلان ہوتے ہی خود اہل ہند نے ایسے جوش و خروش سے برطانیہ کی رفاقت پر آمادگی ظاہر کی کہ انگریز حکام بھی حیران رہ گئے۔ دیسی ریاستوں اور جاگیرداروں وغیرہ نے سرکار کو بے دریغ روپیہ اور سپاہی دئے چنانچہ چار سال میں آٹھ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی سپاہی جنگ کے لئے بھرتی ہوئے جن میں کم سے کم آدھے مختلف میدانوں میں کام آئے اربوں روپیہ اور ہر قسم کا بے حساب ساز و سامان اور اجناس ہندوستان سے بھیجا گیا جن میں صرف گیہوں کی مقدار پچاس لاکھ ٹن تھی۔

سیاسی شورش اور نئی اصلاحات

ہندوستان کی اس بیش بہا امداد کا برطانی وزرا نے نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا اور ہندوستانی افواج کی یورپ میں بہت کچھ قدر و منزلت ہوئی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو یہ طرز عمل دیکھ کر بہت سی نئی نئی امیدیں پیدا ہوئیں اور انھوں نے ہندوستان کو اندرونی آزادی یا ہوم رول دینے کا باضابطہ مطالبہ کیا اول اول اس تحریک کی سرگروہ ایک انگریز بی بی، مسز اینی بی سنٹ تھیں حکومت مدراس نے ان کو حراست میں لیا تو لوگوں میں اور بھی ہیجان پیدا ہوا اور اخباروں میں سرکار انگریزی کے خلاف بہت سخت مضامین لکھے گئے۔

قوانین رولٹ

عام رعایا اور امرا نے جنگ عظیم میں بہت امداد کی اور نمک حلالی دکھانے میں قصور نہیں کیا لیکن بنگالے کے خونی بغاوت پسند خاموش نہ بیٹھے اور بم بنانے اور بم یا گولی سے انگریزی عہدہ داروں کو قتل کرنے کا سلسلہ جاری رہا[2] ان لوگوں نے ایک اور شرارت یہ کی کہ تعلیم یافتہ سر پھرے نوجوانوں کو ڈاکے ڈالنے کی تعلیم دینے لگے اور ان پڑھے لکھے

[1] کیمبرج ہسٹری ششم ۴۷۶ (بحوالۂ بیانات سرکاری)

[2] صرف سنہ ۱۹۱۵ و ۱۶ میں بنگالے میں پولس کے آٹھ عہدہ دار بغاوت پسندوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ (کیمبرج ہسٹری ششم ۴۸۵)۔

ڈکیتوں نے خود اپنے امن پسند ہموطنوں کو جا بجا لوٹنا اور پریشان کرنا شروع کیا۔ اسی دوران میں ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف اشتعال پیدا ہوا کیونکہ سلطنت ترکی سے جنگ اور فوج کشی میں زیادہ تر برطانی افواج کو حصہ لینا پڑا، اور ترکوں کے نقصانات کی خبروں سے مسلمانوں کو سخت رنج و ملال پہنچتا تھا۔

ملک میں عام بے چینی اور بدامنی کا میلان دیکھ کر سرکار انگریزی نے (۱۹۱۸ء میں) ایک تحقیقاتی جماعت مقرر کی جس نے بہت سی خفیہ تحریکات کو طشت از بام کیا اور سازش و بغاوت کا انسداد کرنے کی غرض سے سخت قوانین بنانے کا مشورہ دیا۔ اس تحقیقات کے صدر ایک انگریز جج مسٹر رولٹ تھے لہذا یہ قوانین انھی کے نام سے منسوب کئے جانے لگے اور ہندوستانی ارکان کی متفقہ مخالفت کے باوجود وائسرائے کے حکم سے ملک میں نافذ کر دئے گئے۔ ان قوانین کے خلاف جا بجا جلسے اور مظاہرے ہوئے اور دہلی، امرتسر، لاہور اور احمد آباد میں پولس کو گولیاں چلانی پڑیں۔

جلیاں والا باغ کا قتل عام

یورپ کی قیامت خیز جنگ نومبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہو گئی۔ ولایات متحدہ امریکہ کی شرکت سے فرانس و برطانیہ کی قوت بڑھ گئی اور جرمانیہ اور اس کے حلیفوں کو آخر کار ہار ماننی پڑی لیکن ہندوستان میں عام بے چینی برابر بڑھتی رہی۔ اور سب سے زیادہ اندیشہ پنجاب کی جنگجو آبادی سے پیدا ہو گیا جہاں انھی دنوں بہت سے سپاہی یورپ اور ایشیا کے میدانوں سے واپس آئے اور جنگی جذبات کے ساتھ نئے ہتھیاروں سے بھی خوب واقف تھے۔ حکومت کو لاہور و امرتسر میں جنگی قانون (مارشل لا) جاری کرنا پڑا (۱۹۱۹ء) اور لوگوں کی سرکشی دیکھ کر جنرل ڈائر نے امرتسر کے جلیان والا باغ میں مجمع عام پر فوج کو گولیاں چلانے کا حکم دیا۔ اس موقع پر صدہا اشخاص مارے گئے اور سارے ملک میں یہ خبر سن کر سناٹا سا چھا گیا۔

اصلاحات مونٹیگو

۱۹۱۷ء میں اہل ہند کو مطمئن کرنے کی غرض سے وزیر ہند نے اعلان کیا تھا کہ حکومت برطانیہ کا عین منشا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستان میں نیابتی حکومت کے آئین جاری کئے جائیں اور وہ سلطنت برطانیہ میں شامل رہ کر اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہو جائے۔

دوسرے سال خود وزیر ہند (مسٹر مون ٹیگو) ہندوستان آئے اور بہت سے اہل الرائے سے مل کر وہ تجاویز مرتب کیں جو مون ٹیگو چیمز فورڈ رپورٹ کہلاتی ہیں۔ انھی تجاویز کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کی منظوری سے جدید قانونِ اصلاحات نافذ ہوا جس نے صحیح معنی میں اور ہندوستان کی ساری تاریخ میں پہلی مرتبہ، جمہوری طرز کی حکومت کا آغاز کر دیا اگرچہ اس کی تکمیل میں بظاہر ابھی بہت زمانہ درکار ہوگا۔

اس نئے قانون نے (۱) بلدیات کو اپنے شہری معاملات میں بہت کچھ آزادی اور اختیارات عطا کیے (۲) صوبوں کی مجالس وضع قوانین اور خود وایسرائے کی مجلس تشریعی (لیجس لیٹو اسیمبلی) میں سرکاری ارکان کے بجائے قومی مبعوثوں کی تعداد زیادہ کر دی جو عام انتخاب میں کثرت رائے سے منتخب کیے جائیں اور ملکی معاملات میں حکومت کے شریک و مشیر ہوں۔ صوبوں کے بعض سررشتے بھی انھی مجالس کے پسند کردہ وزیروں کے سپرد کر دیے گئے۔ امن عامہ، مالگزاری وغیرہ چند اہم محکمے سرکاری حکام ہی کے پاس رہے جنھیں محفوظ محکمے کہا جاتا ہے۔ اور صوبوں میں اسی آدھی سرکاری اور آدھی نیابتی قسم کی حکومت کو ثنویہ (یا Dyarchy) کہنے لگے۔

وایسرائے کو کسی قانون کے نامنظور کرنے یا کسی تجویز کو اپنے ذاتی حکم سے بطور قانون نافذ کرنے کے خاص اختیارات دیے گئے لیکن اس کی انتظامی مجلس میں ایک کی بجائے تین ہندوستانی ارکان کا تقرر کر دیا گیا۔ انگریز ارکان کی طرح ان کو بھی وزیر ہند اپنی رائے سے نامزد کرتے ہیں تاہم حکومت کے جملہ کاموں میں ان کا مشورہ ضرور لیا جاتا ہے۔

خلافت کا ہنگامہ اور تحریک ترک موالات

اس قانون کا ۱۹۲۱ء میں نفاذ ہوا اور بادشاہ کی طرف سے ان کے چچا شہزادہ کناٹ ہندوستان آئے اور نئی مجالس کا دہلی میں افتتاح کیا (فروری ۲۱ء)۔ لیکن ہندوستان کے بعض ارباب سیاست کے نزدیک یہ اصلاحات بھی کافی نہ تھیں۔ وہ سواراج یعنی ملک میں خود اپنی حکومت قائم کرنی چاہتے تھے اور سرکار انگریزی پر دباؤ ڈالنے کا عجیب موقع انھیں یہ ملا کہ جنگ عظیم کے بعد متحدہ اتحادیوں نے ترکی سلطنت سے

اس کے تمام عربی صوبے چھین لئے اور یورپ میں بھی شہر استنبول کی حوالی کے سوا سارا علاقہ یونان کو دلوا دیا۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی سلطان کو اپنا مذہبی پیشوا، مقامات مقدسہ کا محافظ اور خلیفۃ المسلمین سمجھتے تھے۔ ترکوں کے مصائب سے انھیں دلی صدمہ تھا۔ برطانیہ کا ترکی کے ساتھ یہ برتاؤ دیکھ کر وہ نہایت غضبناک اور سرکار انگریزی کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ برطانی حکومت مسلمانوں کو تا امکان ناراض کرنا نہ چاہتی تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ یہاں کے چند قومی سرگروہ ولایت بلائے گئے اور خود وزیر اعظم برطانیہ نے ان سے گفتگو کی۔ لیکن مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی اور ادھر نیشنل کانگریس نے تحریک خلافت کی تائید کا بیڑا اٹھایا اور ہندوؤں کی شرکت سے یہ تحریک سواراج کے سیاسی مطالبے کا ایک جزو بن گئی۔

خلافت کا ہنگامہ مسلمانوں کے مذہبی جوش کا نتیجہ تھا اور شروع میں وہی سرکار کی مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے[1] لیکن تھوڑے ہی دن میں ہندو مسلمان دونوں انگریزوں سے ترکِ موالات کرنے میں متفق ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ سرکار انگریزی سے بالکل قطع تعلق کر لیا جائے تاکہ انگریزوں کو حکومت کرنا دشوار ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے انگریزی کپڑا اور ہر قسم کا سامان لینا، ان کے مدارس میں تعلیم پانا، عدالتوں میں وکالت کرنا، یا مقدمے لے جانا، اور ان کی نوکری کرنا سب ناجائز قرار دیا گیا اور ہزاروں اشخاص نے سرکاری احکام نہ ماننے کی بدولت قید خانے میں جانا گوارا کیا۔

افغانستان کی جنگ آزادی

اسی زمانے میں حبیب اللہ خاں امیر افغانستان کسی خونی کے ہاتھ سے مارے گئے اور ان کے ایک چھوٹے بیٹے امان اللہ خاں وارث تخت ہوئے۔ (۱۹۱۹ء) انھوں نے اپنے باپ دادا کے مسلک کے خلاف سرکار انگریزی سے لڑائی چھیڑ دی۔ ان کی فوجیں انگریزی توپ خانے کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں

[1] دیکھو انڈیا ان ۱۹۲۰ء صفحہ ۴۳ و مابعد۔

لیکن سرحد پر آزاد قبائل نے بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور ان پرجوش مجاہدین نے اکثر سرحدی چوکیوں کی انگریزی جمعیت کو وہاں سے نکال دیا۔ آخر امیر افغانستان سے طول طویل مباحثوں کے بعد صلح ہو گئی۔ (سنہ ۱۹۲۱ء) افغانستان کو بالکل آزاد سلطنت تسلیم کر لیا گیا۔ آزاد قبائل کے علاقے سے بھی انگریزی چوکیاں ہٹائی گئیں اور صرف وزیرستان کی چھاؤنیوں کو مستحکم رکھنے پر اکتفا کی گئی۔ اسی بنا پر بعض انگریز نکتہ چینوں نے اسے "نیم پیش قدمی" قرار دیا جو لارڈ کرزن کی پیش روی کے خلاف بلکہ اس حکمت عملی کی تنسیخ تھی۔

نئی جامعات

یوں تو برطانی عہد میں عام تعلیم کو ہندوستان میں برابر ترقی ہوتی رہی، لیکن گزشتہ بیس سال میں اعلیٰ تعلیم کو جو فروغ ہوا، وہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی زمانہ ہے جس میں سرسید احمد خاں کا خواب عمل میں آیا اور مدرسۃ العلوم علی گڈھ نے مسلم یونیورسٹی کی صورت اختیار کی (سنہ ۱۹۱۵ء)۔ اس جامعہ کو سرکار انگریزی نے صرف مقامی رکھنے کی اجازت دی، جو عام مسلمانوں کی امید اور خواہش کے خلاف تھا۔ لیکن چونکہ بنارس کی ہندو یونیورسٹی اس شرط کو قبول کر چکی تھی، اس لئے مسلمانوں کو بھی خاموش ہو جانا پڑا۔ بہار کے صوبے میں پٹنہ یونیورسٹی اور پھر لکھنؤ، رنگون اور ڈھاکے میں الگ الگ جامعات قائم ہوئیں۔ آگرہ دہلی اور اسی طرح دوسری جامعات قائم ہونے کا سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کی سب سے اہم اور امید افزا نئی درس گاہ وہ ہے جو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم شہریار دکن کی فیاضی اور معارف نوازی کی بدولت بلدۂ حیدرآباد میں قائم کی گئی اور جس نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ایک ملکی زبان (اردو) کو بنا کر تعلیم جدید کی تاریخ میں بالکل نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یہ ہماری جامعۂ عثمانیہ ہے جس کی سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے قیام سے سنہ ۱۹۱۶ء کے اخیر میں بنیاد پڑی، سررشتۂ مذکور نے چند ہی سال میں مغربی علوم کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ یا تالیف کر دیں اور اعلیٰ مغربی تعلیم بذریعۂ اردو حاصل کرنے میں کوئی دشواری باقی نہ رہی۔

ترک موالات کا خاتمہ اور باہمی فساد

نئے وایسرائے لارڈ ریڈنگ کے زمانے میں اس عام سیاسی شورش کا جسے تحریک ترک موالات

سے موسوم کرتے ہیں قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔ اس کے تفصیلی اسباب کو یہاں بیان کرنے کی گنجایش نہیں، لیکن تحریک کے ناکام رہ جانے کی سب سے بڑی وجہ اور بدترین نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد غارت ہو گیا اور قومی دوستی اور مل کر کام کرنے کی بجائے ان کی باہمی کشیدگی نے سخت عداوت کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان کے اکثر شہروں قصبات میں فرقہ واری جھگڑے اور بلوے ہوئے جن میں صدہا آدمیوں کی جان گئی[1]۔

سب سے زیادہ شورش چند کتابوں اور اخباری مضامین کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ مسلمانوں کی عام ناراضی دیکھ کر سرکار کو بھی ایک نیا قانون بنانا ضروری معلوم ہوا جس میں ہر شخص کو جو کسی کے مذہب یا پیشوائے مذہب کی جان کر توہین کرے، قابل سزا قرار دیا گیا۔ یہ افسوسناک اور عجیب خانہ جنگی دو تین سال میں کم ہو گئی پھر بھی آج تک کسی گن پتی یا محرم وغیرہ کے تہوار پر کہیں کہیں ہندو مسلمان باہم لڑ پڑتے ہیں اور برابر دنیا کو یہ قابل شرم تماشا دکھاتے رہتے ہیں کہ اس ملک میں ابھی تک کتنی جہالت اور ایک دوسرے کے ساتھ کتنا مذہبی عناد موجود ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر یہ قومیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔

اکالی تحریک
چند نئے قوانین

اسی وائسرائے کے عہد میں پنجاب کے سکھوں نے اپنے مذہبی اوقاف کی اصلاح کی کوشش کی مہنتوں نے جو پہلے سے اوقاف پر قابض تھے، نئی جماعت کی مخالفت کی۔ اس پر اصلاح پسند سکھ جو اکالی کہلاتے ہیں، بڑے انتظام اور استقلال کے ساتھ کئی مہینے تک شورش کرتے اور اصلاح کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ حتیٰ کہ پنجاب کی حکومت نے ان کے منشا کے موافق سکھ گردواروں اور معبدوں کے لئے ایک نیا قانون منظور کر لیا۔

[1] سرکاری بیانات کے مطابق ۱۹۲۷ء کے وسط تک ان بلووں میں تین سو کے قریب اشخاص مارے گئے اور ڈھائی ہزار سے زیادہ سخت زخمی ہوئے۔ (انڈیا ان ۱۹۲۶ء۔ ۲۸ صفحہ ۱۷)۔

وایسرائے کی منظوری سے کان کنوں اور مزدوروں کے لئے بھی دو نئے قانون نافذ ہوئے اور بارہ سال سے کم عمر کے بچوں سے یا رات کے وقت عورتوں سے مشقت کا کام لینا، ناجائز قرار دیا گیا۔

لارڈ ریڈنگ کے زمانے کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ، شہزادۂ ویلز کی ہندوستان میں تشریف آوری ہے، مگر اس وقت (۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء) ملک میں ترکِ موالات کی تحریک پوری زور پر تھی اور اسی لئے تعلیم یافتہ اہلِ ہند کی طرف سے ولی عہد برطانیہ کی آمد پر وہ مسرت و تپاک ظاہر نہیں ہوا جو یہاں کے شاہ پرست باشندوں کی قدیم خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔

سائمن کمیشن

اس کے چھ سال بعد سائمن کمیشن کے استقبال کی جو مخالفت ہوئی وہ صرف کانگرسی خیال کے لوگوں تک محدود تھی۔ یہ تحقیقاتی جماعت برطانی پارلیمنٹ کی طرف سے مقرر ہوئی تھی (۱۹۲۷ء) کہ خود ہندوستان جاکر ملکی حالات اور جدید آئین کی عملی حالت پر غور کرے اور حکومت برطانیہ سے سفارش کرے کہ اہلِ ہند کو کس حد تک مزید سیاسی اختیارات دینے مناسب ہوں گے۔ ہندوستان کے اہل الرائے کا مطالبہ یہی تھا لیکن اس جماعت میں صرف پارلیمنٹ کے ۷ ارکان تھے اور سرجان سائمن اس کے صدر نشین مقرر کئے گئے تھے۔ اس پر کانگرس والوں نے شور مچایا کہ کمیشن میں ہندوستانی بھی شامل ہونے چاہئیں حالانکہ یہ بات برطانی آئین کے خلاف تھی۔ اور اگرچہ سرکار انگریزی نے ہر صوبے کے ممتاز اشخاص کو موقع دیا کہ سائمن کمیشن کے ساتھ بیٹھ کر جملہ مباحث اور تحقیقات میں برابر کا حصہ لیں پھر بھی کانگرس کی مخالفت جاری رہی اور کانگرسی خیال کے لوگوں نے مذکورۂ بالا تحقیقات میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ ہر طرح کمیشن کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔

لارڈ اروِن

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ کانگرس والوں کی تقویت کا ایک سبب یہ ہوا کہ لارڈ ریڈنگ کے بعد لارڈ اروِن وایسرائے مقرر ہوئے (۱۹۲۶ء) جو کانگرس کے ساتھ بہت نرمی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ دوسرے برطانی پارلیمنٹ میں اشتراکی (سوشلسٹ) گروہ کا اثر بڑھ گیا تھا بلکہ اسی وایسرائے کے زمانے میں یہی گروہ برسرِ حکومت ہو گیا اور برطانی وزارت میں

کئی ایسے افراد مقرر ہوئے جو ہندوستان خاص کر کانگرس کے سیاسی مطالبات کی تائید کرتے رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی سائمن کمیشن اپنی تجاویز مرتب کرنے بھی نہ پائی تھی کہ لارڈ اروِن نے سیاسی شورش کو فرو کرنے کی غرض سے سرکاری طور پر یہ اعلان کیا کہ خود سرکار انگریزی کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کو برطانی نوآبادیوں کا مرتبہ، یعنی اندرونی معاملات میں کامل خود مختاری عطا کر دی جائے۔ (نومبر ۱۹۲۹ء)

قانون شکنی کی دوبارہ تحریک

اس اعلان کے باوجود کانگرس نے سرکار سے کوئی مصالحت کرنی منظور نہیں کی اور دوبارہ ترک موالات کی تحریک شروع کی۔ اس دفعہ نوکریاں وغیرہ چھوڑنے کی بجائے کانگرسی لوگوں نے سرکاری قوانین کی خلاف ورزی کرکے قید میں جانے کا منصوبہ سوچا اور جابجا بغیر محصول نمک بنایا اور فروخت کیا جو سرکاری قانون کے خلاف فعل تھا۔ اس تحریک میں مسلمانوں کی مجلس خلافت نے تو کوئی حصہ نہیں لیا مگر جمعیت علما کی طرف سے فتوے چھپے کہ سرکار انگریزی کی بلا تشدد مخالفت اور قانون شکنی کی جائے۔

مجلس مشاورۃ

اس مرتبہ بھی ہزاروں ہندو مسلمان قانون شکنی کرکے قید خانوں میں گئے۔ آخر لارڈ اروِن کی تحریک پر سائمن کمیشن کی تجاویز کو قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا اور لندن میں ایک مجلس مشاورۃ یا گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے اکثر سربرآوردہ رہنما اور بہت سے راجہ نواب شریک ہوئے۔ کانگرس والوں نے بھی سرکار انگریزی سے عارضی صلح کر لی تھی اور ان کی طرف سے تنہا گاندھی جی لندن بھیجے گئے تھے کہ ہندوستان کے واسطے بہترین آئین منظور کرالیں۔ لیکن ہندوستان کے یہ منتخب اکابر و رؤسا بھی آپس میں اتفاق نہ کر سکے اور نہ صرف اہل برطانیہ بلکہ ساری مہذب دنیا کو اہل ہند کی کمزوری اور عدم صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ گاندھی جی نے لندن سے واپس آکر دوبارہ قانون شکنی کی تحریک تازہ کی۔ صوبہ متحدہ میں کانگرس کی کوشش سے بہت سے کسانوں نے زمینداروں اور سرکار کو مالیہ ادا کرنے سے انکار کیا۔ عام اقتصادی پریشانی اور افلاس کی وجہ سے اس تحریک کو اور بھی قوت پہنچی لیکن لارڈ اروِن کے

رخصت ہونے اور برطانیہ میں اشتراکی وزارت کی بجائے مخلوط قومی یا قدامت پسند وزارت مقرر ہونے کے بعد یہ سیاسی شورش بہت کمزور پڑ گئی۔ کانگریس کا اثر قریب قریب زائل ہو گیا۔ لندن کی مجلس مشاورۃ برابر اپنا کام کرتی اور نئی تجاویز ترتیب دیتی رہی۔ اسی کے جلسوں کے دوران میں مسلمانوں کے مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی کا لندن میں انتقال ہوا۔ مگر اہل فلسطین کی خواہش پر ان کا جنازہ بیت المقدس لایا گیا اور تزک و احتشام کے ساتھ وہیں مسجد اقصیٰ کے ایک گوشے میں دفن ہوا۔

مجلس مشاورۃ کا کام بھی اب ختم کے قریب ہے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، ہندوستان کا جدید وفاقی آئین اور صوبوں کی خود مختاری اور تازہ سیاسی اختیارات کے باضابطہ قانون کی صورت میں بہت جلد بروئے عمل آنے کی توقع ہے۔

ہندوستان کے وائسرائے

نام وائسرائے	زمانۂ حکمرانی	کیفیت
(۱) لارڈ کیننگ	۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۲ء	اعلان شاہی سے پہلے کیننگ کی گورنر جنرلی کے دو سال کمپنی کی ملازمت میں داخل ہیں۔
(۲) ارل آف ایلجن	۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۳ء	ارل آف ایلجن نے ایک سال بعد ہندوستان میں بیماری سے وفات پائی۔
(۳) سر جان لارنس	۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء	
(۴) ارل آف میو	۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۲ء	اس وائسرائے کو جزائر انڈمان میں ایک دیسی قیدی نے مار ڈالا ورنہ ہر وائسرائے کی میعاد خدمت بالعموم پانچ سال ہوتی ہے۔
(۵) لارڈ نارتھ برک	۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء	
(۶) لارڈ لٹن	۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۰ء	
(۷) مارکوئس آف رپن	۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء	
(۸) ارل آف ڈفرن	۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۸ء	
(۹) مارکوئس آف لینسڈاؤن	۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۶ء	

(۱۰) لارڈ کرزن	سنہ ۱۸۹۶ تا سنہ ۱۹۰۵ء
(۱۱) لارڈ منٹو	سنہ ۱۹۰۵ تا سنہ ۱۹۱۰ء
(۱۲) لارڈ ہارڈنگ	سنہ ۱۹۱۰ تا سنہ ۱۹۱۶ء
(۱۳) لارڈ چیمزفورڈ	سنہ ۱۹۱۶ تا سنہ ۱۹۲۱ء
(۱۴) لارڈ ریڈنگ	سنہ ۱۹۲۱ تا سنہ ۱۹۲۶ء
(۱۵) لارڈ ارون	سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۳۱ء
(۱۶) لارڈ ولنگڈن	سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۶ء
(۱۷) لارڈ لنلتھگو	سنہ ۱۹۳۶ء تا زمانۂ حال

تمت

صحت نامہ

تاریخ ہند حصہ اول، دوم وسوم (برائے میٹرک) طبع ششم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۴	۱۳	وہ ساد	وہ سادہ	۱۳۴	۷	سنہ ۱۷۲۱ھ	سنہ ۷۲۱ھ
۳۸	۸	سند شاہی	مسند شاہی	۱۳۶	۷	آتے	آنے
۴۱	۸	بایا جاتا	پایا جاتا	۱۴۲	۱۸	بائی	بانی
۵۱	۱	باختہ یہ کہ کے	باختر یہ کے	۱۴۹	۱۲	سنہ ۱۹۲۳ھ	سنہ ۹۲۳ھ
۶۹	۲۲	یکرینگی	یکرنگی	۱۵۲	۱۹	سنہ ۱۹۳۰ھ ۱۵۲۴ء	سنہ ۹۳۳ھ ۱۵۲۴ء
۷۲		زینہ اولاد	نرینہ اولاد	۱۸۴	۳	لقب	نقب
۷۹	۱۲	ورصل	دراصل	۲۳۱	۳	تہیں	یہیں
۹۷	۹	وضاحت ے	وضاحت سے	″	۲۴و۲۵	اوراور	اور
۱۱۳	۱۵	ہنگالہ	بنگالہ	۲۰۶	۶	عطاہو۔	عطاہوا۔
۱۱۴	۲۴	سمش الدین	شمس الدین		۱۲	شیخہ	شیعہ
۱۳۱	۱	براجہ	راجہ	۲۶۹	۱۶	پیچید	پیچیدہ
″	۱۴	پھیل کہ	پھیل گیا کہ	۲۷۸	۶	لاہور لے کر	لاہور سے لے کر
۱۳۴	۱	سنہ ۱۷۱۹ھ ۱۳۱۹ء	سنہ ۷۱۹ھ ۱۳۱۹ء	۲۹۵	۲۳	کمپنیوں لئے	کمپنیوں نے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳۰۶	۳	وست براور	دست بردار	۳۳۶	۸	قدر رتی	قدرتی
۳۲۳	۸	جیسیں	جبیں	۳۷۶	۱۴	کے قت	کے وقت
۳۲۵	۲	ثابت ہو ہوے	ثابت نہ ہوے	۳۷۷	۲۲	نہ کھے	نہ رکھے
۳۳۵	۱۹	اسی	انہی	۴۳۹	۲۵	ورارت	وزارت
″	۲۵	سیس ٹنگز	ہیس ٹنگز				